ملفوظات

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی
مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام

جلد ۱

دیباچہ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بابرکت تصانیف اس سے قبل رُوحانی خزائن کے نام سے ایک سیٹ کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں لیکن ایک عرصہ سے نایاب ہونے کی وجہ سے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس رُوحانی مائدہ کو دوبارہ شائع کر کے تشنہ روحوں کی سیرابی کا سامان کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا بیحد احسان ہے کہ اسکی دی ہوئی توفیق سے خلافت رابعہ کے بابرکت دور میں اب ان کتب کو دوبارہ سیٹ کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ یہ کتب اکثر چونکہ اُردو زبان میں ہیں اور اُردو دان طبقہ کی اکثریت پاکستان میں ہے اس لئے مناسب تو یہ تھا کہ ان کتب کی اشاعت بھی پاکستان میں ہوتی۔ لیکن ناگزیر مشکلات کی وجہ سے مجبوراً بیرون پاکستان سے ہی ان کی اشاعت کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اس ایڈیشن کے سلسلہ میں چند امور قابل ذکر ہیں۔

ا۔ قرآنی آیات کے حوالے موجودہ طرز پر (نام سورۃ : نمبر آیت) نیچے حاشیہ میں دیئے گئے ہیں۔

ب۔ سابقہ ایڈیشن سے محض کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔

ج۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی انگریزی عبارات کو صاف TYPE میں پیش کیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سعید روحوں کو ان رُوحانی خزائن کے ذریعہ راہِ ہدایت نصیب فرمائے اور ہماری حقیر کوششوں کو قبولیت بخشے۔ آمین

خاکسار

الناشر

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء

مبارک احمد ساقی ایڈیشنل ناظر اشاعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہمارا ارادہ یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جملہ کُتب کی طباعت کے بعد رُوحانی خزائن کا دوسرا سلسلہ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اشتہارات، مکتوبات اور ملفوظات پر مشتمل ہوگا شروع کریں، لیکن بعض دوستوں اور خصوصاً حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سلمہٗ ربّہٗ کے شدید اصرار پر کہ ملفوظات جلد شائع ہونے چاہئیں الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ملفوظات شائع کر رہی ہے

ہمارے مقررہ پروگرام میں اس تبدیلی کی ایک وجہ جماعت کا یہ شدید احساس بھی ہے کہ اِس وقت تربیت کی سخت ضرورت ہے، اور جیسا کہ ملفوظات کی جلد اوّل طبع اوّل کے عرض حال میں لکھا گیا تھا ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک ایسا قیمتی خزانہ ہے جو خود ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے اندر ایک غیر معمولی مواد اور طاقت رکھتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کلام چار قسموں پر مشتمل ہے :-

اوّل کُتب و رسائل و اشتہارات جو آپ نے خود بغرض اشاعت تالیف فرمائیں۔

دوم مکتوبات یعنی خطوط جو آپ نے اپنے دوستوں یا عزیزوں یا دیگر لوگوں کے نام اپنے قلم سے لکھ کر ارسال کئے۔

سوئم ملفوظات جس سے مراد آپ کا وہ کلام ہے جو آپ نے کسی مجمع یا مجلس یا سیر وغیرہ میں بطریق تقریر یا گفتگو ارشاد فرمایا۔ اور لکھنے والوں نے اُسی وقت لکھ کر ڈائری وغیرہ کی صورت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی شائع کر دیا۔

چہارم روایات وہ بھی ایک نوع ملفوظات کی ہے مگر وہ ساتھ ساتھ ضبط میں نہیں لائی گئیں

بلکہ راویوں کے حافظہ کی بنا پر جمع کی جاتی ہیں۔

ان چہار اقسام کا مرتبہ یقین اور سند کے لحاظ سے جیسا کہ عرض حال ملفوظات جلد اوّل طبع اوّل میں لکھا ہے اس مذکورہ بالا ترتیب میں سمجھا جانا چاہیئے۔ یعنی سب سے اوّل نمبر پر تالیفات، پھر مکتوبات اور اس کے بعد ملفوظات اور پھر روایات۔

مگر جہاں تک جماعت کی تربیت کا سوال ہے ملفوظات کا مرتبہ ایک لحاظ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کلام کی جملہ اقسام میں سے نمبر اوّل پر سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے احباب اور متبعین کو براہ راست مخاطب کرکے فرمایا۔ اور بیشتر طور پر ایسے حالات میں فرمایا کہ جب حضور کے مدّنظر جماعت کی تعلیم و تربیت کا پہلو تھا۔ اس لئے جہاں تک تربیت اور اصلاحِ نفس کا تعلق ہے ملفوظات میں جملہ اقسام کے کلام کی نسبت سب سے بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب "فتح اسلام" میں اس طرزِ کلام کی اہمیت اور ضرورت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زبانی تقریریں جو سائلین کے سوالات کے جواب میں کی گئیں یا کی جاتی ہیں یا اپنی طرف سے محل اور موقع کے مناسب کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ طریق بعض صورتوں میں تالیفات کی نسبت نہایت مفید اور مؤثر اور جلد تر دلوں میں بیٹھنے والا ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام نبی اس طریق کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں اور بجز خدا تعالیٰ کے کلام کے جو خاص طور پر بلکہ قلمبند ہوکر شائع کیا گیا باقی جسقدر مقالاتِ انبیاء ہیں وہ اپنے اپنے محل پر تقریروں کی طرح پھیلتے رہے ہیں، عام قاعدہ نبیوں کا یہی تھا کہ ایک محل شناس لیکچرار کی طرح ضرورتوں کے وقتوں میں مختلف مجالس اور محافل میں اُن کے حال کے مطابق رُوح سے قوت پاکر تقریریں کرتے تھے۔ مگر نہ اس زمانہ کے متکلّموں کی طرح کہ جن کو اپنی تقریرت فقط اپنا علمی سرمایہ دکھلانا منظور ہوتا ہے یا یہ غرض ہوتی کہ انہیں اپنی جھوٹی منطق اور سوفسطائی حجّتوں سے کسی سادہ لوح کو اپنے پیچ میں لاویں، اور پھر اپنے سے زیادہ جہنم کے لائق کریں۔ بلکہ انبیاء نہایت سادگی سے کلام کرتے اور جو اپنے دل سے اُبلتا تھا وہ دوسروں کے دلوں میں ڈالتے تھے۔ اُن کے کلماتِ قدسیہ عین محل اور حاجت کے وقت پر ہوتے تھے، اور مخاطبین کو شغل یا افسانہ کی طرح کچھ نہیں سُناتے تھے، بلکہ اُن کو بیمار دیکھ کر اور طرح طرح کے آفاتِ رُوحانی میں مبتلا پاکر علاج کے طور پر انکو نصیحتیں کرتے تھے یا حجج قاطعہ سے اُن کے اوہام کو رفع فرماتے تھے اور اُن کی گفتگو میں الفاظ تھوڑے اور معانی بہت ہوتے تھے۔ سو یہی قاعدہ

یہ عاجز ملحوظ رکھتا ہے، اور واردین اور صادرین کی استعداد کے موافق اور اُن کی ضرورتوں کے لحاظ سے اور اُن کے امراضِ لاحقہ کے خیال سے ہمیشہ باب تقریر کھلا رہتا ہے۔ کیونکہ بُرائی کو نشانہ کے طور پر دیکھ کر اُس کے روکنے کے لئے نصائح ضروریہ کی تیر اندازی کرنا اور بگڑے ہوئے اخلاق کو ایسے عضو کی طرح پاکر جو اپنے محل سے ٹل گیا ہو اپنی حقیقی صورت اور محل پر لانا جیسے یہ علاج بیمار کے روبرو ہونیکی حالت میں متصور ہے اور کسی حالت میں کماحقہٗ ممکن نہیں۔"

(روحانی خزائن جلد ۳ بحوالہ فتح اسلام صفحہ ۱۵-۱۷)

پس جماعت کی تعلیمی و تربیتی اور اصلاحِ نفس کے نقطۂ نگاہ کے پیشِ نظر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ملفوظات طیبہ کو اپنے مقررہ پروگرام میں تبدیلی کرکے پہلے شائع کر رہی ہے۔

کتابت جلد ہٰذا

اِس جلد کی کتابت ملفوظات جلد اوّل سے کروائی گئی ہے جو صیغہ تالیف و تصنیف قادیان نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں طبع کی تھی اور جس کی ترتیب و تدوین زیادہ تر چوہدری احمد جان صاحب وکیل المال تحریک جدید اور شیخ عبد القادر صاحب مولوی فاضل حال مربّی سلسلہ احمدیہ لاہور اور مولوی عبد الرشید صاحب مولوی فاضل کی مساعی کی رہینِ منت تھی۔ فجزاہم اللہ خیراً، اور یہ ملفوظات ۱۸۹۱ء لغایت ۱۸۹۹ء تک کے ہیں جو سِلسلہ کے مختلف اخبارات اور رسائل سے مرتب کئے گئے ہیں۔

ملفوظات احمدیہ حصّہ دوم میں جو خواجہ منظور الٰہی مرحوم غیر مبائع نے جمع کرکے شائع کئے اُن میں انہوں نے ابتداء میں "۱۸۷۳ء سے قبل" الحکم جلد ۱۳ نمبر ۱۹ صفحہ ۳-۴ سے اور "۱۸۷۹ء کے قریب" کے زیر عنوان الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۰-۱۱ اور زیرِ عنوان "۱۸۷۹ء کے قریب کا زمانہ" الحکم جلد ۶ نمبر ۴۳ سے اور زیرِ عنوان "۱۸۷۹ء سے پہلے" الحکم جلد ۶ نمبر ۴۴ و ۴۵ سے اور زیرِ عنوان "۱۸۷۹ء سے قبل" الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ و الحکم جلد ۷ نمبر ۳ سے اور زیرِ عنوان ۸ مئی ۱۸۸۵ء" اخبار عام لاہور مطبوعہ ۱۰ مئی ۱۸۸۹ء اور عبد اللہ جیمز عیسائی کے تین سوالوں کے جوابات کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ سب تحریریں حضور کے اپنے قلم سے رقم کردہ مضامین تھے اِس لئے انہیں ملفوظات میں درج نہیں کیا گیا۔ ہم انہیں اشتہارات کے ساتھ ذکر کرینگے۔ کیونکہ ملفوظات سے حضورؑ کی وہ باتیں مراد ہیں جو حضورؑ نے زبانی بیان فرمائیں اور ڈائری نویسوں نے بعد میں مرتب کیں۔

ذیل میں ملفوظات کی اس جلد کا انڈیکس بصورت خلاصۂ مضامین درج کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ملفوظات مبارکہ کو افرادِ جماعت اور غیروں کیلئے مفید اور نافع بنائے۔ آمین

خاکسار جلال الدین شمس حال مقیم کوئٹہ ۲۰ اگست ۱۹۶۰ء

انڈیکس مضامین

مرتبہ
مولانا جلال الدین شمس

الف

اللہ۔

استغفار

استہزاء

اسلام

ج - اسلام نے وہ خدا پیش کیا ہے جو جمیع محامد کا سزاوار ہے۔ اُس کی صفات رحمٰن۔ مالکیت تواب ستجی وغیرہ کا ذکر۔ ص ۱۹۶

د - مسلمان جس خدا کو مانتے ہیں وہ الحمد للہ ...الی... یوم الدین کا مصداق ہے۔ ص ۲۰

ھ - اسلام کے خدا کی عبادت اور پرستش کے لئے نہ تو مشقتوں اور ریاضتوں کی ضرورت ہے نہ کسی مورتی کی حاجت۔ ص ۳۱۸

۱۰ - اسلام اور عیسائیت

ا - شریعت کے متعلق اسلام اور عیسائیت کا عقیدہ ص ۶۱-۶۲

ب - اعمال کے متعلق اصولوں کا مقابلہ

اسلام - من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ پس انسان نیک عمل کیلئے سعی کریگا۔

عیسائیت - عیسائیوں کا یہ اصول کہ انسان اعمال سے نجات نہیں پاسکتا انسان کی ہمت اور سعی کو پست اور مایوس کرنیوالا ہے

ص ۱۷۷-۱۷۸ نیز دیکھو ص ۳۲۷-۳۳۱

۱۱ - اسلام کی تعلیم اور انجیل و توراۃ کی تعلیم کا مقابلہ بلحاظ کمالیت کے۔

ا - کامل تعلیم وہی ہوسکتی ہے جو انسانی قویٰ کی پوری مربی اور متکفل ہو۔

ب - انسانی قویٰ اور فطرت خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب ہے تو قولی کتاب اس کے متضاد نہیں ہوسکتی۔

ج - بہشت دوزخ اور توحید کے لحاظ سے مقابلہ ص ۲۸۱-۲۸۲

د - دوسری تعلیمیں ادھوری اور مکمل تعلیم اسلام ہی کی ہے جو ہر قوت کو اعتدال اور عین محل پر رکھتی اور تربیت کرتی ہے اور یہ ہمارے نبی صلعم کا عظیم الشان معجزہ ہے۔ ص ۲۸۹

۱۲ - اسلام کی دلیل صداقت

ا - مخالفوں کی اپنی ساری طاقتیں اور قوتیں اسلام کے نابود کردینے کے لئے صرف کردینے کے باوجود اسلام کا محفوظ رہنا اور اس کی ترقی اسکی صداقت کی دلیل اور ایک معجزہ ہے۔ ص ۹۹-۱۰۰

ب - اللہ تعالیٰ نے اس ترقی کے زمانہ میں اسلام کو بغیر امداد نہ چھوڑا اور آنحضرتؐ کی پیشگوئی کے مطابق اس کی حفاظت کیلئے ایک شخص پیدا کردیا جو صداقت کی رُوح اسلام میں پھونک دیگا۔ ص ۱۰۰

۱۳ - اسلام اور اسکے مخالفین - مخالفینِ اسلام کو ارضی علوم سے مناسبت ہے اور اہلِ اسلام کو سماوی علوم سے - ایک گنوار مسلمان کی سچی رؤیا اور خوابیں بڑے بڑے فلاسفروں، بشپوں اور پنڈتوں کے خوابوں سے طاقت میں بڑھ کر ہیں۔ ص ۱۲۷

۱۴ - اسلام پر اصحاب الفیل کی طرح حملے - پادری صرف اسلام پر حملے کرتے ہیں کیونکہ اُنکی کانشنس کہتی ہے کہ اُن کی ہلاکت اسلام ہی سے ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اصحاب الفیل کا پھر نمونہ دکھلائے گا۔ ص ۱۴۲-۱۴۳

در پادری بھی اسی پر عمل کر رہے ہیں صفحہ ۴۳۶-۴۳۹

ب - انجیل اور قرآن مجید کی تعلیم کا مقابلہ
دیکھو "قرآن مجید"

اندھاپن

نابینائی کی دو قسمیں ہیں - آنکھوں کی نابینائی اور دل کی - صفحہ ۵۳

انسان

۱ - خدا کی منشاء کے مطابق انسان کا ہر ایک فعل اسوقت ہو جاتا ہے کہ جب وہ جذباتِ نفس سے پاک ہونا اور نفسانیت چھوڑ کر خدا کے ارادوں کے اندر چلتا ہے - صفحہ ۱۴

۲ - انسان چودہ برس پر بلوغ پالیتا ہے - صفحہ ۴۶

۳ - انسان سہو و نسیان سے مرکب ہے اس لئے اسکی ہر خواہش مفید نہیں ہوتی - صفحہ ۱۰۷

۴ - انسان کا سینہ بیت اللہ سے اور قلب حجر اسود سے مشابہت رکھتا ہے - ماسوی اللہ کے خیالات بُت ہیں جو اس میں رکھے جاتے ہیں - انکے نکالنے کے لئے دس ہزار قدسیوں اور فتح مکہ سے مشابہت کا ذکر اور ان سے جہاد کا طریق - صفحہ ۱۸۶-۱۸۷

۵ - انسان کا سینہ مہبط الانوار ہونے کی وجہ سے بیت اللہ کہلاتا ہے - صفحہ ۱۸۸

۶ - انسان کی روحانی طاقتوں پر اس کے معبود کا بڑا اثر پڑتا ہے - اگر ہندو آئے تو دور سے ہی اس سے غفلت کی بو آتی ہے - صفحہ ۲۱۰

۷ - انسان کے اچھی باتوں کی پیروی نہ کرنیکی وجہ صفحہ ۲۱۳

۸ - انسان کے شباب اور انحطاط کا زمانہ - شباب تیس برس تک ہے اور اس کے بعد انحطاط شروع ہو جاتا ہے - صفحہ ۲۷

۹ - انسان کے وجود میں تین قسم کی حکومت - ۱ - دماغ بمنزلہ وزیر جو عقول اور براہین سے کام لیتا ہے - دُوسرا دل جو تمام وجود کا بادشاہ ہے - یہ دلائل سے کام نہیں لیتا - اس کے اندر اللہ تعالےٰ نے قوتِ حاسّہ رکھی ہے - تیسرؔی زبان - صفحہ ۴۰۴-۴۰۵

۱۰ - انسان کا کمال یہ ہے کہ اس میں حقیقی معرفت اور سچی فراست یعنی ایمانی فراست مؤید بنور اللہ پیدا ہو - پنجاب و ہندوستان کے سجادہ نشینوں اور گدیوں کے پیرزادوں اور انکے قوالوں اور ھُو حق کا نعرہ مارنیوالوں کا ذکر - اور اگر وہ فریبی نہیں تو فریب خوردہ ضرور ہیں - عبودیت اور الوہیت کے درمیان جو سچا رشتہ ہے اُسے ان قلا بازیوں سے کوئی تعلق نہیں - صفحہ ۴۰۸-۴۱۰

۱۱ - انسان کی زندگی کا اصل مقصد انعمت علیہم کے گروہ کے کمالات کو حاصل کرنا ہے - صفحہ ۳۵۶

۱۲ - انسان اور خدائی کام انسان سے خدا تعالےٰ کی طرف کھنچے جانے اور فنا کی حالت میں صادر ہوتے ہیں - صفحہ ۳۶۸-۳۶۹

انسانی ہستی

کا مدعا یہ ہے کہ وہ نفسِ مطمئنہ کی حالت حاصل کرے اور خدا کے بدوں نہ رہ سکے - صفحہ ۱۱۳

انشراح صدر

رفتہ رفتہ صالح انسان ترقی

فرع خود ہی ثابت ہو جاتی ہے۔ ص۲۸۵

بدظنی

ا۔ بدظنی انسان کو اندھا کر کے ہلاکت کے ایک تاریک کنوئیں میں گرا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ماموروں سے بدظنی کرنے والے خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور اُس کے فضل کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ص۱۰

ب۔ ساری خرابیاں اور برائیاں بدظنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہماری مخالفت کا باعث بھی بدظنی ہے۔ ص۳۷۱-۳۷۲

ج۔ بدظنی کا انجام جہنم ہے۔ ص۳۷۲

بروز

۱۔ مسئلہ بروز اور بروزی آمد۔ یہ مسئلہ ایک متفق علیہ مسئلہ ظہورات کا ہے۔ صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ کسی گذرے ہوئے انسان کی طبیعت۔ خُو۔ اخلاق ایک اور میں آتے ہیں اُنکی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص قدمِ آدمؑ پر ہے یا قدمِ نوحؑ پر بعض اس کو بروز بھی بولتے ہیں۔

مثل یعنی نوحؑ شیثؑ کے بروز تھے۔ اور حضرت ابراہیم کے بروز آنحضرتؐ تھے۔

۲۔ آخری زمانہ کے واسطے آنحضرتؐ نے دو رنگ کے فتنوں کی خبر دی تھی۔ اندرونی یعنی مسلمان سچی ہدایت پر قائم نہ رہیں گے۔ بیرونی۔ اہل صلیب آنحضرتؐ پر اعتراضات اور اسلام کی توہین و تخریب کرینگے۔ ساتھ ہی بشارت ملی کہ امت میں سے ایک شخص مبعوث کیا جائیگا۔ جو مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی وجہ سے مہدی اور کسرِ صلیب کی وجہ سے مسیح ابن مریم کہلائیگا۔ ص۴۴۳-۴۴۵

۳۔ بدیوں کے دو بروز۔ الدجال جو تمام مکائد اور شرارتوں کا مجموعہ ہے اس نے دو قسم کا دجل دکھایا۔ ایک قسم کا حملہ نبوت پر کیا اور ایک خدا پر۔ اور اُنکی حقیقت۔ دوسرا یاجوج ماجوج۔ اس کا اثر دل پر پڑتا ہے اسکو شوکت حاصل ہے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع۔ امانت دیانت کا اختیار کرنا۔ شراب۔ زنا۔ بدکاری۔ قمار بازی سے بچنا مشکل ہو رہا ہے۔ ص۴۵۰-۴۵۱

۴۔ نیکی کے دو بروز۔ اندرونی لحاظ سے مہدی اور بیرونی لحاظ سے مسیح ابن مریم۔ مسیح کا کام دفع شر اور مہدی کا کسبِ خیر۔ مہدی اکمل ہے اس لئے وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ وہ اصل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہے۔ ص۴۵۱-۴۵۲

برہمو سماج

الہام کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے شانتی اور سچا نور نجات کا حاصل نہیں کر سکتے۔ الہام کو فضول قرار دینے والے عقل سے بھی کام نہیں لیتے۔ ص۶۵

بسطامیؒ

بایزید بسطامیؒ کے ایک مشائخ زادہ کے خیال کا کہ یہ معمولی آدمی صاحب خوارق کیونکر ہو گیا۔ تیل اور پانی کی مثال دیکر سمجھانا کہ بلندی مصائب اور صعوبتیں جھیل کر حاصل ہوتی ہے۔

ص۲۶

ت

تائیدات الٰہیہ

تبلیغ

تثلیث

تحریف

تربیت

تزکیہ نفس

ایاک نعبد وایاک نستعین نہیں کہا۔ اس لئے کہ اس میں نفس کے تقدم کی بُو آتی تھی۔ اور یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ ص ۴۲۲

۴۔ من کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی
(الف) اس آیت میں اندھے سے مراد روحانی معارف اور روحانی لذات سے خالی شخص مراد ہے۔
(ب) آخری جہان کے مشاہدہ کیلئے اسی جہان سے آنکھیں لے جانی ہیں اور حواس کی تیاری بھی یہاں سے ہوگی اور کورانہ تقلید سے ممانعت ص ۲۰ و ۲۸ و ص ۳۴۹
(ج) جس کو یہاں علم بصیرت اور معرفت نہیں دی گئی۔ اُسے وہاں کیا علم ملے گا۔ ص ۳۴۹

۵۔ ھدی للمتقین کی تفسیر۔ یہ کتاب اُن کے لئے نافع ہے جو پرہیز کرنے اور نصیحت کے سُننے کے لئے تیار ہوں۔ اتقا کے ساتھ عجب غرور اور پندار دُور ہوجاتا ہے۔ ص ۲۱

۶۔ والذین یؤمنون بالغیب ... الی ... یوقنون کی لطیف تفسیر۔ اور یہ کہ مما رزقنٰھم میں رزق سے مراد علم و حکمت اور طبابت سب شامل ہیں۔ ص ۲۱ و ص ۲۸ و ص ۳۲

۷۔ آیت یؤمنون بالغیب ... الی ... ینفقون میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اتقاء کی تین اقسام کا ذکر اور انکی تفصیل۔ ص ۲۳۲-۲۳۵

۸۔ آیت الم ذٰلک الکتاب ... الی ھدی للمتقین میں علل اربعہ کا ذکر اور اُن کی تشریح ص ۲۲۲-۲۲۵

۹۔ واذا مروا باللغو مروا کراماً جیسے گالی سن کر غصہ نہ کرنا۔ ص ۲۳

۱۰۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ یعنی اس راہ میں پیغمبر کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا اور جان دینے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ مجاہد کا کام ایک دو گھنٹے کے بعد بھاگ جانا نہیں ص ۲۵ نیز دیکھو ص ۲۰ و ص ۲۹ و ۱۴۷ و ۲۹۳

۱۱۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ الآیۃ کی لطیف تفسیر حقیقی پیرو وہ ہونگے جو اپنے متبوع کے ہر قول و فعل کی پوری پیروی کریں گے۔ ص ۲۷

۱۲۔ ان اللہ وملائکتہٗ یصلون علی النبی الآیۃ کی لطیف تفسیر کہ رسول کریمؐ کے اعمال صالحہ کی تعریف بھی تحدید سے باہر تھی۔ اس قسم کی آیت اور کسی قسم کے نبی کی شان میں نہیں آئی۔ ص ۲۷-۲۸

۱۳۔ ورابطوا میں لفظ رباط کی نہایت لطیف تفسیر و تشریح۔ ص ۵۴ و ۵۵ و ۵۸ و ۷۷

۱۴۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے احکام ایسے نہیں جن کی بجا آوری کوئی کرہی نہ سکے یا جن کو کوئی سمجھ ہی نہ سکے۔ ص ۶۱

۱۵۔ (الف) انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون۔ یعنی قرآن کی تعلیم صحیفۂ فطرت میں ہے۔ قانونِ قدرت اس کی شہادت دیتا ہے۔ ص ۶۴ و ۶۹
(ب) زمین و آسمان کی چھپی ہوئی کتاب۔ قرآن کریم اسی کتاب کا آئینہ ہے۔ اُس نے وہی خدا دکھایا جسپر زمین و آسمان شہادت دیتے ہیں۔ ص ۲۷۱

۸ - تقویٰ شریعت کا مغز اور خلاصہ ہے ۔ صـ ۱۰۹
۹ - حقائق و معارف کے دروازے تقویٰ کے ذریعے کھلتے ہیں صـ ۲۳۲
۱۰ - انسان کو نیک بختی اور تقویٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے
بعض وقت ایک شخص کی بدی سارے گھر اور شہر کی ہلاکت
کا موجب ہو جاتی ہے ۔ صـ ۲۶۲
۱۱ - تقویٰ خلاصہ ہے تمام صحف مقدسہ کا اور تورات اور
انجیل کی تعلیمات کا ۔ صـ ۳۰۳
۱۲ - تقویٰ کی راہ جس سے سکھ اور آرام ملتا ہے دوسرے
لفظوں میں قرآن کریم کی راہ ہے اور اس کا نام
صراط مستقیم بھی ہے ۔ صـ ۴۲۰
۱۳ - حقیقی راحت اور لذت کا مدار تقویٰ پر ہے ۔ جو
دنیا دار کو حاصل نہیں ہوتی ۔ صـ ۴۲۱
۱۴ - تقویٰ تمام جوارح انسانی اور عقائد زبان اخلاق
وغیرہ سے متعلق ہے ۔ نازک ترین معاملہ زبان
سے ہے ۔ ایک دنیا دار حاجی نے ایک بزرگ کی
دعوت کی ۔ اور نوکر سے تین تھالیاں تین حجوں کا
ذکر کر کے منگوائیں ۔ بزرگ نے کہا ۔ تین فقروں میں
تین حجوں کا ستیا ناس کر دیا ۔ صـ ۴۲۲
۱۵ - تقویٰ کے تین مراتب ۔
۱ - یومنون بالغیب یعنی پہلی قسم اتقاء کی علمی
رنگ رکھتی ہے جو حالت ایمان کی صورتیں ہوتی ہیں ۔
دوسری قسم عملی رنگ رکھتی ہے جیسا کہ یقیمون الصلوٰۃ
اس میں لوازم الصلوٰۃ معراج ہے ۔ و مما رزقنٰھم
ینفقون یہ تقویٰ عملی کا ایک جزو ہے صـ ۴۲۸ ۴۲۲
تیسری قسم تقویٰ کی و یومنون بما انزل الیک ،

یعنی راستبازوں کی شہادتیں ۔ صـ ۴۳۹ و ۴۴۰

متقی

متقی اور اس کے علامات

۱ - اللہ تعالیٰ متقی کو مکروہات دنیا سے آزاد کر کے
اس کے کاموں کا خود متکفل ہو جاتا ہے اور دینی امور
سے حارج اور مصائب سے مخلصی بخشتا ہے صـ ۱۲
۲ - متقی کو خاص طور پر رزق دیتا ہے روحانی رزق (معارف)
کا رزق ۔ صـ ۱۳
۳ - متقی کے پاس جو آ جاتا ہے وہ بھی بچایا جاتا ہے ۔
صـ ۱۵
۴ - متقیوں کو دنیا میں سچے خوابوں کے ذریعہ بشارتیں ملتی
ہیں ۔ وہ صاحب مکاشفات ہو جاتے ہیں مکالمۃ اللہ
کا شرف حاصل کرتے اور بشریت کے لباس میں ملائکہ
دیکھ لیتے ہیں ۔ صـ ۱۵
۵ - اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لئے چاہا کہ ہر دو لذتیں
اُٹھائیں ۔ بعض وقت دنیوی لذات آرام اور طیبات
کے رنگ میں ۔ بعض وقت عسر اور مصائب میں ۔
تاکہ انکے دونوں اخلاق کامل نمونہ دکھا سکیں ۔ صـ ۱۷
۶ - متقیوں ۔ اولیاء اور انبیاء کو اللہ کی راہ میں مصائب
کے وقت لذت محسوس ہوتی ہے ۔ صـ ۱۶ - ۱۷
۷ - متقی کو آئندہ زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے ۔ اُسے
دنیا میں خدا ملتا نظر آتا اور اُس سے باتیں کرتا ہے
صـ ۱۸
۸ - خدا کا منشاء ہے کہ متقی ان مراتب کو حاصل کر سکے
جو انبیاء اور اصفیاء کو حاصل ہوتے ہیں ۔
صـ ۲۱ و ۲۸ ، ۲۹ ، ۱۸۵

خمیر کئے گئے ہیں کہ ایک وقت ہمارے بڑے کام آسکتے ہیں۔ جتنا شرف بڑھ جاتا ہے۔ محنت اور کام ہلکا ہو جاتا ہے۔ صـ ۳۲۲

۴۔ اس سلسلہ کو قائم کرنے سے اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا ہے کہ یہ جماعت صحابہؓ کی طرح قرآن شریف اور آنحضرتؐ کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔ صـ ۳۵۶

۵۔ قانون سٹڈیشن سے فائدہ جماعت احمدیہ ہی اٹھاسکتی ہے اور اس کی تفصیل۔ صـ ۱۲۴

جماعت کو نصائح

۱۔ جوشِ نفس سے دل دکھانے والے الفاظ استعمال نہ کرو۔ صـ ۸

۲۔ ہماری جماعت کو اللہ تعالیٰ نے ایک نمونہ بنانا چاہا ہے، صـ ۹

۳۔ خدا تعالیٰ کی عظمت کو یاد کرکے سب ترساں رہو و دیگر نصائح۔ صـ ۹

۴۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة الآیة کی دعا بکثرت کرنے کی نصیحت۔ صـ ۹

۵۔ تقویٰ کے متعلق جماعت کو نصیحت۔ صـ ۹

۶۔ جس کا قول و فعل برابر نہیں وہ موردِ غضب الٰہی ہوگا۔ صـ ۱۱

۷۔ ہماری جماعت کل دنیوی غموں سے بڑھ کر یہ غم اپنی جان پر لگائے کہ اُن میں تقویٰ ہے یا نہیں۔ صـ ۳۵

۸۔ ایک دوسرے کو چھوٹا یا بڑا نہ سمجھو۔ غرور نہ کرو۔ حقارت سے نہ دیکھو۔ چڑ کے نام نہ لو وغیرہ صـ ۳۶

۹۔ جسقدر کوئی قرب حاصل کرتا ہے اُسی قدر مؤاخذہ کے قابل ہے۔ صحابہؓ کی طرح صادق و وفا اپنے جذبات پر قابو اور خدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق اپنے قول و فعل وغیرہ بنانے کی نصیحت۔ صـ ۴۴ - ۴۶

۱۰۔ أ۔ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو عقلِ سلیم سے کام لو تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو۔

ب۔ فلاحِ دارین اور لوگوں کے دلوں پر فتح چاہتے ہو تو کلامِ الٰہی کی ہدایات پر چلو۔ اور دوسروں کے لئے نمونہ بنو۔

ج۔ اگر دلوں پر اثر اندازی چاہتے ہو تو عملی حالت پیدا کرو۔ صـ ۶۶ - ۶۷

۱۱۔ علوم جدیدہ کی ماہیت اور کیفیت سے آگاہی حاصل کرو کیونکہ اسلام پر اعتراضات کی بنیاد وہی ہیں۔ صـ ۶۸

۱۲۔ دلوں کو روشن کرنے کیلئے آسمانی نور اترا ہے اُسے قبول کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کو تیار ہو جاؤ۔ صـ ۷۲

۱۳۔ راستباز اور متقی بنو تا عقل میں جودت اور ذہانت پیدا ہو۔ صـ ۷۳

۱۴۔ ہدایت اور روشنی کی راہوں پر قدم مارنے کیلئے عقل اور تزکیۂ نفوس سے کام لو۔ صـ ۷۳

۱۵۔ اگر تم اسلام کی حمایت اور خدمت چاہتے ہو۔ تو پہلے خود تقویٰ اور طہارت اختیار کرو جس سے خود تم خدا تعالیٰ کی پناہ کے حصن حصین میں آسکو۔ صـ ۷۷

۱۶۔ اخلاقی ترقی کریں۔ سختی کا نرمی اور ملاطفت سے جواب دیں۔ انتقامی طور پر بھی جبر اور تشدد

نہ کریں۔ گالی دینے والے شریر سے اعراض کریں۔
ص۱۰۲ و ۱۰۳

۱۷ ۔ خدا تعالےٰ کی بشارت کہ قیامت تک تیرے متبعین منکرین پر غالب رہیں گے۔ یہ کامیابی تمہیں حاصل نہیں ہوسکتی جبتک لوامہ کے درجہ سے گذر کر مطمئنہ کے مینار تک نہ پہنچ جاؤ۔ ص۱۰۴

۱۸ ۔ جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کا اثر میری ذات تک محدود نہیں بلکہ ان کا اثر ہمارے نبی کریمؐ اور خود خدا تعالےٰ کی ذات تک پہنچ جاتا ہے۔ ص۱۰۴

۱۹ ۔ دوستوں کو لازم ہے کہ ہماری دعاؤں کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ جس کا سبب ان کی ناشائستہ حرکات بن سکتی ہیں۔ کیونکہ دعا کرنے والے کیلئے تقویٰ اور راستبازی سے خدا تعالےٰ کو خوش کرنا ضروری ہے۔ ص۱۰۸

۲۰ ۔ تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو تاکہ قبولیت دعا کا سرور اور حظ حاصل ہو۔ ص۱۰۹

۲۱ ۔ اکثر اوقات اہل وعیال اور اموال کی ناجائز محبت انسان سے ایسے کام کرواتی ہے۔ جو اس میں ایک حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔ ص۱۱۱-۱۱۲

۲۲ ۔ ساری ہمت تبدیلیٔ اخلاق میں صرف کرو۔ کیونکہ یہی حقیقی قوت اور دلیری ہے۔ ص۱۴۰

۲۳ ۔ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور جانا ہے پس عمدہ حالت میں اس دنیا سے کوچ کرو۔ ص۱۴۲

۲۴ ۔ کامیابی کی راہ خدا کی راہ ہے اسکی معرفت چاہو اور اس کی طرف قدم اٹھاؤ۔ ص۱۴۵

۲۵ ۔ اچھے اخلاق ظاہر کرنا ہی اپنی کرامت ظاہر کرنا ہے ص۱۴۶

۲۶ ۔ ہماری جماعت کے لوگ میرے مرید ہو کر مجھے بدنام نہ کریں کیونکہ بیعت کرنیوالا فرزند کے حکم میں ہوتا ہے۔ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو بدنام کرے۔ ص۱۴۷

۲۷ ۔ میں تمہارے اندر ایک نمایاں تبدیلی چاہتا ہوں تا مخالف شرمندہ ہوں اور جو دوسروں کے لئے موجب ہدایت وسعادت ہو۔ ص۱۴۸ و ۱۵۱

۲۸ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کو مدنظر رکھو۔ ص۱۴۹

۲۹ ۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ آخرت پر نظر رکھے۔ دوسروں کی غفلت سے خود غافل نہ رہے اور انکی محبت کو سرد دیکھ کر اپنی محبت کو ٹھنڈا نہ کرے ص۱۵۲

۳۰ ۔ دنیوی کامیابیوں کو خداشناسی کا ذریعہ قرار دو۔ ص۱۵۵

۳۱ ۔ اپنے سینہ ودل کو تقویٰ پاک صاف کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔ ص۱۸۷ - ۱۸۸

۳۲ ۔ تقویٰ اور اعمال صالحہ کے لئے نصیحت۔ اس وقت ہمارے قلم رسول اللہؐ کی تلواروں کے برابر ہیں۔ یاد رکھو۔ تمہاری فتح تقویٰ سے ہے۔ ص۱۷۸ - ۱۷۹

۳۳ ۔ تم صرف اپنا عملی نمونہ دکھاؤ اور اس میں ایک ایسی چمک ہو کہ دوسرے اس کو قبول کریں۔ ص۱۸۱

۳۴ ۔ مصاحبت دین چاہتا ہے۔ اس لئے دوستوں کو

جنّت

جنگ

جہاد

حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے۔ اور کسی بزرگ نے بذریعہ کشف اس کا انکار نہیں کیا۔ بلکہ کیا ہے تو تصدیق ہی کی ہے۔ علماء سے مراد ظاہری علماء نہیں بلکہ عالم ربّانی ہیں جو صفات خوف و خشیۃ اللہ اور تقوی اللہ سے متصف اور جنکو حق الیقین کا مقام حاصل ہے۔
ص ۳۴۷ - ۳۴۹

۱۴۔ مسجد کی طرف کی تمام کھڑکیاں بند کر دی جائیں حضرت ابوبکرؓ کی کھڑکی مسجد کی طرف کھلی رہیگی کی لطیف تشریح۔ ص ۴۴۱-۴۴۲

۱۵۔ زمانہ فیج اعوج کی نسبت فرمانِ نبویؐ لیسوا منی ولست منہم۔ ص ۴۴۳

۱۶۔ الائمۃ من قریش کا صحیح مفہوم۔ سلاطین مغلیہ وغیرہ بھی بروزی طور پر قریش ہی ہیں ص ۴۵۳-۴۵۴

حسینؓ (امام)

مسلم نے ستر ہزار آدمیوں سے حضرت امام حسینؓ کی رفاقت کا عہد لیا مگر یزید کے آنے کی خبر سے سب کے سب آپ کو تنہا چھوڑ گئے۔ ص ۳۷۵

حکمت

ا۔ حکمت کے یہ معنے نہیں کہ ایسی گفتگو کی جاوے جس سے خواہ نخواہ جوش ہو۔ ص ۹

ب۔ حکمت کے معنے ہیں وضع الشیء فی محلہ۔ ص ۱۳۱ و ۴۳۷

خ

خاتم النبیین

ا۔ جس قوت اور یقین، معرفت اور بصیرت کے ساتھ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے ہیں۔ اسکا لاکھواں حصہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے۔ ص ۳۴۲

۲۔ ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں۔ جب سب ضرورتیں پوری ہوگئیں تو آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ثابت ہوئے۔ ص ۸۸

۳۔ معنے (ا) نبوت کے امور کو آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔

(ب) کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرتؐ پر ختم ہوگیا۔ ص ۲۸۶

(ج) رسول کریمؐ کے بعد کوئی نیا یا پرانا نبی نہیں آسکتا جس کی نبوت پر آپ کی مہر نہ ہو۔ ص ۳۳۴

(د) اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ نبی دیا جو خاتم المؤمنین خاتم العارفین اور خاتم النبیین ہے۔ ص ۳۴۱

(ہ) آنحضرت کے خاتم النبیین ہونے کا ایک پہلو یہ ہے کہ امت میں بڑی بڑی استعدادیں رکھدی ہیں۔ ص ۳۴۷

خاتم الکتاب

آنحضرتؐ کو خاتم النبیین اور قرآنِ شریف جیسی کامل اور خاتم الکتاب عطا فرمائی جس کے بعد قیامت تک نہ کوئی کتاب آئیگی اور نہ کوئی نیا نبی نئی شریعت لے کر آئیگا۔ ص ۳۵۳

ختم نبوت

ا۔ جہاں پر دلائل اور معرفت طبعی طور پر ختم ہو جاتے ہیں وہ وہی حد ہے جس کو ختم نبوت کے نام سے

موسوم کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ایمان اور عرفان کی تکمیل ہوئی۔ دوسری قوموں کو روشنی پہنچی - صـ ۲۸۳

۲۔ نبوت ختم ہونے سے مراد یہ ہے کہ طبعی طور پر آپ پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے۔ یعنی آپ جامع کمالات جمیع انبیاء ہیں - صـ ۳۴۱

۳۔ ختم نبوت کی مثال۔ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر اس کا کمال ہو جاتا ہے جبکہ اُسے بدر کہا جاتا ہے۔ معترضین تو ختم نبوت کی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔ صـ ۳۴۲ - ۳۴۳

خدا تم

دیکھو "اللہ"

خدا بخش

سکھوں کے زمانہ میں ہمارے گاؤں کے قریب رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنا نام خدا سنگھ رکھ لیا تھا۔ صـ ۳۱۲ و صـ ۴۴۶

خلق جمع اخلاق

۱۔ خوش اخلاقی ایک ایسا جوہر ہے کہ موذی انسان پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ صـ ۸۱

۲۔ اخلاق انسان کے صالح ہونے کی نشانی ہے۔ صـ ۱۲۷ - ۱۲۸

۳۔ اخلاق انسان کو انسان بناتے ہیں۔ اخلاق کی حقیقت۔ خَلق اور خُلق کی تشریح۔ صـ ۱۳۲

۴۔ اگر کوئی اپنے اخلاق فاسدہ کو اخلاق فاضلہ اور خصائلِ حسنہ سے تبدیل کرنیکی کوشش نہیں کرتا تو اس کی اخلاقی حالت بالکل گر جاتی ہے۔ صـ ۱۳۷

۵۔ تبدیلئ اخلاق دُعا اور مجاہدہ سے ہو سکتی ہے۔ صـ ۱۳۷

۶۔ اخلاقِ سیئہ حقیقی توبہ سے تبدیل ہو سکتے ہیں۔ صـ ۱۳۸

۷۔ حکماء کے تبدیل اخلاق کے متعلق دو مذہب ہیں کہ انسان تبدیل اخلاق پر قادر ہے۔ بعض کے نزدیک قادر نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کوشش سے ہو سکتے ہیں۔ تبدیلئ اخلاق کو ناممکن قرار دینے والے غلطی پر ہیں۔ افلاطون کے پاس ایک آدمی کے آنیکا واقعہ جس نے اپنے اخلاق تبدیل کر لئے تھے - صـ ۱۳۷ - ۱۳۸

۸۔ اخلاقی حالت کی درستی ایسی کرامت ہے جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا۔ صـ ۱۴۲ و صـ ۱۴۶

۹۔ مومن کو چاہیئے کہ وہ اپنے اخلاق کو اس درجہ پر پہنچائے کہ وہ متعدّی ہو جائیں۔ حاتم بوجہ سخاوت اور رستم و اسفندیار بوجہ بہادری مشہور ہیں۔ اور فلپ سڈنی کا واقعہ خود پانی نہ پینے کا اور دوسرے ساتھی کو پلانے کا۔ صـ ۲۱۲ - ۲۱۳

۱۰۔ اخلاق تمام قویٰ کو برمحل استعمال کرنے کا نام ہے۔ صـ ۴۳۶

خلق عظیم

بڑی بھاری کرامت ہے جو خوارق عادت امور کو بھی مشتبہ کر سکتا ہے۔ شق القمر اور رمضان میں کسوف و خسوف پر جو اس وقت شبہات پیش کئے جاتے ہیں۔ صـ ۱۴۰ - ۱۴۱

خواب

ایک ولی کا قول ہے جس کو ایک خواب سچّا عمر میں نصیب نہیں ہوا۔ اسکا خاتمہ خطرناک ہے۔ صـ ۱۸

کا حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اُس وقت کی باتیں بھولتی نہیں
صـ ۱۷

ڈ

ڈاکٹروں کو نصیحت

طبیبوں اور ڈاکٹروں کو چاہیئے کہ متقی بن جاویں۔ دوا بھی کریں اور دُعا بھی۔ تنہائی میں بہت دُعائیں مانگیں جالینوس کو اسہال بند کرنے کا بڑا دعویٰ تھا۔ خداؑ کی شان کہ وہ خود اس مرض کا شکار ہوا۔ خداؑ کی طرف توجہ کرنے والا سعادت مند ہے۔ صـ ۲۵۲-۲۵۳

ڈگلس

کیپٹن ڈگلس کے پادری ہنری مارٹن کلارک کے مقدمہ میں منصفانہ فیصلہ کی تعریف۔ صـ ۲۱۶ و ۲۱۱

ذ

ذات پات

ذاتیں وجۂ شرافت نہیں۔ میرے نزدیک ذات کوئی سند نہیں حقیقی مکرمت اور عظمت کا باعث فقط تقویٰ ہے۔ صـ ۳۷

ر

رازی (امام فخر الدینؒ)

ان کا یہ قول بہت درست ہے کہ جو شخص خداؑ کو عقل کے پیمانہ سے اندازہ کرنے کا ارادہ کرے گا وہ بے وقوف ہے۔ صـ ۹۰

رام بھجدت

آریہ وکیل نے بلا فیس ڈاکٹر مارٹن کلارک کے مقدمہ میں پیروی کی۔ شاید قتل لیکھرام کا کوئی سراغ ملے۔ صـ ۲۷۹

رانی الیشر کور

دیکھو "جیمل سنگھ"

رباط

ا۔ وہ گھوڑے جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں۔ اس میں ظاہری دشمنوں کا مقابلہ اور روحانی مقابلہ دونوں شامل ہیں۔

ب۔ رباط انسانی نفس اور دل کو بھی کہتے ہیں۔

ج۔ ظاہری جنگ کے لحاظ سے رباط اسباب و اسلحہ اور ان کے استعمال کا طریق اور پھر قوت بازو کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اندرونی حرب اور جہاد کے لئے نفوس انسانی کی تربیت پھر عمل اور مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔

(د) اس لفظ کی تشریح کے سلسلہ میں عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے کا ثبوت۔ صـ ۵۵-۵۸

ربوبیت

بشریت کا ربوبیت سے تعلق اس وقت ہوتا ہے جب تک انسان کی رُوح آستانۂ الٰہی پر گر کر عدم یا مشابہ بالعدم نہ ہو۔ صـ ۲۱۱

رحمانیت و رحیمیت

ا۔ یہ رحم کی دو قسمیں ہیں۔ رحمانیت ایسا فیضان ہے، جو ہمارے وجود اور ہستی سے بھی پہلے شروع ہوا اور اس کی تفصیل۔ دوسری رحیمیت یعنی جب ہم دُعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ صـ ۱۲۸-۱۲۹

ب۔ رحمانیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہم میں رحیمیت سے فیض اٹھانے کی سکت پیدا کرے جو ایسا نہیں کرتا وہ کافر نعمت ہے۔ صـ ۱۳۰ و ۱۹۷، ۱۹۹ و ۲۰۲ و ۲۰۳

۳- جسقدر تعلقات انسان کے وسیع ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر اس کی خوابوں کا تعلق وسیع ہوتا ہے۔ اور اپنی ایک رؤیا کا ذکر جس میں آپ نے بڑا پیالہ شربت کا پیا۔ فرمایا۔ شربت سے مراد کامیابی ہوتی ہے اور یہ اسلام اور ہماری جماعت کی کامیابی کی بشارت ہے۔ ص ۲۷۵-۲۷۶

رہبانیت

ا- رہبانیت اسلام کا منشا نہیں وہ تو انسان کو چست ہوشیار اور مستعد بنانا چاہتا ہے۔ پس دنیا کے کاروبار کو چھوڑنا اور بیوی بچوں سے الگ ہو جانے کو اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ ص ۱۸۴

ب- رہبانیت معرفت تامہ کا ذریعہ نہیں ہے۔ اور خطرناک ریاضتیں کرنا اور اعضاء اور قویٰ کو مجاہدات میں بیکار کرنا نکمّی بات ہے ص ۳۲۲

ریاء اور ریاکاری

۱- ریاء کی چال ایک چیونٹی کی طرح ہے۔ بعض وقت بے سمجھے انسان ریاء کو اپنے دل میں پیدا ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اور اس کی مثال ص ۲۲

۲- وہی اچھا ہے جو ہر ایک امر خفیہ رکھے اور ریاء سے بچے۔ تذکرۃ الاولیاء سے ایک بزرگ کو بوقت ضرورت ایک ہزار روپیہ دیئے جانے کا واقعہ۔ ص ۲۲-۲۳

۳- ریاء اور حلم کا بسا اوقات جنگ ہو جاتا ہے ص ۲۳

۴(ا) حاتم کی سخاوت کے واقعات اور رستم و اسفندیار کی بہادری کے اور سر فلپ سڈنی کا نزع کی حالت میں پانی کا پیالہ دوسرے زخمی سپاہی کو دینے کا گو ریاء کاری سے ہی سہی لیکن چونکہ اُن میں نیکی کی اصل موجود ہوتی ہے اسلئے عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔

(ب) جبتک انسان سچا مومن نہیں بنتا اس کی نیکی کے کام خواہ کیسے ہی عظیم الشان ہوں وہ ریاکاری کے ملمع سے خالی نہیں ہوتے۔ ص ۲۱۲-۲۱۳

ریاضت۔ ریاضتیں

۱- اسلامی خدا کی عبادت کیلئے نہ تو مشقتوں اور ریاضتوں کی ضرورت ہے نہ موتی کی۔ ص ۳۱۸ و ص ۳۵۱

۲- جو حقیقۃً فطرت کے مقتضا سے وہ قویٰ نہیں رکھتے اور ریاضتوں میں پڑ جاتے ہیں آخر کار دیوانے اور مخبط الحواس ہو جاتے ہیں۔ ص ۴۵۸

ریفارمر

حقانی واعظ اور راستباز لوگوں کا مطلوب و مقصود خدا ہوتا ہے۔ انکی نگاہ میں سامعین ایک مردہ کیڑا ہوتے ہیں۔ نہ اُن سے کوئی اجر مقصود ہوتا ہے۔ نہ ان کے واہ واہ کی پرواہ۔ اُن کے چند کلمے جو نہایت خلوص اور سچے جوش اور حقیقی ہمدردی کی بنا پر اُن کے پاک مُنہ سے نکلتے ہیں۔ لوگوں کے لئے سُننا دشوار اور گراں ہوتا ہے۔ ص ۴۰۱-۴۰۲

زبان

۱- تقویٰ میں سے نازک ترین معاملہ زبان سے ہے

پیدا نہیں ہوتا۔ ص ۴۲۳

صلیب

جب یہ ثابت ہو جائے کہ مسیحؑ صلیب پر نہیں مرے تو الوہیت اور کفارہ باطل ہو جاتے ہیں۔ ص ۳۳۴

صوفیاء

بعض بزرگ اہل کمال بایزید بسطامیؒ سے لیکر شبلیؒ ذوالنونؒ اور محی الدینؒ ابن عربی کے بعض کلمات علی العموم فنا نظری کے ہیں۔ ہمارا یہ حق نہیں کہ ہم ان کو استہزاء کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اہل عقل تھے اور اُن کے ایسے کلمات کہنے کی اصل وجہ۔ ص ۱۱۷

ط

طاعون

۱۔ بعض امراض قیامت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ طاعون بھی ان میں سے ایک ہے۔ ص ۲۴۵

۲۔ طاعون کی بیماری میں چاروں قسم کے امتحانات۔ خوف نقصانِ مال۔ نقصانِ جان اور تلفِ ثمرات مجموعی طور پر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ص ۲۴۶

۳۔ طاعون سے لوگوں نے عبرت نہیں پکڑی۔ ص ۲۴۷

۴۔ طاعون کے معنے۔ ص ۲۴۸

۵۔ تورات اور قرآن سے ثابت ہے کہ طاعون انسان کی نافرمانی اور بدکاری کی وجہ سے آتی ہے۔ ص ۲۴۸

۶۔ طاعون کے متعلق جو گورنمنٹ نے تدابیر سوچی ہیں ہماری بھلائی کے لئے ہیں۔ اور درحقیقت اس کی طرف سے ایک نیکی ہے۔ ص ۲۴۶، ۲۴۹، ۲۵۵

۷۔ اللہ تعالیٰ نے طاعون کا نام رجز رکھا ہے جس کے معنے عذاب اور دوام اور پلیدی اور ناپاکی کے ہیں اور طاعون میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور اس کی تفصیل۔ ص ۲۵۰

۸۔ طاعون کیا ہوتی ہے :-

(ا) کتب لغت میں لکھا ہے اونٹ کی بن ران میں مرض ہوتا ہے۔ اس میں ایک کیڑا پڑ جاتا ہے ص ۲۵۰

(ب) یہ ایک شدید تپ ہے جس کے ساتھ غشی متلی۔ درد سر اور نسیان اور لرزہ ہوتا ہے بیچینی سراسیمگی اور چند روز کے بعد بن ران یا گردن یا پسِ گوش ایک پھنسی نکل آتی ہے الخ ص ۲۵۷

(ج) حدیث شریف میں طاعون کا نام نخف رکھا ہے۔ تیرہ سو برس پیشتر بانیٔ اسلام نے وہ بات بتا دی جو آج بعد تحقیقات ثابت ہوئی ہے۔ قرآن شریف نے بھی طاعون کو کیڑا ہی بتلایا ہے ص ۲۵۹

۹۔ طاعون کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ کو بذریعہ رؤیا اور الہام خبر دیئے جانا کہ یہ وباء اس ملک میں زور سے پھیلے گی۔ سیاہ رنگ کے پودے لگائے جانے کے متعلق رؤیا۔ ص ۲۵۳

۱۰۔ طاعون لوگوں کی اپنی شامت اعمال کی وجہ سے آئی ص ۲۵۴

۱۱۔ طاعون کیلئے حضرت مسیح موعودؑ کا ایک دوائی تیار کرنے کے ارادہ کا اظہار۔ ص ۲۵۸

۱۲۔ اسباب طاعون۔ پلیدی۔ سمیت۔ تپ پھوڑے۔ اس کا فیصلہ کہ اصل سبب پھوڑا ہے یا تپ۔ حضور کا فیصلہ مع دلیل کہ ڈاکٹر دل

کی رائے کہ تپ ہے صحیح نہیں۔ اصل سبب پھوڑا ہے
ص ۲۵۹-۲۶۰

طہارت

جو شخص باطنی طہارت پر قائم ہونا چاہتا ہے وہ ظاہری پاکیزگی کا بھی لحاظ رکھے۔ کیونکہ ظاہری پاکیزگی اندرونی طہارت کو مستلزم ہے۔ وضو غسل وغیرہ کے متعلق اسلامی ہدایات۔ نیز مرنے کے وقت کافور کا استعمال بھی اس لئے ہے اور کافور کے خواص۔ ص ۲۵۱

ظ

ظاہر پرستی

ظاہر پرستی گمراہی کا موجب ہے۔ یہود نے اسی وجہ سے مسیح ناصریؑ اور رسول کریمؐ کا انکار کیا۔ یہی مصیبت ہمارے زمانہ کے مولویوں اور ملانوں کو پیش آئی۔ ص ۲۳۹

ع

عالمگیر

عالمگیر کے زمانہ میں شاہی مسجد کو آگ لگ گئی تو وہ یہ خبر سنکر فوراً سجدہ میں گر گیا اور شکر کیا خدا تعالےٰ نے میرے لئے بھی حصول ثواب کی ایک راہ نکال دی۔ ص ۳۸۷

عبادت

۱۔ عبادت میں خدا تعالےٰ نے لذت اور سرور رکھا ہے جو تمام لذتوں سے بالا اور بلند ہے۔ جو لذت نہیں پاتے انکو اپنی بیماری کی فکر کرنی چاہیئے۔ ص ۱۵۹-۱۶۰

۲۔ اس زمانہ میں سب سے بڑی عبادت موجودہ فتنہ کو دور کرنے میں حصہ لینا ہے۔ ہر ایک مسلمان کو خدا تعالےٰ نے کی توحید و تفرید کیلئے ایسا جوش ہونا چاہیئے جیسا کہ خود اللہ تعالےٰ کو اپنی توحید کا جوش ہے ص ۳۹۴

۳۔ کوئی عبادت اور صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اللہ تعالےٰ کے لئے ذاتی جوش نہ ہو جس کے ساتھ کوئی طونی ذاتی فوائد اور منافع کی نہ ہو۔ ص ۳۹۶

۴۔ انسانی پیدائش کی غرض عبادت ہے۔ عبادت کے لئے محبت کی ضرورت ہے، اور محبت دو قسم کی ہے ایک ذاتی اور دوسری اغراض سے وابستہ جو اغراض پورے ہونے پر سرد پڑ جاتی ہے مگر سچی راحت ذاتی محبت سے حاصل ہوتی ہے۔ ص ۱۸۱-۱۸۳

۵۔ عبادت کیلئے تکمیل عمل ضروری شئی ہے۔ ص ۱۸۹

عبد صالح

۱۔ سالک کے عبد صالح ہو جانے پر تکلیف کا رنگ دور ہو کر طبعًا و فطرتًا اس سے نیکی صادر ہوتی ہے اور نفسانی جذبات سے جنگ ختم ہو کر وہ دار الامان میں ہوتا ہے۔ ص ۲۱

۲۔ صالح کیلئے غیب غیب نہیں رہتا۔ ص ۲۸

۳۔ عبد صالح اور متقی میں فرق۔ ص ۲۹

۴۔ دونوں کے اعمال میں فرق۔ ص ۳۰

عبد اللہ غزنوی

آپ کو مولوی محمد حسین بٹالوی کے متعلق الہام اور ایک رؤیا کا ذکر کہ اس کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ ص ۱۹۶

سید **عبد القادر** (جیلانی)۔ آپ کے قول کہ "ثواب اس وقت تک ہے جبتک مجاہدات ہیں۔ مجاہدات

قرآن مجید اور انجیل

قرآن کریم اور تورات

۱- ضرورت قرآن بعد توریت - توریت نے صرف متن کو لیا ہے جس کے ساتھ دلائل و براہین اور شرح نہیں مگر قرآن اخلاق کے مفاد کو معقولی طور پر دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کرتا ہے
ص ۸۷

۲- قرآن اور توریت میں دو بڑے فرق -

۱- توریت میں طریق استدلال نہیں۔ دعوٰی کی دلیل خود تلاش کرنی پڑتی ہے - لیکن قرآن اپنے دعوٰی کو ہر قسم کی دلیل سے مدلل کر کے پیش کرتا ہے -

۲- تورات کا مخاطب خاص گروہ ہے اور قرآن کے مخاطب کل لوگ ہیں جو قیامت تک ہونگے -

۳- علاوہ ازیں قرآن جسمانی اور روحانی خوارق ہر قسم کے اپنے اندر رکھتا ہے -
ص ۸۸-۸۹

قرآن مجید میں ترتیب اور نظام - اور

آیت انی متوفیک ورافعک الیّ میں تقدیم و تاخیر ماننے والوں کو تفصیلی جواب - ص ۴۲۹

قرآن شریف کی تلاوت -

جب تک نظام اور ترتیب قرآنی کو مدنظر نہ رکھا جائے اور اس پر پورا غور نہ کیا جاوے قرآن شریف کی تلاوت کے اغراض پورے نہ ہونگے
ص ۴۲۹

قرآن مجید اور علوم

ا- قرآن مجید علوم حقہ سے اس لئے واقفیت کرانا چاہتا ہے کہ اس سے خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے اور انسان کو قضاء و قدر کے نیچے رہنے کی اس لئے تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور بھروسہ کی صفت اور راضی برضا رہنے کی حقیقت سے آشنا ہو کر ایک سچی سکینت اور اطمینان حاصل کرے -
ص ۲۲۳-۲۲۴

ب- سچے علوم کا منبع اور سرچشمہ قرآن شریف میں ہے
ص ۴۳۹

قرآن کریم کے کمال کے متعلق مخالفین اسلام کو چیلنج

ا- میرا دعوٰی ہے کہ تمام صداقتیں قرآن مجید میں ہیں اگر کوئی مدعی ایسی صداقتیں پیش کرے کہ وہ قرآن میں نہیں میں اسے نکال کر دکھانے کو تیار ہوں -
ص ۲۸۵

ب- قرآن کریم تمام صداقتوں کا مجموعہ اور صدق تام ہے -
ص ۴۱۵

قرآن کریم کا معجزہ ہونا

۱- قرآن حکمت - روحانی معارف و حقائق۔ فصاحت و بلاغت ہر لحاظ سے اعجاز ہے - ص ۸۲

۲- قرآن شریف حکمتوں اور معارف کا جامع ہے ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔ ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے کو تیار ہیں -
ص ۸۳

۳ - یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ جو بھی توحید پر قلم اٹھائیگا۔ اُس کو وہی خدا پیش کرنا پڑے گا جو اسلام نے پیش کیا ہے - ص ۸۳

۴ - منکرینِ اعجازِ قرآن کو چیلنج - کوئی مدعی ہستیٔ باری تعالیٰ توحید الٰہی کے متعلق دلائل لکھے وہ سب قرآن سے دکھا دینگے - یا ایسی صداقتوں اور پاک تعلیموں پر دلائل لکھے جن کی نسبت اُس کا خیال ہے کہ وہ قرآن میں نہیں لیکن ہم وہ تمام صداقتیں اور پاک تعلیمیں قرآن سے ثابت کر دینگے - ص ۸۴

۵ - اس امر کا جواب کہ مقامات حریری وغیرہ بنظیر و بے مثل ہے - ص ۸۴-۸۵

۶ - اعجاز کی خوبی یہی ہے کہ ہر قسم کی رعایت کو زیر نظر رکھے - فصاحت و بلاغت بھی ہاتھ سے نہ جانے دے - صداقت و حکمت کو بھی نہ چھوڑے - یہ معجزہ صرف قرآن ہی کا ہے - ص ۸۵

۷ - قرآن مجید کا اعجاز اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم اور اصولِ تمدن اور اُس کی فصاحت و بلاغت کا ہے - ایسا ہی غیب کی خبریں اور پیشگوئیاں ہیں جن کا مقابلہ کوئی انسان ہرگز نہیں کر سکتا - ص ۳۸۹

قرآن کا مقصد

وحشیانہ حالت سے انسان بنانا - مہذب انسان بنانا - پھر باخدا انسان بنانا - ص ۸۶

قرآن کی قسموں کی حکمت اور فلاسفی

۱ - اللہ تعالیٰ کے قرآن کریم میں مخلوق اشیاء کی قسم کھانے سے یہ غرض ہے کہ بعض نظری امور کے اثبات کے لئے ایسے امور کا جو بدیہی اور ظاہر و باہر ہیں قسم کھانا انکو بطور دلیل و نظیر و شاہد کے پیش کرنا ہوتا ہے اور اس کی تفصیل - اور بطور مثال والسماء ذات الرجع والارض ذات الصدع کی لطیف تفسیر - ص ۲۱۵ و ص ۲۲۱-۲۲۷

۲ - والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ کی قسم کی لطیف حقیقت کا بیان - ص ۲۲۹

قرآنی

۱ - قرآنی تعلیم کی علت غائی تقویٰ ہے ص ۴۲۴

۲ - قرآنی علوم کے انکشاف کے لئے تقویٰ کی شرط ہے - علوم ظاہری کیلئے نہیں - مگر قرآن شریف کے معارف اور خوبیوں پر اطلاع پانے کے لئے پاک تبدیلی اور نفس کے تزکیہ کی ضرورت ہے - مغربی تعلیم کے دلدادہ مسلمانوں اور پُرانے فیشن کے مسلمانوں اور صوفیاء کا ذکر - ص ۴۲۵-۴۲۸

۳ قرآنی حقائق نہیں کھلتے جب تک کہ ابدال کے زمرہ میں داخل نہ ہو - ص ۴۲۷ نیز دیکھو "ابدال"

۴ - آنحضرت ﷺ کا اُمّی ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی یا آسمانی علوم کے لئے تقویٰ مطلوب ہے نہ چالاکیاں - ص ۴۲۸

۵ - قرآنی تعلیم انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے ص ۴۳۹

محبت جو اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور کبھی راحت ذاتی محبت سے ملتی ہے۔ ص۱۱۳ و ص۱۸۱

ب۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کا رابطہ پیدا کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے اعضاء ہو جاتا ہے ص۱۸۲

ج۔ خدا کی محبت ایک ایسی شے ہے جو انسان کی زندگی کو جلا کر اُسے ایک نیا اور مصفّیٰ انسان بنا دیتی ہے۔ ص۲۵۳

محبوب الٰہی

محبوب الٰہی وہی ہوتے ہیں جو کظم اور عفو کے بعد نیکی کرتے ہیں۔ اس پر امام حسن علیہ السلام کا واقعہ ص۱۷۹-۱۸۰

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ آنحضرتؐ کو دونو زمانے تکلیف اور فتحمندی کے نصیب ہوئے تا دونوں اوقات میں کامل نمونہ اخلاق دکھا سکیں۔

۲۔ یہ فخر اور یہ موقع صرف آپ ہی کو نصیب ہوا کہ نبوت کا کام چھوڑانے کیلئے آپ کو سخت جسمانی تکالیف دی گئیں۔ پھر امارت دولت اور ہر سامان آرائش کا وعدہ دیا گیا جو کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ مگر آپ نے نہ مصائب نہ وعدہ بادشاہت کی پرواہ کی مسیحؑ کا مقابلہ آنحضرتؐ سے۔ ص۱۷

۳۔ آپؐ کے اخلاق یا کام طبعی رنگ میں ظاہر ہوئے جبر سے نہ تھے۔ ص۱۸

۴۔ آپؐ اتقاد کے درجہ سے گذر کر صلاحیت تک پہنچ چکے تھے۔ اسی لئے حضرت عائشہؓ سے دریافت کرنے پر گھر میں جو ایک دینار تھا وہ کبھی دے دیا۔ ص۳۱

۵۔ آپؐ کے صدق و وفا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر فضل کیا۔ اور فرمایا۔ ان اللّٰہ وملٰئکتہ یصلون علی النّبیّ الآیۃ ص۳۷

۶۔ صدق و وفا اور تاثیر روحی میں کوئی نبی اور حضرت مسیحؑ بھی آپؐ کا شریک نہیں اور اس کا ثبوت۔ ص۳۸

۷۔ نبی کریمؐ کی اصلاح ہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ ص۳۹

۸۔ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو نبوت تو در کنار خدائی کا ثبوت بھی اس طرح نہ ملتا۔ اور اس کا ثبوت۔ ص۳۹

۹۔ مماثلت مابین آنحضرتؐ و موسیٰؑ از روئے قرآن مجید کاموں اور قوموں کو نجات دینے کے لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات ملی۔ لیکن انہوں نے گناہ سے نجات نہ پائی۔ مگر آنحضرتؐ نے پوری پوری نجات دی مستقل اسلامی سلطنت قائم ہو گئی اور گناہوں سے کامل نجات مل گئی۔ ص۴۰-۴۱

۱۰۔ آنحضرتؐ اور مسیح ناصری کا مقابلہ۔ آپ کے پیروؤں کے صدق و وفا اور اُن میں تاثیر روحی کے لحاظ اور یہ کہ مسیحؑ کی قوم توریت کو مانتی تھی۔ انکی اصلاح بظاہر عربوں کے مقابلہ میں مشکل نہ تھی اور پطرس کا ذکر۔ ص۴۱-۴۳، ص۲۷۳-۲۷۵، ص۳۳۶-۳۳۷

۱۱- ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل میں پوری مطابقت تھی۔ اس لئے جو کامیابی اور تاثیر فی القلوب آپ کے حصہ میں آئی اس کی کوئی نظیر بنی آدم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صـ ۶۸

۱۲- آنحضرت صلعم کے اخلاقی معجزات کی دو مثالیں عفو کی اور سخاوت کی۔ صـ ۱۰۱-۱۰۲

۱۳- آپؐ کی صداقت کی ایک دلیل قرآن مجید ہے صـ ۱۲۲

۱۴- سب سے اکمل نمونہ اور نظیر آنحضرتؐ ہیں جو جمیع اخلاق میں کامل ہیں اور اسکی تفصیل صـ ۱۳۲-۱۳۳

۱۵- رسول کریمؐ اور حضرت مسیحؑ کے اخلاق کا مقابلہ۔ صـ ۱۳۳-۱۳۵

۱۶- ہمارے رسول کریمؐ کو سب سے بڑا اعجاز اخلاق کا ہی دیا گیا۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ صـ ۱۴۱

۱۷- آپؐ کی بےنظیر قوتِ قدسی۔ اور بلند شان کا پتہ لگتا ہے کہ عرب جیسی قوم کو سیدھا کر دیا یہاں تک کہ کنتم خیر امة اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی آواز ان کو آگئی۔ اور مدینہ میں کوئی منافق نہ رہا۔ کسی نبی کے واقعاتِ زندگی میں اس کی نظیر نہیں۔ صـ ۱۸۰

۱۸- آپؐ کی اتباع کی ضرورت۔ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور ان انعام مکالمات اور معارف وحقائق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں جو اعلیٰ درجہ کے تزکیہ نفس پر ملتے ہیں۔ جبتک وہ رسول اللہ صلعم کی اتباع میں کھویا نہ جائے صـ ۲۰۴

۱۹- آنحضرتؐ اور قرآن کے معقولی اور علمی معجزات

(الف) آنحضرتؐ کا حدیث میں اور قرآن مجید کا طاعون کی خبر کثیرا بتانا۔

(ب) قلب گردش دینے والے کو کہتے ہیں۔ گویا قلب نام رکھ کر دورانِ خون کے دل پیدا ہونے کا انکشاف کر دیا۔ صـ ۲۵۹

۲۰- آنحضرتؐ کی تاثیر۔ آپؐ کے ذریعہ بےنظیر انقلاب واقع ہوا۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزانِ اعتدال پر قائم کیا اور مردارخور اور مردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ صـ ۲۷۴

۲۱- آنحضرتؐ کی فضیلت۔ آپؐ کو دوسرے انبیاء سے وہی نسبت ہے جو بدر کو ہلال سے ہوتی ہے۔ اگر آپ نہ آتے تو پہلے نبی اور اُن کی نبوتوں کے پہلو مخفی رہتے۔ صـ ۲۸۱

۲۲- آنحضرتؐ کی نبوت کے نشانات سورج سے زیادہ روشن اور بےانتہا اور بےشمار ہیں۔ صـ ۲۸۲

۲۳ کامل نبیؐ۔ تمام کمالاتِ متفرقہ جو انبیاء میں تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع کر دیئے۔ صـ ۳۲۰

۲۴- رحمة للعلمین۔ آپؐ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول سے اللہ تعالےٰ نے یہ چاہا ہے کہ تا دنیا پر عظیم الشان رحمت کا نمونہ دکھاوے۔ صـ ۲۹۷

۲۵- (الف) منعم علیہم کی راہ کا سچا تجربہ کار اور کوئی نہیں۔ آپؐ کی راہ جو بہت ہی صحیح اور

اقرب ہے اُس کو چھوڑ کر دوسری راہ ایجاد کرنا میری رائے میں ہلاکت ہے اور خدا تعالےٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔ ص ۳۵۵

(ب) آپؐ کی سچی اتباع سے خدا ملتا ہے ص ۳۵۶

۲۶ - مظلوم نبیؐ - آپؐ جیسا دُنیا میں کوئی مظلوم نہیں - کوئی گند اور گالی اور دشنام دہی نہیں جو آپ کی طرف نہ پھینکی گئی ہو۔ ص ۲۹۴-۲۹۵

۲۷ - ہمدرد نبیؐ آپ میں لوگوں کی ہدایت کیلئے ہمدردی اور جوش غایت درجہ کا تھا - اس سے بڑھکر کسی دوسرے میں ہوسکتا ہی نہیں ص ۴۰۳

۲۸ - آنحضرتؐ کے معجزات - کل نبیوں کے معجزات سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بڑھ کر ہیں - ص ۴۱۳

۲۹ - آپؐ کی پیشگوئیاں - قرآن شریف پیشگوئیوں سے بھرا پڑا ہے - قیامت اور اُس کے بعد تک کی پیشگوئیاں اس میں موجود ہیں - ہر زمانہ میں ان پیشگوئیوں کا زندہ ثبوت دینے والا موجود ہوتا ہے - چنانچہ اس زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے مجھے بطور نشان کھڑا کیا اور پیشگوئیوں کا عظیم الشان نشان مجھے دیا - ص ۴۱۳

۳۰ - زندہ رسولؐ - ابدالآباد کے لئے صرف محمدؐ رسول اللہ صلعم ہی ہوسکتے ہیں - ص ۴۱۴

محمد افضل

ہندوستان سے افریقہ جاتے ہوئے حضورؑ سے غفلت شکوک شبہات اور نفسانی ظلمتوں کا علاج دریافت کیا - تو حضورؑ نے فرمایا - تلاوت قرآن شریف - موت کو یاد رکھنا - حالات سفر قلمبند کرتے رہنا - ممکن ہو تو ہر روز کارڈ لکھتے رہنا - ص ۲۳۴

محمد حسین بٹالوی (مولوی)

ان کے متعلق مولوی عبداللہ غزنوی کو الہام ہوا کہ اس میں کوئی عیب ہے - اُس نے چاہا کہ ظاہر کردیں انہوں نے کہا کہ اللہ کی حیا مانع ہے - پھر رؤیا دیکھا کہ اس کے کپڑے پھٹ گئے ہیں - ص ۱۹۶

۲ - مارٹن کلارک عیسائی کے مقدمہ میں مولوی محمد حسین کا اس کی طرف سے بطور شاہد پیش ہونا ص ۲۰۹

۳ - اُن کی گالیوں کا جواب - رب ان کان هذا الرجل صادقا فی قوله فاکرمه و ان کان کاذبا فخذه امین - ص ۲۶۸

۴ - ان کا یہ کہنا کہ حضرت مسیح موعودؑ کو عربی کا ایک صیغہ نہیں آتا - مگر آپ کی عربی کتابوں کے مقابلے میں ایک صیغہ بھی نہ لکھ سکنا - ص ۲۷۷ - ۲۷۸

۵ - مولوی محمد حسین کے اس اعتراض کا جواب کہ آپ نے بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے - الہام "سلطان" گورنر جنرل یعنی حکم عام میں آسمانی سلطنت کی طرف اشارہ ہے - ص ۳۱۱

مخالفین

۱ - بعض جگہ مخالفین پر سختی اُن کے تکبر کو دور کرنے کے واسطے ہے - سخت باتوں کا جواب نہیں لیکن ہر شخص کے واسطے جائز نہیں کہ وہ ایسی

آنے جانے والے اخلاص لیکر نہیں جاتے بلکہ اُن کی غرض مولوی ہوں یا صوفی یا مشائخ صرف سامعین کی خوشنودی اور واہ واہ لینی ہوتی ہے۔ سامعین اُن کے معبود ہوتے ہیں۔ صـ ۴۰۱

۹ - ہمارے مخالف مسلمان حضرت عیسیٰؑ میں خدائی صفات مانتے ہیں۔ اس کی تفصیل -

میری دشمنی اس لئے کرتے ہیں کہ مَیں کہتا ہوں خدائی صفات کسی کو نہ دو اور یہ کہ مسیحؑ کے درجات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات سے ہرگز نہ بڑھاؤ - صـ ۴۳۱ - ۴۳۲

مسیح موعودؑ

۱ - حضرت مسیحؑ کیلئے نزول کا لفظ استعمال ہُوا رجوع کا نہیں جس کے معنے واپس آنے کے ہیں - صـ ۸

۲ - لوگوں کی گالیوں سے ہمارا نفس جوش میں نہیں آتا صـ ۹

۳ - خدا کہتا ہے کہ مسیح موعودؑ کے ساتھ صحابہؓ جیسے لوگ ہونگے - صـ ۴۳

۴ - مسیح موعود امتِ محمدیہ میں بطور حکم آئے گا۔ جیسے کہ مسیحؑ ناصری موسیٰؑ سے چودہ سو برس کے بعد اسرائیلی سلسلہ میں بطور حکم آیا صـ ۴۶

۵ - مسیح موعود امت محمدیہ سے آئے گا اور مسیح موعود کا ذکر اس قدر تواتر رکھتا ہے کہ جس تواتر سے انکار محال ہے۔ قرآنی اشارات بھی آنے والے کے شاہد ہیں - صـ ۴۷

۶ - زمانہ ظہور مسیح موعود

ا - آیت استخلاف سے استدلال کہ مسیح محمدی کو مسیح ناصری کی طرح چودھویں صدی کے سر پہ آنا چاہیئے -

ب - شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ اہلحدیث کا اتفاق کہ علامات صغریٰ اور علامات کبریٰ ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں -

ج - حدیث یکسر الصلیب سے ظاہر ہے کہ نزول مسیح کا وقت نصاریٰ اور صلیب پرستی کا غلبہ ہے -

د - اگر اب مسیح نہ آتا اور چونکہ وہ صدی کا مجدد ہے۔ پھر سو سال کے بعد آتا اور موجودہ مسلمانوں میں سو سال تک پادریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ آنے والا مسیح آگیا جو دجال کو اتمام حجت سے ہلاک کریگا - صـ ۴۸

ھ - مہدی کے دعویٰ کے بعد ماہ رمضان میں کسوف وخسوف کے ظہور کی پیشگوئی کی اہمیت صـ ۴۸-۴۹

و - ذوالسنین یعنی دُمدار ستارہ کا طلوع جو مسیح ناصری کے وقت بھی نکلا تھا - صـ ۴۹

ز - قرآن شریف سے واذا العشار عطلت .... الخ .... واذا الصحف نشرت میں مسیح موعود کے زمانہ کے نشانات - صـ ۴۹-۵۰

ح - مسیح موعود کے زمانہ کی علامت کہ قرآن کریم پڑھینگے لیکن انکے حلق سے نہ اتریگا پوری ہوگئی - صـ ۹۶-۹۷

۷ - جائے ظہور - دجال کا خروج مشرق سے ہونا بحوالہ حجج الکرامہ ظہور فتن دجال ہندستان میں ہے

اس لئے مسیح موعود کا بھی وہیں ظہور ہونا ضروری ہے۔ پھر گاؤں کا نام قدعہ جو قادیان کا مخفف ہے اور "غلام احمد قادیانی" کے عدد بحساب جمل ۱۳۰۰ نکلتے ہیں یعنی اس نام کا امام چودھویں صدی میں ہوگا۔ ص۵۰

۸ - حوادث سماوی و ارضی کا ذکر جن سے مسیح موعود کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ ص۵۰-۵۱

۹ - ایک کشف دیکھو "کشف"

۱۰ - آپ کا دعویٰ

(الف) آپ داعظ من جانب اللہ اور مامور من اللہ ہیں ص۵۲

(ب) میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق مسیح موعود ہو کر آیا ہوں۔ چاہو تو قبول کرو۔ چاہو تو ردّ کرو۔ ص۲۰۶

(ج) آپ کا حلفیہ بیان کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور کر کے بھیجا ہے۔ ص۳۴۳

(د) مسیح موعود اور مصلح کی ضرورت اور حالاتِ زمانہ کا ذکر۔ ص۳۹۶-۳۹۸

(ھ) مہدی اور مسیح ابن مریم - آخری زمانہ کے موعود کو یہ دو نام دیئے جانے کی وجہ ص۴۴۵ و ص۴۵۱-۴۵۲، ۴۵۴-۴۵۵، ۴۵۹ - نیز دیکھو "بروز"

(و) مسیح موعود چودھویں صدی کا مجدد ہے کیونکہ اس میں صلیبی فتنہ زوروں پر ہے۔ چودھویں صدی کے فتنہ کا تذکرہ - خاص اس فتنہ کی اصلاح کے لئے خدا نے مجھے بھیجا۔ ص۱۴۰-۱۴۲

۱۱ - آپ کا کام اور بعثت کی غرض

(الف) مسیح موعود کی بعثت دین اسلام اور نبی کریم صلعم کی تائید کے لئے غیرتِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ ص۴۳

(ب) غیر احمدیوں کے نظریہ کا ذکر جو حد درجہ قابلِ اعتراض ہے صحیح راہ نصاریٰ پر حجت پوری کرنے کی وہی ہے جو خدا میرے ہاتھ سے پوری کریگا۔ ص۳۰۷

(ج) ہمارا سب کاروبار دینی ہے اور ہم محض دین کے ہیں۔ لوگوں کے خطرناک اعتقادی طریق کی اصلاح کرنا ہمارا اصل منشاء اور مقصود ہے مثلاً غیر قوموں کی چیزیں چرانے کو جائز قرار دینا - حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آکر خونریزیاں کریں گے وغیرہ۔ ص۳۱۰

(د) لوگوں کو خدا کی طرف راہنمائی کرنا جسے ہم نے خود دیکھا ہے۔ پس ہم اپنی ذات اور اپنے وجود کو پیش کر کے دُنیا سے خدا تعالیٰ کا وجود منوانا چاہتے ہیں۔ ص۳۲۰-۳۲۱

(ھ) اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے مامور کر کے بھیجا ہے تاکہ میں زندہ ایمان زندہ خدا پر پیدا کرنے کی راہ بتلاؤں۔ اور زمانہ کی حالت۔ ص۳۲۹

(و) تاکہ اسلامی نور لوگوں کو دکھلاؤں ص۳۳۱

(ز) استیصالِ عیسائیت ص۳۳۱ و ص۳۳۲

(ح) اندرونی طور پر مسلمانوں میں پیدا شدہ غلطیوں کا دُور کرنا۔

(ط) اسلام کی حقیقت کا دنیا پر ظاہر کرنا -

بیرونی طور پر جو اسلام پر اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کا جواب دینا۔ اور دوسرے مذاہب باطلہ کی حقیقت کھول کر دکھانا۔ صـ۳۳۲

(ی) قرآن مجید کے خزائن مدفونہ کو دنیا پر ظاہر کرنا۔ صـ۶۰

۱۲ مسیح موعودؑ کے زمانہ کا جہاد

مخالفین اسلام نے مختلف سائنسوں اور مکائد کی رُو سے اسلام پر حملہ کیا ہے۔ مَیں اس سائنس اور علمی ترقی کے میدان کارزار میں قلمی اسلحہ لے کر اُترا ہوں۔ تا اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ دکھاؤں۔ اللہ تعالیٰ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اپنے دین کی عزت ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ صـ۵۹-۶۰

۱۳۔ مسیح موعودؑ کی دُعائیں

(ا) تیس ہزار کم از کم میری دعائیں قبول ہوئیں۔ عربی تصنیفات میں ایک ایک لفظ دُعا ہی کا اثر ہے۔ ورنہ انسانی طاقت کا کام نہیں کہ تحدی کرے۔ صـ۲۸

(ب) جماعت کیلئے دُعا۔ اتنی دُعا کرتا ہوں کہ دُعا کرتے کرتے ضعف کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بعض وقت غشی اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ صـ۳۰۳

۱۴۔ تعلق باللہ

جب میر صاحب نے ایک افواہ کی بنا پر کہ آج وارنٹ ہتھکڑی سمیت آویگا۔ آپ کو خبر دی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ لوگ دُنیا کی خوشیوں میں چاندی سونے کے کنگن پہنا کرتے ہیں۔ ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لوہے کے کنگن پہن لئے۔ پھر فرمایا۔ مگر ایسا نہ ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ اپنے خلفاء ماموریں کی ایسی رسوائی پسند نہیں کرتا۔ صـ۳۰۵-۳۰۶

۱۵۔ صداقت کے دلائل

(ا) اللہ تعالیٰ نے مجھے چار نشان دیئے ہیں:-

۱۔ عربی دانی کا نشان اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعجازی مدد۔

۲۔ دعاؤں کا قبول ہونا۔

۳۔ پیشگوئیوں کا یعنی اظہار علی الغیب

۴۔ قرآن کریم کے دقائق و معارف اور مخالفین کو تفسیر لکھنے کیلئے چیلنج۔ صـ۲۷۷-۲۷۸

(ب) مفتری کو جو الہام و مکالمہ کا افترٰی کرے مہلت نہیں دی جاتی خصوصاً آنحضرتؐ کے زمانۂ نبوت تک کی مہلت نہیں مل سکتی۔ صـ۳۰۱-۳۰۲

(ج) ایک شخص کے سوال پر کہ اپنے قلم سے قسمیہ لکھیں کہ آیا آپ وہی مسیح موعود ہیں جسکا ذکر احادیث اور قرآن شریف میں ہے۔ حضور کا حلفیہ جواب۔ صـ۳۲۷

۱۶ مسلمانوں کی بدعملیوں کو دیکھکر آپ کا بیقرار ہونا اسلئے کہ ان کی بدعملیاں اسلام کو غیروں کی نظر میں مشکوک کر دیتی ہیں۔ صـ۴۸

(د) حرمات اللہ کی ہتک آپ کو گوارا نہ تھی ص۴۵۷

(ھ) قناعت۔ فرمایا۔ کھانے کے متعلق اپنے نفس میں اتنا تحمل پاتا ہوں کہ ایک پیسہ پر دو دو وقت بڑے آرام سے بسر کر سکتا ہوں۔ چھماہ کے روزوں کا ذکر۔ ایک آدھ لقمہ کھایا کرتا جو روٹی گھر سے آتی وہ دو تین مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ لیکن کسی کو پتہ نہ لگا کہ میں کچھ نہیں کھایا کرتا۔ ص۴۵۹

(و) سائل کو رد نہ کرتے۔ ایک سائل کی تلاش کروانا۔ نہ ملنے کی وجہ سے بیقراری کا اظہار آخر شام کو اسی سائل کا واپس آنا اور اس کو کچھ دینا۔ ص۴۵۹

(ز) ہمدردی۔ اگر کسی کو درد ہوتا ہو اور میں نماز میں مصروف ہوں اور میرے کان میں اس کی آواز پہنچ جائے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ نماز کو توڑ کر فائدہ پہنچا سکوں تو فائدہ پہنچاؤں اور جہاں تک ممکن ہے اس سے ہمدردی کروں۔ اور ایک بڑھیا کے خط پڑھنے کا واقعہ جبکہ مولوی عبدالکریم نے انکار کر دیا تھا۔ ص۴۶۲

(ح) خدا کی یاد۔ رات کی خاموشی کے وقت جب ہم اکیلے ہوتے ہیں اس وقت بھی خدا کی یاد میں دل ڈوبتا رہتا ہے۔ ص۴۶۴

مسیحؑ ناصری

۱۔ ہم اس لئے کہ قرآن میں ان کا ذکر آگیا سچے نبی مانتے ہیں۔ ورنہ انجیل سے تو ان کا اولوالعزم نبیوں کی شان کا کوئی خلق ثابت نہیں ہوتا۔ ص۱۸

۲۔ حضرت مسیحؑ نے توریت سبقاً سبقاً ایک استاد سے پڑھی تھی اور وہ اپنے پاس روپیہ رکھتے تھے۔ ص۴۲

۳۔ وفات مسیحؑ ناصری

(ا) آیت یا عیسٰی انی متوفیک اور آیت فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم سے مسیحؑ کی وفات ثابت ہے۔ اور حدیث امامکم منکم سے کہ مسیح موعود امت میں سے ہے۔ ص۴۷

(ب) آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل اور معراج میں حضرت یحیٰؑ اور مسیحؑ کو اکٹھے دیکھنا اور پھر تمام صحابہؓ کی شہادت۔ حضرت ابوبکرؓ کا آیت قد خلت من قبلہ الرسل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر استدلال۔ ص۴۴۰-۴۴۱

(ج) وفات مسیحؑ پر تمام صحابہؓ کا اجماع۔ اور ائمہ کے وفات مسیحؑ پر اقوال امام مالکؒ ابن حزم وغیرہ اور معتزلہ ص۴۴۳

(د) اس مسئلہ پر زور دینے کی وجہ کہ اس کی موت کے ساتھ عیسائی مذہب کی بھی موت ہے۔ ص۴۴۴

۴۔ مسیحؑ ناصری کے آسمان پر جانے کا مسئلہ جس پر عیسائیت کا دارومدار ہے۔ اور اصل واقعہ

مہر نبوت

مہدی

ن

نابینائی

نبوت

نبی جمع انبیاء

نماز

نوافل

نور الدینؓ

نوشیرواں

نیچریت

نیک

نیکی

۲ - ہندوستان دارالحرب ہے بلحاظ قلم کے۔ پادری لوگوں نے اسلام کے خلاف قلمی جنگ شروع کی ہے۔ ہمیں بھی قلم کا ہتھیار لیکر میدان میں نکلنا چاہیئے۔ صـ۲۱۷، صـ۲۳۱، صـ۲۳۲

۳ - چونکہ یہاں ہر طرف سے حملے پر حملہ ہو رہا ہے اس لئے ہمیں قوتِ متفکرہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لئے ہندوستان اور پنجاب کے رہنے والے جوہر قابل بن رہے ہیں۔ اور معارف اور حقائق سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ بلادِ شام اور دیگر ممالک اسلامیہ میں اُن کا نام و نشان تک نہیں۔ صـ۲۳۰-۲۳۲

۴ - یہ ملک بہت ہی قابلِ رحم ہے۔ اسلام صرف رسمی طور پر رہ گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے احسان کیا جو اپنا نظیر اس ملک میں بھیجا۔ ملاؤں کی بُری حالت۔ صـ۲۳۶

ی

یاجوج ماجوج

اجیج سے مشتق ہے جس میں اشارہ ہے کہ آتشی کاموں کے ساتھ اُن کا تعلق ہوگا۔ آگ سے کام لینے میں مہارت رکھیں گے۔ نصاریٰ کا فتنہ۔ اور یہ دونوں بروز ہیں۔ یہ دونوں کیفیتیں ایک وجود میں آئی ہیں۔ اور ایسا ہی ماجوج ہیں۔ اور ان کا اثر لوگوں پر۔ صـ۴۴۶-۴۴۷

یزید

سب سے زیادہ بدنام یزید ہے۔ اگر اس کی شراکت سے امام حسینؓ کی شہادت ہوئی تو بُرا کیا لیکن آجکل کے شیعہ مل کر بھی وہ دینی کام نہیں کر سکتے جو اُس نے کیا۔ صـ۱۵۳

یقین

یقین کا لفظ جب عام طور پر استعمال ہو تو اس سے مراد علم الیقین یعنی اس کا ادنیٰ درجہ مراد ہوتا ہے۔ صـ۳۳

یوسفؑ

اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے گرویدہ اور عاشق زار تھے۔ وہ حدود اللہ کو توڑنا ہرگز پسند نہ کرتے۔ بارہ برس جیل میں رہ کر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ مگر اس صدیق نے اپنا صدق نہ چھوڑا۔ صـ۳۸۲

یوسف بیگ (میرزا) میرے بہت ہی مخلص اور صادق دوست ہیں اور اُن کا ذکر بھائیوں میں باہم تعارف اور محبت بڑھانے کی غرض سے کیا ہے۔ صـ۳۳۹

یونسؑ

یونسؑ کی قوم گریہ وزاری اور دُعا کے سبب عذاب سے بچ گئی اور مناسبت نون اور حوت کے معنے۔ صـ۲۳۸

یہود کے مسیحؑ ناصری اور آنحضرتؐ کے انکار کی وجہ ظاہر پرستی تھی۔ صـ۲۳۹

تمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡدِ

ملفوظات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۱۸۹۱ء ۔ جناب مولانا مولوی عبدالکریم صاحب فرماتے ہیں:۔

غرضِ بعثت

" مجھے خوب یاد ہے ۔ اور میں نے اپنی نوٹ بک میں اس کو لکھ رکھا ہے کہ جالندھر کے مقام پر ایک شخص نے حضرت اقدس امام صادق حضرت میرزا صاحبؑ کی خدمت میں سوال کیا ۔ کہ آپؑ کی غرض دُنیا میں آنے سے کیا ہے ؟ . . . . . . آپؑ نے فرمایا کہ

"مَیں اِس لئے آیا ہوں ۔ تا لوگ قوتِ یقین میں ترقی کریں"

ایمان کی دو قسمیں

ایک اَور بات بھی ہے ۔ جو میری نوٹ بک میں درج ہے ۔ اور وہ واقعہ بھی اسی جالندھر کا ہے ۔ ہماری جماعت کے ایک آدمی ہمارے بھائی منشی ظفر احمد صاحب نے سوال کیا ۔ کہ حضرت ایمان کتنی طرح کا ہوتا ہے ؟ آپؑ نے جو جواب اُس کا فرمایا ۔ بہت ہی لطیف اور سلیس ہے ۔ کہا:۔

"ایمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ موٹا اور باریک۔ موٹا ایمان تو یہی ہے کہ دینُ العجائز پر عمل کرے۔ اور باریک ایمان یہ ہے کہ میرے پیچھے ہو لے۔"

(از تقریر حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؓ فرمودہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۷ء۔ دیکھو رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷)

۱۸۹۵ء۔ جناب مفتی محمد صادق صاحبؓ لکھتے ہیں:-

"۱۸۹۵ء میں جب میں حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا تو اس وقت بھی مجھے شوق تھا کہ آپؑ کے کلماتِ طیبات ایک کاغذ پر نقل کر کے ہمیشہ لاہور لے جانا۔ اور وہاں کے احمدی احباب کو ہفتہ وار کمیٹی میں سُنایا کرتا۔ . . . . اس وقت کی یادداشت میں سے کچھ نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اُن ایام میں چونکہ تاریخ کا انتظام نہیں رکھا تھا۔ اس لئے بلا تاریخ ہر ایک بات درج کی جاتی ہے۔

بیعت اور توبہ اور ضمناً گناہ کا حال

بیعت میں جاننا چاہیئے کہ کیا فائدہ ہے۔ اور کیوں اس کی ضرورت ہے؟ جب تک کسی شئے کا فائدہ اور قیمت معلوم نہ ہو تو اس کی قدر آنکھوں کے اندر نہیں سماتی۔ جیسے گھر میں انسان کے کئی قسم کا مال و اسباب ہوتا ہے۔ مثلاً روپیہ، پیسہ، کوڑی، لکڑی وغیرہ۔ تو جس قسم کی جو شئے ہے۔ اسی درجہ کی اس کی حفاظت کی جاوے گی۔ ایک کوڑی کی حفاظت کے لئے وُہ سامان نہ کرے گا۔ جو پیسہ اور روپیہ کے لئے اُسے کرنا پڑے گا۔ اور لکڑی وغیرہ کو تو یُونہی ایک کونہ میں ڈال دے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس جس کے تلف ہونے سے اس کا زیادہ نقصان ہے۔ اس کی زیادہ حفاظت کرے گا۔ اسی طرح بیعت میں عظیم الشان بات توبہ ہے۔ جس کے معنی رجوع کے ہیں۔ تو یہ اس حالت کا نام ہے کہ انسان اپنے معاصی سے جن سے اُس کے تعلقات بڑھے ہوئے ہیں اور اُس نے اپنا وطن اُنہیں مقرر کر لیا ہُوا ہے گویا کہ گناہ میں اس نے بُود و باش مقرر کر لی ہوئی ہے۔ تو توبہ کے معنے یہ ہیں کہ اُس وطن کو

چھوڑنا۔ اور رجوع کے معنے پاکیزگی کو اختیار کرنا۔ اب وطن کو چھوڑنا بڑا گراں گزرتا ہے اور ہزاروں تکلیفیں ہوتی ہیں۔ ایک گھر جب انسان چھوڑتا ہے تو کس قدر اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ اور وطن کو چھوڑنے میں تو اُس کو سب یار دوستوں سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے اور سب چیزوں کو مثل چارپائی، فرش و ہمسائے، وُہ گلیاں کوچے، بازار سب چھوڑچھاڑ کر ایک نئے مُلک میں جانا پڑتا ہے۔ یعنی اُس (سابقہ) وطن میں کبھی نہیں آتا۔ اس کا نام **توبہ** ہے۔ معصیت کے دوست اَور ہوتے ہیں اور تقویٰ کے دوست اَور۔ اس تبدیلی کو صُوفیا رنے موت کہا ہے۔ جو توبہ کرتا ہے۔ اُسے بڑا حرج اُٹھانا پڑتا ہے اور سچّی توبہ کے وقت بڑے بڑے حرج اُس کے سامنے آتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ رحیم کریم ہے۔ وہ جب تک اُس کُل کا نعم البدل عطا نہ فرماوے نہیں مارتا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ[1] میں یہی اشارہ ہے کہ وہ توبہ کرکے غریب، بیکس ہو جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ اُس سے محبّت اور پیار کرتا ہے اور اُسے نیکوں کی جماعت میں داخل کرتا ہے۔ دوسری قومیں خدا کو رحیم کریم خیال نہیں کرتیں۔ عیسائیوں نے خدا کو تو ظالِم جانا اور بیٹے کو رحیم کہ باپ تو گُناہ نہ بخشے اور بیٹا جان دے کر بخشوائے۔ بڑی بے وقوفی ہے کہ باپ بیٹے میں اتنا فرق۔ والد مولُود میں مناسبت اخلاق، عادات کی ہُوا کرتی ہے۔ (مگر یہاں تو بالکل ندارد)۔ اگر اللہ رحیم نہ ہوتا تو انسان کا ایک دَم گذارہ نہ ہوتا۔ جس نے انسان کے عمل سے پیشتر ہزاروں اشیاء اُس کے لیے مفید بنائیں۔ تو کیا یہ گُمان ہو سکتا ہے۔ کہ توبہ اور عمل کو قبول نہ کرے۔

توبہ کی حقیقت

گُناہ کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ گناہ کو پیدا کرے۔ اور پھر ہزاروں برس کے بعد گُناہ کی مُعافی سُوجھے۔ جیسے مکھی کے دو پَر ہیں۔ ایک میں شفا اور دوسرے میں زہر۔ اسی طرح انسان کے دو پَر ہیں۔ ایک معاصی کا۔ دوسرا خجالت، توبہ، پریشانی

[1] البقرۃ ۲۲۳

کا۔ یہ ایک قاعدہ کی بات ہے۔ جیسے ایک شخص جب غلام کو سخت مارتا ہے تو پھر اس کے بعد پچھتاتا ہے۔ گویا کہ دونوں پر اکٹھے حرکت کرتے ہیں۔ زہر کے ساتھ تریاق ہے اب سوال یہ ہے کہ زہر کیوں بنایا گیا؟ تو جواب یہ ہے کہ گو یہ زہر ہے۔ مگر کُشتہ کرنے سے حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو رعونت کا زہر انسان میں بڑھ جاتا اور وُہ ہلاک ہو جاتا۔ توبہ اس کی تلافی کرتی ہے۔ کبر اور عُجب کی آفت سے گناہ انسان کو بچائے رکھتا ہے۔ جب نبی معصومؐ ستر بار استغفار کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ گناہ سے توبہ وہی نہیں کرتا جو اس پر راضی ہو جاوے۔ اور جو گناہ کو گناہ جانتا ہے۔ وُہ آخر اُسے چھوڑے گا۔

اِعْمَلْ مَاشِئْتَ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ کے معنے

حدیث میں آیا ہے کہ جب انسان بار بار رو رو کر اللہ سے بخشش چاہتا ہے۔ تو آخر کار خدا کہہ دیتا ہے کہ ہم نے تجھ کو بخش دیا۔ اب تیرا جو جی چاہے سو کر۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دل کو بدل دیا۔ اور اب گناہ اُسے بالطبع بُرا معلوم ہوگا۔ جیسے بھیڑ کو میلا کھاتے دیکھ کر کوئی دوسرا حرص نہیں کرتا کہ وُہ بھی کھاوے۔ اسی طرح وُہ اِنسان بھی گُناہ نہ کرے گا جسے خدا نے بخش دیا ہے۔ مُسلمانوں کو خنزیر کے گوشت سے بالطّبع کراہت ہے حالانکہ اَور دوسرے ہزاروں کام کرتے ہیں جو حرام اور منع ہیں تو اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک نمونہ کراہت کا رکھ دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اسی طرح انسان کو گناہ سے نفرت ہو جاوے۔

کثرتِ گناہ کی وجہ سے دُعا میں کوتاہی نہ ہو

گناہ کرنے والا اپنے گناہوں کی کثرت وغیرہ کا خیال کرکے دعا سے ہرگز باز نہ رہے۔ دُعا تریاق ہے۔ آخر دُعاؤں سے دیکھ لیگا کہ گناہ اُسے کیسا بُرا لگنے لگا۔ جو لوگ معاصی میں ڈوب کر دُعا کی قبولیت سے مایوس رہتے ہیں۔ اور توبہ کی طرف رجوع

نہیں کرتے۔ آخر وُہ انبیاء اور اُن کی تاثیرات کے منکر ہو جاتے ہیں۔

توبہ جُزوِ بیعت کیوں ہے

یہ توبہ کی حقیقت ہے (جو اُوپر بیان ہوئی) اور یہ بیعت کی جُز کیوں ہے؟ تو بات یہ ہے کہ انسان غفلت میں پڑا ہوُا ہے۔ جب وہ بیعت کرتا ہے اور ایسے کے ہاتھ پر جسے اللہ تعالیٰ نے وُہ تبدیلی بخشی ہو۔ تو جیسے درخت میں پیوند لگانے سے خاصیت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح سے اس پیوند سے بھی اس میں وُہ **فیوض** اور **انوار** آنے لگتے ہیں (جو اُس تبدیلی یافتہ انسان میں ہوتے ہیں) بشرطیکہ اسکے ساتھ سچا تعلق ہو خشک شاخ کیطرح نہ ہو۔ اس کی شاخ ہو کر پیوند ہو جاوے جسقدر یہ نسبت ہوگی۔ اسی قدر فائدہ ہوگا۔

بیعت کب فائدہ دیتی ہے

بیعت رسمی فائدہ نہیں دیتی۔ ایسی بیعت سے حصہ دار ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اُسی وقت حصہ دار ہوگا۔ جب اپنے وجود کو ترک کر کے بالکل محبت اور اخلاص کے ساتھ اُس کے ساتھ ہو جاوے۔ منافق آنحضرت صلعم کے ساتھ سچا تعلق نہ ہونے کی وجہ سے آخر بے ایمان رہے۔ اُن کو سچی محبت اور اخلاص پیدا نہ ہوُا۔ اس لئے ظاہری لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اُن کے کام نہ آیا۔ تو اِن تعلقات کو بڑھانا بڑا ضروری امر ہے۔ اگر ان تعلقات کو وُہ (طالب) نہیں بڑھاتا۔ اور کوشش نہیں کرتا تو اس کا شکوہ اور افسوس بیفائدہ ہے۔ محبت و اخلاص کا تعلق بڑھانا چاہیئے۔ جہانتک ممکن ہو اُس انسان (مرشد) کے ہمرنگ ہو طریقوں میں اور اعتقاد میں۔ نفس لمبی عُمر کے وعدے دیتا ہے۔ یہ دھوکا ہے۔ عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ جلدی راستبازی اور عبادت کی طرف جھکنا چاہیئے اور صبح سے لے کر شام تک حساب کرنا چاہیئے۔

(مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ تقریر حضرتؑ نے اس وقت فرمائی تھی۔ جب محمد نواب خاں صاحب تحصیلدار نے حضورؑ سے بیعت کی تھی۔ ایڈیٹر) (البدر جلد اشاعت ۱۹ پرچہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء)

تہجد کی تاکید

" اس زندگی کے کُل انفاس اگر دُنیاوی کاموں میں گذر گئے۔ تو آخرت کے لئے کیا ذخیرہ کیا۔

تہجد میں خاص کر اُٹھو اور ذوق اور شوق سے ادا کرو۔ درمیانی نمازوں میں بہ باعث ملازمت کے ابتلا آجاتا ہے۔ رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ نماز اپنے وقت پر ادا کرنی چاہیئے۔ ظہر و عصر کبھی کبھی جمع ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ضعیف لوگ ہوں گے۔ اس لئے یہ گنجائش رکھ دی۔ مگر یہ گنجائش تین نمازوں کے جمع کرنے میں نہیں ہو سکتی۔

جبکہ ملازمت میں اور دوسرے کئی امور میں لوگ سزا پاتے ہیں (اور مورد عتاب حکام ہوتے ہیں) تو اگر اللہ تعالیٰ کے لئے تکلیف اُٹھاویں تو کیا خوب ہے۔

نبیوں اور صدیقوں کا کام

جو لوگ راستبازی کے لئے تکلیف اور نقصان اُٹھاتے ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں بھی مرغوب ہوتے ہیں۔ اور یہ کام نبیوں اور صدیقوں کا ہے۔

جو شخص اللہ تعالےٰ کے لئے دُنیاوی نقصان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے ذمہ نہیں رکھتا۔ پُورا اجر دیتا ہے۔

انسان منافقانہ طرز نہ رکھے

(انسان کو لازم ہے) منافقانہ طرز نہ رکھے۔ مثلاً اگر ایک ہندو (خواہ حاکم یا عہدیدار ہو) کہے کہ رام اور رحیم ایک ہے۔ تو ایسے موقعہ پر ہاں میں ہاں نہ ملائے اللہ تعالےٰ تہذیب سے منع نہیں کرتا۔ مہذبانہ جواب دیوے۔ حکمت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ایسی گفتگو کی جاوے جس سے خواہ نخواہ جوش پیدا ہو اور بیہودہ جنگ ہو۔ کبھی اخفائے حق نہ کرے۔ ہاں میں ہاں ملانے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ع

یار غالب شو کہ تا غالب شوی

اللہ تعالٰی کا لحاظ اور پاس رکھنا چاہیئے۔ ہمارے دین میں کوئی بات تہذیب کے خلاف نہیں۔

اِسلام پر ظُلم

اِسلام! اِسلام ہمیشہ مظلوم چلا آیا ہے۔ جیسے کبھی دو بھائی میں فساد ہو۔ تو بڑا بھائی بہ سبب اپنی عظمت اور پہلے پیدا ہونے کے اپنے چھوٹے بھائی پر خواہ نخواہ ظلم کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیدائش میں اوّل ہونے سے اپنا حق زیادہ خیال کرتا ہے۔ حالانکہ حق دونوں کا برابر ہے۔ اسی طرح کا ظلم اِسلام پر ہو رہا ہے۔ اسلام سب مذاہب کے بعد آیا۔ اسلام نے سب مذاہب کی غلطی اُنکو بتلائی تو جیسے قاعدہ ہے کہ جاہل، خیر خواہ کا دشمن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ سب مذاہب اس سے ناراض ہوئے۔ کیونکہ اُن کے دلوں میں اپنی اپنی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔ انسان کثرتِ قوم، قدامت اور کثرت مال کے باعث متکبر ہو جایا کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غریب، قلیل اور نئے گروہ والے تھے۔ اس لئے (ابتدا میں) اُنہوں (مخالفین) نے نہ مانا۔ حق ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے۔

اِسلام کسی مذہب کے بانی کو بُرا کہنے نہیں دیتا

اسلام ایسا مطہر مذہب ہے کہ کسی مذہب کے بانی کو بُرا کہنے نہیں دیتا۔ دیگر مذاہب والے جھٹ گالی دینے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ دیکھو۔ یہ عیسائی قوم آنحضرت صلعم کو کسقدر گالیاں دیتی ہے۔ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت زندہ ہوتے تو آپ کی دُنیاوی عظمت کے خیال سے بھی یہ لوگ کوئی کلمہ زبان پر نہ لا سکتے۔ بلکہ ہزارہا درجہ تعظیم سے پیش آتے۔ امیر کابل اور سلطان رُوم ایک ادنیٰ اُمتی آنحضرت صلعم کے ہیں۔ اُن کو گالی نہیں دے سکتے۔ بے ادبی سے پیش نہیں آسکتے۔ مگر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نام لیا جاوے تو ہزاروں گالیاں سُناتے ہیں۔ اسلام دوسری اقوام کا مُحسن ہے۔ کہ ہر ایک نبی اور کتاب کو بَری کیا۔ اور خود اسلام مظلوم ہے۔ اسلام کا مضمون

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے" (البدر جلد ۱ پرچہ ۹ ۱۹ دسمبر ۱۹۰۲ء)

۱۸۹۶ء۔ فرمایا۔ حضرت مسیحؑ کی آمد کے واسطے جو لفظ آیا ہے وُہ نزُول ہے۔ اور

نزُول کے معنے

رجُوع نہیں ہے۔ اوّل تو واپس آنے والے کی نسبت جو لفظ آتا ہے وہ رجُوع ہے اور رجُوع کا لفظ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کہیں نہیں بولا گیا۔ دوم۔ نزول کے معنے آسمان سے آنے کے نہیں ہیں۔ نزیل مُسافر کو کہتے ہیں۔

مخالفین پر سختی کرنے کی وجہ

فرمایا۔ ہم نے جو مخالفین پر بعض جگہ سختی کی ہے۔ وہ اُن کے تکبّر کو دُور کرنے کے واسطے ہے۔ وہ سخت باتوں کا جواب نہیں۔ بلکہ علاج کے طور پر کڑوی دوائی ہے اَلْحَقُّ مُرٌّ۔ لیکن ہر شخص کے واسطے جائز نہیں کہ وہ ایسی تحریر کو استعمال کرے جماعت کو احتیاط چاہیئے۔ ہر ایک شخص اپنے دل کو پہلے ٹٹول کر دیکھ لے کہ صرف ضد اور دشمنی کے طور پر ایسے لفظ لکھ رہا ہے یا کسی نیک نیّت پر یہ کام مبنی ہے۔

فرمایا۔ مخالفین کے ساتھ دشمنی سے پیش نہیں آنا چاہیئے۔ بلکہ زیادہ تر دُعا سے کام لینا چاہیئے اور دیگر وسائل سے کوشش کرنی چاہیئے۔

(بدر جلد ۱۱ نمبر ۹۔ پرچہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۱ء)

۱۸۹۷ء۔ کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

مولوی کہلانے سے نفرت

میں ہرگز اپنے آپ کو مولوی نہیں کہتا اور نہ میں راضی ہوں کہ کبھی کوئی مجھے مولوی کہے۔ بلکہ مجھے تو اس لفظ سے ایسا رنج ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے گالی دے دی۔

فرمایا۔ لوگ تمہیں دُکھ دیں گے اور ہر طرح سے تکلیف پہنچائیں گے۔ مگر ہماری جماعت کے لوگ جوش نہ دکھائیں۔ جوشِ نفس سے دل دُکھانے والے الفاظ استعمال نہ کرو

اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند نہیں ہوتے۔ ہماری جماعت کو اللہ تعالیٰ ایک نمونہ بنانا چاہتا ہے۔" (بدر جلد ۱۱ ملا صلا پرچہ ۲ر نومبر ۱۹۱۱ء)

آسمانی کام رُک نہیں سکتا

فرمایا۔ یہ آسمانی کام ہے اور آسمانی کام رُک نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں ہمارا قدم ایک ذرّہ بھی درمیان میں نہیں۔

فرمایا۔ لوگوں کی گالیوں سے ہمارا نفس جوش میں نہیں آتا۔

فرمایا۔ دولت مندوں میں نخوت ہے مگر آج کل کے علماء میں اس سے بڑھکر ہے اُن کا تکبر ایک دیوار کی طرح اُن کی راہ میں رُکاوٹ ہے۔ مَیں اس دیوار کو توڑنا چاہتا ہُوں۔ جب یہ دیوار ٹوٹ جاوے گی تو وُہ انکسار کے ساتھ آویں گے۔

خدا کی عظمت کو یاد کرکے سب ترساں رہو

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ متقی کو پیار کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عظمت کو یاد کرکے سب ترساں رہو اور یاد رکھو کہ سب اللہ کے بندے ہیں۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ نہ تیزی کرو۔ نہ کسی کو حقارت سے دیکھو جماعت میں اگر ایک آدمی گندہ ہوتا ہے تو وہ سب کو گندہ کر دیتا ہے۔ اگر حرارت کی طرف تمہاری طبیعت کا مَیلان ہو تو پھر اپنے دل کو ٹٹولو۔ کہ یہ حرارت کس چشمہ سے نکلی ہے۔ یہ مقام بہت نازک ہے۔" (بدر جلد ۱۱ ملا ۹ پرچہ ۳۰ر نومبر ۱۹۱۱ء)

دسمبر ۱۸۹۷ء۔ دارالامان قادیان سے بذریعہ پوسٹ کارڈ اطلاع ملی ہے کہ ہماری جماعت ہر نماز کی آخری رکعت میں بعد رکوع مندرجہ ذیل دُعا بکثرت پڑھے

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ[1]

(الحکم جلد ۱ ملا پرچہ ۹ر دسمبر ۱۸۹۷ء)

[1] البقرۃ: ۲۰۲

حضرت اقدس کی پہلی تقریر بر جلسہ سالانہ

۲۵ر دسمبر ۱۸۹۷ء تقویٰ کے متعلق نصیحت

اپنی جماعت کی خیر خواہی کے لئے زیادہ ضروری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تقویٰ کی بابت نصیحت کی جاوے۔ کیونکہ یہ بات عقلمند کے نزدیک ظاہر ہے کہ بجز تقویٰ کے اور کسی بات سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔[1] (ص۔۱۴)

جماعت احمدیہ کو خاص کر تقویٰ کی ضرورت ہے

ہماری جماعت کے لئے خاص کر تقویٰ کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس خیال سے بھی کہ وہ ایک ایسے شخص سے تعلق رکھتے ہیں اور اُس کے سلسلۂ بیعت میں ہیں جس کا دعوے ماموریت کا ہے تا وُہ لوگ جو خواہ کسی قسم کے بغضوں، کینوں یا شرکوں میں مبتلا تھے یا کیسے ہی رُو بہ دُنیا تھے۔ اُن تمام آفات سے نجات پاویں۔

آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی بیمار ہو جاوے خواہ اس کی بیماری چھوٹی ہو یا بڑی اگر اُس بیماری کے لئے دوا نہ کی جاوے اور علاج کے لئے دُکھ نہ اُٹھایا جاوے۔ بیمار اچھا نہیں ہو سکتا۔ ایک سیاہ داغ مُنہ پر نکل کر ایک بڑا فکر پیدا کر دیتا ہے کہ کہیں یہ داغ بڑھتا بڑھتا کُل مُنہ کو کالا نہ کر دے۔ اسی طرح معصیت کا بھی ایک سیاہ داغ دل پر

صغائر سہل انگاری سے کبائر ہو جاتے ہیں

ہوتا ہے۔ صغائر سہل انگاری سے کبائر ہو جاتے ہیں۔ صغائر وہی داغ چھوٹا ہے جو بڑھ کر آخرکار کُل مُنہ کو سیاہ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے ویسا ہی قہار اور مُنتقم بھی ہے۔ ایک جماعت کو دیکھتا ہے کہ اُن کا دعویٰ اور لاف و گزاف تو بہت کچھ ہے اور اُن کی عملی حالت ایسی نہیں۔ تو

[1] النحل: ۱۲۹

اُس کا غیظ و غضب بڑھ جاتا ہے۔ پھر ایسی جماعت کی سزا دہی کے لئے وُہ کُفّار کو ہی تجویز کرتا ہے۔ جو لوگ تاریخ سے واقف ہیں۔ وُہ جانتے ہیں کہ کئی دفعہ مُسلمان کافروں سے تہ تیغ کئے گئے۔ جیسے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے مُسلمانوں کو تباہ کیا۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے مُسلمانوں سے حمایت اور نُصرت کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی مُسلمان مغلوب ہوئے۔ اس قسم کے واقعات بسا اَوقات پیش آئے۔ اس کا باعث یہی ہے کہ جب اللہ تعالےٰ دیکھتا ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ تو پُکارتی ہے لیکن اس کا دِل اَور طرف ہے۔ اور اپنے افعال سے وُہ بالکل رُو بدُنیا ہے تو پھر اُس کا قہر اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

اللہ کا خوف کِس میں ہے؟

اللہ کا خوف اِسی میں ہے کہ انسان دیکھے کہ اُس کا قوْل و فعل کہانتک ایکدوسرے سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جب دیکھے کہ اس کا قول و فعل برابر نہیں تو سمجھ لے۔ کہ وُہ موردِ غضبِ الٰہی ہوگا۔ جو دل ناپاک ہے خواہ قول کتنا ہی پاک ہو وہ دِل خدا کی نگاہ میں قیمت نہیں پاتا۔ بلکہ خدا کا غضب مشتعل ہوگا۔ پس میری جماعت سمجھ لے کہ وہ میرے پاس آئے ہیں۔ اسی لئے کہ تخم ریزی کی جاوے۔ جس سے وُہ پھلدار درخت ہو جاوے۔ پس ہر ایک اپنے اندر غور کرے کہ اس کا اندرُونہ کیسا ہے۔ اور اس کی باطنی حالت کیسی ہے۔ اگر ہماری جماعت بھی خُدانخواستہ ایسی ہے کہ اُس کی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ ہے تو پھر خاتمہ بالخیر نہ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ جب دیکھتا ہے کہ ایک جماعت جو دل سے خالی ہے۔ اور زبانی دعوے کرتی ہے۔ وہ غنی ہے۔ وہ پرواہ نہیں کرتا۔ بدؔر کی فتح کی پیشگوئی ہو چکی تھی۔ ہر طرح فتح کی اُمید تھی لیکن پھر بھی آنحضرت صلعم رو رو کر دُعا مانگتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ جب ہر طرح فتح کا وعدہ ہے تو پھر ضرورتِ الحاح کیا ہے؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ کہ وہ ذات غنی ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ وعدۂ الٰہی میں کوئی مخفی شرائط ہوں۔

مُتقی کے علامات

پس ہمیشہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے تقویٰ وطہارت میں کہاں تک ترقی کی ہے۔اس کا معیار قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مُتقی کے نشانوں میں ایک یہ بھی نشان رکھا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مُتقی کو مکروہاتِ دُنیا سے آزاد کرکے اُس کے کاموں کا خود متکفل ہو جاتا ہے۔جیسے کہ فرمایا وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (س ۲۸) جو شخص خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک مصیبت میں اس کے لئے راستہ مخلصی کا نکال دیتا ہے اور اس کے لئے ایسے روزی کے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے علم وگمان میں نہ ہوں یعنی یہ بھی ایک علامت مُتقی کی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ متقی کو نابکار ضرورتوں کا محتاج نہیں کرتا۔ مثلاً ایک دوکاندار یہ خیال کرتا ہے کہ دروغگوئی کے سوا اس کا کام ہی نہیں چل سکتا۔اس لئے وُہ دروغ گوئی سے باز نہیں آتا۔اور جھوٹ بولنے کے لئے وہ مجبوری ظاہر کرتا ہے۔لیکن یہ امر ہرگز سچ نہیں۔خدا تعالیٰ متقی کا خود محافظ ہو جاتا اور اُسے ایسے موقع سے بچا لیتا ہے۔جو خلافِ حق پر مجبور کرنے والے ہوں۔یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ کو کسی نے چھوڑا، تو خدا نے اُسے چھوڑ دیا۔ جب رحمان نے چھوڑ دیا۔ تو ضرور شیطان اپنا رشتہ جوڑے گا۔

یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کمزور ہے۔وہ بڑی طاقت والا ہے۔جب اس پر کسی امر میں بھروسہ کرو گے وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (س ۲۸) لیکن جو لوگ اِن آیات کے پہلے مخاطب تھے۔ وُہ اہلِ دین تھے۔اُن کی ساری فکریں محض دینی امُور کے لئے تھیں اور دُنیوی امور حوالہ بخدا تھے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو تسلّی دی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔غرض برکاتِ تقویٰ میں سے ایک یہ ہے۔کہ اللہ تعالیٰ متقی کو اِن مصائب سے مخلصی بخشتا ہے۔جو دینی امُور کے حارج ہوں۔

لہ الطلاق: ۳-۴

اللہ تعالے متقی کو خاص طور پر رزق دیتا ہے

ایسا ہی اللہ تعالے متقی کو خاص طور پر رزق دیتا ہے۔ یہاں میں معارف کے رزق کا ذکر کروں گا۔

آنحضرتؐ کو روحانی رزق (معارف) اس قدر ملا کہ آپ سب پر غالب آئے

آنحضرت صلعم کو باوجود اُمّی ہونے کے تمام جہان کا مقابلہ کرنا تھا جس میں اہلِ کتاب۔ فلاسفر۔ اعلےٰ درجہ کے علمی مذاق والے لوگ اور عالم فاضل شامل تھے۔ لیکن آپؐ کو رُوحانی رزق اس قدر ملا کہ آپ سب پر غالب آئے۔ اور اُن سب کی غلطیاں نکالیں۔

یہ رُوحانی رزق تھا کہ جس کی نظیر نہیں۔ متقی کی شان میں دوسری جگہ یہ بھی آیا ہے۔ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ[1] (پ ۹) اللہ تعالیٰ کے ولی وُہ ہیں جو متقی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست۔ پس یہ کیسی نعمت ہے کہ تھوڑی سی تکلیف سے خدا کا مقرب کہلائے۔ آج کل زمانہ کسقدر پست ہمت ہے۔ اگر کوئی حاکم یا افسر کسی کو یہ کہدے کہ تُو میرا دوست ہے۔ یا اُس کو کُرسی دے اور اُس کی عزت کرے۔ تو وہ شیخی کرتا ہے۔ فخر کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اُس انسان کا کس قدر افضل رُتبہ ہوگا۔ جس کو اللہ تعالے اپنا ولی یا دوست کہہ کر پکارے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اکرمؐ کی زبان سے یہ وعدہ فرمایا ہے۔ جیسے کہ ایک حدیث بخاری میں وارد ہے۔ لَا يَزَالُ يَتَقَرَّبُ عَبْدِيْ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا ولی ایسا قرب میرے ساتھ بذریعہ نوافل پیدا کر لیتا ہے . . . . . الخ

انسان کی نیکیوں کے دو حصے

انسان جس قدر نیکیاں کرتا ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک فرائض

[1] الانفال : ۳۵

دُوسرے نوافل۔ فرائض یعنی جو انسان پر فرض کیا گیا ہو۔ جیسے قرضہ کا اُتارنا۔ یا نیکی کے مقابل نیکی۔ ان فرائض کے علاوہ ہر ایک نیکی کے ساتھ نوافل ہوتے ہیں۔ یعنی ایسی نیکی جو اس کے حق سے فاضل ہو۔ جیسے احسان کے مقابل احسان کے علاوہ اور احسان کرنا یہ نوافل ہیں۔ یہ بطور مکملات اور متممات فرائض کے ہیں۔ اس حدیث میں بیان ہے۔ کہ اولیاء اللہ کے دینی فرائض کی تکمیل نوافل سے ہو رہتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے علاوہ وُہ اور صدقات دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کا دلی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ اُس کی دوستی یہانتک ہوتی ہے کہ میں اُس کے ہاتھ، پاؤں وغیرہ حتیٰ کہ اُس کی زبان ہو جاتا ہُوں جس سے وہ بولتا ہے۔

کب انسان کا ہر ایک فعل خُدا کے منشاء کے مطابق ہوتا ہے

بات یہ ہے کہ جب انسان جذباتِ نفس سے پاک ہوتا اور نفسانیت چھوڑ کر خدا کے ارادوں کے اندر چلتا ہے۔ اس کا کوئی فعل ناجائز نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ایک فعل خدا کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں لوگ ابتلا میں پڑتے ہیں وہاں یہ امر ہمیشہ ہوتا ہے۔ کہ وہ فعل خدا کے ارادہ سے مطابق نہیں ہوتا۔ خدا کی رضا اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنے جذبات کے نیچے چلتا ہے۔ مثلاً غصہ میں آکر کوئی ایسا فعل اس سے سرزد ہو جاتا ہے جس سے مقدمات بن جایا کرتے ہیں۔ فوجداریاں ہو جاتی ہیں۔ مگر اگر کسی کا یہ ارادہ ہو کہ بلا استصواب کتابُ اللہ اس کا حرکت و سکُون نہ ہوگا۔ اور اپنی ہر ایک بات پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے گا تو یقینی امر ہے کہ کتاب اللہ مشورہ دے گی جیسے فرمایا۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ [1] (س ۷) سو اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ ہم مشورہ کتاب اللہ سے لیں گے تو ہم کو ضرور مشورہ ملے گا لیکن جو اپنے جذبات کا تابع ہے۔ وہ ضرور نقصان ہی میں پڑے گا۔ بسا اوقات وہ اس جگہ مواخذہ میں پڑیگا سو اس کے مقابل اللہ نے فرمایا کہ دلی جو میرے ساتھ بولتے چلتے کام کرتے ہیں۔ وُہ گویا

[1] الانعام : ۶۰

اس میں محو ہیں۔ سو جس قدر کوئی محویت میں کم ہے۔ وہ اتنا ہی خدا سے دُور ہے۔ لیکن اگر اس کی محویت ویسی ہی ہے جیسے خدا نے فرمایا تو اس کے ایمان کا اندازہ نہیں۔ اُن کی حمایت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ عَادَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (الحدیث) جو شخص میرے ولی کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ متقی کی شان کس قدر بلند ہے اور اس کا پایہ کس قدر عالی ہے۔ جس کا قرب خُدا کی جناب میں ایسا ہے کہ اس کا ستایا جانا خُدا کا ستایا جانا ہے۔ تو خُدا اس کا کس قدر معاون و مددگار ہوگا۔

مُتقی کے پاس جو آجاتا ہے وُہ بھی بچایا جاتا ہے

لوگ بہت سی مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں لیکن متقی بچائے جاتے ہیں۔ بلکہ اُن کے پاس جو آجاتا ہے وُہ بھی بچایا جاتا ہے۔ مصائب کی کوئی حد نہیں۔ انسان کا اپنا اندر اس قدر مصائب سے بھرا ہوا ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ امراض کو ہی دیکھ لیا جاوے کہ ہزارہا مصائب کے پیدا کرنے کو کافی ہیں لیکن جو تقوے کے قلعہ میں ہوتا ہے وہ اُن سے محفوظ ہے۔ اور جو اس سے باہر ہے وُہ ایک جنگل میں ہے جو درندہ جانوروں سے بھرا ہُوا ہے۔

مُتقیوں کو اسی دُنیا میں بشارتیں سچّے خوابوں کے ذریعہ ملتی ہیں

مُتّقِی کے لئے ایک اَور بھی وعدہ ہے۔ لَہُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ[1] (الآیہ س ۱۱) یعنی جو متقی ہوتے ہیں۔ اُن کو اسی دُنیا میں بشارتیں سچے خوابوں کے ذریعہ ملتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ صاحب مکاشفات ہو جاتے ہیں۔ مکالمۃ اللہ کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ وہ بشریّت کے لباس میں ہی ملائکہ کو دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ[2] ... الخ (س ۲۴) یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور استقامت دکھلاتے ہیں... الخ یعنی ابتلا کے وقت ایسا شخص دکھلا دیتا ہے کہ جو مَیں نے مُنہ سے وعدہ کیا تھا۔ وہ عملی طور سے پُورا کرتا ہوں۔

[1] یونس : ۶۵ ، [2] حٰمٓ السجدۃ : ۳۱

ابتلا ضروری ہے

کیونکہ ابتلا ضروری ہے۔ جیسے یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ [1] (س ۲۰) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور استقامت کی۔ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں۔ مفسّروں کی غلطی ہے کہ فرشتوں کا اُترنا نزع میں ہے یہ غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کو صاف کرتے ہیں اور نجاست اور گندگی سے جو اللہ سے دُور رکھتی ہے۔ اپنے نفس کو دُور رکھتے ہیں۔ اُن میں سلسلہ الہام کے لئے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ سلسلہ الہام شروع ہو جاتا ہے۔ پھر متقی کی شان میں ایک اور جگہ فرمایا۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [2] (س ۱۱) یعنی جو اللہ کے ولی ہیں اُن کو کوئی غم نہیں۔ جس کا خدا متکفّل ہو اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ کوئی مقابلہ کرنے والا ضرر نہیں دے سکتا۔ اگر خدا ولی ہو جاوے۔ پھر فرمایا۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ [3] (س ۲۴) یعنی تم اس جنّت کے لئے خوش ہو۔ جس کا تم کو وعدہ ہے۔

انسان کیلئے دو جنّت

قرآن کی تعلیم سے پایا جاتا ہے کہ انسان کے لئے دو جنّت ہیں۔ جو شخص خدا سے پیار کرتا ہے کیا وُہ ایک جلنے والی زندگی میں رہ سکتا ہے؟ جب اس جگہ ایک حاکم کا دوست دُنیوی تعلقات میں ایک قسم کی بہشتی زندگی میں ہوتا ہے تو کیوں نہ اُن کے لئے دروازہ جنّت کا کھُلے۔ جو اللہ کے دوست ہیں۔ اگرچہ دُنیا پُر از تکلیف و مصائب ہے۔ لیکن کسی کو کیا خبر وُہ کیسی لذّت اُٹھاتے ہیں۔ اگر اُن کو رنج ہو۔ تو آدھ گھنٹہ تکلیف اُٹھانا بھی مشکل ہے۔ حالانکہ وہ تو تمام عمر تکلیف میں رہتے ہیں۔ ایک زمانہ کی سلطنت اُن کو دے کر اُن کو اپنے کام سے روکا جاوے تو کب کسی کی سُنتے ہیں۔ اسی طرح خواہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ وہ اپنے ارادہ کو نہیں چھوڑتے۔

[1] العنکبوت: ۳ [2] یونس: ۶۳ [3] حٰمٓ السجدۃ: ۳۱

۲۱

آنحضرت صلعم کے اخلاق

ہمارے ہادیٔ کامل کو یہ دونوں باتیں دیکھنی پڑیں۔ ایک وقت تو طائف میں پتھر برسائے گئے۔ ایک کثیر جماعت نے سخت سے سخت جسمانی تکلیف دی۔ لیکن آنحضرتؐ کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ جب قوم نے دیکھا کہ مصائب و شدائد سے ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تو انہوں نے جمع ہو کر بادشاہت کا وعدہ دیا۔ اپنا امیر بنانا چاہا۔ ہر ایک قسم کے سامانِ آسائش مہیا کر دینے کا وعدہ کیا۔ حتیٰ کہ عمدہ سے عمدہ بی بی بھی۔ بدیں شرط کہ حضرتؐ بتوں کی مذمت چھوڑ دیں۔ لیکن جیسے کہ طائف کی مصیبت کے وقت ویسی ہی اِس وعدہ بادشاہت کے وقت حضرتؐ نے کچھ پروا نہ کی اور پتھر کھانے کو ترجیح دی۔ سو جبتک خاص لذت نہ ہو تو کیا ضرورت تھی کہ آرام چھوڑ کر دُکھوں میں پڑتے۔

یہ موقع سوا ہمارے رسول علیہ الصلوٰۃ و التحیات کے کسی اور نبی کو نہ ملا۔ کہ اُن کو نبوت کا کام چھوڑنے کے لئے کوئی وعدہ دیا گیا ہو۔ مسیحؑ کو بھی یہ امر نصیب نہ ہوا۔ دُنیا کی تاریخ میں صرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہی یہ معاملہ ہوا۔ کہ آپ کو سلطنت کا وعدہ دیا گیا۔ اگر آپ اپنا کام چھوڑ دیں۔ سو یہ عزت ہمارے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اسی طرح ہمارے ہادیٔ کامل کو دونو زمانے تکلیف اور فتحمندی کے نصیب ہوئے۔ تاکہ وہ دونو اوقات میں کامل نمونہ اخلاق کا دکھا سکیں۔

اللہ تعالےٰ نے متقیوں کے لئے چاہا ہے۔ کہ ہر دو لذتیں اٹھائیں۔ بعض وقت دُنیوی لذات، آرام اور طیبات کے رنگ میں۔ بعض وقت عُسرت اور مصائب میں۔ تاکہ اُن کے دونو اخلاق کامل نمونہ دکھا سکیں۔ بعض اخلاق طاقت میں اور بعض مصائب میں کھُلتے ہیں۔ ہمارے نبی کریمؐ کو یہ دونو باتیں مُیسّر آئیں۔ سو جس قدر ہم آپؐ کے اخلاق پیش کر سکیں گے۔ کوئی اَور قوم اپنے کسی نبی کے اخلاق پیش نہ کر سکے گی۔ جیسے مسیحؑ کا صرف صبر ظاہر ہو سکتا ہے۔ کہ وُہ مار کھاتا رہا۔ لیکن یہ کہاں سے نکلیگا کہ اُن کو طاقت نصیب

ہوئی ۔ وہ نبی بیشک سچے ہیں ۔لیکن اُن کے ہر قسم کے اخلاق ثابت نہیں ۔چونکہ اُن کا ذکر قرآن میں آگیا ۔ اس لئے ہم اُن کو نبی مانتے ہیں ۔ ورِنہ انجیل میں تو اُن کا کوئی ایسا خُلق ثابت نہیں ۔ جیسے اولوالعزم انبیاء کی شان ہوتی ہے ۔ ایسا ہی ہمارے ہادیٔ کامل بھی اگر ابتدائی تیرہ برس کی مصائب میں مَر جاتے ۔ تو اُن کے اَور بہت سے اخلاقِ فاضلہ مسیح کی طرح ثابت نہ ہوتے ۔لیکن دوسرا زمانہ جب فتح کا آیا اور مُجرم آپ کے سامنے پیش کئے گئے تو اس سے آپ کی صفتِ رحم اور عفو کا کامل ثبوت مِلا ۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے ۔کہ آپ کے کام کوئی جبر پر نہ تھے ۔ نہ زبردستی تھی ۔ بلکہ ہر ایک امر اپنے طبعی رنگ میں ہوا اسی طرح آپؐ کے اَور بہت سے اخلاق بھی ثابت ہیں ۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ۔کہ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ [1] (س ۲۴) ۔ کہ ہم اس دُنیا میں بھی اور آئندہ بھی متقی کے ولی ہیں ۔ سو یہ آیت بھی تکذیب میں اُن نادانوں کے ہے جنہوں نے اس زندگی میں نزولِ ملائکہ سے انکار کیا ۔ اگر نزع میں نزولِ ملائکہ تھا ۔ تو حیٰوۃ الدنیا میں خدا تعالیٰ کیسے ولی ہوا ۔

متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے

سو یہ ایک نعمت ہے کہ ولیوں کو خدا کے فرشتے نظر آتے ہیں ۔ آئندہ کی زندگی محض ایمانی ہے ۔لیکن ایک متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے ۔ اُنہیں اسی زندگی میں خدا ملتا ہے ، نظر آتا ہے اور اُن سے باتیں کرتا ہے ۔ سو اگر ایسی صورت کسی کو نصیب نہیں ۔ تو اس کا مرنا اور یہاں سے چلے جانا نہایت خراب ہے ۔ ایک ولی کا قول ہے کہ جس کو ایک خواب سچا عمر میں نصیب نہیں ہوا ۔ اس کا خاتمہ خطرناک ہے جیسے کہ قرآن مومن کے یہ نشان ٹھہراتا ہے ۔ سُنو ! جس میں یہ نشان نہیں اُس میں تقویٰ نہیں ۔ سو ہم سب کی یہ دُعا چاہیئے ۔ کہ یہ شرط ہم میں پُوری ہو ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ، خواب ، مکاشفات کا فیضان ہو ۔ کیونکہ مومن کا یہ خاصہ ہے

[1] حٰمٓ السجدۃ : ۳۲

سو یہ ہونا چاہیئے۔

بہت سی اور بھی برکات ہیں جو متّقی کو ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں جو قرآن کے شروع میں ہی ہے۔ اللہ تعالےٰ مومن کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ دُعا مانگیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ [1] یعنی ہمیں وہ راہ سیدھی بتلا ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام و فضل ہے۔ یہ اس لئے سکھلائی گئی ہے کہ انسان عالی ہمّت ہو کر اس سے خالق کا منشا سمجھے اور وُہ یہ ہے کہ یہ اُمّت بہائم کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ بلکہ اس کے تمام پردے کھُل جاویں۔ جیسے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ولایت بارہ اماموں کے بعد ختم ہو گئی۔ برخلاف اس کے اس دُعا سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے کہ جو متقی ہو اور خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ تو وہ اُن مراتب کو حاصل کر سکے۔ جو انبیاء اور اصفیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان کو بہت سے قوٰی ملے ہیں۔ جنھوں نے نشوونما پانا ہے اور بہت ترقی کرنا ہے۔ ہاں ایک بکرا چونکہ انسان نہیں، اس کے قوٰی ترقی نہیں کر سکتے۔ عالی ہمّت انسان جب رسُولوں اور انبیاء کے حالات سُنتا ہے تو چاہتا ہے کہ وُہ انعامات جو اس پاک جماعت کو حاصل ہوئے اُس پر نہ صرف ایمان ہی ہو بلکہ اُسے بہ تدریج ان انعامات کا علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہو جاوے۔

عِلم کے تین مدارج

علم کے تین مدارج ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ مثلاً ایک جگہ سے دھوآں نکلتا دیکھ کر آگ کا یقین کر لینا علم الیقین ہے۔ لیکن خود آنکھ سے آگ کا دیکھنا عین الیقین ہے۔ ان سے بڑھ کر درجہ حق الیقین کا ہے۔ یعنی آگ میں ہاتھ ڈال کر جلن اور حرقت سے یقین کر لینا کہ آگ موجود ہے۔ پس کیسا وہ شخص بدقسمت ہے۔ جس کو تینوں

[1] الفاتحۃ: ۶، ۷

میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں۔ اس آیت کے مطابق جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں وُہ کورانہ تقلید میں پھنسا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا [1] (س ۲۱)۔ جو ہماری راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلادیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دعا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ [2]۔ سو انسان کو چاہیئے۔ کہ اس کو مدّنظر رکھ کر نماز میں بالحاح دُعا کرے۔ اور تمنّا رکھے کہ وُہ بھی ان لوگوں میں سے ہو جاوے۔ جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اُٹھایا جاوے۔ چُنانچہ فرمایا مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی [3]۔ الآیہ (س ۱۵) کہ جو اِس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہے۔

آخرت کی تیاری اس دُنیا سے چاہیئے

جس کی منشاء یہ ہے کہ اس جہان کے مشاہدہ کے لئے اسی جہان سے ہم کو آنکھیں لے جانی ہیں۔ آئندہ جہان کو محسُوس کرنے کے لئے حواس کی طیاری اسی جہان میں ہوگی پس کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کرے اور پُورا نہ کرے۔

اندھے سے مراد وُہ ہے۔ جو روحانی معارف اور رُوحانی لذّات سے خالی ہے۔ ایک شخص کورانہ تقلید سے کہ مُسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوگیا، مُسلمان کہلاتا ہے۔ دوسری طرف اسی طرح ایک عیسائی عیسائیوں کے ہاں پیدا ہو کر عیسائی ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کو خدا، رسُول اور قرآن کی کوئی عزّت نہیں ہوتی۔ اس کی دین سے محبت بھی قابلِ اعتراض ہے۔ خدا اور رسُول کی ہتک کرنے والوں میں اس کا گذر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایسے شخص کی رُوحانی آنکھ نہیں۔ اس میں محبّتِ دین نہیں۔ ورنہ محبّت والا اپنے محبوب کے برخلاف کیا کچُھ پسند کرتا ہے؟ غرض اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے کہ میں تو دینے کو تیار ہوں اگر تو لینے کو تیار ہے۔ پس یہ دُعا کرنا ہی اس ہدایت کو لینے کی تیاری ہے۔

[1] العنکبوت: ۷۰ [2] الفاتحۃ: ۶ [3] بنی اسرائیل: ۷۳

هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر

اس دُعا کے بعد سُورہ بقرہ کے شروع میں ہی جو هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ[1] کہا گیا۔ تو گویا خدا تعالیٰ نے دینے کی تیاری کی۔ یعنی یہ کتاب متقی کو کمال تک پہنچانے کا وعدہ کرتی ہے۔ سو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ان کے لئے نافع ہے جو پرہیز کرنے اور نصیحت کے سُننے کو تیار ہوں۔ اس درجہ کا متقی وُہ ہے جو مخلّی بالطبع ہو کر حق کی بات سُننے کو تیار ہو۔ جیسے جب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو وُہ متقی بنتا ہے۔ جب کسی غیر مذہب کے اچھے دن آئے۔ تو اس میں اتقاء پیدا ہوا۔ عجب، غرور، پندار دُور ہوا۔ یہ تمام روکیں تھیں جو دُور ہوگئیں ان کے دُور ہونے سے تاریک گھر کی کھڑکی کھُل گئی۔ اور شعاعیں اندر داخل ہوگئیں۔

یہ جو فرمایا کہ یہ کتاب متقین کی ہدایت ہے۔ یعنی هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ تو اِتّقا جو اِفتِعال کے باب سے ہے۔ اور یہ باب تکلّف کے لئے آتا ہے۔ یعنی اِس میں اشارہ ہے کہ جس قدر یہاں ہم تقویٰ چاہتے ہیں وُہ تکلُّف سے خالی نہیں جس کی حفاظت کے لئے اس کتاب میں ہدایات ہیں۔ گویا متقی کو نیکی کرنے میں تکلیف سے کام لینا پڑتا ہے۔

عبدِ صالح

جب یہ گذر جاتا ہے تو سالک عبدِ صالح ہو جاتا ہے۔ گویا تکلیف کا رنگ دُور ہوا۔ اور صالح نے طبعًا و فطرۃً نیکی شروع کی۔ وہ ایک قسم کے دارُالامان میں ہے۔ جس کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب کُل جنگ اپنے نفسانی جذبات کے برخلاف ختم ہو چکے اور وُہ امن میں آگیا۔ اور ہر ایک قسم کے خطرات سے پاک ہوگیا۔ اسی امر کی طرف ہمارے ہادیٔ کامل ؐ نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ ہر ایک کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ لیکن میرا شیطان مُسلم ہوگیا ہے۔ سو متقی کو ہمیشہ شیطان کے مقابل جنگ ہے۔ لیکن جب وُہ صالح ہو جاتا ہے۔ تو کُل جنگیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ریاء ہی ہے۔ جس سے اُسے آٹھوں پہر جنگ ہے۔ متقی ایک ایسے مَیدان میں ہے۔ جہاں ہر وقت لڑائی ہے۔ اللہ کے فضل کا ہاتھ اُس کے ساتھ ہو

[1] البقرۃ: ۳

تو اُسے فتح ہو۔ جیسے ریا۔ جس کی چال ایک چیونٹی کی طرح ہے۔ بعض وقت انسان بے سمجھے لیکن موقعہ پر ریا کو دل میں پیدا ہونے کا موقعہ دے دیتا ہے۔ مثلاً ایک کا چاقو گم ہو جاوے اور وُہ دوسرے سے دریافت کرے تو اس موقعہ پر ایک متقی کا جنگ شیطان سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو اُسے سکھاتا ہے کہ مالک چاقو کا اس طرح دریافت کرنا ایک قسم کی بے عزتی ہے۔ جس سے اس کے افروختہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ آپس میں لڑائی بھی ہو جاوے۔ اس موقعہ پر ایک متقی کو اپنے نفس کی بدخواہش سے جنگ ہے۔ اگر اس شخص میں محض للہ دیانت موجود ہو تو غصہ کرنے کی اس کو ضرورت

دیانت جسقدر مخفی رکھی جاوے۔ اسی قدر بہتر ہے

ہی کیا ہے۔ کیونکہ دیانت جس قدر مخفی رکھی جاوے۔ اسی قدر بہتر ہے۔ مثلاً ایک جوہری کو راستہ میں چند چور مل جاویں اور چور آپس میں اس کے متعلق مشورہ کریں۔ بعض اُسے دولت مند بتلاویں اور بعض کہیں کہ وہ کنگال ہے۔ اب مقابلتاً یہ جوہری انہیں کو پسند کرے گا جو اُسے کنگال ظاہر کریں گے۔

اعمال میں اخفاء اچھا ہے

اسی طرح یہ دُنیا کیا ہے۔ ایک قسم کی دارا لابتلا ہے۔ وہی اچھا ہے۔ جو ہر ایک امر خفیہ رکھے اور ریاء سے بچے۔ وہ لوگ جن کے اعمال للہی ہوتے ہیں وہ کسی پر اپنے اعمال ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ یہی لوگ متقی ہیں۔

میں نے تذکرۃ الاولیاء میں دیکھا ہے کہ ایک مجمع میں ایک بزرگ نے سوال کیا۔ کہ اس کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کوئی اس کی مدد کرے ایک نے صالح سمجھ کر اُس کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ اُنھوں نے روپیہ لے کر اس کی سخاوت اور فیاضی کی تعریف کی۔ اس بات پر وُہ رنجیدہ ہُوا کہ جب یہاں ہی تعریف ہوگئی تو شاید ثواب آخرت سے محرومیت ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وُہ آیا اور کہا کہ وُہ روپیہ اس کی والدہ کا تھا۔ جو

دینا نہیں چاہتی چنانچہ وہ روپیہ واپس دیا گیا۔ جس پر ہر ایک نے لعنت کی اور کہا۔ کہ جھوٹا ہے۔ اصل میں روپیہ دینا نہیں چاہتا جب شام کے وقت وُہ بزرگ گھر گیا۔ تو وُہ شخص ہزار روپیہ اس کے پاس لایا اور کہا کہ آپ نے برسرِ عام میری تعریف کر کے مجھے محرومِ ثوابِ آخرت کیا۔ اس لئے میں نے یہ بہانہ کیا۔ اب یہ روپیہ آپ کا ہے۔ لیکن آپ کسی کے آگے نام نہ لیں۔ بزرگ رو پڑا اور کہا کہ اب تُو قیامت تک موردِ لعن طعن ہُوا کیونکہ کل کا واقعہ سب کو معلوم ہے اور یہ کسی کو معلوم نہیں۔ کہ تُو نے مجھے روپیہ واپس دے دیا ہے۔

سچا متقی ایک قسم کا ستر چاہتا ہے

ایک متقی تو اپنے نفس امارہ کے برخلاف جنگ کر کے اپنے خیال کو چُھپاتا ہے۔ اور خفیہ رکھتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس خفیہ خیال کو ہمیشہ ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک بدمعاش کسی بدچلنی کا مرتکب ہو کر خفیہ رہنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک متقی چھپ کر نماز پڑھتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کوئی اُس کو دیکھ لے۔ سچا متقی ایک قسم کا ستر چاہتا ہے۔ تقویٰ کے مراتب بہت ہیں۔ لیکن بہرحال تقویٰ کے لئے تکلف ہے اور متقی حالتِ جنگ میں ہے اور صالح اس جنگ سے باہر ہے۔ جیسے کہ میں نے مثال کے طور پر اُوپر ریاء کا ذکر کیا ہے۔ جس سے متقی کو آٹھوں پہر جنگ ہے۔

ریاء اور حلم کا جنگ

بسا اوقات ریاء اور حلم کا جنگ ہو جاتا ہے۔ کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سُن کر اُس کا نفس جوش مارتا ہے۔ تقویٰ تو اُس کو سکھلاتا ہے کہ وُہ غصہ کرنے سے باز رہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا[1] (پارہ ۱۹)۔ ایسا ہی بے صبری کے ساتھ اُسے اکثر جنگ کرنا پڑتا ہے۔ بے صبری سے مُراد یہ ہے کہ اس کو راہِ تقویٰ میں اس قدر دقتوں کا مقابلہ ہے کہ مشکل سے وُہ

[1] الفرقان: ۷۳

منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ اس لئے بے صبر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک کنواں پچاس ہاتھ تک کھودنا ہے۔ اگر دو چار ہاتھ کے بعد کھودنا چھوڑ دیا جاوے تو محض یہ ایک بدظنی ہے۔ اب تقویٰ کی شرط یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے، اُن کو اخیر تک پہنچائے اور بے صبر نہ ہو جاوے۔

راہِ سلوک میں مبارک قدم دو گروہ ہیں

راہِ سلوک میں مبارک قدم دو گروہ ہیں۔ ایک دین العجائز والے جو موٹی موٹی باتوں پر قدم مارتے ہیں۔ مثلاً احکامِ شریعت کے پابند ہو گئے۔ اور نجات پا گئے۔ دوسرے وُہ جنہوں نے آگے قدم مارا۔ ہرگز نہ تھکے اور چلتے گئے۔ حتیٰ کہ منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ لیکن نامراد وُہ فرقہ ہے کہ دین العجائز سے تو قدم آگے رکھا لیکن منزلِ سلوک کو طے نہ کیا۔ وہ ضرور دہریہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ ہم تو نمازیں بھی پڑھتے رہے۔ چلّہ کشیاں بھی کیں۔ لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔ جیسے ایک شخص منصور مسیح نے بیان کیا۔ کہ اُس کی عیسائیت کا باعث یہی تھا کہ وہ مُرشدوں کے پاس گیا۔ چلّہ کشی کرتا رہا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تو بدظن ہو کر عیسائی ہو گیا۔

استقامت

سو جو لوگ بے صبری کرتے ہیں وُہ شیطان کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ سو متقی کو بے صبری کے ساتھ بھی جنگ ہے۔ بوستان میں ایک عابد کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کبھی وہ عبادت کرتا۔ تو ہاتف یہی آواز دیتا کہ تُو مردُود و مخذول ہے۔ ایک دفعہ ایک مُرید نے یہ آواز سُن لی۔ اور کہا کہ اب تو فیصلہ ہو گیا۔ اب ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وُہ بہت رویا اور کہا کہ میں اُس جناب کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ اگر ملعُون ہوں۔ تو ملعُون ہی سہی۔ غنیمت ہے کہ مجھ کو ملعون تو کہا جاتا ہے۔ ابھی یہ باتیں مرید سے ہو ہی رہی تھیں کہ آواز آئی۔ کہ تُو مقبول ہے۔ سو یہ سب صدق و صبر کا نتیجہ تھا جو متقی میں ہونا شرط ہے۔

مجاہدہ کا کام

یہ جو فرمایا ہے۔ کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[۱] (پارہ ۲۱)
یعنی ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس راہ میں پیمبر کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا ہوگا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے تیار رہنا اس کا کام ہے۔ سو متقی کی نشانی استقامت ہے جیسے کہ فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا[۲] الخ۔ یعنی جنہوں نے کہا کہ رب ہمارا اللہ ہے اور استقامت دکھائی۔ اور ہر طرف سے مُنہ پھیر کر اللہ کو ڈھونڈا۔ مطلب یہ کہ کامیابی استقامت پر موقوف ہے۔ اور وہ اللہ کو پہچاننا اور کسی ابتلا اور زلازل اور امتحان سے نہ ڈرنا ہے۔ ضرور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مورد مخاطبہ و مکالمہ الٰہی انبیاء کی طرح ہوگا۔

ولی بننے کے لئے ابتلا ضروری ہیں

بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھونک مار کر عرش پر پہنچ جائیں اور واصلین سے ہو جاویں۔ ایسے لوگ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ وہ انبیاء کے حالات کو دیکھیں۔ یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ[۳] (پارہ ۲۰) جب تک انسان آزمایا نہ جاوے۔ فتن میں نہ ڈالا جاوے وہ کب ولی بن سکتا ہے۔

ایک مجلس میں بایزیدؒ وعظ فرما رہے تھے۔ وہاں ایک مشائخ زادہ بھی تھا۔ جو ایک لمبا سلسلہ رکھتا تھا۔ اس کو آپ سے اندرونی بغض تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاصہ ہے کہ پُرانے خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اَور کو لے لیتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسمٰعیل کو لے لیا۔ کیونکہ وہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ کر خدا کو بھول

[۱] العنکبوت : ۷۰ [۲] حٰمٓ السجدۃ : ۳۱ [۳] العنکبوت : ۳

گئے ہوتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[1] (پارہ ۴) سو اس شیخ زادے کو خیال آیا کہ یہ ایک معمولی خاندان کا آدمی ہے۔ کہاں سے ایسا صاحب خوارق آگیا۔ کہ لوگ اس کی طرف جھکتے ہیں۔ اور ہماری طرف نہیں آتے۔ یہ باتیں خدا تعالیٰ نے حضرت بایزیدؒ پر ظاہر کیں۔ تو انہوں نے ایک قصہ کے رنگ میں یہ بیان شروع کیا۔ کہ ایک جگہ مجلس میں رات کے وقت ایک لمپ میں پانی سے ملا ہوا تیل جل رہا تھا تیل اور پانی میں بحث ہوئی۔ پانی نے تیل کو کہا کہ تو کثیف اور گندہ ہے۔ اور باوجود کثافت کے میرے اُوپر آتا ہے۔ مَیں ایک مصفّا چیز ہوں اور طہارت کے لئے استعمال کیا جاتا ہوں۔ لیکن نیچے ہوں۔ اس کا باعث کیا ہے؟ تیل نے کہا کہ جسقدر صعوبتیں مَیں نے کھینچی ہیں۔ تو نے وہ کہاں جھیلی ہیں۔ جس کے باعث یہ بلندی مجھے نصیب ہوئی۔ ایک زمانہ تھا۔ جب میں بویا گیا، زمین میں مخفی رہا۔ خاکسار ہُوا۔ پھر خُدا کے ارادہ سے بڑھا بڑھنے نہ پایا، کہ کاٹا گیا۔ پھر طرح طرح کی مشقتوں کے بعد صاف کیا گیا۔ کولھو میں پیسا گیا۔ پھر تیل بنا اور آگ لگائی گئی۔ کیا ان مصائب کے بعد بھی میں بلندی حاصل نہ کرتا؟

اہل اللہ مصائب و شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں

یہ ایک مثال ہے کہ اہل اللہ مصائب و شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیالِ خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جاکر بلا مجاہدہ و تزکیہ ایک دم میں صدّیقین میں داخل ہوگیا۔ قُرآنِ شریف کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو جبتک نبیوں کی طرح تم پر مصائب و زلازل نہ آویں۔ جنہوں نے بعض وقت تنگ آکر یہ بھی کہہ دیا۔ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ[2] (پارہ ۲) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے۔ پھر خدا نے ان کو قبول کیا۔

[1] آل عمران : ۱۴۱ [2] البقرۃ : ۲۱۵

ترقیات کی دو راہیں

صُوفیوں نے ترقیات کی دو راہیں لکھی ہیں۔ ایک سلوک دوسرا جذب۔
سلوک وہ ہے جو لوگ آپ عقلمندی سے سوچ کر اللہ و رسولؐ کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ[1] (پارہ ۳) یعنی اگر تم اللہ کے پیارے بننا چاہتے ہو۔ تو رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پیروی کرو۔ وہ ہادیٔ کامل وہی رسُول ہیں جنہوں نے وُہ مصائب اُٹھائیں کہ دُنیا اپنے اندر نظیر نہیں رکھتی۔ ایک دن بھی آرام نہ پایا۔ اب پیروی کرنے والے بھی حقیقی طور سے وہی ہوں گے۔ جو اپنے متبوُع کے ہر قول وفعل کی پیَروی پُوری جد وجہد سے کریں۔ متّبع وہی ہے جو سب طرح پیروی کرے گا۔ سہل انگار اور سخت گذار کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے غضب میں آوے گا۔ یہاں جو اللہ تعالےٰ نے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کا حکم دیا۔ تو سالِک کا کام یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اول رسول اکرمؐ کی مکمّل تاریخ دیکھے۔ اور پھر پیروی کرے۔ اسی کا نام سلوک ہے۔ اس راہ میں بہت مصائب و شدائد ہوتے ہیں۔ ان سب کو اُٹھانے کے بعد ہی انسان سالِک ہو جاتا ہے۔

اہلِ جذب کا درجہ

اہلِ جذب کا درجہ سالکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ انہیں سلوک کے درجہ پر ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ خود اُن کو مصائب میں ڈالتا اور جاذبۂ ازلی سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کُل انبیاء مجذُوب ہی تھے۔ جس وقت انسانی رُوح کو مصائب کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اُن سے فرسُودہ کار اور تجربہ کار ہو کر رُوح چمک اُٹھتی ہے۔ جیسے کہ توا یا شیشہ اگرچہ چمک کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن صَیقلوں کے بعد ہی مجلّٰی ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ اس میں مُنہ دیکھنے والے کا منہ نظر آجاتا ہے۔ مجاہدات بھی صَیقل کا ہی کام کرتے ہیں۔ دِل

[1] آل عمران : ۳۲

کا صیقل یہاں تک ہونا چاہیئے کہ اُس میں سے بھی مُنہ نظر آجاوے۔ مُنہ کا نظر آنا گیا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا مصداق ہونا۔ سالک کا دِل آئینہ ہے۔ جس کو مصائب شدائد اس قدر صیقل کر دیتے ہیں۔ کہ اَخلاق النبیؐ اُس میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب بہت مجاہدات اور تزکیوں کے بعد اس کے اندر کسی قسم کی کدورت یا کثافت نہ رہے۔ تب یہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ ہر ایک مومن کو ایک حد تک ایسی صفائی کی ضرورت ہے۔ کوئی مومن بلا آئینہ ہونے کے نجات نہ پائے گا۔ سلوک والا خود یہ صیقل کرتا ہے۔ اپنے کام سے مصائب اُٹھاتا ہے۔ لیکن جذبہ والا مصائب میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا خود اُس کا مُصیقل ہوتا ہے۔ اور طرح طرح کے مصائب و شدائد سے صیقل کر کے اس کو آئینہ کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔ دراصل سالک و مجذوب دونو کا ایک ہی نتیجہ ہے۔ سو متقی کے دو حصّے ہیں۔ سلوک و جذب +

اِیمان بِالغیب

تقویٰ جیسا کہ مَیں بیان کر آیا ہوں۔ کسی قدر تکلّف کو چاہتا ہے۔ اسی لئے فرمایا۔ کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ[1] (پ۱) اس میں ایک تکلّف ہے۔ مشاہدہ کے مقابل ایمان بالغیب لانا ایک قسم کے تکلّف کو چاہتا ہے۔ سو متقی کے لئے ایک حد تک تکلّف ہے۔ کیونکہ جب وُہ صَالح کا درجہ حاصل کرتا ہے تو پھر غیب اُس کے لئے غیب نہیں رہتا۔ کیونکہ صَالح کے اندر سے ایک نہر کُھلتی ہے جو اس میں سے نکل کر خُدا تک پہنچتی ہے۔ وُہ خُدا اور اُس کی محبّت کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کہ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[2]۔ اسی سے ظاہر ہے کہ جب تک انسان پوری روشنی اسی جہان میں نہ حاصل کرلے۔ وہ کبھی خُدا کا مُنہ نہ دیکھے گا۔ سو متقی کا کام یہی ہے کہ وُہ ہمیشہ ایسے سُرمے تیار کرتا رہے۔ جس سے اس کا رُوحانی نزولُ الماء دُور ہو جاوے۔ اب اس سے ظاہر ہے کہ متقی شروع میں اندھا ہوتا ہے۔ مختلف کوششوں

[1] البقرۃ ۳-۴ [2] بنی اسرائیل : ۷۳

اور تزکیوں سے وُہ نُور حاصل کرتا ہے۔ پس جب سوچا کھا ہوگیا اور صالح بن گیا۔ پھر ایمان بالغیب نہ رہا اور تکلف بھی ختم ہوگیا۔ جیسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برأی العین اسی عالم میں بہشت و دوزخ وغیرہ سب کچھ مشاہدہ کرایا گیا۔ جو متقی کو ایک ایمان بالغیب کے رنگ میں ماننا پڑتا ہے وہ تمام آپؐ کے مشاہدہ میں آگیا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ متقی اگرچہ اندھا ہے اور تکلّف کی تکلیف میں ہے۔ لیکن صالح ایک دارُالامان میں آگیا ہے۔ اور اُس کا نفس نفسِ مطمئنہ ہوگیا ہے۔ متّقی اپنے اندر ایمان بالغیب کی کیفیت رکھتا ہے۔ وُہ اندھا دُھند طریق سے چلتا ہے۔ اُس کو کچھ خبر نہیں ہر ایک بات پر اُس کا ایمان بالغیب ہے۔ یہی اُس کا صدق ہے۔ اور اس صدق کے مقابل خُدا تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ وُہ فلاح پائے گا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[۱]

اقامت صلوٰۃ

اس کے بعد متقی کی شان میں آیا ہے۔ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ[۲]۔ یعنی وُہ نماز کو کھڑی کرتا ہے۔ یہاں لفظ کھڑی کرنے کا آیا ہے۔ یہ بھی اس تکلّف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو متقی کا خاصہ ہے۔ یعنی جب وہ نماز شروع کرتا ہے تو طرح طرح کے وساوس کا اُسے مقابلہ ہوتا ہے۔ جن کے باعث اس کی نماز گویا بار بار گری پڑتی ہے۔ جس کو اُس نے کھڑا کرنا ہے۔ جب اس نے اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہا۔ تو ایک ہجوم وساوس ہے۔ جو اُس کے حضورِ قلب میں تفرقہ ڈال رہا ہے۔ وُہ اُن سے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ پریشان ہوتا ہے۔ ہر چند حضور و ذوق کے لئے لڑتا مرتا ہے۔ لیکن نماز جو گری پڑتی ہے۔ بڑی جان کنی سے اُسے کھڑا کرنے کی فکر میں ہے۔ بار بار اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہہ کر نماز کے قائم کرنے کے لئے دُعا مانگتا ہے۔ اور ایسے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی ھدایت چاہتا ہے جس سے اُس کی نماز کھڑی ہو جاوے۔ ان وساوس کے مقابل میں مُتّقی ایک بچّہ کی طرح ہے۔ جو خُدا کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ روتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اَخْلَدَ

[۱] البقرۃ : ۶ [۲] البقرۃ : ۴

اِلَی الْاَرْضِ[1] ہو رہا ہوں۔ سو یہی وُہ جنگ ہے جو متقی کو نماز میں نفس کے ساتھ کرنی ہوتی ہے۔ اور اسی پر ثواب مترتب ہوگا +

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نماز میں وساوس کو فی الفور دُور کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی منشاء کچھ اَور ہے۔ کیا خُدا نہیں جانتا۔ حضرت شیخ عبد القادر گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قول ہے کہ ثواب اس وقت تک ہے جبتک مجاہدات ہیں۔ اور جب مجاہدات ختم ہوئے۔ تو ثواب ساقط ہو جاتا ہے۔ گویا صَوم وصلوٰۃ اُس وقت تک اعمال ہیں۔ جبتک ایک جد وجہد سے وساوس کا مقابلہ ہے۔ لیکن جب اُن میں ایک اعلیٰ درجہ پیدا ہو گیا اور صاحبِ صَوم وصلوٰۃ تقویٰ کے تکلّف سے بچکر صلاحیت سے رنگین ہو گیا۔ تو اب صَوم و صلوٰۃ اعمال نہیں رہے۔ اس موقعہ پر اُنہوں نے سوال کیا ہے۔ کہ کیا اب نماز معاف ہو جاتی ہے؟ کیونکہ ثواب تو اس وقت تھا۔ جس وقت تک تکلّف کرنا پڑتا تھا۔ سو بات یہ ہے کہ نماز اب عمل نہیں بلکہ ایک انعام ہے۔ یہ نماز اس کی ایک غذا ہے جو اس کے لئے قُرَّۃُ الْعَیْن ہے۔ یہ گویا نقد بہشت ہے +

مقابل میں وُہ لوگ جو مجاہدات میں ہیں۔ وہ کشتی کر رہے ہیں۔ اور یہ نجات پا چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا سلوک جب ختم ہوا تو اُس کے مصائب بھی ختم ہو گئے۔ مثلاً ایک مخنّث اگر یہ کہے کہ وُہ کبھی کسی عَورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تو وُہ کونسی نعمت یا ثواب کا مستحق ہے۔ اُس میں تو صفتِ بدنظری ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر ایک مرد صاحبِ رجولیّت اگر ایسا کرے تو ثواب پائے گا۔ اسی طرح انسان کو ہزاروں مقامات طےَ کرنے پڑتے ہیں بعض بعض امُور میں اُس کی مشاقی اُس کو قادر کر دیتی ہے نفس کے ساتھ اس کی مصالحت ہو گئی۔ اب وُہ ایک بہشت میں ہے۔ لیکن وہ پہلا سا ثواب نہیں رہے گا۔ وُہ ایک تجارت کر چکا ہے۔ جس کا وُہ نفع اُٹھا رہا ہے۔ لیکن پہلا رنگ نہ رہے گا۔ انسان میں ایک فعل تکلّف سے کرتے کرتے طبیعت کا رنگ پیدا ہو

[1] الاعراف: ۱۷۷

جاتا ہے۔ ایک شخص جو طبعی طور سے لذت پاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اُس کام سے ہٹایا جاوے۔ وُہ طبعًا یہاں سے ہٹ نہیں سکتا۔ سو اتّقا اور تقوٰی کی حدتک پُورا انکشاف نہیں ہوتا۔ بلکہ وُہ ایک قسم کا دعوٰی ہے۔

اِنْفَاق مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ

اِس کے بعد متقی کی شان میں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] آیا ہے۔ یہاں متقی کے لئے مِمَّا کا لفظ استعمال کیا کیونکہ اُسوقت وہ ایک اعمٰی کی حالت میں ہے۔ اس لئے جو کچھ خُدا نے اُس کو دیا۔ اُس میں سے کچھ خدا کے نام کا دیا۔ حق یہ ہے۔ کہ اگر وُہ آنکھ رکھتا تو دیکھ لیتا کہ اس کا کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ خُدا تعالیٰ کا ہی ہے۔ یہ ایک حجاب تھا۔ جو اتّقا میں لازمی ہے۔ اس حالت اتقا کے تقاضے نے متقی سے خدا کے دیئے میں سے کچھ دِلوایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایامِ وفات میں دریافت فرمایا کہ گھر میں کچھ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک دینار تھا۔ فرمایا کہ یہ سیرت یگانگت سے بعید ہے کہ ایک چیز بھی اپنے پاس رکھی جاوے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اتقا کے درجہ سے گزر کر صلاحیت تک پہنچ چکے تھے۔ اس لئے مِمَّا ان کی شان میں نہ آیا کیونکہ وہ شخص اندھا ہے جس نے کچھ اپنے پاس رکھا اور کچھ خدا کو دیا۔ لیکن یہ لازمہ متقی تھا۔ کیونکہ خدا کی راہ میں دینے سے بھی اُسے نفس کے ساتھ جنگ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ دیا اور کچھ رکھا۔ ہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے سب کچھ خدا کی راہ میں دے دیا۔ اور اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔

جیسے دھرم مہوتسو کے مضمون میں انسان کی تین حالتیں ذکر کی گئی ہیں جو انسان پر ابتدا سے انتہا تک وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی قرآن کریم نے جو انسان کو تمام مراحل ترقی کے طے کرانے آیا۔ اتّقا سے شروع کیا۔ یہ ایک تکلّف کا راستہ ہے۔ یہ ایک خطرناک مَیدان ہے۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اور مقابل بھی تلوار ہے۔ اگر بچ گیا۔ تو

[1] البقرۃ : ۴

نجات پا گیا۔ والّا اسفل السافلین میں پڑ گیا۔ چنانچہ یہاں متقی کی صفات میں یہ نہیں فرمایا۔ کہ جو کچھ ہم دیتے ہیں۔ اسے سب کا سب خرچ کر دیتا ہے۔ متقی میں اس قدر ایمانی طاقت نہیں جو نبی کی شان ہوتی ہے کہ وہ ہمارے ہادیٔ کامل کی طرح کُل کا کُل خدا کا دیا ہوا خدا کو دیدے۔ اسی لئے پہلے مختصر سا ٹیکس لگایا گیا۔ تاکہ چاشنی چکھ کر زیادہ ایثار کیلئے تیار ہو جاوے۔

رِزق سے مُراد

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1]۔ رزق سے مراد صرف مال نہیں۔ بلکہ جو کچھ اُن کو عطا ہوا۔ علم۔ حکمت۔ طبابت۔ یہ سب کچھ رزق میں ہی شامل ہے۔ اس کو اسی میں سے خدا کی راہ میں بھی خرچ کرنا ہے۔ انسان نے اس راہ میں بتدریج اور زینہ بہ زینہ ترقی کرنی ہے۔ اگر انجیل کی طرح یہ تعلیم ہوتی کہ گال پر ایک طمانچہ کھا کر دوسرے طمانچہ کے لئے گال آگے رکھ دی جاوے۔ یا سب کچھ دے دیا جاوے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح تعلیم کے ناممکن التعمیل ہونے کے باعث ثواب سے محروم رہتے۔

قرآن حسب فطرت انسانی آہستہ آہستہ ترقی کراتا ہے

لیکن قرآن شریف تو حسب فطرت انسانی آہستہ آہستہ ترقی کراتا ہے۔ انجیل کی مثال تو اُس لڑکے کی ہے جو مکتب میں داخل ہوتے ہی بڑی مشکل کتاب پڑھنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ حکیم ہے۔ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے تھا۔ کہ تدریج کے ساتھ تعلیم کی تکمیل ہو۔

اس کے بعد متقی کے لئے فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ[2]۔ یعنی وہ متقی ہوتے ہیں جو پہلی نازل شدہ کُتب پر اور تجھ پر جو کتاب نازل ہوئی۔ اس پر ایمان لاتے اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ امر بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابھی تک ایمان ایک محجوبیت کے رنگ میں ہے۔ متقی کی آنکھیں معرفت اور بصیرت کی نہیں۔ اس نے تقویٰ سے شیطان کا مقابلہ کر کے ابھی تک ایک بات کو مان

[1] البقرة: ۴ [2] البقرة: ۵

۵۱ لیا ہے یہی حال اس وقت ہماری جماعت کا ہے۔ انہوں نے بھی تقویٰ سے مانا تو ہے۔ پر ابھی تک وُہ نہیں جانتے۔ کہ یہ جماعت کہاں تک نشوونما الٰہی ہاتھوں سے پانے والی ہے۔ سو یہ ایک ایمان ہے جو بالآخر فائدہ رساں ہوگا۔

یَقِیْن کا لفظ جب عام طور پر استعمال ہو۔ تو اس سے مُراد اُس کا اَدنیٰ درجہ ہوتا ہے۔ یعنی علم کے تین مدارج میں سے ادنیٰ درجہ کا علم۔ یعنی عِلْم الیقین۔ اس درجہ پر اتقا والا ہوتا ہے۔ مگر بعد اس کے عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ بھی تقوے کے مراحل طے کرنے کے بعد حاصل کر لیتا ہے۔

تقویٰ کوئی چھوٹی چیز نہیں

تقویٰ کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ اس کے ذریعہ سے اُن تمام شیطانوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ جو انسان کی ہر ایک اندرونی طاقت و قوّت پر غلبہ پائے ہوئے ہیں۔ یہ تمام قوتیں نفس امّارہ کی حالت میں انسان کے اندر شیطان ہیں۔ اگر اصلاح نہ پائیں گی۔ تو انسان کو غلام کر لیں گی۔ علم و عقل ہی بُرے طور پر استعمال ہو کر شیطان ہو جاتے ہیں۔ متقی کا کام اُن کی اور ایسا ہی اَور دیگر کُل قویٰ کی تعدیل کرنا ہے۔ ایسا ہی جو لوگ انتقام، غضب یا نکاح کو ہر حال میں بُرا جانتے ہیں۔ وُہ بھی صحیفۂ قدرت کے مخالف ہیں۔ اور قویٰ انسانی کا مقابلہ کرتے ہیں۔

سچّا مذہب وُہی ہے جو انسانی قویٰ کا مُربّی ہو۔

سچّا مذہب وُہی ہے جو انسانی قویٰ کا مُربّی ہو۔ نہ کہ اُن کا استیصال کرے۔ رجولیت یا غضب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے فطرتِ انسانی میں رکھے گئے ہیں۔ ان کو چھوڑنا خدا کا مقابلہ کرنا ہے۔ جیسے تارک الدُنیا ہونا یا راہب بن جانا۔ یہ تمام امور حق العباد کو تلف کرنے والے ہیں۔ اگر یہ امر ایسا ہی ہوتا۔ تو گویا اُس خُدا پر اعتراض ہے۔ جس نے یہ قویٰ ہم میں پیدا کئے۔ پس ایسی تعلیمات جو انجیل میں ہیں۔ اور جن سے قوے کا استیصال

لازم آتا ہے، ضلالت تک پہنچاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اُس کی تعدیل کا حکم دیتا ہے۔ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ جیسے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ[1] الخ (س ۱۴) عدل ایک ایسی چیز ہے۔ جس سے سب کو فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ حضرت مسیحؑ کا یہ تعلیم دینا۔ کہ اگر تُو بُری آنکھ سے دیکھے تو آنکھ نکال ڈال۔ اس میں بھی قویٰ کا استیصال ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم نہ دی کہ تو غیر محرم عورت کو ہرگز نہ دیکھ۔ مگر برخلاف اس کے اجازت دی کہ دیکھ تو ضرور لیکن زنا کی آنکھ سے نہ دیکھ۔ دیکھنے سے تو ممانعت ہے ہی نہیں۔ دیکھیگا تو ضرور بعد دیکھنے کے دیکھنا چاہیئے کہ اس کے قویٰ پر کیا اثر ہوگا۔ کیوں نہ قرآن شریف کی طرح آنکھ کو ٹھوکر والی چیز ہی کے دیکھنے سے روکا۔ اور آنکھ جیسی مُفید اور قیمتی چیز کو ضائع کر دینے کا افسوس لگایا۔

اسلامی پردہ سے مُراد

آج کل پردہ پر حملے کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ اِسْلَامِی پَرْدَہ سے مراد زِندان نہیں۔ بلکہ ایک قسم کی روک ہے کہ غیر مَرد اور عورت ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ جب پردہ ہوگا۔ ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک مُنصف مزاج کہہ سکتا ہے۔ کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیر مَرد و عورت اکٹھے بلا تامل اور بے محابا مل سکیں۔ سیر یں کریں۔ کیونکر جذباتِ نفس سے اِضطرارًا ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سُننے اور دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ایسی قومیں غیر مَرد اور عورت کے ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو۔ کوئی عَیب نہیں سمجھتیں۔ یہ گویا تہذیب ہے۔ اِنہی بد نتائج کو روکنے کے لئے شارع اسلام نے وُہ باتیں کرنے کی اجازت ہی نہ دی جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقعہ پر یہ کہدیا کہ جہاں اس طرح غیر محرم مَرد و عورت ہر دو جمع ہوں۔ تیسرا اُن میں شیطان ہوتا ہے۔ اُن ناپاک نتائج پر غور کرو۔ جو یورپ اس خلیع الرسن تعلیم سے بُھگت رہا ہے۔ بعض جگہ بالکل قابلِ شرم طوائفانہ زندگی بسر کی جارہی ہے۔ یہ انہیں تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی چیز کو خیانت سے بچانا چاہتے ہو تو حفاظت کرو۔ لیکن اگر حفاظت نہ کرو۔ اور

[1] النحل : ۹۱

یہ سمجھ رکھو کہ بھلے مانس لوگ ہیں۔ تو یاد رکھو کہ ضرور وہ چیز تباہ ہو گی۔ اسلامی تعلیم کیسی پاکیزہ تعلیم ہے کہ جس نے مَرد و عورت کو الگ رکھ کر ٹھوکر سے بچایا۔ اور انسان کی زندگی حرام اور تلخ نہیں کی جس کے باعث یورپ نے آئے دن کی خانہ جنگیاں اور خودکُشیاں دیکھیں۔ بعض شریف عورتوں کا طوائفانہ زندگی بسر کرنا ایک عملی نتیجہ اس اجازت کا ہے جو غیر عورت کو دیکھنے کے لئے دی گئی۔

خُدا تعالےٰ کے عطا کردہ قویٰ کی تعدیل اور جائز استعمال کرنا ہی اُن کی نشو و نما ہے

اللہ تعالےٰ نے جس قدر قویٰ عطا فرمائے ہیں۔ وہ ضائع کرنے کے لئے نہیں دیئے گئے اُن کی تعدیل اور جائز استعمال کرنا ہی اُن کی نشو و نما ہے۔ اسی لئے اسلام نے قوائے رجولیت یا آنکھ کے نکالنے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ ان کا جائز استعمال اور تزکیہ نفس کرایا۔ جیسے فرمایا۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ[1]۔ اور ایسے ہی یہاں بھی فرمایا۔ متقی کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر آخر میں بطور نتیجہ یہ کہا۔ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ[2]۔ یعنی وہ لوگ جو تقوےٰ پر قدم مارتے ہیں۔ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ نماز ڈگمگاتی ہے۔ پھر اُسے کھڑا کرتے ہیں۔ خُدا کے دیئے ہوئے سے دیتے ہیں۔ باوجود خطراتِ نفس بلا سوچے گزشتہ اور موجودہ کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور آخر کار وہ یقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے سر پر ہیں۔ وہ ایک ایسی سڑک پر ہیں جو برابر آگے کو جا رہی ہے اور جس سے آدمی فلاح تک پہنچتا ہے۔ پس یہی لوگ فلاح یاب ہیں جو منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے اور راہ کے خطرات سے نجات پا چکے ہیں۔ اس لئے شروع میں ہی اللہ تعالےٰ نے ہم کو تقویٰ کی تعلیم دے کر ایک ایسی کتاب ہم کو عطا کی جس میں تقویٰ کے وصایا بھی دیئے۔

سو ہماری جماعت یہ غم کُل دنیوی غموں سے بڑھ کر اپنی جان پر لگائے۔ کہ اُن میں تقویٰ ہے یا نہیں۔

[1] المومنون: ۲ [2] البقرۃ: ۶

اپنی زندگی غربت اور مسکینی میں بسر کرو

اہلِ تقویٰ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اپنی زندگی غربت اور مسکینی میں بسر کریں۔ یہ تقویٰ کی ایک شاخ ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہمیں ناجائز غضب کا مقابلہ کرنا ہے۔ بڑے بڑے عارف اور صدیقوں کے لئے آخری اور کڑی منزل غضب سے بچنا ہی ہے۔ عجب و پندار غضب سے پیدا ہوتا ہے اور ایسا ہی کبھی خود غضب عجب و پندار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ غضب اس وقت ہوگا جب اِنسان اپنے نفس کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری جماعت والے آپس میں ایک دوسرے کو چھوٹا یا بڑا سمجھیں۔ یا ایک دوسرے پر غرور کریں یا نظرِ استخفاف سے دیکھیں۔ خدا جانتا ہے کہ بڑا کون ہے۔ یا چھوٹا کون ہے۔ یہ ایک قسم کی تحقیر ہے جس کے اندر حقارت ہے۔ ڈر ہے کہ یہ حقارت بیج کی طرح بڑھے اور اس کی ہلاکت کا باعث ہو جاوے۔ بعض آدمی بڑوں کو مل کر بڑے ادب سے پیش آتے ہیں لیکن بڑا وُہ ہے جو مسکین کی بات کو مسکینی سے سُنے۔ اس کی دلجوئی کرے۔ اس کی بات کی عزت کرے۔ کوئی چِڑ کی بات منہ پر نہ لاوے کہ جس سے دُکھ پہنچے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ[1] ۔ تم ایک دوسرے کا چِڑ کے نام نہ لو۔ یہ فعل فُسّاق و فجّار کا ہے۔ جو شخص کسی کو چِڑاتا ہے۔ وُہ نہ مَرے گا جبتک وُہ خود اسی طرح مبتلا نہ ہو گا۔ اپنے بھائیوں کو حقیر نہ سمجھو۔ جب ایک ہی چشمہ سے کُل پانی پیتے ہو۔ تو کون جانتا ہے کہ کس کی قسمت میں زیادہ پانی پینا ہے۔ مکرم و معظم کوئی دُنیاوی اصولوں سے نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا وُہ ہے۔ جو متقی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ[2] (ص ۲۶)

ذاتوں کا امتیاز

یہ جو مختلف ذاتیں ہیں۔ یہ کوئی وجہ شرافت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے محض عرف کیلئے یہ ذاتیں بنائیں۔ اور آجکل تو صرف بعد چار پُشتوں کے حقیقی پتہ لگانا ہی مشکل ہے۔ متقی

---

[1] الحجرات : ۱۲ [2] الحجرات : ۱۴

کی شان نہیں کہ ذاتوں کے جھگڑے میں پڑے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ میرے نزدیک ذات کوئی سند نہیں۔ حقیقی مکرمت اور عظمت کا باعث فقط تقویٰ ہے۔

متقی کون ہوتے ہیں

خُدا کے کلام سے پایا جاتا ہے۔ کہ متقی وہ ہوتے ہیں جو حلیمی اور مسکینی سے چلتے ہیں۔ وہ مغرورانہ گفتگو نہیں کرتے۔ ان کی گفتگو ایسی ہوتی ہے جیسے چھوٹا بڑے سے گفتگو کرے۔ ہم کو ہر حال میں وُہ کرنا چاہیئے۔ جس سے ہماری فلاح ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی کا اجارہ دار نہیں۔ وُہ خاص تقویٰ کو چاہتا ہے۔ جو تقویٰ کرے گا وُہ مقام اعلیٰ کو پہنچے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم یا حضرت ابراہیم علیہ السّلام میں سے کسی نے وراثت سے تو عزت نہیں پائی۔ گو ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے والد ماجد عبداللہ مشرک نہ تھے۔ لیکن اس نے نبوّت تو نہیں دی۔ یہ تو فضلِ الٰہی تھا۔ اُن صِدقوں کے باعث جو اُن کی فطرت میں تھے۔ یہی فضل کے محرک تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ابُوالانبیاء تھے۔ اُنہوں نے اپنے صدق و تقوٰے سے ہی بیٹے کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا۔ خود آگ میں ڈالے گئے۔ ہمارے سیّد و مولیٰ حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہی صِدق و وفا دیکھئے۔ آپؐ نے ہر ایک قسم کی بد تحریک کا مقابلہ کیا۔ طرح طرح کے مصائب و تکالیف اُٹھائے۔ لیکن پروا نہ کی۔ یہی صِدق و وفا تھا جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (پ ۲۲)[1] ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے تمام فرشتے رسولؐ پر درُود بھیجتے ہیں۔ اَے ایمان والو! تم درُود و سلام بھیجو نبیؐ پر۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے اعمال ایسے تھے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی تعریف یا اَوصاف کی تحدید کرنے کے لئے کوئی لفظ خاص نہ فرمایا۔ لفظ تو مِل سکتے تھے لیکن خود استعمال نہ کئے۔ یعنی آپؐ کے اعمال صالحہ کی تعریف تحدید سے بیرون

[1] الاحزاب : ۵۷

تھی۔ اس قسم کی آیت کسی اَور نبی کی شان میں استعمال نہ کی۔ آپؐ کی رُوح میں وُہ صِدقؔ وفا تھا۔ اور آپؐ کے اعمال خُدا کی نگاہ میں اس قدر پسندیدہ تھے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ حکم دیا۔ کہ آیندہ لوگ شکر گذاری کے طور پر دُرود بھیجیں۔ آپ کی ہمّتؔ صِدق وُہ تھا کہ اگر ہم اُوپر یا نیچے نگاہ کریں۔ تو اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ خود حضرت مسیحؑ کے وقت کو دیکھ لیا جاوے کہ اُن کی ہمت یا رُوحانی صِدق و وفا کا کہاں تک اثر اُن کے پیروؤں پر ہوا۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ایک بَد روش کو درست کرنا کس قدر مشکل ہے۔ عاداتِ راسخہ کا گنوانا کیسا محالات سے ہے۔ لیکن ہمارے مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے تو ہزاروں انسانوں کو دُرست کیا۔ جو حیوانوں سے بد تر تھے۔ بعض ماؤں اور بہنوں میں حیوانوں کی طرح فرق نہ کرتے تھے۔ یتیموں کا مال کھاتے۔ مُردوں کا مال کھاتے۔ بعض ستارہ پرست، بعض دہریہ، بعض عناصر پرست تھے۔ جزیرہ عرب کیا تھا۔ ایک مجموعہ مذاہب اپنے اندر رکھتا تھا۔

قرآن مجید کامل ہدایت ہے

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قرآن کریم ہر ایک قسم کی تعلیم اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہر ایک غلط عقیدہ یا بُری تعلیم جو دُنیا میں ممکن ہے۔ اس کے استیصال کے لئے کافی تعلیم اس میں موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عمیق حکمت و تصرف ہے۔

چونکہ کامل کتاب نے آکر کامل اصلاح کرنی تھی۔ ضرور تھا۔ کہ اُس کے نزول کے وقت اُس کے جائے نزول میں بیماری بھی کامل طور پر ہو۔ تاکہ ہر ایک بیماری کا کامل علاج مہیا کیا جاوے۔ سو اس جزیرہ میں کامل طور سے بیمار (لوگ موجود) تھے۔ اور جن میں وہ تمام رُوحانی بیماریاں موجُود تھیں۔ جو اُس وقت یا اُس کے بعد آیندہ نسلوں کو لاحق ہونیوالی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن شریف نے کل شریعت کی تکمیل کی۔ دُوسری کتابوں کے نزول کے وقت نہ یہ ضرورت تھی۔ نہ اُن میں ایسی کامل تعلیم ہے۔

نبی کریمؐ کی اصلاح ہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے

ہمارے نبی اکملؐ کی برکات جس قدر ظہور میں آئیں۔ اگر تمام خوارق کو الگ کر دیا جائے تو صرف آپؐ کی اصلاح ہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اگر کوئی اُس حالت پر غور کرے جب آپؐ آئے پھر اُس حالت کو دیکھے جو آپ چھوڑ گئے۔ تو اس کو ماننا پڑے گا۔ کہ یہ اثر بذاتِ خود ایک اعجاز تھا۔ اگرچہ کُل انبیاء عزت کے قابل ہیں لیکن ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ[1]

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف نہ لاتے۔ تو نبوّت تو درکنار، خُدائی کا ثبوت بھی اس طرح نہ ملتا۔ آپ ہی کی تعلیم سے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ[2] ۔ کا پتہ لگا۔ اگر توریت میں کوئی ایسی تعلیم ہوتی اور قرآن شریف اس کی تصریح ہی کرتا۔ تو نصارےٰ کا وجود ہی کیوں ہوتا۔ غرض قرآن شریف نے جس قدر تقویٰ کی راہیں بتلائیں۔ اور ہر طرح کے انسانوں اور مختلف عقل والوں کی پرورش کرنے کے طریق سکھلائے۔ ایک جاہل، عالم اور فلسفی کی پرورش کے راستے ہر طبقہ کے سوالات کے جواب۔ غرضیکہ کوئی فرقہ نہ چھوڑا جس کی اصلاح کے طریق نہ بتائے۔

قرآن پاک میں سب سچائیاں ہیں

یہ ایک صحیفۂ قدرت تھا جیسے کہ فرمایا۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔[3] (پ۳۰) یہ وہ صحیفے ہیں جن میں کُل سچائیاں ہیں۔ یہ کیسی مبارک کتاب ہے کہ اس میں سب سامان اعلیٰ درجہ تک پہنچنے کے موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جیسے حدیث میں آیا کہ ایک درمیانی زمانہ آوے گا۔ جو فیج اعوج ہے۔ یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک میرا زمانہ برکت

مہدی

والا ہے۔ ایک آنے والے مسیح و مہدی کا۔ مسیح و مہدی کوئی دو الگ اشخاص نہیں ان سے مراد ایک ہی ہے۔ مہدی ہدایت یافتہ سے مراد ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسیح

[1] الجمعہ : ۵ [2] الاخلاص : ۲-۵ [3] البیّنہ : ۴

مہدی نہیں۔ مہدی مسیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن مسیح کے مہدی ہونے سے انکار کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے یہ دو الفاظ سبّ و شتم کے مقابل بطور ذبّ کے رکھے ہیں۔ کہ وہ کافر، ضالّ، مُضِل نہیں۔ بلکہ مہدی ہے۔ چونکہ اُس کے علم میں تھا کہ آنے والے مسیح و مہدی کو دجّال و گمراہ کہا جائے گا۔ اس لئے اُسے مسیح و مہدی کہا گیا۔ دجّال کا تعلق اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ[1] سے تھا۔ اور مسیحؑ کو رفع آسمانی ہونا تھا۔ سو جو کچھ اللہ تعالےٰ نے چاہا تھا۔ اس کی تکمیل دو ہی زمانوں میں ہونی تھی۔ ایک آپؐ کا زمانہ اور ایک آخری مسیح و مہدی کا زمانہ یعنی ایک زمانے میں تو قرآن اور سچّی تعلیم نازل ہوئی۔ لیکن اس تعلیم پر فیج اعوج کے زمانہ نے پردہ ڈال دیا۔ جس پردہ کا اُٹھایا جانا مسیحؑ کے زمانہ میں مقدر تھا۔ جیسے کہ فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک تو موجودہ جماعت یعنی جماعتِ صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کیا اور ایک آنے والی جماعت کا جس کی شان میں لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[2] آیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے بشارت دی۔ کہ ضلالت کے وقت اللہ تعالےٰ اس دین کو ضائع نہ کرے گا۔ بلکہ آنے والے زمانہ میں خدا تعالےٰ حقائق قرآنیہ کو کھول دے گا۔ آثار میں ہے۔ کہ آنے والے مسیح کی ایک یہ فضیلت ہوگی۔ کہ وہ قرآنی فہم اور معارف کا صاحب ہوگا۔ اور صرف قرآن سے استنباط کر کے لوگوں کو اُن غلطیوں سے متنبّہ کرے گا۔ جو حقائق قرآن کی ناواقفیت سے لوگوں میں پیدا ہوگئی ہونگی۔

مماثلت سلسلہ مُوسویہ و محمّدیہ

قرآن شریف میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مثیلِ موسیٰؑ قرار دے کر فرمایا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا[3] (پ ۲۹) یعنی ہم نے ایک رسُول بھیجا۔ جیسے موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا تھا۔ ہمارا رسُول مثیلِ موسیٰؑ ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ[4] (پ)

[1] الاعراف : ۱۷۷ [2] الجمعۃ : ۴ [3] المزمّل : ۱۶ [4] النور : ۵۶

۲۱ کہ اس مثیل موسیٰؑ کے خلفاء بھی اُسی سلسلہ سے ہوں گے۔ جیسے کہ موسیٰؑ کے خلفاء سلسلہ وار آئے۔ اس سلسلہ کی میعاد چودہ سو برس تک رہی۔ برابر خلفاء آتے رہے۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ویسے ہی اس سلسلہ کا آغاز ہوگا۔ یعنی جس طرح موسیٰؑ نے ابتدا میں جلالی نشان دکھائے۔ اور قوم کو فرعون سے چھڑایا۔ اسی طرح آنیوالا نبی بھی موسیٰؑ کی طرح ہوگا۔ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۖ اِۨالسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۚ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا[1] (پ ۲۹) یعنی جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو بھیجا تھا۔ رسول اکرم صلعم کے وقت کفار عرب بھی فرعونیت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی فرعون کی طرح باز نہ آئے جبتک انہوں نے جلالی نشان نہ دیکھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کام موسیٰؑ کے کاموں کے سے تھے۔ اس موسیٰؑ کے کام قابلِ پذیرائی نہ تھے۔ لیکن قرآن شریف نے منوایا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں گو فرعون کے ہاتھ سے بنی اسرائیل کو نجات ملی۔ لیکن گناہوں سے نجات نہ پائی۔ وہ لڑے اور کج دل ہوئے۔ اور موسیٰ پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری پوری نجات قوم کو دی۔ رسول اکرم صلعم اگر طاقت، شوکت، سلطنت اسلام کو نہ دیتے۔ تو مسلمان مظلوم رہتے۔ اور کفار کے ہاتھ سے نجات نہ پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ نجات دی۔ کہ مستقل اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ گناہوں سے ان کو کامل نجات ملی۔ خدا تعالیٰ نے ہر دو نقشے کھینچے ہیں۔ کہ عرب پہلے کیا تھے اور پھر کیا ہوگئے۔ اگر ہر دو نقشے اکٹھے کئے جائیں تو ان کی پہلی حالت کا اندازہ لگ جائے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُنکو دونوں نجاتیں دیں۔ شیطان سے بھی نجات دی اور طاغوت سے بھی۔

آنحضرتؐ و مسیحؑ کا مقابلہ

جو صدق و صفا آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے دکھایا۔ اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ جان دینے تک سے دریغ نہ کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے لئے کوئی مشکل کام نہ

[1] المزمّل: ۱۸، ۱۹

نہ تھا اور نہ ہی کوئی منکر الہام تھا۔ برادری کے چند لوگوں کو سمجھانا کونسا بڑا کام ہے۔ یہودی توریت تو پڑھے ہی ہوئے تھے۔ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ خدا کو وحدہٗ لاشریک جانتے ہی تھے۔ بعض وقت یہ خیال آجاتا ہے کہ حضرت مسیح کیا کرنے آئے تھے۔ یہودیوں میں تو توریت کے لئے اب بھی غیرت پائی جاتی ہے۔ نہایت کار یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید اخلاقی نقص یہود میں تھے۔ لیکن تعلیم تو توریت میں موجود ہی تھی۔ باوجود اس سہولت کے کہ قوم اس کتاب کو مانتی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے وہ کتاب سبقاً سبقاً ایک اُستاد سے پڑھی تھی اس کے مقابل ہمارے سید و مولیٰ ہادیٔ کامل اُمّیؐ تھے۔ آپ کا کوئی اُستاد بھی نہ تھا اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ مخالف بھی اس امر سے انکار نہ کر سکے۔ پس حضرت عیسیٰؑ کے لئے دو آسانیاں تھیں۔ ایک تو برادری کے لوگ تھے۔ اور جو بھاری بات اُن سے منوانی تھی۔ وہ پہلے ہی مان چکے تھے۔ ہاں کچھ اخلاقی نقص تھے۔ لیکن باوجود اتنی سہولت کے حواری بھی درست نہ ہوئے۔ لالچی رہے۔ حضرت عیسیٰؑ اپنے پاس روپیہ رکھتے تھے بعض حواری چوریاں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ وُہ (حضرت مسیحؑ) کہتے ہیں۔ کہ مجھے سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ ایسا کہنے کے کیا معنے ہیں۔ جب گھر بھی ہو۔ مکان بھی ہو اور مال میں گنجائش اس قدر کہ چوری کی جاوے تو پتہ بھی نہ لگے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ باوجود ان تمام سہولتوں کے کوئی اصلاح نہ ہو سکی۔ پطرس کو بہشت کی کُنجیاں تو مل جاویں۔ لیکن وہ اپنے اُستاد کو لعنت دینے سے نہ رُک سکے۔

اب اس کے مقابلہ میں انصافاً دیکھا جاوے کہ ہمارے ہادیٔ اکملؐ کے صحابہؓ نے اپنے خُدا اور رسُول کے لئے کیا کیا جان نثاریاں کیں۔ جلاوطن ہوئے۔ ظلم اُٹھائے۔ طرح طرح کے مصائب برداشت کئے۔ جانیں دیں۔ لیکن صدق و وفا کے ساتھ قدم مارتے ہی گئے۔ پس وہ کیا بات تھی کہ جس نے انہیں ایسا جاں نثار بنا دیا۔ وُہ سچی الٰہی محبت کا جوش تھا جس کی شعاع اُن کے دل میں پڑ چکی تھی۔ اس لئے خواہ کسی نبی کے ساتھ

مقابلہ کر لیا جاوے۔ آپؐ کی تعلیم، تزکیہ نفس، اپنے پیروؤں کو دُنیا سے متنفر کرا دینا، شجاعت کے ساتھ صداقت کے لئے خُون بہا دینا، اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے گی۔ یہ مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا ہے۔ اور اُن میں جو باہمی اُلفت و محبت تھی۔ اس کا نقشہ دو فقروں میں بیان فرمایا ہے۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ[1] (پ۱۰) یعنی جو تالیف اُن میں ہے وُہ ہرگز پیدا نہ ہوتی، خواہ سونے کا پہاڑ بھی دیا جاتا۔ اَب ایک اَور جماعت مسیح موعودؑ کی ہے۔ جس نے اپنے اندر صحابہؓ کا رنگ پیدا کرنا ہے۔ صحابہؓ کی تو وُہ پاک جماعت تھی جس کی تعریف میں قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ کیا آپ لوگ ایسے ہیں؟ جب خدا کہتا ہے کہ حضرت مسیح کے ساتھ وُہ لوگ ہوں گے۔ جو صحابہؓ کے دوش بدوش ہوں گے۔ صحابہؓ تو وُہ تھے۔ جنہوں نے اپنا مال، اپنا وطن راہِ حق میں دے دیا۔ اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اکثر سُنا ہوگا۔ ایک دفعہ جب راہِ خدا میں مال دینے کا حکم ہوا تو گھر کا کل اثاثہ لے آئے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دریافت کیا کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے۔ تو فرمایا کہ خدا اور رسُول کو گھر میں چھوڑ آیا ہوں۔ رئیس مکہ ہو اور کمبل پوش۔ غربا کا لباس پہنے۔ یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ تو خدا کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ان کے لئے تو یہی لکھا ہے کہ سیفوں (تلواروں) کے نیچے بہشت ہے۔ لیکن ہمارے لئے تو اتنی سختی نہیں۔ کیونکہ يَضَعُ الْحَرْبَ ہمارے لئے آیا ہے۔ یعنی مہدی کے وقت لڑائی نہیں ہو گی۔

اسلامی جنگیں

اللہ تعالیٰ بعض مصالح کے رُو سے ایک فعل کرتا ہے اور آئندہ جب وہ فعل معرضِ اعتراض ٹھہرتا ہے تو پھر وہ فعل نہیں کرتا۔ اوّلاً ہمارے رسُول اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے کوئی تلوار نہ اُٹھائی۔ مگر اُن کو سخت سے سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ تیرہ[13] سال کا عرصہ ایک بچّے کو بالغ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور حضرت مسیحؑ کی میعاد تو اگر اس میعاد

[1] الانفال: ۶۴

میں سے دس نکال دیں تو پھر بھی کافی ہوتی ہے۔ غرض اس لمبے عرصہ میں کوئی یا کسی رنگ کی تکلیف نہ تھی جو اٹھانی نہ پڑی ہو۔ آخر کار وطن سے نکلے تو تعاقب ہوا۔ دوسری جگہ پناہ لی تو دشمن نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ جب یہ حالت ہوئی تو مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے حکم ہوا۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۨ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ[1] (پ۱۷) کہ جن لوگوں کے ساتھ لڑائیاں خواہ مخواہ کی گئیں اور گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ سو یہ ضرورت تھی جو تلوار اٹھائی گئی ورنہ آنحضرت کبھی تلوار نہ اُٹھاتے۔ ہاں ہمارے زمانہ میں ہمارے برخلاف قلم اُٹھائی گئی ہے قلم سے ہم کو اذیت دی گئی اور سخت ستایا گیا۔ اس لئے اس کے مقابل پر قلم ہی ہمارا حربہ ہے۔

جسقدر کوئی قُرب حاصل کرتا ہے اسی قدر مؤاخذہ کے قابل ہے

میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ جس قدر کوئی شخص قُرب حاصل کرتا ہے۔ اسی قدر مؤاخذہ کے قابل ہے۔ اہلبیت زیادہ مؤاخذہ کے لائق تھے۔ وہ لوگ جو دُور ہیں۔ وہ قابل مؤاخذہ نہیں لیکن تم ضرور ہو۔ اگر تم میں اُن پر کوئی ایمانی زیادتی نہیں۔ تو تم میں اور اُن میں کیا فرق ہوا۔ تم ہزاروں کے زیر نظر ہو۔ وہ لوگ گورنمنٹ کے جاسُوسوں کی طرح تمہاری حرکات و سکنات کو دیکھ رہے ہیں۔ وُہ سچے ہیں۔ جب مسیحؑ کے ساتھی صحابہؓ کے ہمدوش ہونے لگے ہیں۔ تو کیا آپ ویسے ہیں۔ جب آپ لوگ ویسے نہیں۔ تو قابل گرفت ہیں۔ گو یہ ابتدائی حالت ہے لیکن موت کا کیا اعتبار ہے۔ مُوت ایک ایسا ناگزیر امر ہے جو ہر ایک شخص کو پیش آتا ہے۔ جب یہ حالت ہے۔ تو پھر آپ کیوں غافل ہیں۔ جب کوئی شخص مجھ سے تعلق نہیں رکھتا۔ تو یہ امر دُوسرا ہے۔ لیکن جب آپ میرے پاس آئے۔ میرا دعویٰ قبول کیا اور مجھے مسیح مانا۔ تو گویا من وجہ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمدوش ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ تو کیا صحابہؓ نے کبھی صدق و وفا پر قدم مارنے سے دریغ کیا۔ اُن میں کوئی کسل تھا۔ کیا وہ دل آزار تھے۔

[1] الحج: ۴۰، ۴۱

کیا اُن کو اپنے جذبات پر قابُو نہ تھا؟ کیا وہ منکسر المزاج نہ تھے۔ بلکہ ان میں پرلے درجہ کا انکسار تھا۔ سو دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھی ویسی ہی توفیق عطا کرے۔ کیونکہ تذلّل اور انکساری کی زندگی کوئی شخص اختیار نہیں کر سکتا۔ جبتک کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہ کرے اپنے آپ کو ٹٹولو اور اگر بچّہ کی طرح اپنے آپ کو کمزور پاؤ۔ تو گھبراؤ نہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ[1] کی دعا صحابہ کی طرح جاری رکھو:۔

راتوں کو اُٹھو اور دُعا کرو

راتوں کو اُٹھو اور دُعا کرو۔ کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی راہ دکھلائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ نے بھی تدریجاً تربیت پائی۔ وہ پہلے کیا تھے۔ ایک کسان کی تخم ریزی کی طرح تھے۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آبپاشی کی۔ آپ نے اُن کے لئے دُعائیں کیں۔ بیج صحیح تھا۔ اور زمین عمدہ تو اس آبپاشی سے پھل عمدہ نکلا۔ جس طرح حضور علیہ السّلام چلتے۔ اسی طرح وہ چلتے۔ وہ دن کا یا رات کا انتظار نہ کرتے تھے۔ تم لوگ سچے دل سے توبہ کرو۔ تہجد میں اُٹھو، دُعا کرو، دل کو درست کرو۔ کمزوریوں کو چھوڑ دو۔ اور خُدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق اپنے قول وفعل کو بناؤ۔ یقین رکھو کہ جو اس نصیحت کو وِرد بنائے گا اور عملی طور سے دُعا کرے گا۔ اور عملی طور پر التجاء خدا کے سامنے لائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر فضل کرے گا۔ اور اس کے دل میں تبدیلی ہو گی۔ خدا تعالیٰ سے نا امیّد مت ہو۔ ع　　　بر کریماں کارہا دشوار نیست۔

اِنسان نے وَلی بننا ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو کیا کوئی ولی بننا ہے؟ افسوس انہوں نے کچھ قدر نہ کی بیشک اِنسان نے (خدا کا) ولی بننا ہے۔ اگر وہ صراط مستقیم پر چلے گا۔ تو خُدا بھی اس کی طرف چلے گا۔ اور پھر ایک جگہ پر اس کی ملاقات ہو گی۔ اُس کی اُس طرف حرکت خواہ آہستہ ہو گی۔ لیکن اُس کے مقابل خدا تعالیٰ کی حرکت بہت جلد ہو گی۔ چنانچہ یہ آیت اِسی

[1] الفاتحہ : ٦

طرف اشارہ کرتی ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ[1] الخ (پ۲۱)۔ سو جو جو
باتیں مَیں نے آج وصیت کی ہیں۔ اِن کو یاد رکھو کہ ان ہی پر مدارِ نجات ہے۔ تمہارے
معاملات خدا اور خلق کے ساتھ ایسے ہونے چاہئیں۔ جن میں رضا الٰہی مطلق ہی ہو پس
اس سے تم نے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[2] الخ کے مصداق بننا ہے۔

اِسْرائیلی اور اسمٰعیلی دو سلسلے

ہاں جیسا کہ آگے بیان ہو چکا ہے۔ خدا کی حکمتِ بالغہ نے یہی پسند کیا کہ اسرائیلی
اور اسماعیلی دو سلسلے دُنیا میں قائم کرے۔ پہلا سلسلہ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہو کر
حضرت مسیحؑ تک ختم ہوا۔ اور یہ چودہ[۱۴] سو برس تک رہا۔ اسی طرح حضرت رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلّم سے لے کر آج چودہ سو برس پر ایک مسیحؑ کے آنے کا اشارہ ہے۔ عدد چودہ[۱۴] کو خاص
نسبت ایک یہ بھی ہے کہ انسان چودہ[۱۴] برس پر بلوغ پا لیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو خبر ملی تھی۔
کہ مسیحؑ اُس وقت آئیگا۔ جب یہودیوں میں بہت فرقے ہوں گے۔ اُن کے عقائد میں
سخت اختلاف ہوگا۔ بعض کو فرشتوں کے وجود سے انکار۔ بعض کو قیامت وحشرِ اجساد
سے انکار، غرض جب طرح طرح کی عملی بداعتقادی پھیل جائے گی۔ تب بطور حَکَم کے
مسیحؑ اُن میں آویگا۔ اسی طرح ہمارے ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو اطلاع
دی کہ جب تم میں بھی یہودیوں کی طرح کثرت سے فرقے ہو جاویں گے اور اُن کی طرح
مختلف قسم کی بداعتقادیاں اور بدعملیاں شروع ہوں گی۔ علماء یہود کی طرح بعض
بعض کے مکفّر ہوں گے۔ اُس وقت اِس اُمّتِ مرحومہ کا مسیحؑ بھی بطور حَکَم کے آئے گا۔
جو قرآن شریف سے ہر اَمر کا فیصلہ کرے گا۔ وُہ مسیحؑ کی طرح قوم کے ہاتھ سے ستایا
جائے گا۔ اور کافر قرار دیا جائے گا۔ اگر ان لوگوں نے کم سمجھی سے اس شخص کو دجّال
اور کافر کہا۔ تو ضرور تھا کہ ایسا ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں آچکا تھا کہ آنے والا مسیح کافر
اور دجّال ٹھیرایا جائے گا۔ لیکن جو عقیدہ آپ کو سکھلایا جاتا ہے۔ وُہ بالکل صاف اور

[1] العنکبوت: ۷۰ [2] الجمعۃ: ۴

اُجلا ہے۔ اور محتاج دلائل بھی نہیں۔ بُرہانِ قاطع اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

وفاتِ مسیحؑ

پہلا جھگڑا وفاتِ مسیحؑ کا ہی ہے۔ کھُلی کھُلی آیات اس کی حمایت میں ہیں۔ یَاعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (پ ۳)[1] پھر فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ (پ ۷)[2] یہ عذر بالکل جھُوٹا ہے۔ کہ تَوَفِّیْ کے معنے کچھ اور ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور خود ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے معنی اِمَاتت کے کر دیئے ہیں۔ یہ لوگ بھی جہاں کہیں لفظ توفی استعمال کرتے ہیں۔ تو معنی اِماتت اور قبض روح کے مُراد لیتے ہیں۔ قرآن شریف نے بھی ہر ایک جگہ اس لفظ کے یہی معنے بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس پر تو ہاتھ کہیں نہ پڑا۔ اور جب مسیح ناصریؑ کی وفات ثابت ہے۔ تو ضرور ہے کہ آنیوالا اسی اُمّت میں سے کوئی ہو۔ جیسے کہ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ (الحدیث) اس کی تصریح کرتا ہے۔ وہ لوگ جو نیچری ہیں۔ اُن کی خوش قسمتی ہے۔ کہ وہ اس ابتلا سے بچ گئے۔ کیونکہ وَفَاتِ مَسِیْح کے تو وہ قائل ہی ہیں۔ اور مسیح موعود کا ذکر اس قدر تواتر رکھتا ہے۔ کہ جس تواتر سے اِنکار محال ہے۔ علاوہ ازیں قرآنی اشارات بھی آنیوالے کے شاہد ہیں۔ اس لئے ایک عقلمند اس امر سے اِنکار نہیں کر سکتا کہ مسیح آئے گا۔

مسیح کو اس زمانہ سے کیا خصوصیت ہے؟

ہاں بعض کا حق ہے کہ یہ اعتراض کریں کہ مسیح کو اس زمانہ سے کیا خصوصیّت ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ قرآن شریف نے اسرائیلی اور اسماعیلی دو سلسلوں میں خلافت کی مماثلت کا کھُلا کھُلا اشارہ کیا ہے۔ جیسے اس آیت سے ظاہر ہے۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ الآیہ (پ ۱۸)[3] اسرائیلی سِلسِلہ کا آخری خلیفہ جو چودھویں صدی

[1] آل عمران: ۵۶ [2] المائدۃ: ۱۱۸ [3] النور: ۵۶

پر بعد حضرت موسیٰؑ آیا۔ وُہ مسیح ناصریؑ تھا۔ مقابل میں ضرور تھا۔ کہ اس امت کا مسیح بھی چودھویں صدی کے سر پر آوے۔ علاوہ ازیں اہل کشف نے اسی صدی کو بعثت مسیح کا زمانہ قرار دیا۔ جیسے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ اہلحدیث کا اتفاق ہو چکا ہے۔ کہ علاماتِ صغریٰ کل اور علامات کبریٰ ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں۔ لیکن اس میں کسی قدر ان کی غلطی ہے۔ . . . . . . علامات کل پوری ہو چکی ہیں۔ بڑی علامت یا نشان جو آنے والے کا ہے وہ بخاری شریف میں یکسر الصلیب ویقتل الخنزیر الخ لکھا ہے۔ یعنی نزول مسیح کا وقت غلبۂ نصاریٰ اور صلیبی پرستش کا زور ہے۔ سو کیا یہ وُہ وقت نہیں۔ کیا جو کچھ پادریوں سے نقصان اسلام کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی نظیر آدم سے لے کر آجتک کہیں ہے۔ ہر ملک میں تفرقہ پڑ گیا۔ کوئی ایسا خاندان اسلامی نہیں۔ کہ جس میں سے ایک آدھ آدمی اُن کے ہاتھ میں نہ چلا گیا ہو۔ سو آنے والے کا وقت صلیب پرستی کا غلبہ ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا غلبہ ہوگا۔ کہ کس طرح درندوں کی طرح اسلام پر کینہ وری سے حملے کئے گئے۔ کیا کوئی گروہ مخالفین کا ہے۔ کہ جس نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو نہایت وحشیانہ الفاظ اور گالیوں سے یاد نہیں کیا؟ اب اگر آنے والا کا یہ وقت نہیں تو بہت جلدی وہ آیا بھی تو سَو سال تک آئیگا۔ کیونکہ وہ وقت کا مجدّد ہے جس کی بعثت کا زمانہ صدی کا سر ہوتا ہے۔ تو کیا اسلام میں موجودہ وقت میں اس قدر اَور طاقت ہے کہ ایک صدی تک پادریوں کے روزافزوں غلبہ کا مقابلہ کر سکے۔ غلبہ حد تک پہنچ گیا۔ اور آنے والا آگیا۔ ہاں اب وہ دجّال کو اتمام حجت سے ہلاک کرے گا۔ کیونکہ حدیثوں میں آچکا ہے کہ اُس کے ہاتھ پر ملتوں کی ہلاکت مقدر ہے نہ لوگوں کی یا اہل ملل کی۔ تو ویسا ہی پورا ہوا +

کسوف وخسوف

آنے والے کا ایک یہ نشان بھی ہے۔ کہ اس زمانہ میں ماہ رمضان میں کسوف و

خسوف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے نشان سے ٹھٹھا کرنے والے خدا سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ ۷۱
کسوف وخسوف کا اس کے دعویٰ کے بعد ہونا یہ ایک ایسا امر تھا۔ جو افترا اور بناوٹ سے بعید تر ہے۔ اس سے پہلے کوئی کسوف وخسوف ایسا نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسا نشان تھا۔ کہ جس سے اللہ تعالیٰ کو کُل دُنیا میں آنے والے کی مُنادی کرنی تھی۔ چنانچہ اہل عرب نے بھی اس نشان کو دیکھ کر اپنے مذاق کے مطابق درست کہا۔ ہمارے اشتہارات بطور منادی جہاں جہاں نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہاں وہاں اس کسوف وخسوف نے آنے والے کے وقت کی منادی کردی۔ یہ خدا کا نشان تھا۔ جو انسانی منصوبوں سے بالکل پاک تھا۔ خواہ کوئی کیسا ہی فلسفی ہو وہ غور کرے اور سوچے کہ جب مقرر کردہ نشان پُورا ہو گیا۔ تو ضرور ہے کہ اس کا مصداق بھی کہیں ہو۔ یہ امر ایسا نہ تھا۔ کہ جو کسی حساب کے ماتحت ہو۔ جیسے کہ فرمایا تھا کہ یہ اس وقت ہوگا۔ جب کوئی مدعی مہدویت ہو چکے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ آدمؑ سے لیکر اُس مہدی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ اگر کوئی شخص تاریخ سے ایسا ثابت کرے تو ہم مان لیں گے۔

دُمدار تارے کا نکلنا

ایک اَور نشان یہ بھی تھا۔ کہ اُس وقت ستارہ ذوالسنین طلوع کرے گا یعنی اُن برسوں کا ستارہ جو پہلے گزر چکے ہیں۔ یعنی وہ ستارہ جو مسیح ناصری کے ایام (برسوں) میں طلوع ہوا تھا۔ اب وہ ستارہ بھی طلوع ہو گیا۔ جس نے یہودیوں کے مسیح کی اطلاع آسمانی طور سے دی تھی۔ اسی طرح قرآن شریف کے دیکھنے سے بھی پتہ لگتا ہے۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۔ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ۔ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ[1] (پ ۳۰)۔ یعنی اس زمانہ میں اونٹنیاں بیکار ہو جاویں گی۔ اعلیٰ درجہ کی سواری اور باربرداری جن سے ایام سابقہ میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی اُس

[1] التکویر: ۵ تا ۱۱

زمانہ میں سواری کا انتظام کوئی ایسا عمدہ ہوگا کہ یہ سواریاں بیکار ہوجائیں گی ۔ اس سے ریل کا زمانہ مُراد تھا۔ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ اِن آیات کا تعلق قیامت سے ہے وُہ نہیں سوچتے کہ قیامت میں اونٹنیاں حمل دار کیسے رہ سکتی ہیں۔ کیونکہ عشار سے مراد حمل دار اُونٹنیاں ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ اس زمانہ میں چاروں طرف نہریں نکالی جائیں گی۔ اور کتابیں کثرت سے اشاعت پائیں گی۔ غرضیکہ یہ سب نشان اسی زمانہ کے متعلق تھے۔

مسیح موعود کی جائے ظہور

اب رہا مکان کے متعلق۔ سو یاد رہے کہ دجّال کا خروج مشرق میں بتایا گیا ہے۔ جس سے ہمارا ملک مُراد ہے چنانچہ صاحب حج الکرامہ نے لکھا ہے کہ فتن دجّال کا ظہور ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ظہورِ مسیح اُسی جگہ ہو۔ جہاں دجّال ہو۔ پھر اس گاؤں کا نام قدعہ قرار دیا ہے۔ جو قادیان کا مخفف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یمن کے علاقہ میں بھی اس نام کا کوئی گاؤں ہو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یمن حجاز سے مشرق میں نہیں بلکہ جنوب میں ہے۔ آخر اسی پنجاب میں ایک اَور قادیاں بھی تو لدھیانہ کے قریب ہے۔

اس کے علاوہ خود قضاء و قدر نے اس عاجز کا نام جو رکھوایا ہے تو وُہ بھی ایک لطیف اِشارہ اِس طرف رکھتا ہے۔ کیونکہ غلام احمد قادیانی (۱۳۰۰) کے عدد بحساب جمل پُورے تیرہ سَو (۱۳۰۰) نکلتے ہیں۔ یعنی اِس نام کا اِمام چودھویں صدی کے آغاز پر ہوگا۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا اشارہ اسی طرف تھا۔

حوادث سماوی وارضی

حوادث بھی ایک علامت تھی۔ حوادث سماوی نے قحط، طاعون اور ہیضہ کی صورت پکڑلی۔ طاعون وہ خطرناک عذاب ہے کہ اُس نے گورنمنٹ تک کو زلزلہ میں ڈال

دیا۔ اور اگر اس کا قدم بڑھ گیا۔ تو ملک صاف ہو جائے گا۔ ارضی حوادث لڑائیاں، زلازل تھے۔ جنہوں نے ملک کو تباہ کیا۔ مامور من اللہ کے لئے یہ بھی ضرور ہے۔ کہ وہ اپنے ثبوت میں آسمانی نشان دکھاوے۔ ایک لیکھرام کا نشان کیا کچھ کم نشان تھا۔ ایک کُشتی کے طور پر کئی سال تک ایک شرط بدھی رہی۔ پانچ سال تک برابر جنگ ہوتا رہا۔ طرفین نے اشتہار دیئے۔ عام شہرت ہو گئی۔ ایسی شہرت کہ جس کی مثال بھی محال ہے۔ پھر ایسا ہی واقعہ ہوا جیسے کہ کہا گیا تھا۔ کیا اس واقعہ کی کوئی اَور نظیر ہے؟ دھرم مہوتسو کے متعلق بھی کئی دن پہلے اعلان کیا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ ہمارا مضمون سب پر غالب رہے گا۔ جن لوگوں نے اس عظیم الشان اور پُر رعب جلسہ کو دیکھا ہے۔ وہ خود غور کر سکتے ہیں کہ ایسے جلسہ میں غلبہ پانے کی خبر پیش از وقت دینی کوئی اٹکل یا قیاس نہ تھا۔ پھر آخر وہی ہوا جیسے کہا گیا۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی صفحہ ۱۳۲-۱۴۱)

حضرت اقدسؑ کی دوسری تقریر

۲۸ر دسمبر ۱۸۹۷ء بعد نماز ظہر۔

ایک کشف

اس وقت میری غرض بیان کرنے سے یہ ہے کہ چونکہ انسانی زندگی کا کچھ بھی اعتبار نہیں۔ اس لئے جس قدر احباب اس وقت میرے پاس جمع ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں شاید آئندہ سال جمع نہ ہو سکیں۔ اور انہیں دنوں میں میں نے ایک کشف میں دیکھا ہے۔ کہ اگلے سال بعض احباب دُنیا میں نہ ہوں گے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کشف کے مصداق کون کون احباب ہوں گے۔

ہر ایک شخص سفرِ آخرت کی تیاری رکھے

اور میں جانتا ہوں کہ یہ اس لئے ہے۔ تا ہر ایک شخص بجائے خود سفرِ آخرت کی تیاری رکھے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے مجھے کسی کا نام نہیں بتلایا گیا۔ لیکن میں یہ اللہ تعالیٰ کے اعلام سے خوب جانتا ہوں کہ قضاؤ قدر کا ایک وقت ہے۔ اور ضرور ایک وقت اس فانی دُنیا کو چھوڑنا ہے۔ اس لئے یہ کہنا نہایت ضروری ہے۔ کہ ہر شخص اور ہر دوست جو اس وقت موجود ہے۔ وُہ میری باتوں کو قِصّہ گو کی داستان کی طرح نہ سمجھے۔ بلکہ یہ ایک واعظ مِن جانبِ اللہ اور مامُور من اللہ ہے۔ جو نہایت خیر خواہی اور سچّی بھلائی اور پُوری دِلسوزی سے باتیں کرتا ہے ؏

ہستی باریتعالےٰ

پس میں اپنے دوستوں کو اطلاع دیتا ہوں کہ خوب یاد رکھو اور دل سے سُنو اور دل میں جگہ دو۔ کہ اللہ تعالیٰ جیسا کہ اُس نے اپنی کتاب قرآن کریم میں اپنے وجُود اور توحید کو پُرزور اور آسان دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ایک برتر ہستی اور نُور ہے۔ وہ لوگ جو اس زبردست ہستی کی قدرتوں اور عجائبات کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے وجود میں شکوک ظاہر کرتے اور شُبہ کرتے ہیں۔ سچ جانو۔ بڑے ہی بد قسمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی زبردست ہستی اور مقتدر وجُود کے اثبات کے متعلق ہی فرمایا ہے۔ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1]۔ کیا اللہ کے وجود میں بھی شک ہو سکتا ہے۔ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے؟ دیکھو یہ تو بڑی سیدھی اور صاف بات ہے کہ ایک مصنوع کو دیکھ کر صانع کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک عمدہ جُوتے یا صندوق کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی ضرورت کا معًا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ پھر تعجب پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی میں کیونکر انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ایسے صانع کے وجُود کا کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔ جس کے ہزارہا عجائبات سے زمین و آسمان پُر ہیں۔

[1] ابراھیم: ۱۱

پس یقیناً سمجھ لو۔ کہ قدرت کے ان عجائبات اور صنعتوں کو دیکھ کر بھی جن میں انسانی ہاتھ، انسانی عقل و دماغ کا کام نہیں۔ اگر کوئی بیوقوف خدا کی ہستی اور وجود میں شک لائے۔ تو وہ بدقسمت انسان شیطان کے پنجہ میں گرفتار ہے اور اس کو استغفار کرنا چاہیئے۔ خدا کی ہستی کا انکار دلیل اور رویت کی بنا پر نہیں۔ بلکہ اللہ جلشانہٗ کی ہستی کا انکار کرنا باوجود مشاہدہ کرنے اس کی قدرتوں اور عجائبات مخلوقات اور مصنوعات کے جو زمین و آسمان میں بھرے پڑے ہیں۔ بڑی ہی نابینائی ہے۔

نابینائی کی دو قسمیں

نابینائی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آنکھوں کی نابینائی ہے۔ اور دوسری دل کی، آنکھوں کی نابینائی کا اثر ایمان پر کچھ نہیں ہوتا۔ مگر دل کی نابینائی کا اثر ایمان پر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری اور بہت ضروری ہے کہ ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے پورے تذلل اور انکسار کے ساتھ ہر وقت دعا مانگتا رہے۔ کہ وہ اُسے سچی معرفت اور حقیقی بصیرت اور بینائی عطا کرے اور شیطان کے وساوس سے محفوظ رکھے۔

سب سے زیادہ خطرناک وسوسہ آخرت کے متعلق ہے

شیطان کے وساوس بہت ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک وسوسہ اور شبہ جو انسانی دل میں پیدا ہو کر اُسے خسر الدنیا والآخرۃ کر دیتا ہے۔ آخرت کے متعلق ہے۔ کیونکہ تمام نیکیوں اور راستبازیوں کا بڑا بھاری ذریعہ منجملہ دیگر اسباب اور وسائل کے آخرت پر ایمان بھی ہے۔ اور جب انسان آخرت اور اس کی باتوں کو قصہ اور داستان سمجھے تو سمجھ لو کہ وہ رد ہو گیا۔ اور دونوں جہانوں سے گیا گزرا ہوا۔

ایمان بالآخرۃ کا فائدہ

اس لئے کہ آخرت کا ڈر بھی تو انسان کو خائف اور ترساں بنا کر معرفت کے سچے چشمہ کی طرف کشاں کشاں لے آتا ہے اور سچی معرفت بغیر حقیقی خشیت اور خدا ترسی

کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس یاد رکھو کہ آخرت کے متعلق وساوس کا پیدا ہونا ایمان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور خاتمہ بالخیر میں فتور پڑجاتا ہے۔ جس قدر ابرار۔ اخیار اور راستباز انسان دُنیا میں ہو گزرے ہیں۔ جو رات کو اُٹھ کر قیام اور سجدہ میں ہی صبح کر دیتے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ وہ جسمانی قوتیں بہت رکھتے تھے۔ اور بڑے بڑے قوی ہیکل جوان اور تنومند پہلوان تھے؟ نہیں۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ جسمانی قوت اور توانائی سے وہ کام ہرگز نہیں ہو سکتے۔ جو رُوحانی قوت اور طاقت کر سکتی ہے۔ بہت سے انسان آپ نے دیکھے ہوں گے۔ جو تین یا چار بار دن میں کھاتے ہیں۔ اور خوب لذیذ اور مقوی اغذیہ پلاؤ وغیرہ کھاتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ صبح تک خراٹے مارتے رہتے ہیں اور نیند اُن پر غالب رہتی ہے۔ یہانتک کہ نیند اور سستی سے بالکل مغلوب ہو جاتے ہیں۔ کہ اُن کو عشاء کی نماز بھی دوبھر اور مشکل عظیم معلوم دیتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ تہجد گزار ہوں ⁂

صحابہؓ کے طریق زندگی کا نقشہ قرآن کریم میں

دیکھو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کیا تنعم پسند اور خورد و نوش کے دلدادہ تھے۔ جو کفار پر غالب تھے؟ نہیں یہ بات تو نہیں۔ پہلی کتابوں میں بھی اُن کی نسبت آیا ہے کہ وہ قائم اللیل اور صائم الدہر ہوں گے اُن کی راتیں ذکر اور فکر میں گزرتی تھیں۔ اور اُن کی زندگی کیسے بسر ہوتی تھی؟ قرآن کریم کی ذیل کی آیۂ شریفہ اُن کے طریق زندگی کا پُورا نقشہ کھینچکر دکھاتی ہے۔ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ[1]۔ اور يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ الآیہ[2] اور سرحد پر اپنے گھوڑے باندھے رکھو کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن اس تمہاری تیاری اور استعداد سے ڈرتے رہیں۔ اَے مومنو! صبر اور مصابرت اور مرابطت کرو ⁂

[1] الانفال: ۶۱ [2] آل عمران: ۲۰۱

رِباط کے معنی

رِبَاط اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحابہؓ کو اعداء کے مقابلہ کے لئے مستعد رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اس رِبَاط کے لفظ سے انہیں پُوری اور سچّی تیاری کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اُن کے سپرد دو کام تھے ایک ظاہری دشمنوں کا مقابلہ اور دوسرا رُوحانی مقابلہ۔ اور رِبَاط لُغت میں نفس اور انسانی دل کو بھی کہتے ہیں۔ اور یہ ایک لطیف بات ہے کہ گھوڑے وہی کام کرتے ہیں۔ جو سدھائے ہوئے اور تعلیمیافتہ ہوں۔ آجکل گھوڑوں کی تعلیم و تربیّت کا اسی انداز پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور اُسی طرح اُن کو سِدھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ جس طرح بچّوں کو سکولوں میں خاص احتیاط اور اہتمام سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر اُن کو تعلیم نہ دی جائے۔ اور وہ سدھائے نہ جائیں تو وہ بالکل نکمّے ہوں۔ اور بجائے مفید ہونے کے خوفناک اور مُضر ثابت ہوں۔

یہ اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ انسانوں کے نفوس یعنی رِبَاط بھی تعلیمیافتہ ہونے چاہئیں اور اُن کے قویٰ اور طاقتیں ایسی ہونی چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کی حدود کے نیچے نیچے چلیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو۔ تو وہ اس حرب اور جدال کا کام نہ دے سکیں گے جو انسان اور اس کے خوفناک دشمن یعنی شیطان کے درمیان اندرونی طور پر ہر لحظہ اور ہر آن جاری ہے۔ جیسا کہ لڑائی اور میدانِ جنگ میں علاوہ قوائے بدنی کے تعلیمیافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس اندرونی حرب اور جہاد کے لئے نفوسِ انسانی کی تربیّت اور مناسب تعلیم مطلوب ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان اُس پر غالب آجائے گا۔ اور وہ بہت بُری طرح ذلیل اور رُسوا ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص توپ و تفنگ، اسلحہ حرب بندوق وغیرہ تو رکھتا ہو۔ لیکن اس کے استعمال اور چلانے سے ناواقف محض ہو۔ تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اور تیر و تفنگ

اور سامانِ حرب بھی ایک شخص رکھتا ہو اور اُن کا استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔ لیکن اس کے بازو میں طاقت نہ ہو تو بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ صرف طریق اور طرز استعمال کا سیکھ لینا بھی کار آمد اور مفید نہیں ہو سکتا۔ جبتک کہ ورزش اور مشق کر کے بازو میں توانائی اور قوت پیدا نہ کی جائے۔ اب اگر ایک شخص جو تلوار چلانا تو جانتا ہے۔ لیکن ورزش اور مشق نہیں رکھتا۔ تو میدانِ حرب میں جا کر جونہی تین چار دفعہ تلوار کو حرکت دے گا اور دو ایک ہاتھ مارے گا۔ اُس کے بازو نکمّے ہو جائیں گے۔ اور وُہ تھک کر بالکل بیکار ہو جائیگا۔ اور خود ہی آخر دشمن کا شکار ہو جائے گا

اعمال کی ضرورت

پس سمجھ لو اور خوب سمجھ لو کہ نِرا علم و فن اور خشک تعلیم بھی کچھ کام نہیں دے سکتی۔ جبتک کہ عمل اور مجاہدہ اور ریاضت نہ ہو۔ دیکھو۔ سرکار بھی فوجوں کو اِسی خیال سے بیکار نہیں رہنے دیتی۔ عین امن و آرام کے دنوں میں بھی مصنوعی جنگ برپا کر کے فوجوں کو بیکار نہیں بیٹھنے دیتی اور معمولی طور پر چاند ماری اور پریڈ وغیرہ تو ہر روز ہوتی ہی رہتی ہے ✦

جیسا ابھی مَیں نے بیان کیا کہ مَیدان کارِزار میں کامیاب ہونے کے لئے جہاں ایک طرف طریق استعمال اسلحہ وغیرہ کی تعلیم اور واقفیت کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف ورزش اور محل استعمال کی بھی بڑی بھاری ضرورت ہے۔ اور نیز حرب و ضرب تعلیمیافتہ گھوڑے چاہئیں یعنی ایسے گھوڑے جو توپوں اور بندوقوں کی آواز سے نہ ڈریں اور گرد و غبار سے پراگندہ ہو کر پیچھے نہ ہٹیں۔ بلکہ آگے ہی بڑھیں۔ اِسی طرح نفوسِ انسانی کامل ورزش اور پُوری ریاضت اور حقیقی تعلیم کے بغیر اعداءُ اللہ کے مقابل میدانِ کارزار میں کامیاب نہیں ہو سکتے ✦

✦ ✦ ✦

عربی زبان کی خوبی

لغت عرب بھی عجیب چیز ہے۔ رباط کا لفظ جو آیہ مذکورہ میں آیا ہے جہاں دنیاوی جنگ وجدل اور فنونِ جنگ کی فلاسفی پر مشتمل ہے۔ وہاں رُوحانی طور پر اندرونی جنگ اور مجاہدۂ نفس کی حقیقت اور خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے۔ اسی لئے عربی زبان اُمّ الالسنہ ہے۔ اس سے وُہ کام نکلتے ہیں جو دوسری زبان سے ممکن نہیں۔ اور انشاء اللہ یہ معارف نہایت وضاحت اور لطافت سے کتاب مننّ الرحمٰن کے ذریعہ سے ظاہر ہوں گے۔ جو مَیں نے آجکل عربی زبان کی فضیلت اور اُس کو اُمّ الالسنہ ثابت کرنے کے بارہ میں شروع کی ہے۔ معلوم ہو جائے گا کہ یوروپین لوگوں کی تحقیقاتیں بالکل نکمّی اور ادھوری ہیں۔ اور اُن کو بھی پتہ لگ جائے گا۔ کہ زبانوں کی گم گشتہ ماں بھی اس زمانہ ہی میں جہاں اَور گمشدہ دینی صداقتیں مل گئی ہیں۔ مل گئی ہے۔ اور وُہ عربی ہی ہے۔ الغرض عربی زبان کی لغت جسمانی سلسلہ میں رُوحانی سلسلہ بھی دکھلاتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جسمانی امور اور جسمانی باتیں خارجی طور پر ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اور ہم ان کی ماہیت نہایت سہولت اور آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ پس اُن پر قیاس کر کے رُوحانی سلسلہ اور رُوحانی امور کی فلاسفی سمجھ میں آنی مشکل نہیں ہوتی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور برکت ہے جو اُس نے اس تاریکی اور ضلالت کے زمانہ میں معرفت کا نُور آسمان سے اُتارا۔ تاکہ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھلائے۔ اور ایسا طریق اور پیرایہ ظاہر کیا۔ جو اب تک راز کے طور پر تھا۔ وہ کیا؟ یہی لغتِ عرب کی فلاسفی اور ماہیت سے استدلال۔ مبارک ہیں وُہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے فضل کی قدر کرتے اور اس کے لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئی تھیں

اَب دیکھو کہ یہی رباط کا لفظ جو اُن گھوڑوں پر بولا جاتا ہے۔ جو سرحد پر دشمنوں

سے حفاظت کے لئے باندھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ لفظ اُن نفسوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جو اس جنگ کی تیاری کے لئے تعلیمیافتہ ہوں۔ جو انسان کے اندر ہی شیطان سے ہر وقت جاری ہے۔ یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئی تھیں ایک قُوت وہ تھی جس کا استعمال صدر اول میں بطور مدافعت و انتقام کے ہوا۔ یعنی مشرکین عرب نے جب ستایا۔ اور تکلیفیں دیں۔ تو ایک ہزار نے ایک لاکھ کفار کا مقابلہ کر کے شجاعت کا جوہر دکھایا۔ اور ہر امتحان میں اس پاک قوت و شوکت کا ثبوت دیا۔ وہ زمانہ گزر گیا۔ اور رِباطِ کے لفظ میں جو فلاسفی ظاہری قوت جنگ اَور فنون جنگ کی مخفی تھی۔ وہ ظاہر ہو گئی۔

اس زمانہ میں جنگِ باطنی کے نمُونے دکھانے مطلُوب ہیں

اَب اِس زمانہ میں جس میں ہم ہیں۔ ظاہری جنگ کی مطلق ضرورت اور حاجت نہیں۔ بلکہ آخری دنوں میں جنگ باطنی کے نمونے دکھانے مطلُوب تھے۔ اور رُوحانی مقابلہ زیرِ نظر تھا۔ کیونکہ اس وقت باطنی ارتداد اور الحاد کی اشاعت کے لئے بڑے بڑے سامان اور اسلحہ بنائے گئے۔ اس لئے اُن کا مقابلہ بھی اسی قسم کے اسلحہ سے ضروری ہے۔ کیونکہ آجکل امن وامان کا زمانہ ہے اور ہم کو ہر طرح کی آسائش اور امن حاصل ہے۔ آزادی سے ہر آدمی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ اور احکام کی بجاآوری کر سکتا ہے۔ پھر اسلام جو امن کا سچا حامی ہے۔ بلکہ حقیقۃً امن اور سلم اور آشتی کا اشاعت کنندہ ہی اسلام ہے۔ کیونکر اس زمانۂ امن وآزادی میں اُس پہلے نمونہ کو دکھانا پسند کر سکتا تھا؟ پس آجکل وہی دوسرا نمونہ یعنی رُوحانی مجاہدہ مطلُوب ہے کیونکہ ع   کہ حلوا چو یکبار خوردند و بس

موجُودہ زمانہ میں جہاد

ایک اَور بات بھی ہے کہ اُس پہلے نمونہ کے دکھانے میں ایک اَور امر بھی ملحوظ

تھا۔ یعنی اس وقت اظہار شجاعت بھی مقصود تھا۔ جو اُس وقت کی دُنیا میں سب سے زیادہ محمود اور محبوب وصف سمجھی جاتی تھی۔ اور اس وقت تو حرب ایک فن ہو گیا ہے کہ دُور بیٹھے ہوئے بھی ایک آدمی توپ اور بندوق چلا سکتا ہے۔ مگر اُن دنوں میں سچا بہادر وُہ تھا۔ جو تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہوتا۔ مگر آجکل کا فنِ حرب تو بُزدلوں کا پَردہ پوش ہے۔ اب شجاعت کا کام نہیں۔ بلکہ جو شخص آلات حرب جدید اور نئی توپیں وغیرہ رکھتا اور چلا سکتا ہے۔ وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اُس حرب کا مدعا اور مقصد مومنوں کے مخفی مادۂ شجاعت کا اظہار تھا۔ اور خدا تعالیٰ نے جیسا چاہا۔ خوب طرح اُسے دُنیا پر ظاہر کیا۔ اَب اس کی حاجت نہیں رہی۔ اس لئے کہ اب جنگ نے فن اور مکیدۃ اور خدلیعۃ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور نئے نئے آلات حرب اور بیچدار فنون نے اس قیمتی اور قابل فخر جوہر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور جسمانی جنگوں کی اس لئے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوتِ اسلام کرنے والے کا جواب اُن دنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا۔ اس لئے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا۔ لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا۔ بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا ہے۔ کہ سَیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جائے۔ اور تحریر سے مقابلہ کر کے مخالفوں کو پست کیا جائے۔ اِس لئے اب کسی کو شایاں نہیں۔ کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔ ع۔ گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی ؂

اِس وقت قلم کی ضرورت ہے

اِس وقت جو ضرورت ہے۔ وُہ یقیناً سمجھ لو۔ سَیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے۔ ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کئے ہیں۔ اور مختلف سائنسوں اور مکائد کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے۔ اس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ میں قلمی اسلحہ

پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدانِ کارزار میں اُتروں اور اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھلاؤں۔ میں کب اِس میدان کے قابل ہو سکتا تھا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بے حد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اُس کے دین کی عزت ظاہر ہو۔ میں نے ایک وقت اُن اعتراضات اور حملات کو شمار کیا تھا۔ جو اسلام پر ہمارے مخالفین نے کئے ہیں۔ تو اُن کی تعداد میرے خیال اور اندازہ میں تین ہزار ہوئی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو تعداد اَور بھی بڑھ گئی ہو گی۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے۔ کہ اِسلام کی بنا ایسی کمزور باتوں پر ہے کہ اس پر تین ہزار اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ اعتراضات تو کوتاہ اندیشوں اور نادانوں کی نظر میں اعتراض ہیں۔ مگر مَیں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جہاں اِن اعتراضات کو شمار کیا۔ وہاں یہ بھی غور کیا ہے۔ کہ اِن اعتراضات کی تہ میں دراصل بہت ہی نادر صداقتیں موجود ہیں۔ جو عدم بصیرت کی وجہ سے معترضین کو دکھائی نہیں دیں۔ اور درحقیقت یہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ جہاں نابینا معترض آکر اٹکا ہے۔ وہیں حقائق و معارف کا مخفی خزانہ رکھا ہے۔

خُدا نے مجھے مبعُوث فرمایا ہے کہ مَیں قرآن مجید کے خزائن مدفُونہ کو دُنیا پر ظاہر کروں

اور خدا تعالےٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے کہ میں ان خزائن مدفونہ کو دُنیا پر ظاہر کروں۔ اور ناپاک اعتراضات کا کیچڑ جو اُن درخشاں جواہرات پر تھوپا گیا ہے۔ اس سے اُنکو پاک صاف کروں۔ خدا تعالیٰ کی غیرت اس وقت بڑی جوش میں ہے۔ کہ قرآن شریف کی عزت کو ہر ایک خبیث دشمن کے داغ اعتراض سے منزّہ و مقدس کرے ؏

الغرض ایسی صورت میں کہ مخالفین قلم سے ہم پر وار کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں۔

کس قدر بیوقوفی ہوگی۔ کہ ہم اُن سے لٹھم لٹھا ہونے کو تیار ہوجائیں۔ میں تمہیں کھول کر بتلاتا ہوں۔ کہ ایسی صورت میں اگر کوئی اسلام کا نام لے کر جنگ وجدال کا طریق جواب میں اختیار کرے۔ تو وہ اسلام کا بدنام کرنے والا ہوگا۔ اور اسلام کا کبھی ایسا منشا نہ تھا۔ کہ بے مطلب اور بلاضرورت تلوار اُٹھائی جائے۔ اب لڑائیوں کی اغراض جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ فن کی شکل میں آکر دینی نہیں رہیں۔ بلکہ دنیوی اغراض اُن کا موضوع ہوگیا ہے۔ پس کس قدر ظلم ہوگا کہ اعتراض کرنے والوں کو جواب دینے کی بجائے تلوار دکھائی جائے۔ اب زمانہ کے ساتھ حرب کا پہلو بدل گیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل اور دماغ سے کام لیں اور نفوس کا تزکیہ کریں۔ راستبازی اور تقویٰ سے خدا تعالےٰ سے امداد اور فتح چاہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک اٹل قانون اور مستحکم اصول ہے۔ اور اگر مسلمان صرف قیل وقال اور باتوں سے مقابلہ میں کامیابی اور فتح پانا چاہیں۔ تو یہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ لاف وگزاف اور لفظوں کو نہیں چاہتا وہ تو حقیقی تقویٰ کو چاہتا اور سچی طہارت کو پسند فرماتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ[1]

عقل سے بھی کام لینا چاہیئے

ہم کو عقل سے بھی کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ انسان عقل کی وجہ سے مکلّف ہے۔ کوئی آدمی بھی خلاف عقل باتوں کے ماننے پر مجبور نہیں ہوسکتا۔ قویٰ کی برداشت اور حوصلہ سے بڑھ کر کسی قسم کی شرعی تکلیف نہیں اُٹھوائی گئی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا[2]۔ اس آیت سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام ایسے نہیں جن کی بجا آوری کوئی کر ہی نہ سکے اور نہ شرائع واحکام خدا تعالےٰ نے دُنیا میں اس لئے نازل کئے کہ اپنی بڑی فصاحت وبلاغت اور ایجادی قانونی طاقت اور چیستان طرازی کا فخر انسان پر ظاہر کرے۔ اور یوں پہلے ہی سے اپنی جگہ ٹھان رکھا تھا۔ کہ کہاں

[1] النحل: ۱۲۹ [2] البقرۃ: ۲۸۷

بیہودہ ضعیف انسان ! اور کہاں کا ان حکموں پر عمل درآمد؟ خدا تعالیٰ اس سے برتر و پاک ہے۔ کہ ایسا لغو فعل کرے۔ ہاں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں کوئی آدمی شریعت کی تابعداری اور خدا کے حکموں کی بجا آوری کر ہی نہیں سکتا۔ نادان اتنا نہیں جانتے۔ کہ پھر خدا کو شریعت کے بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُن کے خیال اور اعتقاد میں گویا اللہ تعالےٰ نے (نعوذ باللہ) پہلے نبیوں پر شریعت نازل کر کے ایک عبث اور بیہودہ کام کیا۔ اصل میں خدا کی ذات پاک پر اِس قسم کی عیب تراشی کی ضرورت عیسائیوں کو اُسی کفارہ کے مسئلہ کی گھڑت کے لئے پیش آئی مجھے حیرت اور تعجب ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں نے اپنے ایک اختراعی مسئلہ کی بنیاد قائم کرنے کے لئے اس بات کی بھی پروا نہیں کی۔ کہ خدا کی ذات پر کس قسم کا گندہ حرف آتا ہے۔

قرآنی تعلیم کا ہر ایک حکم معلّل باغراض و مصالح ہے

ہاں ! یہ خوبی قرآنی تعلیم میں ہے۔ کہ اس کا ہر ایک حکم معلّل باغراض و مصالح ہے۔ اور اس لئے جا بجا قرآن کریم میں تاکید ہے۔ کہ عقل۔ فہم۔ تدبّر۔ فقاہت۔ اور ایمان سے کام لیا جائے۔ اور قرآنِ مجید اور دوسری کتابوں میں یہی مابہ الامتیاز ہے۔ اور کسی کتاب نے اپنی تعلیم کو عقل اور تدبّر کی دقیق اور آزاد نکتہ چینی کے آگے ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ بلکہ انجیل خاموش کے چالاک اور عیّار حامیوں نے اس خیال سے کہ انجیل کی تعلیم عقلی زور کے مقابل ہیجان محض ہے۔ نہایت ہوشیاری سے اپنے عقائد میں اس امر کو داخل کر لیا کہ تثلیث اور کفارہ ایسے راز ہیں کہ انسانی عقل اُن کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ برخلاف اس کے فُرقان حمید کی یہ تعلیم ہے۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ[1] الآیہ (س ۴) یعنی آسمانوں کی بناوٹ اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا دانشمندوں کو اُس اللہ کا صاف

[1] آل عمران : ۱۹۱-۱۹۲

پتہ دیتے ہیں۔جس کی طرف مَذْھَب اِسْلَام دعوت دیتا ہے۔اس آیت میں کسقدر صاف حکم ہے کہ دانشمند اپنی دانشوں اور مغزوں سے بھی کام لیں۔ اور

اِسْلام کا خُدا

جان لیں کہ اسلام کا خدا ایسا گورکھ دھندا نہیں کہ اُسے عقل پر پتھر مار کر بہ جبر منوایا جائے۔اور صحیفۂ فطرت میں کوئی بھی ثبوت اس کے لئے نہ ہو۔بلکہ فطرت کے وسیع اوراق میں اُس کے اس قدر نشانات ہیں۔جو صاف بتلاتے ہیں کہ وُہ ہے۔ ایک ایک چیز اس کائنات میں اُس نشان اور تختہ کی طرح ہے جو ہر سڑک اور گلی کے سر پر اس سڑک یا محلہ یا شہر کا نام معلوم کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے۔خدا کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔اور اس موجُودہ ہستی کا پتہ ہی نہیں۔بلکہ مطمئن کر دینے والا ثبوت دیتی ہے۔زمین وآسمان کی شہادتیں کسی مصنوعی اور بناوٹی خدا کی ہستی کا ثبوت نہیں دیتیں۔ بلکہ اس خدائے احد الصمد لم یلد و لم یولد کی ہستی کو دکھاتی ہیں جو زندہ اور قائم خدا ہے۔اور جسے اسلام پیش کرتا ہے۔چنانچہ پادری فنڈر جس نے پہلے پہل ہندوستان میں آکر مذہبی مناظروں میں قدم رکھا اور اسلام پر نکتہ چینیاں کیں۔اپنی کتاب میزان الحق میں خود ہی سوال کے طور پر لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسا جزیرہ ہو۔جہاں تثلیث کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔توکیا وہاں کے رہنے والوں پر آخرت میں مواُخذہ تثلیث کے عقیدہ کی بنا پر ہوگا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اُن سے توحید کا مواُخذہ ہوگا۔اس سے سمجھ لو کہ اگر توحید کا نقش ہر ایک شئے میں نہ پایا جاتا اور تثلیث ایک بناوٹی اور مصنوعی تصویر نہ ہوتی۔توعقیدہ توحید کی بنا پر مواُخذہ کیوں ہوتا؟

توحید کا نقش قُدرت کی ہر چیز میں رکھّا ہوُا ہے

بات اصل میں یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی[1] نقش کیا گیا ہے۔اور تثلیث سے کوئی مناسبت جبلت انسانی اور تمام اشیائے عالم

[1] الاعراف : ۱۷۳

کونہیں۔ایک قطرہ پانی کا دیکھو۔تو وہ گول نظر آتا ہے۔مثلّث کی شکل میں نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی صاف طور پر یہی پایا جاتا ہے کہ توحید کا نقش قدرت کی ہر ایک چیز میں رکھا ہوا ہے۔خوب غور سے دیکھو کہ پانی کا قطرہ گول ہوتا ہے اور کُروی شکل میں توحید ہی ہوتی ہے۔اس لئے کہ وہ جہت کو نہیں چاہتی۔اور مثلّث شکل جہت کو چاہتی ہے۔ چنانچہ آگ کو دیکھو۔شکل بھی مخروطی ہے۔اور وہ بھی کُرویت اپنے اندر رکھتی ہے۔اس سے بھی توحید کا نُور چمکتا ہے۔زمین کو لو۔اور انگریزوں ہی سے پُوچھو کہ اس کی شکل کیسی ہے؟ کہیں گے گول۔الغرض طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی جائے گی۔اللہ تعالیٰ اس آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] الآیہ میں بتلاتا ہے کہ جس خُدا کو قرآن مجید پیش کرتا ہے۔اُس کے لئے زمین وآسمان دلائل سے بھرے پڑے ہیں۔

مجھے ایک حکیم کا مقولہ بہت ہی پسند آتا ہے۔کہ اگر کُل کتابیں دریا بُرد کر دیجاویں تو پھر بھی اسلام کا خدا باقی رَہ جائے گا۔اس لئے کہ وہ مثلّث اور کہانی نہیں۔اصل میں پُختہ بات وہی ہے۔جس کی صداقت کسی خاص چیز پر منحصر نہ ہو۔کہ اگر وُہ نہ ہو تو اس کا پتہ ہی ندارد۔قصّہ کہانی کا نقش نہ دل پر ہوتا ہے۔نہ صحیفۂ فطرت میں۔جب تک کسی پنڈت، پاندھے یا پادری نے یاد رکھا۔ان کا کوئی وجود مسلّم رہا۔زاں بعد حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔

تعلیمِ قرآن کی شہادت قانُونِ قُدرت کی زبان سے اَدا ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[2]۔بلکہ یہ سارا صحیفہ قُدرت کے مضبوط صندوق میں محفوظ ہے۔کیا مطلب کہ یہ قرآن کریم ایک چھُپی ہوئی کتاب میں ہے۔اس کا وجُود کاغذوں تک ہی محدود نہیں بلکہ وُہ ایک چھُپی ہوئی کتاب میں ہے۔جس کو صحیفۂ فطرت کہتے ہیں۔یعنی قرآن کی ساری تعلیم

[1] آل عمران : ۱۹۱ [2] الواقعہ : ۷۸ تا ۸۰

کی شہادت قانونِ قدرت کے ذرہ ذرہ کی زبان سے اَدا ہوتی ہے۔ اُس کی تعلیم اور اُس کی برکات کتھا کہانی نہیں جو مٹ جائیں۔

ضرورتِ الہام

ہر ایک آدمی چونکہ عقل سے مدارجِ یقین پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے الہام کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو تاریکی میں عقل کے لئے ایک روشن چراغ ہو کر مدد دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر بھی محض عقل پر بھروسہ کر کے حقیقی خدا کو نہ پا سکے۔ چنانچہ افلاطون جیسا فلاسفر بھی مرتے وقت کہنے لگا۔ کہ میں ڈرتا ہوں۔ ایک بُت پر میرے لئے ایک مُرغا ذبح کرو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو گی۔ افلاطون کی فلاسفی، اس کی دانائی اور دانشمندی اُس کو وُہ سچی سکینت اور اطمینان نہیں دے سکے جو مومنوں کو حاصل ہے۔ یہ خوب یاد رکھو۔ کہ الہام کی ضرورت قلبی اطمینان اور دلی استقامت کے لئے اشد ضروری ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے عقل سے کام لو۔ اور یہ یاد رکھو کہ جو عقل سے کام لیگا۔ اسلام کا خدا اُسے ضرور ہی نظر آجائیگا۔ کیونکہ درختوں کے پتّے پتّے پر اور آسمان کے اجرام پر اس کا نام بڑے جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن بالکل عقل ہی کے تابع نہ بن جاؤ۔ تاکہ الہامِ الٰہی کی وقعت کو نہ کھو بیٹھو۔ جس کے بغیر نہ حقیقی تسلّی اور نہ اخلاقِ فاضلہ نصیب ہو سکتے ہیں۔ برہمو لوگ بھی شانتی اور سچا نُورِ نجات کا حاصل نہیں کر سکتے۔ اِس لئے کہ وُہ الہام کی ضرورت کے قائل نہیں۔ ایسے لوگ جو عقل کے بندے ہو کر الہام کو فضول قرار دیتے ہیں۔ مَیں بالکل ٹھیک کہتا ہوں کہ عقل سے بھی کام نہیں لیتے۔ قرآن کریم میں اُن لوگوں کو جو عقل سے کام لیتے ہیں اُولُوالْاَلْبَاب فرمایا ہے۔ پھر اس کے آگے فرمایا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ[1] الآیہ (رسؑ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرا پہلو بیان کیا ہے۔ کہ اولوا الالباب اور عقلِ سلیم بھی وہی رکھتے ہیں جو اللہ جلّشانہٗ کا ذکر اُٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں۔ یہ گمان نہ کرنا چاہیئے۔ کہ عقل و

[1] آلِ عمران: ۱۹۲

دانش ایسی چیزیں ہیں جو یونہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نہیں۔

سچی فراست اور سچی دانش اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی

بلکہ سچی فراست اور سچی دانش اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے تو کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے۔ صحیح فراست اور حقیقی دانش جیسا میں نے ابھی کہا۔ کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ جبتک تقویٰ میسّر نہ ہو۔

اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو۔ تو عقل سے کام لو۔ فکر کرو۔ سوچو۔ تدبّر اور فکر کے لئے قرآن کریم میں بار بار تاکیدیں موجود ہیں۔ کتاب مکنون اور قرآن کریم میں فکر کرو۔ اور پارسا طبع ہو جاؤ۔ جب تمہارے دل پاک ہو جائیں گے اور ادھر عقلِ سلیم سے کام لوگے اور تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو گے۔ پھر ان دونوں کے جوڑ سے وہ حالت پیدا ہو جائے گی کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ[1] (آل عمران) تمہارے دل سے نکلے گا۔ اُس وقت سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مخلوق عبث نہیں۔ بلکہ صانع حقیقی کی حقانیت اور اثبات پر دلالت کرتی ہے۔ تاکہ طرح طرح کے علوم و فنون جو دین کو مدد دیتے ہیں۔ ظاہر ہوں ⁂

خدا نے مُسلمانوں کو عقل کیساتھ الہام کی روشنی اور نُور بھی مرحمت فرمایا ہے

خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف عقل ہی کے عطیہ سے مشرف نہیں فرمایا بلکہ الہام کی روشنی اور نُور بھی اس کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے۔ اُن کو اُن راہوں پر نہیں چلنا چاہیئے جن پر خشک منطقی اور فلاسفر چلانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر لسانی قوت غالب ہوتی ہے اور روحانی قویٰ بہت ضعیف ہوتے ہیں۔ دیکھو قرآن شریف میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی تعریف میں اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ[2] فرماتا ہے۔ کہیں اولی الالسنہ نہیں فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو وہی لوگ پسند ہیں۔ جو بصر اور بصیرت سے خدا کے

[1] آل عمران : ۱۹۲ [2] ص : ۴۶

کام اور کلام کو دیکھتے ہیں اور پھر اُن پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہ ساری باتیں بجز تزکیہ نفس اور تطہیر قوائے باطنیہ کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتیں ۔

فلاحِ دارین کے حصول کا طریق

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں فلاحِ دارین حاصل ہو اور لوگوں کے دلوں پر فتح پاؤ۔ تو پاکیزگی اختیار کرو۔ عقل سے کام لو اور کلامِ الٰہی کی ہدایات پر چلو۔ خود اپنے تئیں سنوارو۔ اور دوسروں کو اپنے اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ دکھاؤ۔ تب البتہ کامیاب ہو جاؤ گے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔

ع۔ سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم بر دل

پس پہلے دل پیدا کرو۔ اگر دلوں پر اثر اندازی چاہتے ہو تو عملی طاقت پیدا کرو۔ کیونکہ عمل کے بغیر قولی طاقت اور انسانی قوت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ زبان سے قیل وقال کرنے والے تو لاکھوں ہیں۔ بہت سے مولوی اور علماء کہلا کر منبروں پر چڑھ کر اپنے تئیں نائب الرسول اور وارث الانبیاء قرار دے کر وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تکبر، غرور، بدکاریوں سے بچو۔ مگر جو اُن کے اپنے اعمال ہیں اور جو کرتوتیں وہ خود کرتے ہیں۔ ان کا اندازہ اس سے کر لو۔ کہ اُن باتوں کا اثر تمہارے دل پر کہاں تک ہوتا ہے۔

کہنے سے پہلے خود عمل کرو

اگر اس قسم کے لوگ عملی طاقت بھی رکھتے اور کہنے سے پہلے خود کرتے تو قرآن شریف میں لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[1] (الصف) کہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ آیت ہی بتلاتی ہے کہ دُنیا میں کہہ کر خود نہ کرنے والے بھی موجود تھے اور ہیں اور ہوں گے ۔

ہمارے نبی کریمؐ کے قول اور فعل میں پوری مطابقت تھی

تم میری بات سُن رکھو اور خوب یاد کر لو۔ کہ اگر انسان کی گفتگو سچے دل سے نہ ہو۔ اور عملی طاقت اُس میں نہ ہو تو وُہ اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اسی سے تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صداقت معلوم ہوتی ہے کیونکہ جو کامیابی اور تاثیر فی القلوب آپؐ کے حصہ

[1] الصف : ۳

میں آئی۔ اس کی کوئی نظیر بنی آدم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ آپؐ کے قول اور فعل میں پُوری مطابقت تھی +

میری ان باتوں پر عمل کرو اور عقل اور کلامِ الٰہی سے کام لو

میری یہ باتیں اس لئے ہیں کہ تا تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو۔ اور اس تعلق کی وجہ سے میرے اعضا ہو گئے ہو۔ ان باتوں پر عمل کرو۔ اور عقل اور کلام الٰہی سے کام لو۔ تاکہ سچی معرفت اور یقین کی روشنی تمہارے اندر پیدا ہو اور تم دوسرے لوگوں کو ظلمت سے نُور کی طرف لانے کا وسیلہ بنو۔ اس لئے کہ آجکل اعتراضوں کی بنیاد طبعی اور طبابت اور ہیئت کے مسائل کی بنا، پر ہے۔ اس لئے لازم ہوا کہ ان علوم کی ماہیّت اور کیفیت سے آگاہی حاصل کریں۔ تاکہ جواب دینے سے پہلے اعتراض کی حقیقت تو ہم پر کھُل جائے +

علُوم جدیدہ کی ماہیّت اور کیفیّت سے آگاہی حاصل کرو

میں اُن مولویوں کو غلطی پر جانتا ہوں۔ جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ وُہ دراصل اپنی غلطی اور کمزوری کو چھُپانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہُوئی ہے کہ علُوم جدیدہ کی تحقیقات اسلام سے بدظن اور گمراہ کر دیتی ہے۔ اور وُہ یہ قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ کہ گویا عقل اور سائنس اسلام سے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ چونکہ خود فلسفہ کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لئے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ بات تراشتے ہیں کہ علوم جدیدہ کا پڑھنا ہی جائز نہیں۔ اُن کی رُوح فلسفہ سے کانپتی ہے اور نئی تحقیقات کے سامنے سجدہ کرتی ہے۔

سچّا فلسفہ قرآن میں ہے

مگر وُہ سچا فلسفہ اُن کو نہیں ملا جو الہامِ الٰہی سے پَیدا ہوتا ہے۔ جو قرآن کریم میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ اُن کو اور صرف اُنہیں کو دیا جاتا ہے۔ جو نہایت تذلّل اور نیستی سے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کے دروازے پر پھینک دیتے ہیں۔ جن کے دل اور دماغ سے

متکبرانہ خیالات کا تعفن نکل جاتا ہے اور جو اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے گڑگڑا کر سچی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔

علُوم جدیدہ کو اِسلام کے تابع کرنا چاہیئے

پس ضرورت ہے کہ آجکل دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علُوم جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدّ و جہد سے حاصل کرو۔ لیکن مجھے یہ بھی تجربہ ہے جو بطور انتباہ میں بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ان علوم ہی میں یکطرفہ پڑ گئے اور ایسے محو اور منہمک ہوئے کہ کسی اہلِ دل اور اہلِ ذکر کے پاس بیٹھنے کا اُن کو موقعہ نہ ملا۔ اور وہ خود اپنے اندر الٰہی نُور نہ رکھتے تھے وہ عموماً ٹھوکر کھا گئے اور اسلام سے دُور جا پڑے۔ اور بجائے اس کے کہ اُن علُوم کو اِسلام کے تابع کرتے۔ اُلٹا اسلام کو علُوم کے ماتحت کرنے کی بے سُود کوشش کر کے اپنے زعم میں دینی اور قومی خدمات کے متکفل بن گئے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ کام وُہی کر سکتا ہے۔ یعنی دینی خدمت وہی بجا لا سکتا ہے جو آسمانی روشنی اپنے اندر رکھتا ہو۔

یکطرفہ علُوم کی تحقیقات اور تعلیم میں منہمک ہونے کا نتیجہ

بات یہ ہے کہ ان علوم کی تعلیمیں مادیّت اور فلسفیت کے رنگ میں دی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان تعلیمات کا دلدادہ چند روز تو حُسنِ ظن کی وجہ سے جو اس کو فطرتاً حاصل ہوتا ہے۔ رسوم اسلام کا پابند رہتا ہے۔ لیکن جوں جوں ادھر قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اسلام کو دُور چھوڑتا جاتا ہے۔ اور آخر ان رسُوم کی پابندی سے بالکل ہی رہ جاتا ہے اور حقیقت سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور ہوا ہے یکطرفہ علُوم کی تحقیقات اور تعلیم میں منہمک ہونے کا۔ بہت سے لوگ قومی لیڈر کہلا کر بھی اس رمز کو نہیں سمجھ سکے۔ کہ علُوم جدیدہ کی تحصیل جب ہی مفید ہو سکتی ہے جب محض دینی خدمت کی نیّت سے ہو۔ اور کسی اہلِ دل آسمانی عقل اپنے اندر رکھنے والے مردِ خُدا کی

صحبت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

میرا ایمان یہی کہتا ہے کہ اس دہریت نما نیچریت کے پھیلنے کی یہی وجہ ہے۔ کہ جو شیطانی حملے الحاد کے زہر سے بھرے ہوئے علوم طبعی، فلسفی یا ہیئت دانوں کی طرف سے اسلام پر ہوتے ہیں۔ اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے یا اُن کا جواب دینے کے لئے اِسلام اور آسمانی نُور کو عاجز سمجھ کر عقلی ڈھکوسلوں اور فرضی اور قیاسی دلائل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے مجیب قرآن کریم کے مطالب اور مقاصد سے کہیں دُور جا پڑتے ہیں۔ اور الحاد کا ایک چھُپا ہوا پردہ اپنے دل پر ڈال لیتے ہیں۔ جو ایک وقت آکر اگر اللہ تعالیٰ اپنا فضل نہ کرے تو دہریت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ اور وہی رنگ دِل کو دیتا ہے جس سے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

آجکل کے تعلیمیافتوں پر ایک اَور بڑی آفت

آجکل کے تعلیمیافتہ لوگوں پر ایک اَور بڑی آفت جو آکر پڑتی ہے وُہ یہ ہے۔ کہ اُن کو دینی علوم سے مطلق مَس نہیں ہوتا۔ پھر جب وُہ کسی ہیئت دان یا فلسفہ دان کے اعتراض پڑھتے ہیں۔ تو اسلام کی نسبت شکوک اور وساوس ان کو پیدا ہو جاتے ہیں۔ تب وہ عیسائی یا دہریہ بن جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُن کے والدین بھی ان پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ کہ دینی علوم کی تحصیل کے لئے ذرا سا وقت بھی اُن کو نہیں دیتے۔ اور ابتدا ہی سے ایسے دھندوں اور بکھیڑوں میں ڈال دیتے ہیں۔ جو انہیں پاک دین سے محروم کر دیتے ہیں۔

تعلیم و تربیت دینی بچپن میں ہو

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ دینی علوم کی تحصیل کے لئے طفولیت کا زمانہ بہت ہی مناسب اور موزُوں ہے۔ جب ڈاڑھی نکل آئی۔ تب ضَرَبَ یَضْرِبُ یاد کرنے بیٹھے تو کیا خاک ہوگا۔ طفولیّت کا حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اِنسانی عُمر کے کسی دوسرے حصّہ

میں ایسا حافظہ کبھی بھی نہیں ہوتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ طفولیت کی بعض باتیں تو اب تک یاد ہیں لیکن پندرہ برس پہلے کی اکثر باتیں یاد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی عمر میں علم کے نقوش ایسے طور پر اپنی جگہ کر لیتے ہیں۔ اور قویٰ کے نشو و نما کی عمر ہونے کے باعث ایسے دلنشیں ہو جاتے ہیں۔ کہ پھر ضائع نہیں ہو سکتے۔ غرض یہ ایک طویل امر ہے۔

اپنی ہمسایہ قوموں سے سبق حاصل کرو

مختصر یہ کہ تعلیمی طریق میں اس امر کا لحاظ اور خاص توجہ چاہیئے۔ کہ دینی تعلیم ابتدا سے ہی ہو۔ اور میری ابتدا سے یہی خواہش رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کو پورا کرے۔ دیکھو، تمہاری ہمسایہ قوموں یعنی آریوں نے کس قدر حیثیت تعلیم کے لئے بنائی۔ کئی لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیا۔ کالج کی عالیشان عمارت اور سامان بھی پیدا کیا۔ اگر مسلمان پورے طور پر اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرینگے۔ تو میری بات سُن رکھیں کہ ایک وقت اُن کے ہاتھ سے بچے بھی جاتے رہیں گے۔

صُحبت را اثر

مَثل مشہور ہے۔ "تخمِ تاثیر صُحبت را اثر" اس کے اوّل جُزو (حصّہ) پر کلام ہو تو ہو۔ لیکن دوسرا حصّہ "صُحبت را اثر" ایسا ثابت شدہ مسئلہ ہے کہ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ ہر ایک شریف قوم کے بچوں کا عیسائیوں کے پھندے میں پھنس جانا اور مسلمانوں حتّٰی کہ غوث و قُطب کہلانے والوں کی اولاد اور سادات کے فرزندوں کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنا دیکھ چکے ہو۔ اُن صحیح النّسب سیّدوں کی اولاد جو اپنا سلسلہ حضرت امام حُسینؓ تک پہنچاتے ہیں۔ ہم نے کرسچن (عیسائی) دیکھی ہے۔ اور بانیٔ اسلام کی نسبت قسم قسم کے الزام (نعوذ باللہ) لگاتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی اگر کوئی مسلمان اپنے دین اور اپنے نبیؐ کے لئے غیرت نہیں رکھتا۔ تو اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا؟

اگر تُم اپنے بچّوں کو عیسائیوں، آریوں اور دوسروں کی صُحبت سے نہیں بچاتے یا کم از کم نہیں بچانا چاہتے تو یاد رکھو کہ نہ صرف اپنے اُوپر بلکہ قوم پر اور اسلام پر ظُلم کرتے اور بہت بڑا بھاری ظُلم کرتے ہو۔

کیا تمہیں اِسلام کیلئے کچھ غیرت نہیں؟

اس کے یہ معنے ہیں کہ گویا تمہیں اِسلام کے لئے کچھ غیرت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عزت تمہارے دل میں نہیں۔

راستباز اور متقی بنو تاکہ عقل میں جودت اور ذہانت پیدا ہو

ذرا سوچو اور سمجھو۔ خدا کے واسطے عقل سے کام لو۔ اور اس لئے کہ عقل میں جودت اور ذہانت پیدا ہو۔ راستباز اور متقی بنو۔ پاک عقل آسمان سے آتی ہے اور اپنے ہمراہ ایک نُور لاتی ہے لیکن وُہ جوہرِ قابل کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس پاک سلسلہ کا قانون وہی قانون ہے جو ہم جسمانی قانون میں دیکھتے ہیں۔ بارش آسمان سے پڑتی ہے لیکن کوئی جگہ اُس بارش سے گُلزار ہوتی ہے اور کہیں کانٹے اور جھاڑیاں ہی اُگتی ہیں۔ اور کہیں وہی قطرۂ بارش سمندر کی تہ میں جا کر ایک گوہرِ شاہوار بنتا ہے۔ بقول کسے ع

در باغ لالہ روئید در شورہ بُوم خس

آسمانی نُور کے قبُول کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کو تیار ہو جاؤ

اگر زمین قابل نہیں ہوتی۔ تو بارش کا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ اُلٹا ضرر اور نُقصان ہوتا ہے۔ اسی لئے آسمانی نُور اُترا ہے اور وُہ دلوں کو روشن کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے قبول کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کو تیار ہو جاؤ۔ تا ایسا نہ ہو کہ بارش کی طرح کہ جو زمین جوہرِ قابل نہیں رکھتی وہ اُس کو ضائع کر دیتی ہے۔ تم بھی باوجود نُور کی موجودگی کے تاریکی میں چلو۔ اور ٹھوکر کھا کر اندھے کوئیں میں گر کر ہلاک ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ ماں سے بھی بڑھ کر مہربان ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مخلُوق ضائع ہو۔ وُہ ہدایت اور رَوشنی

کی راہیں تم پر کھولتا ہے۔ مگر تم اُن پر قدم مارنے کے لئے عقل اور تزکیہ نفوس سے کام لو۔ جیسے زمین کہ جبتک ہل چلا کر تیار نہیں کی جاتی۔ تخم ریزی اُس میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح جبتک مجاہدہ اور ریاضت سے تزکیہ نفوس نہیں ہوتا پاک عقل آسمان سے اُتر نہیں سکتی۔

اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے بڑا فضل کیا۔ اور اپنے دین اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تائید میں غیرت کھا کر ایک انسان کو جو تم میں بول رہا ہے بھیجا۔ تاکہ وہ اُس روشنی کی طرف لوگوں کو بُلائے۔ اگر زمانہ میں ایسا فساد اور فتنہ نہ ہوتا۔ اور دین کے محو کرنے کے لئے جس قسم کی کوششیں ہو رہی ہیں نہ ہوتیں۔ تو چنداں حرج نہ تھا۔ لیکن اب تم دیکھتے ہو کہ ہر طرف یمین و یسار اسلام ہی کو معدوم کرنے کی فکر میں جملہ اقوام لگی ہوئی ہیں۔ مجھے یاد ہے۔ اور براہین احمدیہ میں بھی مَیں نے ذکر کیا ہے کہ اسلام کے خلاف چھ کروڑ کتابیں تصنیف اور تالیف ہو کر شائع کی گئی ہیں۔ عجیب بات ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد بھی چھ کروڑ اور اسلام کے خلاف کتابوں کا شمار بھی اسی قدر ہے۔ اگر اس زیادتی تعداد کو جو اَب تک اِن تصنیفات میں ہوئی ہے۔ چھوڑ بھی دیا جائے۔ تو بھی ہمارے مخالف ایک ایک کتاب ہر ایک مسلمان کے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ کا جوش غیرت میں نہ ہوتا۔ اور اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ اس کا وعدہ صادق نہ ہوتا تو یقیناً سمجھ لو کہ اِسلام آج دُنیا سے اُٹھ جاتا اور اُس کا نام و نشان تک مِٹ جاتا۔ مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کا پوشیدہ ہاتھ اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ مجھے افسوس اور رنج اس امر کا ہوتا ہے۔ کہ لوگ مسلمان کہلا کر ناطے بیاہ کے برابر بھی تو اسلام کا فکر نہیں کرتے۔ اور مجھے اکثر بار پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ کہ عیسائی عورتوں تک مرتے وقت لکھوکھا روپیہ عیسائی دین کی ترویج اور اشاعت کے لئے وصیت کر جاتی ہیں۔ اور اُن کا اپنی زندگیوں کو عیسائیت کی اشاعت میں صَرف کرنا تو ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ ہزارہا لیڈیز مشنری گھروں اور کوچوں میں پھرتی اور جس طرح بَن پڑے نقدایمان

چھینتی پھرتی ہیں۔ مُسلمانوں میں سے کسی ایک کو نہیں دیکھا۔ کہ وُہ پچاس روپیہ بھی اشاعتِ اسلام کے لئے وصیت کرکے مرا ہو۔ ہاں شادیوں اور دُنیاوی رسُوم پر تو بے حد اسراف ہوتے ہیں اور قرض لے کر بھی دل کھول کر فضول خرچیاں کی جاتی ہیں۔ مگر خرچ کرنے کے نہیں تو صرف اسلام کے لئے نہیں۔ افسوس! افسوس!! اس سے بڑھ کر اور مُسلمانوں کی حالت قابلِ رحم کیا ہوگی؟

بداعمالی کا نتیجہ بداعمالی ہوتا ہے

اصل بات یہ ہے کہ بداعمالی کا نتیجہ بداعمالی ہوتا ہے۔ اسلام کے لئے خدا تعالےٰ کا قانونِ قدرت ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد آیا۔ تذکرۃُ الاولیاء میں مَیں نے پڑھا تھا۔ کہ ایک آتش پرست بڈھا نوّے برس کی عُمر کا تھا۔ اتفاقاً بارش کی جھڑی جو لگ گئی تو وُہ اُس جھڑی میں کوٹھے پر چڑیوں کے لئے دانے ڈال رہا تھا۔ کسی بزرگ نے پاس سے کہا۔ کہ اے بڈھے تو کیا کرتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ بھائی چھ سات روز متواتر بارش ہوتی رہی ہے۔ چڑیوں کو دانہ ڈالتا ہوں۔ اُن نے کہا کہ تو عبث حرکت کرتا ہے۔ تُو کافر ہے تجھے اجر کہاں۔ بُوڑھے نے جواب دیا۔ مجھے اس کا اجر ضرور ملیگا۔ بزرگ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ میں حج کو گیا۔ تو دُور سے کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بڈھا طواف کر رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اور جب میں آگے بڑھا تو پہلے وُہی بولا۔ کیا میرا دانے ڈالنا ضائع گیا۔ یا اُن کا عوض ملا؟

نیکی کا اجر ضائع نہیں ہوتا

اب خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کافر کی نیکی کا اجر بھی ضائع نہیں کیا۔ تو کیا مُسلمان کی نیکی کا اجر ضائع کر دے گا؟ مجھے ایک صحابی کا ذکر یاد آیا۔ کہ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَیں نے اپنے کُفر کے زمانہ میں بہت سے صدقات کئے ہیں۔ کیا اُن کا اجر مجھے ملیگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ وہی صدقات تو تیرے اسلام کا

مُوجب ہو گئے ہیں۔

نیکی کیا چیز ہے؟

نیکی ایک زینہ ہے اِسلام اور خدا کی طرف پڑھنے کا۔ لیکن یاد رکھو کہ نیکی کیا چیز ہے شیطان ہر ایک راہ میں لوگوں کی راہ زنی کرتا اور اُن کو راہِ حق سے بہکاتا ہے۔ مثلاً رات کو روٹی زیادہ پک گئی اور صبح کو باسی بچ رہی۔ عین کھانے کے وقت کہ اس کے سامنے اچھے اچھے کھانے رکھے ہیں۔ ابھی ایک لُقمہ نہیں کہ دروازہ پر آکر فقیر نے صدا کی اور روٹی مانگی۔ کہا کہ باسی روٹی سائل کو دے دو۔ کیا یہ نیکی ہو گی؟ باسی روٹی تو پڑی ہی رہنی تھی۔ تنعم پسند اُسے کیوں کھانے لگے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا[1] (الدّھر) یہ بھی معلوم رہے کہ طعام کہتے ہی پسندیدہ طعام کو ہیں۔ سڑا ہوا باسی طعام نہیں کہلاتا۔ الغرض اس رکابی میں سے جس میں ابھی تازہ کھانا اور لذیذ اور پسندیدہ رکھا ہوا ہے کھانا شروع نہیں کیا۔ فقیر کی صدا پر نکال دے تو یہ تو نیکی ہے۔

نکمّی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی نیکی کے تنگ دروازہ میں داخل نہیں ہو سکتا

بیکار اور نکمّی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی آدمی نیکی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا نیکی کا دروازہ تنگ ہے۔ پس یہ امر ذہن نشین کر لو۔ کہ نکمّی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نصِ صریح ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[2] (پ۴) جبتک عزیز سے عزیز اور پیاری سے پیاری چیزوں کو خرچ نہ کروگے اس وقت تک محبوب اور عزیز ہونے کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اگر تکلیف اُٹھانا نہیں چاہتے۔ اور حقیقی نیکی کو اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ تو کیونکر کامیاب اور بامُراد ہو سکتے ہو۔ کیا صحابہ کرامؓ مفت میں اس درجہ تک پہنچ گئے جو اُن کو حاصل ہوا۔ دُنیاوی خطابوں کے حاصل کرنے کے لئے کس قدر اخراجات اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ایک معمولی خطاب جس سے دلی اطمینان اور سکینت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ملتا ہے پھر خیال

[1] الدھر: ۹ [2] آلِ عمران: ۹۳

کرو۔ کہ رضی اللہ عنہم کا خطاب جو دل کو تسلی اور قلب کو اطمینان اور مولیٰ کریم کی رضامندی کا نشان ہے۔ کیا یُونہی آسانی سے مِل گیا؟

خدا تعالیٰ کی رضامندی ہی حقیقی خوشی کا موجب ہے

بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی جو حقیقی خوشی کا مُوجب ہے۔ حاصل نہیں ہو سکتی جبتک عارضی تکلیفیں برداشت نہ کی جاویں۔ خُدا ٹھگا نہیں جا سکتا۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تکلیف کی پَروا نہ کریں کیونکہ اَبدی خوشی اور دائمی آرام کی رَوشنی اس عارضی تکلیف کے بعد مومن کو ملتی ہے۔

کِس وقت تک کوئی آدمی سچّا مومن نہیں کہلا سکتا؟

میں کھول کر کہتا ہوں کہ جبتک ہر بات پر اللہ تعالیٰ مقدّم نہ ہو جاوے اور دل پر نظر ڈال کر وُہ نہ دیکھ سکے کہ یہ میرا ہی ہے۔ اس وقت تک کوئی سچّا مومن نہیں کہلا سکتا۔ ایسا آدمی تو اُل (عُرفِ عام) کے طور پر مومن یا مُسلمان ہے۔ جیسے چوہڑے کو بھی مصلّی یا مومن کہہ دیتے ہیں۔ مُسلمان وُہی ہے جو اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کا مصداق ہو گیا ہو۔ وجہ مُونہہ کو کہتے ہیں۔ مگر اس کا اطلاق ذات اور وجُود پر بھی ہوتا ہے۔ پس جس نے ساری طاقتیں اللہ کے حضور رکھ دی ہوں۔ وہی سچّا مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔ مجھے یاد آیا۔ کہ ایک مسلمان نے کسی یہُودی کو دعوتِ اسلام کی کہ تُو مسلمان ہو جا۔ مُسلمان خود فِسق و فجور میں مبتلا تھا۔ یہودی نے اس فاسق مسلمان کو کہا کہ تُو پہلے اپنے آپ کو دیکھ۔ اور تُو اس بات پر مغرور نہ ہو۔ کہ تُو مسلمان کہلاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اِسلام کا مفہُوم چاہتا ہے نہ نام اور لفظ۔ یہُودی نے اپنا قِصّہ بیان کیا کہ میں نے اپنے لڑکے کا نام خالد رکھا تھا۔ مگر دوسرے دِن مجھے اُسے قبر میں گاڑنا پڑا۔ اگر صرف نام ہی میں برکت ہوتی تو وہ کیوں مرتا۔ اگر کوئی مسلمان سے پُوچھتا ہے کہ کیا تُو مُسلمان ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

صرف لفاظی کام نہیں آسکتی جبتک کہ عمل نہ ہو

پس یاد رکھو کہ صرف لفاظی اور لسانی کام نہیں آسکتی جبتک کہ عمل نہ ہو۔ محض باتیں عنداللہ کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[1] (الصف)

اگر تم اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو پہلے خود تقویٰ اور طہارت اختیار کرو

اَب مَیں پھر اپنے پہلے مقصد کی طرف رجُوع کرتا ہُوں۔ یعنی صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا[2] جس طرح دشمن کے مقابلہ پر سرحد پر گھوڑا ہونا ضروری ہے تاکہ دشمن حد سے نہ نکلنے پاوے۔ اسی طرح تم بھی تیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ دُشمن سرحد سے گذر کر اسلام کو صدمہ پہنچائے۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اگر تم اسلام کی حمایت اور خدمت کرنا چاہتے ہو تو پہلے خود تقویٰ اور طہارت اختیار کرو۔ جس سے خود تم خدا تعالیٰ کی پناہ کے حصنِ حصین میں آسکو۔ اور پھر تم کو اس خدمت کا شرف اور استحقاق حاصل ہو۔ تم دیکھتے ہو۔ کہ مسلمانوں کی بیرونی طاقت کیسی کمزور ہو گئی ہے۔ قومیں اُن کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اگر تمہاری اندرونی اور قلبی طاقت بھی کمزور اور پست ہو گئی۔ تو بس پھر تو خاتمہ ہی سمجھو۔ تم اپنے نفسوں کو اَیسے پاک کرو۔ کہ قُدسی قوّت ان میں سرایت کرے۔ اور وہ سرحد کے گھوڑوں کی طرح مضبوط اور محافظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہمیشہ متقیوں اور راستبازوں ہی کے شامل حال ہوا کرتا ہے۔ اپنے اخلاق اور اطوار ایسے نہ بناؤ۔ جن سے اسلام کو داغ لگ جاوے۔ بدکاروں اور اسلام کی تعلیم پر عمل نہ کرنے والے مسلمانوں سے اسلام کو داغ لگتا ہے۔ کوئی مسلمان شراب پی لیتا ہے تو کہیں قَے کرتا پھرتا ہے۔ پگڑی گلے میں ہوتی ہے۔ موریوں اور گندی نالیوں میں گرتا پھرتا ہے۔ پولیس کے جُوتے پڑتے ہیں۔ ہندو اور عیسائی اُس پر ہنستے ہیں۔ اس کا اَیسا خلافِ شرع فعل اس کی ہی تضحیک کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ در پردہ اس کا اثر نفسِ اسلام تک پہنچتا ہے۔ مجھے ایسی خبریں یا

[1] الصف : ۴ [2] آل عمران : ۲۰۱

جیلخانوں کی رپورٹیں پڑھ کر سخت رنج ہوتا ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ اس قدر مسلمان بدعملیوں کی وجہ سے موردِ عتاب ہوئے۔ دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ کہ یہ لوگ جو صراطِ مستقیم رکھتے ہیں۔ اپنی بداعتدالیوں سے صرف اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ بلکہ اسلام پر ہنسی کراتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کسی گذشتہ مردم شماری کے وقت مسٹر ایبٹسن صاحب نے اپنی رپورٹ میں بہت کچھ لکھا تھا۔ میری غرض اس سے یہ ہے کہ مسلمان لوگ مسلمان کہلا کر ان ممنوعات اور منہیات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف ان کو بلکہ اسلام کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ پس اپنے چال چلن اور اطوار ایسے بنا لو کہ کفار کو بھی تم پر (جو در اصل اسلام پر ہوتی ہے) نکتہ چینی کرنے کا موقعہ نہ ملے +

اصل شکر تقویٰ اور طہارت ہی ہے

تمہارا اصل شکر تقویٰ اور طہارت ہی ہے۔ مسلمان پوچھنے پر الحمد للہ کہہ دینا سچا سپاس اور شکر نہیں ہے۔ اگر تم نے حقیقی سپاس گذاری یعنی طہارت اور تقویٰ کی راہیں اختیار کر لیں۔ تو میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم سرحد پر کھڑے ہو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ ایک ہندو سر رشتہ دار جس کا نام جگن ناتھ تھا۔ اور جو ایک متعصب ہندو تھا۔ بتلایا۔ کہ امرتسر یا کسی جگہ میں وہ سر رشتہ دار تھا۔ جہاں ایک ہندو اہلکار در پردہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ مگر بظاہر ہندو تھا۔ میں اور دیگر سارے ہندو اُسے بہت بُرا جانتے تھے۔ اور ہم سب اہلکاروں نے مل کر ارادہ کر لیا۔ کہ اس کو ضرور موقوف کرائیں۔ سب سے زیادہ شرارت میرے دل میں تھی۔ میں نے کئی بار شکایت کی کہ اس نے یہ غلطی کی ہے اور یہ خلاف ورزی کی ہے۔ مگر اس پر کوئی التفات نہ ہوتی تھی۔ لیکن ہم نے ارادہ کر لیا ہوا تھا۔ کہ اُسے ضرور موقوف کرا دیں گے۔ اور اپنے اس ارادہ میں کامیاب ہونے کے لئے بہت سی نکتہ چینیاں بھی جمع کر لی تھیں۔ اور میں وقتاً فوقتاً ان نکتہ چینیوں کو صاحب بہادر کے رُوبرُو پیش کر دیا کرتا تھا۔ صاحب اگر بہت ہی غصہ ہو کر اُس کو بُلا

بھی لیتا تھا۔ تو جونہی وہ سامنے آجاتا تو گویا آگ پر پانی پڑجاتا۔ معمولی طور پر نہایت نرمی سے اُسے فہمائش کر دیتا۔ گویا اس سے کوئی قصور سرزد ہی نہیں ہوا۔

تقویٰ کا رُعب دُوسروں پر بھی پڑتا ہے

اصل بات یہ ہے۔ کہ تقویٰ کا رُعب دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ متقیوں کو ضائع نہیں کرتا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت سید عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے اکابر میں سے ہوئے ہیں۔ ان کا نفس بڑا مُطہّر تھا۔ ایک بار انہوں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میرا دِل دُنیا سے برداشتہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی پیشوا تلاش کروں جو مجھے سکینت اور اطمینان کی راہیں دکھلائے۔ والدہ نے جب دیکھا کہ یہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا۔ تو اُن کی بات کو مان لیا۔ اور کہا کہ اچھا مَیں تجھے رخصت کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر اندر گئی۔ اور اَسّی مُہریں جو اس نے جمع کی ہوئی تھیں۔ اُٹھا لائی۔ اور کہا کہ ان مُہروں سے حِصّہ شرعی کے موافق چالیس مُہریں تیری ہیں اور چالیس تیرے بڑے بھائی کی۔ اس لئے چالیس مُہریں تجھے بحصّہ رَسدی دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چالیس مُہریں اُن کی بغل کے نیچے پَیراہن میں سی دیں۔ اور کہا کہ امن کی جگہ پہنچ کر نکال لینا اور عندالضرورت اپنے صَرف میں لانا۔ سید عبد القادر صاحبؒ نے اپنی والدہ سے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرما دیں۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا۔ جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ اس سے بڑی برکت ہوگی۔ اتنا سُن کر آپ رخصت ہوئے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ جس جنگل میں سے ہو کر آپؒ گزرے اُس میں چند راہزن قزاق رہتے تھے۔ جو مسافروں کو لُوٹ لیا کرتے تھے۔ دُور سے سید عبد القادر صاحبؒ پر بھی اُن کی نظر پڑی۔ قریب آئے تو اُنہوں نے ایک کمبل پوش فقیر سا دیکھا۔ ایک نے ہنسی سے دریافت کیا کہ تیرے پاس کچھ ہے؟ آپؒ ابھی اپنی والدہ سے تازہ نصیحت سُن کر آئے تھے۔ کہ جھُوٹ نہ بولنا۔ فی الفور جواب دیا کہ ہاں۔ چالیس مُہریں میری بغل کے نیچے ہیں۔ جو میری والدہ صاحبہ نے

کیسہ کی طرح سی دی ہیں۔ اُس قزاق نے سمجھا کہ یہ ٹھٹھا کرتا ہے۔ دوسرے قزاق نے جب پُوچھا تو اُس کو بھی یہی جواب دیا۔ الغرض ہر ایک چور کو یہی جواب دیا۔ وہ ان کو اپنے امیر قزاقاں کے پاس لے گئے کہ بار بار یہی کہتا ہے۔ امیر نے کہا۔ اچھا۔ اس کا کپڑا دیکھو تو سہی۔ جب تلاشی لی گئی۔ تو واقعی چالیس مہریں برآمد ہوئیں۔ وُہ حیران ہوئے کہ یہ عجیب آدمی ہے۔ ہم نے ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ امیر نے آپؒ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تُو نے اِس طرح پر اپنے مال کا پتہ بتا دیا؟ آپؒ نے فرمایا کہ میں خُدا کے دین کی تلاش میں جاتا ہوں۔ روانگی پر والدہ صاحبہ نے نصیحت فرمائی تھی کہ جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ یہ پہلا امتحان تھا۔ مَیں جھُوٹ کیوں بولتا۔ یہ سُنکر امیر قزاقاں رو پڑا۔ اور کہا کہ آہ! میں نے ایک بار بھی خدا تعالیٰ کا حکم نہ مانا۔ چوروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اِس کلمہ اور اس شخص کی استقامت نے میرا تو کام تمام کر دیا ہے۔ میں اَب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اور توبہ کرتا ہوں۔ اس کے کہنے کے ساتھ ہی باقی چوروں نے بھی توبہ کر لی۔

"چوروں قطب بنایا اِی"

مَیں "چوروں قطب بنایائی" اسی واقعہ کو سمجھتا ہُوں۔ الغرض سیّد عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے بیعت کرنے والے چور ہی تھے۔

صبر

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا[1] (پارہ ۴) صبر ایک نقطہ کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر دائرہ کی شکل اختیار کر کے سب پر محیط ہو جاتا ہے۔ آخر بدمعاشوں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دے۔ اور تقوٰے کی راہوں پر مضبوطی سے قدم مارے۔ کیونکہ مُتّقی کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اور اُس کا رُعب مخالفوں کے دِل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

✦ ✦ ✦

[1] آل عمران: ۲۰۱

تقویٰ کے اجزاء

تقویٰ کے بہت سے اجزاء ہیں عجب، خود پسندی، مال حرام سے پرہیز اور بداخلاقی سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ جو شخص اچھے اخلاق ظاہر کرتا ہے۔ اس کے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ[1] (پ ۱۸)

اَب خیال کرو کہ یہ ہدایت کیا تعلیم دیتی ہے؟ اس ہدایت میں اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے۔ کہ اگر مخالف گالی بھی دے۔ تو اس کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ اُس پر صبر کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مخالف تمہاری فضیلت کا قائل ہو کر خود ہی نادم اور شرمندہ ہوگا۔ اور یہ سزا اُس سزا سے بہت بڑھ کر ہوگی جو انتقامی طور پر تم اُس کو دے سکتے ہو۔ یُوں تو ایک ذرا سا آدمی اقدامِ قتل تک نوبت پہنچا سکتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تقاضا اور تقویٰ کا منشاء یہ نہیں ہے۔ خوش اخلاقی ایک ایسا جوہر ہے کہ موذی سے انسان پر بھی اُس کا اثر پڑتا ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔ کہ ع

لُطف کُن لُطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

ایمان لانے کے مختلف وجوہ

فاسق آدمی جو انبیاء کے مقابلہ پر تھے۔ خصوصاً وہ لوگ جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر تھے۔ ان کا ایمان لانا مُعجزات پر منحصر نہ تھا۔ اور نہ مُعجزات اور خوارق اُن کی تسلّی کا باعث تھے۔ بلکہ وہ لوگ آنحضرتؐ کے اخلاقِ فاضلہ کو ہی دیکھ کر آپؐ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے۔ اخلاقی مُعجزات وہ کام کر سکتے ہیں جو اقتداری مُعجزات نہیں کر سکتے۔ اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ کا یہی مفہوم ہے۔ اور تجربہ کر کے دیکھ لو۔ کہ استقامت کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔ کرامت کی طرف تو چنداں التفات ہی نہیں ہوتا۔ خصوصاً آج کل کے زمانہ میں۔ لیکن اگر پتہ لگ جائے کہ فلاں شخص با اخلاق آدمی ہے۔ تو اس کی طرف جس قدر رجُوع ہوتا ہے۔ وہ کوئی مخفی امر نہیں۔ اخلاقِ

[1] المومنون: ۹۷

حمیدہ کی زد اُن لوگوں پر بھی پڑتی ہے جو کئی قسم کے نشانات کو دیکھ کر بھی اطمینان اور تسلی نہیں پا سکتے۔ بات یہ ہے کہ بعض آدمی ظاہری مُعجزات اور خوارق کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں اور بعض حقایق اور معارف کو دیکھ کر۔ مگر اکثر لوگ وُہ ہوتے ہیں۔ جن کی ہدایت اور تسلی کا موجب اخلاق فاضلہ اور التفات ہوتے ہیں۔

ہمارے نبی کریمؐ کے مُعجزات

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر ایک قسم کے خوارق اور مُعجزات حاصل تھے ہم آپؐ کی شان کیا بیان کریں۔ جس طرف دیکھو۔ بیشمار مُعجزات ملیں گے۔ ہر سہ اقسام بالا کے مُعجزات ملیں گے۔ ہر سہ اقسام بالا کے مُعجزات کا آپؐ مجموعہ تھے۔ ظاہری خوارق مثل شق القمر وغیرہ، دیگر مُعجزات جن کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے۔ معارف اور حقایق کے مُعجزات سے تو سارا قرآن شریف لبریز ہے۔ جو ہر وقت تازہ اور نئے ہیں۔ اور بلحاظ اخلاقی مُعجزات کے خود آپؐ کا وجود مقدس اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[1] (پ۲۹) کا مصداق ہے۔ قرآن کریم اپنے اعجاز کے ثبوت میں اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ[2] (پ۱) کہتا ہے۔ یہ مُعجزات رُوحانی ہیں جس طرح وحدانیت کے دلائل دیئے ہیں۔ اسی طرح پر اس کی حکمت، فصاحت، بلاغت کی مثل لانے پر بھی انسان قادر نہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا۔ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ[3] (پ۱۵)

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے۔

غرض روحانی معجزات کے بارہ میں کوئی یہ خیال نہ کر لے۔ کہ یہ مسلمانوں کا زعم اور خیال باطل ہے۔ آجکل کے نیچری نہیں بلکہ (وُہ لوگ جو) خلاف نیچر (ہیں) یہ نہیں مانتے کہ فصاحت و بلاغت قرآن شریف کا معجزہ ہے۔ سیّد احمد نے بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اور وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ نہیں مانتے۔ جب ہم یاد کرتے ہیں۔ تو ہم کو افسوس

[1] القلم: ۵ [2] البقرۃ: ۲۴ [3] بنی اسرائیل: ۸۹

ہوتا ہے کہ سیّد احمد نے مُعجزات سے انکار کیا ہے۔سیّد صاحب کسی طور سے مُعجزہ نہیں مان سکتے۔کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ایک معمولی درجہ کا آدمی یا اعلیٰ درجہ کا آدمی بھی نظیر بنا سکتا ہے۔مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ اتنا نہیں جانتے کہ قرآن مجید لانے والا وہ شان رکھتا ہے کہ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (پ۳۰)[1] ایسی کتاب جس میں ساری کتابیں اور ساری صداقتیں موجود ہیں۔کتاب سے مراد اور عام مفہوم وہ عمدہ باتیں ہیں۔ جو بالطبع انسان قابلِ تقلید سمجھتا ہے۔

قرآن کے اندر ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان موجود ہے

قرآن شریف حکمتوں اور معارف کا جامع ہے۔اور وہ رطب و یابس فضولیات کا کوئی ذخیرہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔ہر ایک امر کی تفسیر وہ خود کرتا ہے۔اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔وہ ہر ایک پہلو سے نشان اور آیت ہے۔اگر کوئی اس امر کا انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں آجکل توحید اور ہستی الٰہی پر بہت زور آور حملے ہو رہے ہیں۔عیسائیوں نے بھی بہت کچھ زور مارا اور لکھا ہے۔لیکن جو کچھ کہا اور لکھا وہ اسلام کے خدا کی بابت ہی لکھا ہے۔نہ کہ ایک مُردہ، مصلوب اور عاجز خدا کی بابت۔ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر قلم اُٹھائے گا۔اس کو آخر کار اسی خدا کی طرف آنا پڑے گا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک پتّے میں اس کا پتہ ملتا ہے۔اور بالطبع انسان اُسی خدا کا نقش اپنے اندر رکھتا ہے۔غرض ایسے آدمیوں کا قدم جب اُٹھے گا وُہ اسلام ہی کے مَیدان کی طرف اُٹھے گا۔یہ بھی تو ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔

منکرینِ اعجازِ قرآن کو چیلنج

اگر کوئی شخص قرآن کریم کے اِس مُعجزہ کا اِنکار کرے تو ایک ہی پہلو سے ہم آزما لیتے ہیں۔یعنی اگر کوئی شخص قرآن کریم کو خدا تعالےٰ کا کلام نہیں مانتا۔تو اس رُوشنی اور

[1] البیّنۃ : ۳،۴

سائنس کے زمانہ میں ایسا مدعی خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلائل لکھے بالمقابل ہم وہ تمام دلائل قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھلادیں گے۔ اور اگر وہ شخص توحید الٰہی کی نسبت دلائل قلمبند کرے تو وُہ سب دلائل بھی ہم قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھادیں گے۔ پھر وُہ ایسے دلائل کا دعویٰ کر کے لکھے جو قرآن کریم میں نہیں پائے جاتے۔ یا اُن صداقتوں اور پاک تعلیموں پر دلائل لکھے جن کی نسبت اس کا خیال ہو کہ وُہ قرآن کریم میں نہیں ہیں۔ تو ہم ایسے شخص کو واضح طور پر دکھلادیں گے کہ قرآن شریف کا دعویٰ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ [1] کیسا سچّا اور صاف ہے۔ اور یا اصل و فطرتی مذہب کی بابت دلائل لکھنا چاہے تو ہم ہر پہلو سے قرآن کریم کا اعجاز ثابت کر کے دکھلادیں گے۔ اور بتلادیں گے کہ تمام صداقتیں اور پاک تعلیمیں قرآن کریم میں موجُود ہیں۔

قرآن کریم کے معارف و اسرار کے حاصل کرنے کیلئے قوّتِ قدسیہ کی ضرورت ہے

الغرض قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر ایک قسم کے معارف اور اسرار موجود ہیں۔ لیکن اُن کے حاصل کرنے کے لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اسی قوّتِ قدسیہ کی ضرورت ہے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ [2]

مقاماتِ حریری وغیرہ اور قرآن مجید

ایسا ہی فصاحت، بلاغت میں (اس کا مقابلہ ناممکن ہے) مثلاً سورۂ فاتحہ کی موجودہ ترتیب چھوڑ کر کوئی اور ترتیب استعمال کرو۔ تو وہ مطالب عالیہ اور مقاصد عظمیٰ جو اس ترتیب میں موجود ہیں۔ ممکن نہیں کہ کسی دوسری ترتیب میں بیان ہو سکیں۔ کوئی سی سُورۃ لیلو۔ خواہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [3] ہی کیوں نہ ہو۔ جس قدر نرمی اور ملاطفت کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر اس میں معارف اور حقائق ہیں۔ وُہ کوئی دوسرا بیان نہ کر سکے گا۔ یہ بھی فقط اعجاز قرآن ہی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب بعض نادان مقاماتِ حریری یا سبع معلقہ کو بے نظیر اور بے مثل کہتے ہیں۔ اور اس طرح پر قرآن کریم کی بے مانندیت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے۔

[1] البیّنۃ : ۴ [2] الواقعہ : ۸۰ [3] الاخلاص : ۲

کہ اوّل تو تحریری کے مصنف نے کہیں اس کے بے نظیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور دوم یہ کہ مصنفِ تحریری خود قرآن کریم کی اعجازی فصاحت کا قائل تھا۔ علاوہ ازیں معترضین راستی اور صداقت کو ذہن میں نہیں رکھتے۔ بلکہ اُن کو چھوڑ کر محض الفاظ کی طرف جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا کتابیں حق اور حکمت سے خالی ہیں۔

اعجاز کی خوبی

اعجاز کی خوبی اور وجہ تو یہی ہے کہ ہر ایک قسم کی رعایت کو زیرِ نظر رکھے۔ فصاحت اور بلاغت بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ صداقت اور حکمت کو بھی نہ چھوڑے۔ یہ معجزہ صرف قرآن شریف ہی کا ہے۔ جو آفتاب کی طرح روشن ہے۔ اور ہر پہلو سے اپنے اندر اعجازی طاقت رکھتا ہے۔ انجیل کی طرح محض زبانی ہی جمع خرچ نہیں۔ کہ "ایک گال پر طانچہ مارے تو دوسری بھی پھیر دو۔" یہ لحاظ اور خیال نہیں کہ ایسی تعلیم حکیمانہ فعل سے کہانتک تعلق رکھتی ہے۔ اور انسان کی فطرت کا لحاظ اِس میں کہانتک ہے؟

اس کے مقابل میں قرآن کریم کی تعلیم پڑھینگے تو پتہ لگ جائیگا کہ انسان کے خیالات اس طرح ہر پہلو پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اور ایسی مکمل اور بے نقص تعلیم جیسی کہ قرآن شریف کی ہے۔ زمینی دماغ اور ذہن کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ہمارے رُوبرُو ایک ہزار مسکین آدمی ہوں۔ اور ان میں سے ہم چند ایک کو کچھ دے دیں اور باقی کا خیال تک بھی نہ کریں۔ ایسا ہی انجیل ایک ہی پہلو پر پڑی ہے۔ باقی پہلوؤں کا اُسے خیال تک بھی نہیں رہا۔ ہم یہ الزام انجیل پر نہیں دیتے کیونکہ یہ یہودیوں کی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے جیسی اُن کی استعدادیں تھیں۔ انہیں کے موافق انجیل آئی "جیسی رُوح ویسے فرشتے" اس میں کسی کا کیا قصور؟

انجیل کی تعلیم مختص الزمان تھی

اس کے علاوہ انجیل ایک قانون ہے مختص المقام والزمان اور مختص القوم جیسا کہ

انگریز بھی قوانین مختص المقام اور مختص الوقت نافذ کر دیا کرتے ہیں۔ جن کا بعد از وقت کوئی اثر نہیں رہتا۔ اسی طرح انجیل بھی ایک مختص قانون ہے۔ عام نہیں۔ مگر اس کے خلاف تعلیم قرآنی کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ قیامت تک ایک ہی لاتبدیل قانون ہے۔ اور ہر قوم اور ہر وقت کے لئے ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (پ۱۴)[1] یعنی ہم اپنے خزانوں میں سے بقدر معلوم نازل کرتے ہیں۔ انجیل کی ضرورت (صرف) اسی قدر تھی۔ اس لئے انجیل کا خلاصہ (صرف) ایک صفحہ میں آسکتا ہے۔

قرآن سب زمانوں کے لئے ہے

لیکن قرآن کریم کی ضرورتیں تھیں سارے زمانہ کی اصلاح۔ قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا، انسانی آداب سے مہذّب انسان بنانا۔ تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو۔ اور پھر باخُدا انسان بنانا۔ گو یہ لفظ مختصر ہیں۔ مگر اُن کے ہزارہا شعبے ہیں۔ چونکہ یہودیوں، طبیعیوں، آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں بدروشنی کی رُوح کام کر رہی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے باعلام الٰہی سب کو مخاطب کر کے فرمایا۔ یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (پ۹)[2] اس لئے ضروری تھا کہ قرآن شریف ان تعلیمات کا جامع ہوتا۔ جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں۔ اور ان تمام صداقتوں کو اپنے اندر رکھتا۔ جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعے سے زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ قرآن کریم کے مدِّنظر تمام نوع انسان تھا نہ کوئی خاص قوم اور ملک اور زمانہ۔ اور انجیل کے مدِّنظر (صرف) ایک خاص قوم تھی۔ اسی لئے مسیح علیہ السلام نے بار بار کہا کہ "میں اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں"۔

بعد تورات ضرورتِ قرآن شریف

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ قرآن کیا لایا؟ اس میں وُہی کچھ تو ہے جو توراۃ میں درج

[1] الحجر: ۲۲ [2] الاعراف: ۱۵۹

ہے۔ اور اسی کوتاہ نظری نے بعض عیسائیوں کو عدمِ ضرورتِ قرآن جیسے رسائل لکھنے پر دلیر کر دیا۔ کاش وہ سچی دانائی اور حقیقی فراست سے حصّہ رکھتے۔ تا وُہ بھٹک نہ جاتے ایسے لوگ کہتے ہیں۔ کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ تُو زنا نہ کر۔ ایسا ہی قرآن میں لکھا ہے کہ زنا نہ کر۔ قرآن توحید سکھاتا ہے اور توراۃ بھی خدائے واحد کی پرستش سکھلاتی ہے۔ پھر فرق کیا ہوا؟ بظاہر یہ سوال بڑا پیچدار ہے۔ اور اگر کسی ناواقف آدمی کے سامنے پیش کیا جاوے تو وُہ گھبرا جاوے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اس قسم کے باریک اور پیچدار سوالات کا حل بھی اللہ تعالےٰ کے خاص فضل کے بغیر ممکن نہیں یہی تو قرآنی معارف ہیں۔ جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن شریف اور توراۃ میں تطابق ضرور ہے۔ اس سے ہم کو انکار نہیں۔ لیکن توراۃ نے صرف مَتن کو لیا ہے جس کے ساتھ دلائل، براہین اور شرح نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم نے معقولی رنگ کو لیا ہے۔ اس لئے کہ توریت کے (نزول کے) وقت انسانوں کی اِستعدادیں وحشیانہ رنگ میں تھیں۔ (مگر قرآن شریف کے نزول کے وقت اِستعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں) اس لئے قرآن شریف نے وُہ طریق اختیار کیا جو اخلاق کے منافع کو ظاہر کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اخلاق کے مفاد یہ ہیں۔ اور نہ صرف مفاد اور منافع کو بیان ہی کرتا ہے۔ بلکہ معقولی طور پر دلائل اور براہین کے ساتھ اُن کو پیش کرتا ہے۔ تا کہ عقلِ سلیم سے کام لینے والوں کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ قرآن شریف کے وقت اِستعدادیں معقولیّت کا رنگ پکڑ گئی تھیں۔ اور توریت کے وقت وحشیانہ حالت تھی بحضرت آدم ؑ سے لے کر زمانہ ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ یہانتک کہ قرآن شریف کے وقت وُہ دائرہ کی طرح پُورا ہو گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ زمانہ مستدیر ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[1] (پ۲۲) ✦

[1] الاحزاب : ۴۱

ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں

ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں۔ ظلماتی راتیں اس نُور کو کھینچتی ہیں۔ جو دُنیا کو تاریکی سے نجات دے۔ اس ضرورت کے موافق نبوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جب قرآن کریم کے زمانہ تک پہنچا۔ تو مکمل ہوگیا۔ اب (گویا) سب ضرورتیں پوری ہوگئیں۔ اِس سے لازم آیا کہ آپؐ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے۔ اب بڑا اور واضح فرق (تورات و قرآن شریف کی تعلیم میں) ایک تو یہی ہے۔ کہ قرآن شریف نے دلائل پیش کئے ہیں جن کو توریت نے مَس تک نہیں کیا۔

قرآن و توریت کی تعلیم میں دُوسرا فرق

اور دُوسرا فرق یہ ہے کہ تورات نے صرف بنی اسرائیل کو مخاطب کیا ہے۔ اور دُوسری قوموں سے کوئی تعلق اور واسطہ ہی نہیں رکھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے دلائل براہین پر زور نہیں دیا۔ کیونکہ توریت کے زیرِ نظر کوئی دُوسرا فرقہ (یا مذہب مثل) دہریہ فلاسفیہ اور براہمہ وغیرہ کا نہ تھا۔ بخلاف اس کے قرآن شریف کے مخاطب چونکہ کُل مِلَل اور فِرقے تھے۔ اور اس تک پہنچ کر تمام ضرورتیں ختم ہوگئی تھیں۔ اس لئے قرآن کریم نے عقاید کو بھی اور احکامِ عملی کو بھی مدلّل (طور پر بیان) کیا۔

پَردہ کا حُکم

چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ (پ۱۸) یعنی مومنوں کو کہدے کہ کسی کے سَتر کو آنکھ پھاڑ کر نہ دیکھیں اور باقی تمام فرُوج کی بھی حفاظت کریں۔ یعنی انسان پر لازم ہے کہ چشم خوابیدہ ہوتا کہ کسی غیر محرم عورت کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔ کان بھی فرُوج میں داخل ہیں جو قصص اور فحش باتیں سُن کر فتنہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر فرمایا۔ کہ تمام موریوں (سُوراخوں) کو محفوظ رکھو اور فضُولیات سے بالکل بند رکھو ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ (پ۱۸)۔ یہ

مومنوں کے لئے بہت ہی بہتر ہے۔ اور یہ طریق تعلیم ایسی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اپنے اندر رکھتا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بدکاروں میں نہ ہوگے۔

قرآن دلائل وبراہین بھی خود ہی بیان کرتا ہے

دیکھو! قرآن نے اسی ایک امر کو جو توریت میں بھی اپنے لفظوں اور اپنے مفہوم پر بیان ہوا کیسا شرح وبسط کے ساتھ اور دلائل اور براہین کے ساتھ مؤکد کر کے بیان فرمایا۔ یہی تو قرآنی اعجاز ہے کہ وہ اپنے پیرو کو کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہونے دیتا۔ دلائل اور براہین بھی خود ہی بیان کر کے اُسے مستغنی کر دیتا ہے۔ قرآن شریف نے دلائل کے ساتھ احکام کو لکھا ہے۔ اور ہر حکم کے جُداگانہ دلائل دیئے ہیں۔ غرض یہ دو بڑے فرق ہیں۔ جو توریت اور قرآن میں ہیں۔ اوّل الذکر میں طریق استدلال نہیں۔ دعوے کی دلیل خود تلاش کرنی پڑتی ہے۔ آخرالذکر اپنے دعوے کو ہر قسم کی دلیل سے مدلّل کرتا ہے۔ اور پھر پیش کرتا ہے۔ اور خدا کے احکام کو زبردستی نہیں منواتا۔ بلکہ اِنسان کے منہ سے سرِ تسلیم خم کرنے کی صدا نکلواتا ہے۔ نہ کسی جبر و اکراہ سے بلکہ اپنے لطیف طریق استدلال سے اور فطری سیادت سے۔ توریت کا مخاطب خاص گروہ ہے اور قرآن کے مخاطب کُل لوگ جو قیامت تک پیدا ہوں گے۔ پھر بتلاؤ۔ کہ توریت اور قرآن کیونکر ایک ہو جائیں۔ اور توریت کے ہونے سے کیونکر ضرورتِ قرآن نہ پڑے۔ قرآن جب کہتا ہے۔ کہ تُو زنا نہ کر۔ تو کُل بنی نوعِ انسان اُس کا مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی لفظ توریت بولتی ہے۔ تو اُس کا مخاطب اور مشارٌ الیہ وُہی قوم بنی اسرائیل ہوتی ہے۔ اس سے بھی قرآن کی فضیلت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ مگر دُور اندیش اور خدا ترس دل ہو۔ تو۔

قرآن شریف جسمانی اور رُوحانی ہر دو قسم کے خوارق اپنے اندر رکھتا ہے۔

(علاوہ ازیں) توریت اور قرآن میں یہ بھی ایک فرقِ عظیم ہے۔ کہ قرآن جسمانی اور رُوحانی خوارق ہر قسم کے اپنے اندر رکھتا ہے۔ مثلاً شق القمر کا مُعجزہ جسمانی مُعجزات کی قسم سے

ہے بعض نادان شق القمر کے معجزہ پر قانونِ قدرت کی آڑ میں چھپ کر اعتراض کرتے ہیں لیکن اُن کو اتنا معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور قوانین کا احاطہ اور اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قانونِ قدرت کی تحدید نہیں ہو سکتی

ایک وقت تو وُہ منہ سے خدا بولتے ہیں لیکن دُوسرے وقت پر جائیکہ اُن کے دل، اُن کی رُوح خدائے تعالیٰ کی عظیم الشان اور وراء الوراء قدرتوں کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑے۔ اُسے مطلق بھُول جاتے ہیں۔ اگر خدا کی ہستی اور بساط یہی ہے۔ کہ اُس کی قدرتیں اور طاقتیں ہمارے ہی خیالات اور اندازہ تک محدود ہیں۔ تو پھر دُعا کی کیا ضرورت رہی؟ لیکن نہیں۔ میں تمہیں بتلاتا ہُوں کہ اللہ تعالےٰ کی قدرتوں اور ارادوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ایسا انسان جو یہ دعویٰ کرے وُہ خدا کا مُنکر ہے۔ لیکن کس قدر واویلا ہے اُس نادان پر جو اللہ تعالےٰ کو لامحدود قدرتوں کا مالک سمجھ کر بھی یہ کہے کہ شق القمر کا معجزہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ سمجھ لو کہ ایسا آدمی فکرِ سلیم اور دُور اندیش دِل سے بہرہ مند نہیں۔ خوب یاد رکھو۔ کہ کبھی قانُونِ قدرت پر بھروسہ نہ کر لو یعنی کہیں قانونِ قدرت کی حد نہ ٹھہرا لو۔ کہ بس خدا کی خدائی کا سارا راز یہی ہے۔ پھر تو سارا تار و پود کھُل گیا۔ نہیں۔ اس قسم کی دلیری اور جسارت نہ کرنی چاہیئے۔ جو انسان کو عبُودیت کے درجہ سے گرا دے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ ایسی بیوقوفی اور حماقت کرنا کہ خدا کی قدرتوں کو محصُور اور محدُود کرنا کسی مومن سے نہیں ہو سکتی۔ امام فخر الدین رازی کا یہ قول بہت درست ہے کہ جو شخص خدا تعالےٰ کو عقل کے پیمانہ سے اندازہ کرنے کا ارادہ کریگا وُہ بیوقوف ہے۔ دیکھو نُطفہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ یہ لفظ کہہ دینے آسان اور بالکل آسان ہیں۔ اور یہ بالکل معمولی سی بات نظر آتی ہے۔ مگر یہ ایک سِرّ اور راز ہے کہ ایک قطرۂ آب سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور اس میں اس قسم کے قویٰ رکھ دیتا ہے۔ کیا کسی عقل کی طاقت ہے کہ وہ اس کی کیفیت اور کُنہ تک پہنچے۔ طبیعیوں اور فلاسفروں نے بہتیرا زور مارا لیکن وہ اس کی ماہیت پر اطلاع نہ پا سکے۔ اسی طرح ایک ایک ذرّہ خدا

تعالیٰ کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پہ قادر ہے کہ یہ ظاہری نظام بھی اُسی طرح رہے اور ایک خارقِ عادت امر بھی ظاہر ہو جاوے۔ عارف لوگ ان کیفیتوں کو خوب دیکھتے اور اُن سے حظ اُٹھاتے ہیں۔ بعض لوگ ایک ادنیٰ ادنیٰ اور معمولی باتوں پر اعتراض کر دیتے ہیں۔ اور شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا۔ یہ امر بھی ایسا ہی ہے جیسا شق القمر کے متعلق۔ خدا خوب جانتا ہے کہ اس حد تک آگ جلاتی ہے۔ اور اِن اسباب کے پیدا ہونے سے فرو ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا مصالحہ ظاہر ہو جاوے یا بتلا دیا جاوے تو فی الفور مان لیں گے۔ لیکن ایسی صورت میں ایمان بالغیب اور حسنِ ظن کا لُطف اور خوبی کیا ظاہر ہو گی۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ خدا خلقِ اسباب نہیں کرتا۔ مگر بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں۔ اور بعض اسباب نظر نہیں آتے۔ غرض یہ ہے کہ خدا کے افعال گُوناگوں ہیں۔ خدا تعالیٰ کی قدرت کبھی درماندہ نہیں ہوتی اور وہ نہیں تھکتا۔ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ[1] اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ[2] (پ ۲۶) اس کی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں اور افعال کا کیسا ہی صاحبِ عقل اور علم کیوں نہ ہو، اندازہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُس کو اظہارِ عجز کرنا پڑتا ہے۔

مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ ڈاکٹر خوب جانتے ہیں۔ عبدالکریم نام ایک شخص میرے پاس آیا۔ اس کے پیٹ کے اندر ایک رسولی تھی۔ جو پاخانہ کی طرف بڑھتی جاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے کہا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کو بندوق مار کر مار دینا چاہیئے۔ الغرض بہت سے امراض اس قسم کے ہیں۔ جن کی ماہیت ڈاکٹروں کو بخوبی معلوم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً طاعون یا ہیضہ ایسے امراض ہیں کہ ڈاکٹر کو اگر پلیگ ڈیوٹی پر مقرر کیا جاوے۔ تو اُسے خود ہی دست لگ جاتے ہیں۔ انسان جہانتک ممکن ہو علم پڑھے اور فلسفہ کی تحقیقات میں محو ہو جاوے۔ لیکن بالآخر اُس کو معلوم ہو گا۔ کہ اُس نے کچھ ہی نہیں کیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے سمندر کے کنارے ایک چڑیا پانی کی چونچ بھرتی ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے کلام اور فعل کے معارف

[1] یٰسٓ: ۸۰ [2] قٓ: ۱۶

اور اسرار سے حصہ ملتا ہے۔ پھر کیا عاجز انسان۔ ہاں۔ نادان فلسفی اسی حیثیت اور شیخی پر خدا تعالیٰ کے ایک فعل شق القمر پر اعتراض کرتا اور اُسے قانونِ قدرت کے خلاف ٹھہراتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اعتراض نہ کرو۔ نہیں کرو اور ضرور کرو۔ شوق سے اور دل کھول کر کرو۔

اعتراض کرتے وقت دو امر مدنظر رکھو

لیکن دو باتیں زیرِ نظر رکھ لو۔ اوّل خدا کا خوف (اور اُس کی لامحدود طاقت)۔ دوسرے (انسان کی نیستی اور محدود علم) بڑے بڑے فلاسفر بھی آخر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہم جاہل ہیں۔ انتہائے عقل ہمیشہ انتہائے جہل پر ہوتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں سے پوچھو۔ کہ عصبہ مجوفہ کو سب وُہ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ مگر نُور کی ماہیت اور اُس کا کُنہ تو بتلاؤ کہ کیا ہے آواز کی ماہیت پوچھو تو یہ تو کہدیں گے کہ کان کے پردہ پر یُوں ہوتا ہے اور وُوں ہوتا ہے۔ لیکن ماہیتِ آواز خاک بھی نہ بتلا سکیں گے۔ آگ کی گرمی اور پانی کی ٹھنڈک پر کیوں کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کُنہِ اشیاء تک پہنچنا کسی حکیم یا فلاسفر کا کام نہیں ہے۔ دیکھئے ہماری شکل آئینہ میں منعکس ہوتی ہے لیکن ہمارا سر ٹوٹ کر شیشہ کے اندر نہیں چلا جاتا۔ ہم بھی سلامت ہیں اور ہمارا چہرہ بھی آئینہ کے اندر نظر آتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ چاند شق ہو اور شق ہو کر بھی انتظامِ دُنیا میں خلل نہ آوے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اشیاء کے خواص ہیں۔ کون دم مار سکتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے خوارق اور مُعجزات کا انکار کرنا اور انکار کے لئے جلدی کرنا شتاب کاروں اور نادانوں کا کام ہے۔

خُدا کی قُدرتوں اور عجائبات کو محدُود سمجھنا دانشمندی نہیں

خدا کی قدرتوں اور عجائبات کو محدُود سمجھنا دانشمندی نہیں۔ وہ اپنی ماہیت نہیں جانتا۔ اور سمجھتا اور آسمانی باتوں پر رائے زنی کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ؎

تو کار زمین را نکو ساختی　　　　که با آسماں نیز پرداختی

انسان کو لازم ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر قدم نہ مارے۔ اکثر امراض اور عوارض کے اسباب اور علامات ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تو کیا ایسی کمزوری پر اُسے مناسب ہے کہ وُہ بساط سے بڑھ کر چلے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ طریق عبودیت یہی ہے کہ سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ[1] کہنے والوں کے ساتھ ہو۔ دیکھو۔ ستارے جو اتنے بڑے بڑے گولے ہیں۔ آسمان میں بغیر ستون کے لٹکتے ہیں۔ اور خود آسمان بغیر کسی سہارے کے ہزارہا سال سے اسی طرح چلے آئے ہیں۔ چاند ہر روز دُھلا دُھلایا نکلتا ہے۔ آفتاب ہر روز طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک رفتار اور روش پر چلتا ہے۔ ہمارے کاموں میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کام دیکھو کہ یہی چاند سُورج اپنے ایک ہی طریق پر چلتے ہیں۔ اگر ہر روز اِن باتوں کو سوچو کہ سُورج ہر روز مقررہ طریق پر نکلتا ہے۔ جہات کو بتلاتا ہے تو دیوانہ ہو جاؤ دیکھو ہم پر اتنی حالتیں آتی ہیں اور سُورج پر کوئی حالت نہیں آتی۔ ایک گھڑی جو دو ہزار روپیہ کی ہو۔ اگر وہ بارہ کی بجائے دس اور دس کی بجائے بارہ بجائے۔ تو نکمّی اور ناقص سمجھی جائے گی۔ لیکن خدائیتعالیٰ کی قائم کردہ گھڑی ایسی ہے۔ کہ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں اور نہ اس کو کسی چابی کی ضرورت۔ نہ صاف کرنے کی حاجت۔ کیا ایسے صانع کی طاقتوں کا شمار کر سکتے ہیں۔ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہماری اشیاء کپڑے برتن وغیرہ جو استعمال میں آتے ہیں گھِستے رہتے ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے ہو کر مرتے ہیں۔ لیکن جو سُورج کل طلُوع ہوا تھا آج بھی وہی سورج ہے اور ایک لاتعداد زمانہ سے اسی طرح چلا آیا ہے۔ اور چلا جائیگا۔ مگر اس پر کوئی حالت تحلیل وغیرہ کی یا اثر زمانہ کا نہیں ہوتا۔ کس قدر گستاخی ہے کہ ایک کیڑے ہو کر اس رافع ذاتِ الٰہی پر حملہ کریں اور جلدی سے حکم کر دیں کہ خدا میں طاقت نہیں۔

مُعجزاتِ انبیاء کی وجہ

اِسلام کا خدا بڑا طاقتور خدا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ اس کی طاقتوں پر اعتراض

[1] البقرة : ۳۳

کرے۔ انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات دیئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی تجارب شناخت نہیں کر سکتے۔ اور جب انسان اُن خارق عادت امور کو دیکھتا ہے۔ تو ایکبار تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن اگر اپنی عقل کا ادعا کرے اور تفہیم الٰہی کے کُوچے میں قدم نہ رکھے تو دونوں طرف سے راہ بند ہو جاتی ہے۔ ایک طرف معجزات کا انکار۔ دوسری طرف عقلِ خام کا ادّعا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دقیق در دقیق کُنہ کے دریافت کرنے کی فکر میں وہ نادان انسان لگ جاتا ہے۔ جو معجزات کی تہ میں ہے اور جس کی فلاسفی زمینی عقل اور سطحی خیالات پر نہیں کُھل سکتی۔ اس سے وُہ انکار کی طرف رجُوع کرتے کرتے نبوّت کے نفس کا ہی مُنکر ہو جاتا ہے اور شکوک اور وساوس کا ایک بہت سا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے جو اس کی شقاوت کا موجب ہو کر رہتا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیتا ہے۔ کہ یہ بھی ہمارے جیسا ایک آدمی ہے۔ جو کھاتا پیتا اور حوائجِ انسانی رکھتا ہے۔ اس کی طاقتیں ہم سے کیونکر بڑھ سکتی ہیں؟ اس کی طاقتوں میں رُوحانیّت کی قوت، اور دُعاؤں میں استجابت کا اثر کیونکر خاص طور پر آجائے گا؟ افسوس! اس قسم کی باتیں بناتے اور اعتراض کرتے ہیں جس کے سبب جیسا میں نے ابھی کہا۔ نفسِ نبوّت کا اِنکار کر دیتے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے۔ کہ معمولی طور پر تو مانتے نہیں۔ اور غیر معمولی طور پر اعتراض کرتے ہیں۔ اب یہ عمداً اور صریحاً انبیاء علیہم السلام کے وجُود کا اِنکار نہیں تو اَور کیا ہے۔ کیا اِنہی عقلوں اور دانشوں پر ناز ہے کہ فلاسفر کہلا کر دہریہ یا بُت پرست ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مخفی طاقتیں کبھی الہام اور وحی کے سوا اپنا کرشمہ نہیں دکھلا سکتیں۔ وہ وحی اور الہام ہی کے رنگ میں نظر آتی ہیں۔

عقلمند وُہ ہے جو نبی کو شناخت کرتا ہے

یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمانیّت کا تقاضا ہے کہ اُس نے دُنیا میں اپنے نبی بھیجے۔ عقلمند وُہ ہے جو نبی کو شناخت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خُدا کو شناخت کرتا ہے۔ اور بیوقوف وُہ ہے جو نبی کا اِنکار کرتا ہے۔ کیونکہ نبوّت کا اِنکار اُلوہیّت کے اِنکار کو مُستلزم ہے۔

اور جو ولی کو شناخت کرتا ہے وہ نبی کو شناخت کرتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہہ سکتے ہیں کہ نبی اُلوہیت کے لئے بطور ایک میخ آہنی کے ہے۔ اور ولی نبی کے لئے۔ اب ذرا ٹھنڈے دِل سے سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرہ سَو سال پہلے اس سِلسلہ کو دُنیا میں ظاہر کیا۔ اور آنحضرت صلعم کے ذریعے ظاہر کیا۔ لیکن آج تیرہ سَو سال بعد اور اس وقت کہ چودھویں صدی کے بھی پندرہ سال گذر گئے۔ اس کو آریوں، برہموؤں، طبیعیوں اور دہریوں یا عیسائیوں کے سامنے بیان کرو۔ تو وہ ہنس دیتے ہیں اور تمسخر میں اُڑا دیتے ہیں۔ ایسی مصیبت کے وقت میں کہ ایک طرف علُوم جدیدہ کی روشنی، دوسری طرف طبیعیوں میں ایک خاص انقلاب پیدا ہو جانے کے بعد مختلف فِرقوں اور مذہبوں کی کثرت ہے۔ ان امُور کا پیش کرنا اور لوگوں سے منوانا بہت ہی پیچیدہ بات ہو گئی تھی۔ اور اِسلام اور اس کی باتیں ایک قصّہ کہانی سمجھی جانے لگی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ[1] (پ۱۴) کا وعدہ دے کر قرآن اور اِسلام کی حفاظت کا خود ذمّہ دار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اِس مصیبت سے بچا لیا۔ اور فتنہ میں پڑنے نہ دیا۔ پس مُبارک ہیں وُہ لوگ جو اس سِلسلہ کی قدر کرتے اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ اگر ثبوت نہ ملے تو یہ بالکُل ٹھیک ہے کہ جیسا انسانی طبائع کا خاصّہ ہے کہ وُہ بدظنّی کی طرف جھٹ رجُوع کر لیتی ہیں۔ تو اندرُونی طور پر ہی لوگ ایک قصّہ کہانی سمجھ کر قرآن اور اسلام سے دستبردار ہو جاتے۔ مثلاً دیکھو۔ اگر اندر کھڑکا ہو تو باہر والا خواہ مخواہ خیال کریگا۔ کہ اندر کوئی آدمی ضرور ہے۔ مگر وُہ جب دو چار دن تک دیکھتا ہے کہ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ تو پھر اُس کا خیال مبدّل ہونا شروع ہوتا ہے۔ تو پھر بدُوں اندر جانے کے ہی وُہ سمجھ لیتا ہے کہ اگر انسان ہوتا۔ تو اُس کو کھانے پینے کی ضرورت پڑتی اور وُہ ضرور باہر آتا۔ اگر نبوّت کے انوار و برکات جو وحی ولایت کے رنگ میں آتے ہیں۔ اس فلاسفی اور روشنی کے زمانہ میں ظاہر نہ ہوتے تو مسلمانوں کے بچے مُسلمانوں کے گھر میں رہ کر اِسلام اور قرآن کو ایک قصّہ کہانی اور داستان سمجھ لیتے۔

[1] الحجر: ۱۰

اور اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہتا۔ اس طرح پر گویا اسلام کو معدوم کرنے کا سلسلہ بندھ جاتا۔ مگر نہیں! اللہ تعالیٰ کی غیرت اُس کا ایفائے وعدہ کا جوش کب ایسا ہونے دیتا تھا جیسا کہ ابھی مَیں نے کہا۔ کہ خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ[1]

قرآن کا نام ذِکر رکھنے کی وجہ

اب دیکھو۔ قرآن کریم کا نام ذِکر رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ وُہ انسان کی اندرُونی شریعت یاد دلاتا ہے جب اسم فاعل کو مصدر کی صورت میں لاتے ہیں تو وہ مُبالغہ کا کام دیتا ہے۔ جیسا زَیْدٌ عَدْلٌ۔ کیا معنے۔ زید بہت عادل ہے۔ قرآن کوئی نئی تعلیم نہیں لایا۔ بلکہ اُس اندرُونی شریعت کو یاد دلاتا ہے۔ جو انسان کے اندر مختلف طاقتوں کی صُورت میں رکھی ہے۔ حِلم ہے۔ ایثار ہے۔ شجاعت ہے۔ جَبر ہے۔ غضب ہے۔ قناعت ہے وغیرہ۔ غرض جو فطرت باطن میں رکھی تھی۔ قرآن نے اُسے یاد دلایا جیسے فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ[2]۔ یعنی صحیفۂ فطرت میں کہ جو چھُپی ہوئی کتاب تھی اور جس کو ہر ایک شخص نہ دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح اِس کتاب کا نام ذِکر بیان کیا۔ تاکہ وہ پڑھی جاوے تو وہ اندرُونی اور رُوحانی قوتوں اور اس نورِ قلب کو جو آسمانی ودلیت انسان کے اندر ہے، یاد دلاوے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھیج کو بجائے خود ایک رُوحانی معجزہ دکھایا۔ تاکہ انسان اُن معارف اور حقایق اور رُوحانی خوارق کو معلوم کرے۔ جن کا اُسے پتہ نہ تھا۔ مگر افسوس کہ قرآن کی اس عِلّت غائی کو چھوڑ کر جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[3] ہے۔ اس کو صرف چند قصص کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اور نہایت بے پروائی اور خود غرضی سے مُشرکینِ عرب کی طرح اَسَاطِیْرُالْاَوَّلِیْن کہکر ٹالا جاتا ہے۔ وُہ زمانہ تھا آنحضرت صلعم کی بعثت کا۔ اور قرآن کے نزُول کا۔ جب وُہ دُنیا سے گُمشدہ طاقتوں کو یاد دلانے کے لئے آیا تھا۔ اَب وُہ زمانہ آگیا جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کی تھی۔ کہ لوگ قرآن پڑھیں گے۔ لیکن اُن کے حلق سے

[1] الحجر: ۱۰ [2] الواقعۃ: ۷۹ [3] البقرۃ: ۳

نیچے قرآن نہ اُترے گا۔

اِس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک معلّم آیا

سو اب تم اِن آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ لوگ قرآن کیسی خوش الحانی اور عُمدہ قرأت سے پڑھتے ہیں۔ لیکن وُہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں گزرتا۔ اس لئے جیسے قرآن کریم جس کا دوسرا نام ذِکر ہے۔ اُس ابتدائی زمانہ میں اِنسان کے اندر چھُپی ہوئی اور فراموش شدہ صداقتوں اور رُوحانیتوں کو یاد دلانے کے لئے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ واثقہ کی رُو سے کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] اس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک مُعلّم آیا جو اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[2] کا مصداق اور موعُود ہے۔ وُہ وُہی ہے۔ جو تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ میں پھر رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیشین گوئی کی طرف عُود کر کے کہتا ہوں کہ آپؐ نے اس زمانہ کی ہی بابت خبر دی تھی۔ کہ لوگ قرآن کو پڑھیں گے لیکن وُہ اُن کے حلق سے نیچے نہ اُترے گا۔ اب ہمارے مُخالف۔ نہیں نہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی قدر نہ کرنے والے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں پر دھیان نہ دینے والے خوب گلے پھلا پھلا کر یَاعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ[3] اور فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[4] قرآن میں عجیب لہجہ سے پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ اگر کوئی ناصح مشفق بن کر سمجھانا چاہے تو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ نہ کریں۔ اتنا تو کریں کہ اس کی بات ہی ذرا سُن لیں۔ مگر کیوں سُنیں؟ وہ گوشِ شنوا بھی رکھیں۔ صبر اور حُسنِ ظن سے بھی کام لیں۔ اگر خدا تعالیٰ فضل کے ساتھ زمین کی طرف توجہ نہ کرتا تو اسلام بھی اس زمانہ میں مثل دوسرے مذہبوں کے مُردہ اور ایک قصّہ کہانی سمجھا جاتا۔ کوئی مُردہ مذہب کسی دُوسرے کو زندگی نہیں دے سکتا۔ لیکن اسلام اِس وقت زندگی دینے کو تیار ہے۔ لیکن چونکہ یہ سُنّت اللہ ہے کہ کوئی کام خدا تعالےٰ بغیر اسباب کے نہیں کرتا۔ ہاں یہ امر جُدا ہے کہ وُہ اسباب ہم کو دکھائی دیں یا نہ۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسباب ضرور ہوتے ہیں

[1] الحجر: ۱۰ [2] الجمعہ: ۴ [3] اٰل عمران: ۵۶ [4] المائدہ: ۱۱۸

اسی طرح آسمان سے انوار اُترتے ہیں۔ جو زمین پر پہنچکر اسباب کی صُورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ کو تاریکی اور گمراہی میں مُبتلا پایا۔ اور ہر طرف سے ضلالت اور ظلمت کی گھنگھور گھٹا دُنیا پر چھا گئی۔ اُس وقت اُس تاریکی کو دُور کرنے اور ضلالت کو ہدایت اور سعادت سے تبدیل کرنے کے لئے ایک سراج منیر فاران کی چوٹیوں پر چمکا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم مبعُوث ہوئے۔

موجُودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت مصلح

اور ایسا ہی اِس زمانہ میں کہ جس میں ہم رہتے ہیں ایمانی طاقتیں مُردہ ہو کر فسق و فجُور نے اُن کی جگہ لے لی ہے۔ لوگوں کے معاملات ایک طرف۔ عبادات دُوسری طرف غرض ہر بات میں فتُور ہو گیا ہے۔ صرف یہ آفت ہی اگر ہوتی تو کچھ مُضائقہ اور چنداں خطر نہ تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے علاوہ سب سے بڑی آفت جس کا مجھے کئی بار ذکر کرنا پڑا ہے اور جس کو ہر ذی ہوش خواہ اِسلام کا دل محسُوس کر چکا ہے یا کر سکتا ہے وُہ وُہ زہریلا اثر ہے جو آج کل کی طبعی طبابت اور ہیئت اور جھُوٹے فلسفہ کے باعث اِسلام اور اہلِ اسلام پر پڑ رہا ہے۔ عُلماء تو اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ اُن کو خانہ جنگیوں اور اندرُونی جھگڑوں اور ایک دوسرے کی تکفیر بازی سے فُرصت ملے تو اِدھر توجہ کریں۔ زاہد اپنی گوشہ نشینی میں بیٹھ کر اگر دُعاؤں سے کام لیتے تو بھی کچھ آثار نیک پیدا ہوتے۔ مگر وُہ پیر پرستی اور جوازِ سماع وغیرہ کی بحثوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقی صُوفی ازم کی جگہ اب چند رسُومات نے لے لی جن کا قرآن اور سُنّت سے پتہ نہیں چلتا۔ الغرض ہر طرف سے اِسلام عُرضۂ تیغِ جُہلاء و سُفہاء ہو رہا ہے۔ اس وقت میں کہ وہ ضرورتیں جو کسی مُصلح اور ریفارمر کی آمد کے لئے لازم ہیں۔ پُورے اِنتہائی نُقطہ تک پہنچ چکی ہیں۔ ہر ایک شخص بجائے خود ایک نیا مذہب رکھتا ہے۔ ان تمام اُمور اور حالات پر قیاس کر کے اسلام کی عُمر خاتمہ کے قریب نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر اور طبیب جب کسی ہیضہ کے مریض کا بدن برف سا سرد یا اُسے سرسام میں مُبتلا

دیکھتے ہیں تو اُسے لاعلاج بتلا کر کھسک جاتے ہیں۔ اور حالتِ ردیہ دیکھ کر ڈاکٹر حاذق بھی یاس اور نومیدی ظاہر کر دیتا ہے۔ اب اِس وقت اسلام کی حالت پر کچھ شک نہیں کہ اُس کی اِنتہا یاس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اگر وُہ بھی انسان کے اپنے خیالات کا نتیجہ یا اپنی کوششوں کا ثمرہ ہوتا۔ تو ان مصائب اور شدائد کے دَوران میں کہ ہر طرف سے اُس پر زد پڑتی ہے اور اس کی اپنی اندرُونی حالت بوجہ نفاقِ باہمی کمزور ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں کم از کم اِسلام کا قائم رہنا جس کے معدُوم کرنے کے لئے مخالفوں نے ناخنوں تک زور لگایا۔ اور لگا رہے ہیں۔ بہت مشکل ہو جاتا۔ کوئی سال نہیں جاتا جبکہ کوئی نئی صُورت اِسلام پر حملہ کرنے کی نہیں تراشی جاتی۔ اگر کوئی اِیجاد یا کَل بنائی جاتی ہے۔ اُس کے لئے اصُول کو زیرِ نظر رکھ کر اسلام پر حملہ کر دیا جاتا ہے +

آج کل کی ترقی بھی اِسلام کا ایک مُعجزہ ہے

الغرض ایسے فِتنے کے وقت میں قریب تھا کہ دشمن اکٹھے ہو کر ایک دفعہ ہی مسلمانوں کو برگشتہ کر دیتے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے زبردست ہاتھ نے اِسلام کو سنبھالے رکھا۔ یہ بھی ایک دلیل ہے اِسلام کی صداقت کی۔ آجکل کی ترقی بھی اسلام کا ایک مُعجزہ ہے۔ پس دیکھو کہ مخالفوں نے اپنی ساری طاقتیں اور قوتیں حتّٰی کہ جان اور مال تک بھی اِسلام کے نابُود کرنے میں صَرف کر دیا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اپنے وعدہ کے موافق اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] یعنی خدا آپ ہی اُن نقوشِ فطرت کو یاد دلانے والا ہے اور وُہی خطرہ کے وقت اِس کو بچا لیگا۔ اِسلام کی کشتی خطرہ میں جا پڑی تھی۔ پادریوں کا حملہ جنہوں نے کروڑہا روپیہ خرچ کر کے اور طرح طرح کے منافع اور وعدے۔ یہانتک کہ شرمناک نفسانی حظُوظ تک بھی دکھا کر لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ اور دُوسری طرف اسلامی عقائد کو بَدنام کرتے ہیں۔ دیکھو۔ اِمساک بارش کی وجہ سے استسقاء کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اگر کَل سے بارش برسانے میں کامیابی ہو جاوے۔ جیسا کہ آجکل بعض

[1] الحجر : ۱۰

لوگ امریکہ وغیرہ میں کوششیں کرتے ہیں۔ تو اس طرح پر ایک رُکن ٹوٹ جائیگا۔

اس ترقی کے زمانہ میں خُدا نے اسلام کو بغیر امداد کے نہیں چھوڑا

غرض میں کہانتک بیان کروں۔ ہر طرف سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں۔ اور اُس کو بدنام کرنے کی کوشش ہاں اَن تھک کوشش کی جاتی ہے۔ مگر اِن لوگوں کے منصوبے اور ہتھکنڈے کیا کر سکتے ہیں۔ خدا اس کو خود اُن حربوں سے بچانا چاہتا ہے اور اس زمانہ ترقی میں اسلام کو بغیر امداد کے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس نے اسلام کی حفاظت کی۔ اور اپنے سچے رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم کے وعدوں کو سچّا ثابت کیا اور اس کی مُبارک پیشینگوئیوں کی حقیقت کھول دی۔ اور اس صدی میں ایک شخص پیدا کر دیا۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ وُہ وُہی ہے جو تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ وہ صداقت کی رُوح اسلام میں پھُونک دے گا۔ وُہ وُہی ہے جو گُمشدہ صداقتوں کو آسمانوں سے لاتا ہے اور لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ بدظنیوں اور ایمانی کمزوریوں کو دُور کرنا چاہتا ہے

بدظنّی ایک بہت بُری بَلا ہے

بدظنّی ایک ایسا مرض ہے اور ایسی بُری بَلا ہے جو انسان کو اندھا کر کے ہلاکت کے ایک تاریک کنوئیں میں گرا دیتی ہے۔ بدظنّی ہی ہے جس نے ایک مُردہ انسان کی پرستش کرائی۔ بدظنّی ہی تو ہے جو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی صفاتِ خلق، رحم، رازقیّت وغیرہ سے معطّل کر کے نعوذ باللہ ایک فردِ معطّل اور شئے بیکار بنا دیتی ہے۔ الغرض اسی بدظنّی کے باعث جہنّم کا بہت بڑا حصّہ اگر کہوں کہ سارا حصّہ بھر جائیگا تو مبالغہ نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ماموروں سے بدظنّی کرتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فضل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غرض اگر کوئی ہمارے اس سلسلہ کا جو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا، انکار کرے۔ تو ہم کو افسوس ہوتا ہے۔ کہ ہائے! ایک رُوح ہلاکت کے دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ ایسا روشن ہے کہ اگر کوئی شخص مُستعد دل لیکر دو گھنٹہ

بھی ہماری باتوں کو سُنے تو وُہ حق کو پا لیگا۔

مُعجزات کئی رنگ کے ہوتے ہیں

اب میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں اَور کہکر اس تقریر کو ختم کروں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے مُعجزات کے سلسلہ کی طرف پھر عَود کر کے کہتا ہوں کہ ایک خوارق تو شق القمر وغیرہ کے علمی رنگ کے ہیں اور دُوسرے حقایق و معارف کے۔ تیسرا طبقہ مُعجزات کا اَخلاقی مُعجزات ہیں۔ اَخلاقی کرامت میں بہت اثر ہوتا ہے۔ فلاسفر لوگ معارف اور حقائق سے تسلّی نہیں پا سکتے۔ مگر اَخلاقِ عظیمہ اُن پر بہت بڑا اور گہرا اثر کرتے ہیں۔ حضور سیّدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کے اَخلاقی مُعجزات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ آپ ایک درخت کے نیچے سوئے پڑے تھے۔ کہ ناگاہ ایک شور و پکار سے بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ جنگلی اعرابی تلوار کھینچ کر خود حضور پر آ پڑا ہے۔ اس نے کہا۔ اے محمّد! (صلی اللہ علیہ وسلّم) بتا۔ اس وقت میرے ہاتھ سے تجھے کَون بچا سکتا ہے۔ آپؐ نے پُورے اطمینان اور سچّی سکینت سے جو حاصل تھی فرمایا کہ اَللّٰہ۔ آپؐ کا یہ فرمانا عام اِنسانوں کی طرح نہ تھا۔ اَللّٰہ جو خدا تعالیٰ کا ایک ذاتی اِسم ہے اور جو تمام جمیع صِفات کاملہ کا مستجمع ہے۔ اَیسے طور پر آپؐ کے مُنہ سے نکلا کہ دِل سے نکلا اور دِل پر ہی جا کر ٹھہرا۔ کہتے ہیں کہ اِسمِ اعظم یہی ہے اور اس میں بڑی بڑی برکات ہیں۔ لیکن جس کو وہ اللہ یاد ہی نہ ہو وہ اس سے کیا فائدہ اُٹھائے گا۔ الغرض ایسے طور پر اللہ کا لفظ آپؐ کے مُنہ سے نکلا کہ اُس پر رُعب طاری ہو گیا اور ہاتھ کانپ گیا۔ تلوار گِر پڑی۔ حضرتؐ نے وُہی تلوار اُٹھا کر کہا کہ اب بتلا۔ میرے ہاتھ سے تجھے کَون بچا سکتا ہے۔ وہ ضَعِیفُ القلب جنگلی کس کا نام لے سکتا تھا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اَخلاقِ فاضلہ کا نمُونہ دکھایا اور کہا جا تجھے چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ مروّت اور شجاعت مجھ سے سیکھ۔ اس اخلاقی مُعجزہ نے اُس پر ایسا اثر کیا۔ کہ وُہ مُسلمان ہو گیا۔

سیر میں لکھا ہے کہ ابُوالحسن خرقانی کے پاس ایک شخص آیا۔ راستہ میں شیر ملا۔ اور کہا کہ اللہ کے واسطے پیچھا چھوڑ دے۔ شیر نے حملہ کیا۔ اور جب کہا۔ ابُوالحسن کے واسطے چھوڑ دے تو اُس نے چھوڑ دیا۔ شخص مذکور کے ایمان میں اس حالت نے سیاہی سی پیدا کر دی۔ اور اُس نے سفر ترک کر دیا۔ واپس آکر یہ عُقدہ پیش کیا۔ اس کو ابُوالحسن نے جواب دیا کہ یہ بات مشکل نہیں۔ اللہ کے نام سے تو واقف نہ تھا۔ اللہ کی سچی ہیبت اور جلال تیرے دِل میں نہ تھا۔ اور مجھ سے تُو واقف تھا۔ اس لئے میری قدر تیرے دِل میں تھی۔ پس اللہ کے لفظ میں بڑی بڑی برکات اور خوبیاں ہیں۔ بشرطیکہ کوئی اس کو اپنے دِل میں جگہ دے اور اس کی ماہیت پر کان دھرے۔

اسی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی مُعجزات میں ایک اَور مُعجزہ بھی ہے کہ آپ کے پاس ایک وقت بہت سی بھیڑیں تھیں۔ ایک شخص نے کہا۔ اِس قدر مال اِس سے پیشتر کسی کے پاس نہیں دیکھا۔ حضورؐ نے وُہ سب بھیڑیں اس کو دے دیں۔ اُس نے فی الفور کہا کہ لاریب آپ سچے نبی ہیں۔ سچے نبی کے بغیر اس قسم کی سخاوت دوسرے سے عمل میں آنی مشکل ہے۔ الغرض آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ ایسے تھے۔ کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[1]۔ قرآن میں وارد ہوا۔

ہماری جماعت کو مُناسب ہے کہ وُہ اخلاقی ترقی کریں

پس ہماری جماعت کو مُناسب ہے کہ وہ اخلاقی ترقی کریں۔ کیونکہ الاستقامت فوق الکرامت مشہور ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ اگر کوئی ان پر سختی کرے۔ تو حتی الوسع اُس کا جواب نرمی اور ملاطفت سے دیں۔ تشدد اور جبر کی ضرورت انتقامی طور پر بھی نہ پڑنے دیں۔ انسان میں نفس بھی ہے اور اُس کی تین قسم ہیں۔ امّارہ۔ لوّامہ۔ مطمئنّہ۔ امّارہ کی حالت میں انسان جذبات اور بے جا جوشوں کو سنبھال نہیں سکتا۔ اور اندازہ سے نکل جاتا اور اخلاقی حالت سے گر جاتا ہے۔ مگر حالت لوّامہ میں سنبھال لیتا ہے مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ جو

[1] القلم: ۵

سعدی نے بوستاں میں لکھی ہے۔ کہ ایک بزرگ کو کتّے نے کاٹا۔ گھر آیا۔ تو گھر والوں نے دیکھا کہ اُسے کتّے نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک بھولی بھالی چھوٹی لڑکی بھی تھی۔ وہ بولی آپ نے کیوں نہ کاٹ کھایا؟ اُس نے جواب دیا۔ بیٹی۔ اِنسان سے کتّاپن نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے انسان کو چاہیئے۔ کہ جب کوئی شریر گالی دے تو مومن کو لازم ہے کہ اعراض کرے۔ نہیں تو وہی کتّاپن کی مِثال صادق آئے گی۔ خدا کے مقرّبوں کو بڑی بڑی گالیاں دی گئیں۔ بہت بُری طرح ستایا گیا۔ مگر اُن کو اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ[1] کا ہی خطاب ہوا۔ خود اُس اِنسان کامل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بُری طرح تکلیفیں دی گئیں۔ اور گالیاں، بدزبانی اور شوخیاں کی گئیں۔ مگر اس خُلقِ مجسّم ذات نے اس کے مقابلہ میں کیا کیا۔ اُن کے لئے دُعا کی۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کرے گا تو تیری عزّت اور جان کو ہم صحیح وسلامت رکھیں گے۔ اور یہ بازاری آدمی اُس پر حملہ نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ حضور کے مخالف آپ کی عزّت پر حرف نہ لا سکے۔ اور خود ہی ذلیل وخوار ہو کر آپ کے قدموں پر گِرے یا سامنے تباہ ہوئے۔ غرض یہ صفت لوّامہ کی ہے جو انسان کش مکش میں بھی اِصلاح کر لیتا ہے۔ روزمرّہ کی بات ہے۔ اگر کوئی جاہل یا اوباش گالی دے یا کوئی شرارت کرے۔ جس قدر اس سے اعراض کرو گے۔ اسی قدر عزّت بچا لو گے۔ اور جسقدر اُس سے مٹھ بھیڑ اور مقابلہ کرو گے تباہ ہو جاؤ گے اور ذلّت خرید لو گے۔ نفسِ مُطمئِنّہ کی حالت میں انسان کا ملکہ حسنات اور خیرات ہو جاتا ہے۔ وہ دُنیا اور ماسوی اللہ سے بکلّی اِنقطاع کر لیتا ہے۔ وُہ دُنیا میں چلتا پھرتا اور دُنیا والوں سے ملتا جُلتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وُہ یہاں نہیں ہوتا۔ جہاں وُہ ہوتا ہے۔ وُہ دُنیا اَور ہی ہوتی ہے۔ وہاں کا آسمان اور زمین اَور ہوتی ہے۔

حقیقی احمدیوں سے خدا تعالیٰ کا وعدہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ

[1] الاعراف: ۲۰۰

كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ[1]۔ یہ تسلّی بخش وعدہ ناصرت میں پیدا ہونے والے ابنِ مریم سے ہوا تھا۔ مگر میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ یسُوع مسیح کے نام سے آنے والے ابنِ مریم کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں الفاظ میں مخاطب کر کے بشارت دی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ جو میرے ساتھ تعلق رکھ کر اس وعدۂ عظیم اور بشارتِ عظیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں کیا وُہ وُہ لوگ ہو سکتے ہیں جو امّارہ کے درجہ میں پڑے ہوئے فسق و فجور کی راہوں پر کاربند ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی سچّی قدر کرتے ہیں۔ اور میری باتوں کو قِصّہ کہانی نہیں جانتے۔ تو یاد رکھو اور دِل سے سُن لو۔ میں پھر ایک بار اُن لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہوں جو میرے ساتھ تعلّق رکھتے ہیں۔ اور وہ تعلّق کوئی عام تعلّق نہیں۔ بلکہ بہت زبردست تعلّق ہے اور ایسا تعلّق ہے کہ جس کا اثر نہ صرف میری ذات تک بلکہ اس ہستی تک پہنچتا ہے۔ جس نے مجھے بھی اس برگزیدہ انسان کامل کی ذات تک پہنچایا ہے جو دُنیا میں صداقت اور راستی کی رُوح لے کر آیا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ان باتوں کا اثر میری ہی ذات تک پہنچتا۔ تو مجھے کچھ بھی اندیشہ اور فکر نہ تھا۔ اور نہ ان کی پَروا تھی۔ مگر اس پر بس نہیں ہوتی۔ اس کا اثر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اور خود خدا تعالیٰ کی برگزیدہ ذات تک پہنچ جاتا ہے۔ پس ایسی صُورت اور حالت میں تم خوب دھیان دے کر سُن رکھو کہ اگر اس بشارت سے حِصّہ لینا چاہتے ہو۔ اور اس کے مصداق ہونے کی آرزُو رکھتے ہو۔ اور اتنی بڑی کامیابی (کہ قیامت تک مکفّرین پر غالب رہو گے) کی سچّی پیاس تمہارے اندر ہے۔ تو پھر اتنا ہی مَیں کہتا ہوں کہ یہ کامیابی اُسوقت تک حاصل نہ ہو گی جبتک لوّامہ کے درجہ سے گزر کر مطمئنّہ کے مینار تک نہ پہنچ جاؤ۔

اس سے زیادہ اَور میں کچھ نہیں کہتا کہ تم لوگ ایک ایسے شخص کے ساتھ پیوند رکھتے ہو۔ جو مامور من اللہ ہے۔ پس اُس کی باتوں کو دِل کے کانوں سے سُنو۔ اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو جاؤ۔ تاکہ اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ جو اقرار کے بعد انکار کی نجاست

[1] آل عمران : ۵۶

میں گر کر ابدی عذاب خرید لیتے ہیں ۔ فقط۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء۔ صفحہ ۹۲-۱۰۰)

حضرت اقدس امام الزمانؑ کی تیسری تقریر

(۳۰؍ دسمبر ۱۸۹۷ء)

حضرت اقدسؑ کی اپنے دوستوں کیلئے ہمدردی اور غمخواری

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں کا تعلق ہمارے ساتھ اعضاء کی طرح سے ہے اور یہ بات ہمارے روزمرہ کے تجربہ میں آتی ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے عضو مثلاً انگلی ہی میں درد ہو تو سارا بدن بے چین اور بیقرار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ کہ ٹھیک اسی طرح ہر وقت اور ہر آن میں ہمیشہ اسی خیال اور فکر میں رہتا ہوں۔ کہ میرے دوست ہر قسم کے آرام اور آسائش سے رہیں۔ یہ ہمدردی اور یہ غمخواری کسی تکلف اور بناوٹ کی رُو سے نہیں۔ بلکہ جس طرح والدہ اپنے بچوں میں سے ہر واحد کے آرام و آسائش کے فکر میں مستغرق رہتی ہے خواہ وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ اُسی طرح میں للّٰہی دلسوزی اور غمخواری اپنے دل میں اپنے دوستوں کے لئے پاتا ہوں۔ اور یہ ہمدردی کچھ ایسی اضطراری حالت پر واقع ہوئی ہے کہ جب ہمارے دوستوں میں سے کسی کا خط کسی قسم کی تکلیف یا بیماری کے حالات پر مشتمل پہنچتا ہے تو طبیعت میں ایک بیکلی اور گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور ایک غم شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ اور جُوں جُوں احباب کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر یہ غم بڑھتا جاتا ہے۔ اور کوئی وقت ایسا خالی نہیں رہتا جبکہ کسی قسم کا فکر اور غم شاملِ حال نہ ہو۔ کیونکہ اس قدر کثیر التعداد احباب میں سے کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی غم اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اطلاع پر ادھر دل میں قلق اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ مَیں

نہیں بتلا سکتا۔ کہ کس قدر اوقات غموں میں گزرتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو ایسے ہموم اور افکار سے نجات دیوے۔ اس لئے میں ہمیشہ دعاؤں میں لگا رہتا ہوں اور سب سے مقدم دعا یہی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں کو ہموم اور غموم سے محفوظ رکھے کیونکہ مجھے تو اُن کے ہی افکار اور رنج غم میں ڈالتے ہیں۔ اور پھر یہ دعا مجموعی ہیئت سے کی جاتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس سے اُس کو نجات دے۔ ساری سرگرمی اور پورا جوش یہی ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کروں۔ دعا کی قبولیت میں بڑی بڑی امیدیں ہیں۔

الہام اُجِیْبُ کُلَّ دُعَائِکَ سے مراد

بلکہ میرے ساتھ میرے مولیٰ کریم کا صاف وعدہ ہے۔ کہ اُجِیْبُ کُلَّ دُعَائِکَ۔ مگر میں خوب سمجھتا ہوں کہ کُل سے مراد یہ ہے کہ جن کے نہ سُننے سے ضرر پہنچتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ تربیت اور اصلاح چاہتا ہے تو ردّ کرنا ہی اجابتِ دعا ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کسی دعا میں ناکام رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے دعا ردّ کر دی۔ حالانکہ خدا تعالیٰ اُس کی دعا کو سُن لیتا ہے۔ اور وہ اجابت بصورت ردّ ہی ہوتی ہے کیونکہ اُس کے لئے در پردہ اور حقیقت میں بہتری اور بھلائی اُس کے ردّ ہی میں ہوتی ہے۔ انسان چونکہ کوتاہ بین اور دُور اندیش نہیں بلکہ ظاہر پرست ہے۔ اس لئے اس کو مناسب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے اور وہ بظاہر اس کے مفید مطلب نتیجہ خیز نہ ہو۔ تو خدا پر بدظن نہ ہو کہ اُس نے میری دعا نہیں سُنی۔ وہ تو ہر ایک کی دعا سُنتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] فرماتا ہے۔ راز اور بھید یہی ہوتا ہے کہ داعی کے لئے خیر اور بھلائی ردِّ دعا ہی میں ہوتی ہے۔

دعا کا اصول

دعا کا اصول یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبولِ دعا میں ہمارے اندیشہ اور خواہش کے

[1] المومن : ۶۱

تابع نہیں ہوتا ہے۔ دیکھو بچے کس قدر اپنی ماؤں کو پیارے ہوتے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن اگر بچے بیہودہ طور پر اصرار کریں اور رو کر تیز چاقو یا آگ کا روشن اور چمکتا ہوا انگارا مانگیں تو کیا ماں باوجود سچی محبت اور حقیقی دلسوزی کے کبھی گوارا کریگی کہ اس کا بچہ آگ کا انگارا لے کر ہاتھ جلالے یا چاقو کی تیز دھار پر ہاتھ مار کر ہاتھ کاٹ لے۔ ہرگز نہیں۔ اسی اصُول سے اجابتِ دُعا کا اصُول سمجھ سکتے ہیں۔ مَیں خود اس امر میں ایک تجربہ رکھتا ہوں کہ جب دُعا میں کوئی جُزو مُضر ہوتا ہے۔ تو وہ دُعا ہرگز قبول نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات خوب سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہمارا علم یقینی اور صحیح نہیں ہوتا بہت سے کام ہم نہایت خوشی سے مُبارک سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے خیال میں اُن کا نتیجہ بہت ہی مُبارک خیال کرتے ہیں۔ مگر انجام کار وہ ایک غم اور مصیبت ہو کر چمٹ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ خواہشاتِ انسانی سب پر صاد نہیں کر سکتے۔ کہ سب صحیح ہیں۔ چونکہ انسان سہو اور نسیان سے مرکب ہے۔ اس لئے ہونا چاہیئے اور ہوتا ہے کہ بعض خواہش مُضر ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اُس کو منظور کرلے تو یہ امر منصبِ رحمت کے صریح خلاف ہے۔ یہ ایک سچا اور یقینی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دُعاؤں کو سُنتا ہے اور ان کو قبولیت کا شرف بخشتا ہے۔ مگر ہر رطب و یابس کو نہیں۔ کیونکہ جوشِ نفس کی وجہ سے انسان انجام اور مآل کو نہیں دیکھتا اور دُعا کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جو حقیقی بہی خواہ اور مآل بین ہے اُن مضرتوں اور بدنتائج کو ملحوظ رکھ کر جو اس دُعا کے تحت میں بصورتِ قبول داعی کو پہنچ سکتے ہیں، اُسے رَدّ کر دیتا ہے۔ اور یہ ردِّ دُعا ہی اس کے لئے قبولِ دُعا ہوتا ہے۔ پس ایسی دُعائیں جن میں انسان حوادث اور صدمات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے۔ مگر مُضر دُعاؤں کو بصورتِ ردِ قبول فرمالیتا ہے۔ مجھے یہ الہام بارہا ہو چکا ہے اُجِیْبُ کُلَّ دُعَائِكَ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہو کہ ہر ایک ایسی دُعا جو نفس الامر میں نافع اور مُفید ہے قبول کی جائے گی۔ میں جب اِس خیال کو اپنے دِل میں پاتا ہوں تو میری روح لذت اور سرُور

سے بھر جاتی ہے۔ جب مجھے یہ اوّل ہی اوّل الہام ہوا قریباً پچیس یا تیس برس کا عرصہ ہوتا ہے تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ کہ اللہ تعالیٰ میری دُعائیں جو میرے یا میرے احباب کے متعلق ہوں گی ضرور قبول کریگا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اس معاملہ میں بُخل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ایک انعام الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے متّقین کی صفت میں فرمایا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [1]۔ پس مَیں نے اپنے دوستوں کے لئے یہ اصُول کر رکھا ہے کہ خواہ وہ یاد دلائیں یا نہ یاد دلائیں۔ کوئی امرِ خطیر پیش کریں یا نہ کریں۔ اُن کی دینی اور دُنیوی بھلائی کے لئے دُعا کی جاتی ہے۔

قبولِ دُعا کیلئے بھی چند شرائط ہوتی ہیں

مگر یہ بات بھی بحضورِ دل سُن لینی چاہیئے کہ قبولِ دُعا کے لئے بھی چند شرائط ہوتی ہیں۔ اُن میں سے بعض تو دُعا کرنے والے کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دعا کرانے والے کے متعلق دُعا کرانے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیّت کو مدّنظر رکھے۔ اور اس کے غِنا رِ ذاتی سے ہر وقت ڈرتا رہے۔ اور صُلحکاری اور خدا پرستی اپنا شعار بنالے۔ تقویٰ اور راستبازی سے خدا تعالیٰ کو خوش کرے تو ایسی صورت میں دُعا کے لئے باب استجابت کھولا جاتا ہے۔ اور اگر وُہ خدا تعالیٰ کو ناراض کرتا ہے اور اُس سے بگاڑ اور جنگ قائم کرتا ہے تو اس کی شرارتیں اور غلط کاریاں دُعا کی راہ میں ایک سدّ اور چٹان ہو جاتی ہیں۔ اور استجابت کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جاتا ہے پس ہمارے دوستوں کے لئے لازم ہے کہ وہ ہماری دُعاؤں کو ضائع ہونے سے بچاویں اور اُن کی راہ میں کوئی روک نہ ڈال دیں جو ان کی ناشائستہ حرکات سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔ کیونکہ یہی شریعت کا خلاصہ ہے

اُن کو چاہیئے کہ وُہ تقویٰ کی راہ اختیار کریں کیونکہ تقویٰ ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جس کو شریعت کا خُلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر شریعت کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہیں تو مغزِ

[1] البقرۃ : ۴

شریعت تقویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت ہیں۔ لیکن اگر طالبِ صادق ہو کر ابتدائی مراتب اور مراحل کو استقلال اور خلوص سے طے کرے تو وہ اُس راستی اور طلبِ صدق کی وجہ سے اعلیٰ مدارج کو پالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ[1]۔ گویا اللہ تعالیٰ متقیوں کی دُعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ یہ گویا اُس کا وعدہ ہے۔ اور اُس کے وعدوں میں تخلف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ[2]۔ پس جس حال میں تقویٰ کی شرط قبولیّت دُعا کے لئے ایک غیر منفک شرط ہے۔ تو ایک اِنسان غافل اور بے راہ ہو کر اگر قبولیّتِ دُعا چاہے۔ تو کیا وُہ احمق اور نادان نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری جماعت کو لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ہر ایک اُن میں سے تقویٰ کی راہوں پر قدم مارے۔ تاکہ قبولیّتِ دُعا کا سرور اور حظ حاصل کرے اور زیادتی ایمان کا حِصّہ لے۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی کی تین حالتیں ہیں۔ ایک امّارہ۔ دوسری لوّامہ۔ تیسری مُطمئنّہ۔ نفسِ امّارہ کی حالت میں انسان شیطان کے پنجہ میں گویا گرفتار ہوتا ہے۔ اور اُس کی طرف بہت جُھکتا ہے۔ لیکن نفسِ لوّامہ کی حالت میں وُہ اپنی خطاکاریوں پر نادم ہوتا اور شرمسار ہو کر خدا کی طرف جُھکتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی ایک جنگ رہتی ہے۔ کبھی شیطان کی طرف جُھکتا ہے اور کبھی رحمان کی طرف۔ مگر نفسِ مطمئنّہ کی حالت میں وہ عِبادُالرحمٰن کے زُمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ گویا ارتفاعی نُقطہ ہے جس کے بالمقابل نیچے کی طرف امّارہ ہے۔ اس میزان کے بیچ میں لوّامہ ہے۔ جو ترازو کی زبان کی طرح ہے۔ انخفاضی نُقطہ کی طرف اگر زیادہ جُھکتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر اور اَرذل ہو جاتا ہے۔ اور اِرتفاعی نُقطہ کی طرف جس قدر رجُوع کرتا ہے۔ اُسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف قریب ہوتا جاتا ہے اور سفلی اور اَرضی حالتوں سے نکل کر علوی اور

[1] المائدۃ: ۲۸ [2] الرعد: ۳۲

سماوی فیضان سے حصہ لیتا ہے +

دُنیا میں کوئی چیز منفعت سے خالی نہیں

یہ بات بھی خوب یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ ہر بات میں منافعہ ہوتا ہے۔ دُنیا میں دیکھ لو۔ اعلیٰ درجہ کی نباتات سے لے کر کیڑوں اور چُوہوں تک بھی کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے لئے منفعت اور فائدہ سے خالی ہو۔ یہ تمام اشیاء خواہ وہ اَرضی ہیں یا سماوی۔ اللہ تعالیٰ کی صِفات کے اظلال اور آثار ہیں۔ اور جب صفات میں نفع ہی نفع ہے۔ تو بتلاؤ کہ ذات میں کس قدر نفع اور سُود ہوگا۔ اس مقام پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جیسے اِن اشیاء سے کسی وقت نُقصان اُٹھاتے ہیں تو اپنی غلطی اور نافہمی کی وجہ سے۔ اِس لئے نہیں کہ نفس الأمر میں ان اشیاء میں مضرّت ہی ہے۔ نہیں بلکہ اپنی غلطی اور خطا کاری سے۔ اسی طرح پر ہم اللہ تعالیٰ کی بعض صِفات کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے تکلیف اور مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ورنہ خدا تعالیٰ تو ہمہ رحم اور کرم ہے۔ دُنیا میں تکلیف اُٹھانے اور رنج پانے کا یہی راز ہے۔ کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنی سُوءِ فہم اور قصورِ علم کی وجہ سے مبتلائے مصائب ہوتے ہیں۔ پس اس صفاتی آنکھ کے ہی روزن سے ہم اللہ تعالیٰ کو رحیم اور کریم اور حدسے زیادہ قیاس سے باہر نافع ہستی پاتے ہیں اور ان منافع سے زیادہ بہرہ ور وُہی ہوتا ہے جو اس کے زیادہ قریب اور نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ درجہ اُن لوگوں کو ہی مِلتا ہے جو مُتّقی کہلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے قُرب میں جگہ پاتے ہیں جُوں جُوں متقی خُدا تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ ایک نُورِ ہدایت اُسے مِلتا ہے۔ جو اُس کی معلُومات اور عقل میں ایک خاص قسم کی رَوشنی پیدا کرتا ہے۔ اور جُوں جُوں دُور ہوتا جاتا ہے ایک تباہ کرنے والی تاریکی اس کے دِل و دماغ پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہانتک کہ وُہ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ[1]۔ کا مصداق ہو کر ذلت اور تباہی کا مورد بن جاتا ہے۔ مگر اُس کے بالمقابل نُور اور روشنی سے بہرہ ور انسان اعلیٰ درجہ کی راحت

[1] البقرة : ١٩

اور عزت پاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔[1] یعنی اے وہ نفس جو اطمینان یافتہ ہے اور پھر یہ اطمینان خدا کے ساتھ پایا ہے۔ بعض لوگ حکومت سے بظاہر اطمینان اور سیری حاصل کرتے ہیں۔ بعض کی تسکین اور سیری کا موجب اُن کا مال اور عزت ہو جاتی ہے۔ اور بعض اپنی خوبصورت اور ہوشیار اَولاد و اَحفاد کو دیکھ دیکھ کر بظاہر مطمئن کہلاتے ہیں۔ مگر یہ لذت اور انواع و اقسام کی لذات دُنیا انسان کو سچا اطمینان اور سچی تسلی نہیں دے سکتیں بلکہ ایک قسم کی ناپاک حرص کو پیدا کر کے طلب اور پیاس کو پیدا کرتی ہیں۔ اِستسقاء کے مریض کی طرح اُن کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہاں تک کہ اُن کو ہلاک کر دیتی ہے۔ مگر یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے وُہ نفس جس نے اپنا اطمینان خدا تعالیٰ میں حاصل کیا ہے۔ یہ درجہ بندے کے لئے ممکن ہے۔ اس وقت اس کی خوشحالی باوجود مال و منال کے دُنیوی حشمت اور جاہ و جلال کے ہوتے ہوئے بھی خدا ہی میں ہوتی ہے۔ یہ زر و جواہر، یہ دُنیا اور اس کے دھندے، اُس کی سچی راحت کا موجب نہیں ہوتے۔ پس جب تک انسان خدا تعالیٰ ہی میں راحت اور اطمینان نہیں پاتا۔ وُہ نجات نہیں پا سکتا۔ کیونکہ نجات اطمینان ہی کا ایک مترادف لفظ ہے۔

نفسِ مُطمئنّہ کے بغیر انسان نجات نہیں پاسکتا

مَیں نے بعض آدمیوں کو دیکھا اور اکثروں کے حالات پڑھے ہیں جو دُنیا میں مال و دولت اور دُنیا کی جھوٹی لذتیں اور ہر ایک قسم کی نعمتیں اَولاد اَحفاد رکھتے تھے جب مرنے لگے اور اُن کو اس دُنیا کے چھوڑ جانے اور ساتھ ہی اُن اشیاء سے الگ ہونے اور دوسرے عالم میں جانے کا علم ہوا۔ تو اُن پر حسرتوں اور بیجا آرزوؤں کی آگ بھڑکی اور سرد آہیں مارنے لگے۔ پس یہ بھی ایک قسم کا جہنّم ہے۔ جو انسان کے دِل کو راحت اور قرار نہیں دے سکتا بلکہ اس کو گھبراہٹ اور بیقراری کے عالم میں ڈال دیتا ہے۔ اس لئے یہ امر بھی میرے دوستوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے۔ کہ اکثر اوقات انسان اہل و عیال اور اموال کی محبت میں ناجائز

[1] الفجر: ۲۸، ۲۹

اور بیجا محبت میں ایسا محو ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات اسی محبت کے جوش اور نشہ میں ایسے ناجائز کام کر گزرتا ہے جو اس میں اور خدا تعالے میں ایک حجاب پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے لئے ایک دوزخ تیار کر دیتے ہیں۔ اس کو اس بات کا علم نہیں ہوتا جب وہ اُن سب سے یکایک علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اس گھڑی کی اُسے خبر نہیں ہوتی۔ تب وہ ایک سخت بےچینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ کسی چیز سے جب محبت ہو۔ تو اس سے جدائی اور علیحدگی پر ایک رنج اور دردناک غم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اب منقولی ہی نہیں بلکہ معقولی رنگ رکھتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ[1]۔ پس یہ وُہی غیر اللہ کی محبت کی آگ ہے جو انسانی دل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اور ایک حیرتناک عذاب اور درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ بالکل سچی اور یقینی بات ہے کہ نفس مطمئنہ کے بدُوں انسان نجات نہیں پا سکتا۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ کے باطنی معنی

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ نفسِ امّارہ کی حالت میں انسان شیطان کا غُلام ہوتا ہے اور لوّامہ میں اُسے شیطان سے ایک مُجاہدہ اور جنگ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی شیطان۔ مگر مطمئنہ کی حالت ایک امن اور آرام کی حالت ہوتی ہے۔ کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتا ہے اس لئے اس آیت میں کہ يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ[2]۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری حالت میں کس قدر استراحت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ اے نفسِ مطمئنہ اللہ کی طرف چلا آ۔ ظاہر کے لحاظ سے تو یہ مطلب ہے۔ کہ جان کندن کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آتی ہے۔ کہ اے مطمئن نفس۔ اپنے رب کی طرف چلا آ۔ وُہ تجھ سے خوش اور تُو اس سے راضی۔ چونکہ قرآن کے لئے ظاہر اور بطن دونوں ہے۔ اس لئے بطن کے لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ اے اطمینان پر پہنچے ہوئے نفس اپنے رب کی طرف چلا آ۔ یعنی تیری طبعاً یہ حالت ہو چکی ہے۔ کہ تو اطمینان اور سکینت کے

[1] الھمزۃ : ۷، ۸ [2] الفجر : ۲۸

مرتبہ پر پہنچ گیا ہے۔ اور تجھ میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی بُعد نہیں ہے۔ لوامہ کی حالت میں تو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر مطمئنّہ کی حالت میں ایسا ہوتا ہے۔ کہ جیسے پانی اُوپر سے گرتا ہے۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی محبّت انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور وُہ خدا ہی کی محبّت سے جیتا ہے۔ غیراللہ کی محبّت جو اس کے لئے ایک جلانے اور جہنّم کے پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ جل جاتی ہے۔ اور اُس کی جگہ ایک روشنی اور نُور بھر دیا جاتا ہے۔ اس کی رضاء اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اللہ تعالیٰ کی رضاء اس کا منشاء ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی محبّت ایسی حالت میں اس کے لئے بطور جان ہوتی ہے۔ جس طرح زندگی کے لئے لوازمِ زندگی ضروری ہیں۔ اس کی زندگی کے لئے خُدا اور صِرف خُدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ ہی اس کی سچّی خوشی اور پُوری راحت ہوتا ہے۔

انسانی ہستی کا مُدّعا

نفس مطمئنّہ کی یہ نشانی ہے کہ کسی خارجی تحریک کے بِدُوں ہی وُہ ایسی صورت پکڑ جاتا ہے۔ کہ خدا کے بِدُوں رہ نہیں سکتا۔ اور یہی اِنسانی ہستی کا مُدّعا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ فارغ انسان شکار، شطرنج، گنجفہ وغیرہ اشغال اپنے لئے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر مطمئنّہ جبکہ ناجائز اور عارضی اور بسا اوقات رنج اور کرب پیدا کرنے والے اشغال سے الگ ہو گیا۔ اب الگ ہو کر منقطع عالَم اُسے کیوں یاد آوے۔ اس لئے خدا ہی سے محبّت ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی دِل سے محو نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ محبّت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ذاتی محبّت ہوتی ہے اور ایک محبّت اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ یا یہ کہو کہ اُس کا باعث صرف چند عارضی باتیں ہوتی ہیں جن کے دُور ہوتے ہی وہ محبّت سرد ہو کر رنج اور غم کا باعث ہو جاتی ہے۔ مگر ذاتی محبّت سچّی راحت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1]۔ اِس لئے

[1] الذّٰریات: ۵۷

خدا تعالیٰ نے اُس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہوا ہے اور اپنے پوشیدہ اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لئے بنایا ہوا ہے۔ پس جب انسان جھوٹی اور نمائشی یاں عارضی اور رنج پر ختم ہونے والی محبتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ خدا ہی کے لئے ہو جاتا ہے۔ اور طبعاً کوئی بُعد نہیں رہتا۔ اور خدا کی طرف دَوڑا چلا آتا ہے۔ پس اس آیت یَآ اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ [1] میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا آواز دینا یہی ہے کہ درمیانی حجاب اُٹھ گیا اور بُعد نہیں رہا۔ یہ متقی کا اِنتہائی درجہ ہوتا ہے جب وُہ اطمینان اور راحت پاتا ہے۔ دُوسرے مقام پر قرآن شریف نے اس اطمینان کا نام **فلاح** اور **استقامت** بھی رکھا ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ [2] میں اُسی استقامت یا اطمینان یا فلاح کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ اور خود مُستقیم کا لفظ بتلا رہا ہے ÷

شق القمر اور بَردِ نار کے مُعجزات بھی خارج از اسباب نہیں

یہ سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ غیر معمولی طور پر کوئی کام نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ خلق اسباب کرتا ہے خواہ ہم کو ان اسباب پر اطلاع ہو یا نہ ہو۔ الغرض اسباب ضرور ہوتے ہیں اس لئے "شق القمر" یا "یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا [3]" کے مُعجزات بھی خارج از اسباب نہیں۔ بلکہ وُہ بھی بعض مخفی در مخفی اسباب کے نتائج ہیں۔ اور سچے اور حقیقی سائنس پر مبنی ہیں۔ کوتاہ اندیش اور تاریک فلسفہ کے دِلدادہ اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تو یہ حیرت آتی ہے۔ کہ جس حال میں یہ ایک امر مسلّم ہے کہ عدم علم سے عدم شئے لازم نہیں آتا تو نادان فلاسفر کیوں ان اسباب کی بے علمی پر جو اُن مُعجزات کا مُوجب ہیں اصل مُعجزات کی نفی کی جُرأت کرتا ہے۔ ہاں ہمارا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اپنے کسی بندے کو اُن اسبابِ مخفیہ پر مطلع کردے۔ لیکن یہ کوئی لازم بات نہیں ہے۔ دیکھو انسان اپنے لئے جب گھر بناتا ہے۔ تو جہاں اور سب آسائش کے سامانوں کا خیال رکھتا ہے۔ سب سے پہلے اس امر کو بھی ملحوظ رکھ لیتا ہے۔ کہ اندر جانے اور باہر نکلنے کے لئے بھی کوئی دروازہ بنالے۔ اور اگر زیادہ ساز و سامان ہاتھی، گھوڑے، گاڑیاں

[1] الفجر: ۲۸ [2] الفاتحہ: ۶ [3] الانبیاء: ۷۰

بھی پاس ہیں تو علیٰ قدرِ مراتب ہر ایک چیز اور سامان کے نکلنے اور جانے کے واسطے دروازہ بناتا ہے نہ یہ کہ سانپ کی بانبی کی طرح ایک چھوٹا سا سُوراخ۔

عبُودیّت بغیر فیضانِ ربُوبیّت کے نہیں رہ سکتی

اِسی طرح پر اللہ تعالیٰ کے فعل یعنی قانُونِ قدرت پر ایک وسیع اور پُرغور نظر کرنے سے ہم پتہ لگا سکتے ہیں کہ اس نے اپنی مخلوق کو پیدا کر کے یہ کبھی نہیں چاہا کہ وہ عبُودیّت سے سرکش ہو کر رُبُوبیّت سے منقطع نہ ہو۔ رُبُوبیّت نے عبُودیّت کو دُور کرنے کا ارادہ کبھی نہیں کیا۔ سچّا فلسفہ یہی ہے۔ جو لوگ عبُودیّت کو کوئی مُستقل اختیار والی شئے سمجھتے ہیں وُہ سخت غلطی پر ہیں۔ خدا نے اُس کو ایسا نہیں بنایا۔ ہماری معلُومات، خیالات اور عقلوں کا باہم مُساوی نہ ہونا اور ہر امر پر پُوری اور کماحقہ روشنی ڈالنے کے ناقابل ہونا صریح اس امر کی دلیل ہے۔ کہ عبُودیّت بدُوں فیضانِ رُبُوبیّت کے نہیں رہ سکتی۔ ہمارے جسم کا ذرّہ ذرّہ ملایک کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دوا اور اس سے بڑھ کر دُعا کا اُصول ہی بیفائدہ اور بیجان ہوتا ؎

زمین، آسمان اور مافی الارض والسّمٰوات پر نظر کرو۔ اور سوچو کہ کیا یہ تمام مخلُوقات بذاتہٖ وبنفسہٖ اپنے قیام اور ہستی میں مُستقل اختیار رکھتے ہیں یا کسی کے مُحتاج ہیں؟

تمام مخلُوقات اجرامِ فلکی سے لیکر اَرضی تک اپنی بناوٹ ہی میں عبُودیّت کا رنگ رکھتی ہے۔ ہر پتّے سے یہ پتہ ملتا ہے اور ہر شاخ اور آواز سے یہ صَدا نکلتی ہے۔ کہ اُلوہیّت اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کے عمیق در عمیق تصرّفات جن کو ہم خیال اور قوت سے بیان نہیں کر سکتے بلکہ کامل طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اپنا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَللّٰہُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ[1] یعنی اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسی ذات ہے جو جامع صفاتِ کاملہ اور ہر ایک نقص سے منزّہ ہے۔ وُہی مستحق عبادت ہے۔ اسی کا وجُود بدیہی الثّبوت ہے۔ کیونکہ وُہ حَیّ بالذّات اور قائم بالذّات ہے اور بجُز اس کے اور کسی چیز میں حَیّ بالذّات اور قائم بالذّات ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی۔ کیا مطلب کہ اللہ تعالیٰ کے بدُوں اور کسی میں یہ

[1] البقرۃ : ۲۵۶

صفت نظر نہیں آتی کہ بغیر کسی علّت مُوجبہ کے آپ ہی موجود اور قائم ہو یا یہ کہ اس عالم کی جو کمال حکمت اور ترتیب محکم و موزُوں سے بنایا گیا ہے۔ علّت مُوجبہ ہو سکے۔ غرض اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اَور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو ان مخلوقاتِ عالم میں تغیر و تبدل کر سکتی ہو۔ یا ہر ایک شئے کی حیات کا مُوجب اور قیام کا باعث ہو۔

وجُودی مذہب حق سے دُور چلا گیا ہے

اس آیت پر نظر کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجُودی مذہب حق سے دُور چلا گیا ہے اور اس نے صفاتِ الٰہیہ کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ معلوم نہیں کر سکتا کہ اُس نے عبودیّت اور اُلوہیّت کے ہی رشتہ پر ٹھوکر کھائی ہے۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن میں سے جو لوگ اہلِ کشف ہوئے ہیں۔ اور اُن میں سے اہلِ مجاہدہ نے دریافت کرنا چاہا۔ تو عبُودیّت اور ربُوبیّت کے رشتہ میں امتیاز نہ کر سکے اور خلق الاشیاء کے قائل ہو گئے۔

قرآن شریف قلب ہی پر وارد ہو کر زبان پر آتا ہے اور قلب کا کس قدر تعلق تھا۔ کہ کلامِ الٰہی کا مورد ہو گیا۔ اس باریک بحث سے وہ دھوکہ کھا سکتے تھے۔ مگر بات یہ ہے۔ کہ انسان جب غلط فہمی سے قدم اُٹھاتا ہے تو پھر مشکلات کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔ جیسا میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کے تصرفات انسان کے ساتھ ایسے عمیق در عمیق ہیں کہ کوئی طاقت ان کو بیان نہیں کر سکتی۔ اور اگر ایسا ہوتا تو اس کی ربُوبیّت اور صفاتِ کاملہ مندرجہ قرآن نہ پائی جائیں۔ ہمارا عدم ہی اس کی ہستی کا ثبوت ہے۔ اور یہ ایک سچّی بات ہے کہ جب انسان ہر طرح سے بے اختیار ہوتا ہے تو اس کا عدم ہی ہوتا ہے۔ اس باریک بھید کو بعض لوگ نہ سمجھ کر خلق الاشیاء ہو عین کہہ اٹھتے ہیں۔ وجودی اور شہودی میں سے اوّل الذکر تو وہی ہیں جو خلق الاشیا ہو عین کہتے اور مانتے ہیں اور ثانی الذکر وُہ ہیں جو فنائے نظری کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت میں انسان اس قدر استغراق کر سکتا ہے کہ وُہ فنافی اللہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس کے لئے یہ کہنا سزاوار ہوتا ہے۔ من تن شدم تو جاں شُدی۔ من تو شدم تو من شُدی۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دِیگرم تُو دِیگری ؏

بایں ہمہ تصرفاتِ الٰہیہ کا قایل اُن کو بھی ہونا پڑتا ہے۔ خواہ وجُودی ہوں یا شہُودی ہوں۔ اُن کے بعض بزرگ اور اہلِ کمال بایزید بسطامیؒ سے لیکر شبلیؒ۔ ذُوالنّونؒ اور مُحی الدّین ابنِ عربیؒ تک کے کلمات علی العموم ایسے ہیں کہ بعض ظاہر طور پر اور بعض مخفی طور پر اسی طرف گئے ہیں۔ میں یہ بات کھول کر کہنی چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ حق نہیں کہ ہم اُن کو استہزا کی نظر سے دیکھیں۔ نہیں نہیں۔ وہ اہلِ عقل تھے۔ بات یُوں ہے کہ معرفت کا یہ ایک باریک اور عمیق راز تھا۔ اُس کا رِشتہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہی بات تھی اور کچھ نہیں۔ خدا تعالٰی کے اعلیٰ تصرفات پر اِنسان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہالک الذات۔ اُنھوں نے انسان کو ایسا دیکھا اور ان کے مُنہ سے ایسی باتیں نکلیں اور ذہن اُدھر مُنتقل ہو گیا۔ پس یہ امر بحضور دل یاد رکھو۔ کہ باوصفیکہ انسان صفائی باطن سے ایسے درجہ پر پہنچتا ہے (جیسا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اس مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچے) کہ جہاں اُسے اقتداری طاقت ملتی ہے۔ لیکن خالق اور مخلوق میں ایک فرق ہے اور نمایاں فرق ہے۔ اس کو کبھی دِل سے دُور کرنا نہ چاہیئے ؏

انسان ہستی کے عوارض سے آزاد نہیں۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ کھاتا پیتا ہے۔ معاصی ہوتے ہیں۔ کبائر بھی اور صغائر بھی۔ اور اِسی طرح پر اگلے جہان میں بھی بعض جہنّم میں ہوں گے اور بعض جنّت الخُلد میں۔ غرض یہ ہے کہ انسان کبھی بھی جامۂ عبودیت سے باہر نہیں ہو سکتا۔ تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ وہ کونسا حجاب ہے کہ جب وُہ اتار کر ربوبیّت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ بڑے بڑے زاہدوں اور مُجاھدوں کے شاملِ حال عبُودیّت ہی رہی

آنحضرتؐ کی شان

قرآن کریم کو پڑھ کر دیکھ لو۔ اَور تو اَور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دُنیا میں کسی کامل انسان کا نمُونہ موجود نہیں اور نہ آیندہ قیامت تک ہو سکتا ہے۔ پھر دیکھو کہ

اِقتداری مُعجزات کے ملنے پر بھی حضورؐ کے شاملِ حال ہمیشہ عبُودیّت ہی رہی اور بار بار اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[1] ہی فرماتے رہے۔ یہانتک کہ کلمۂ توحید میں اپنی عبُودیّت کے اقرار کا ایک جُزوِ لازم قرار دیا۔ جس کے بدُوں مُسلمان مُسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ سوچو! اور پھر سوچو!! پس جس حال میں ہادیٔ اکمل کی طرزِ زندگی ہم کو یہ سبق دے رہی ہے۔ کہ اعلیٰ ترین مقامِ قرب پر بھی پہنچکر عبُودیّت کے اِعتراف کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ تو اَور کسی کا تو ایسا خیال کرنا اور ایسی باتوں کا دِل میں لانا ہی فضُول اور عبث ہے۔

تصرفات کی دو قسمیں

ہاں! یہ سچّی بات ہے۔ جس کا کوئی اِنکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے تصرّفات بیحد و بیشمار ہیں۔ ان کی تعداد اور گنتی ناممکن ہے۔ اِنسان جس قدر زُہد اور مُجاہدہ کرتا ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اور اس نسبت سے ان تصرّفات کا ایک رنگ اُس پر آتا جاتا ہے اور تصرفات اللہ کی واقفیّت کا دروازہ اس پر کُھلتا ہے۔ اِس امر کا بیان کر دینا بھی مُناسب موقع معلوم ہوتا ہے کہ تصرّفات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک باعتبارِ مخلُوق کے اور دُوسرے باعتبارِ قُرب کے۔ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ ایک تصرّف تو اسی مخلوق کی نوعیّت اور اختیار سے ہوتا ہے جو یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ[2] وغیرہ کے رنگ میں ہوتا ہے صحت، بیماری وغیرہ اُس کے ہی اختیار میں ہوتا ہے اور ایک جدید تصرّف قُرب کے مراتب میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے طور پر اُن کے قریب ہوتا ہے کہ ان سے مخاطبات اور مکالمات شروع ہو جاتے ہیں اور اُن کی دُعاؤں کا جواب ملتا ہے۔ مگر بعض لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اور یہانتک ہی نہیں بلکہ نرے مکالمہ اور مخاطبہ سے بڑھ کر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اُلوہیّت کی چادر اُن پر پڑی ہوئی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اپنی ہستی کے طرح طرح کے نمونے اُن کو دکھاتا ہے۔ اور یہ ایک ٹھیک مثال اس قُرب اور تعلّق کی ہے۔ کہ جیسے لوہے کو کسی آگ میں رکھدیں تو وُہ اثر پذیر ہو کر سُرخ آگ کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے۔ اُس وقت اُس میں آگ کی سی روشنی بھی ہوتی ہے اور احراق جو ایک صفت آگ کی ہے

[1] الکھف: ۱۱۱ [2] الفرقان: ۸

وُہ بھی اُس میں آجاتی ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ ایک بیّن بات ہے کہ وُہ لوہا آگ یا آگ کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔

کب اِنسان سے اَیسے اَفعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُلوہیّت کے خواص رکھتے ہیں

اسی طرح سے ہمارے تجربہ میں آیا ہے کہ اہل اللہ قربِ الٰہی میں ایسے مقام تک جا پہنچتے ہیں جبکہ ربّانی رنگ بشریّت کے رنگ و بُو کو بتمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متوازی کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے۔ کہ ظاہر میں بجُز آگ کے اَور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اور ظِلّی طور پر وہ صفاتِ الٰہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

اُس وقت اُس سے بدُون دُعا و اِلتماس ایسے اَفعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُلوہیت کے خواص رکھتے ہیں اور وہ ایسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہیں جو جس طرح کہتے ہیں اُسی طرح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ اور زبان سے ایسے امُور کے صدُور کی بصراحت بحث ہے۔ جیسا کہ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی[1] اور ایسا ہی مُعجزہ شقّ القمر۔ اور اسی طرح پر اکثر مریضوں اور سقیم الحال لوگوں کا اچھا کر دینا ثابت ہے۔ قرآن شریف میں جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی[2] یہ اُس شدید اور اعلیٰ ترین قُرب ہی کی طرف اِشارہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے کمال تزکیہ نفس اور قُربِ الٰہی کی ایک دِلیل ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ عبدِ مومن کے ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں وغیرہ وغیرہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اعضاء الٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگین ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعالِ الٰہیہ ظہُور پذیر ہوتے ہیں یا ایک مُصفّا آئینہ ہیں۔ جس میں تمام مرضیاتِ الٰہیہ بصفائی تام عکسی طور پر ظہُور پکڑتی رہتی ہیں۔ یا یہ کہو کہ اس حالت میں وُہ اپنی اِنسانیت سے بکُلّی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ جیسے جب اِنسان بولتا ہے۔ تو اُس کے دِل میں خیال ہوتا ہے کہ لوگ اُس کی فصاحت اور خوش بیانی اور

[1] الانفال : ۱۸ [2] النجم : ۴

قادرُ الکلامی کی تعریف کریں۔ مگر وُہ لوگ جو خدا کے بُلائے بولتے ہیں اور ان کی رُوح جب جوش مارتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ایک مَوج اُس پر اثر انداز ہو کر تموّج پیدا کر دیتی ہے۔ اور اپنی آواز اور تکلّم سے وُہ نہیں بولتے۔ بلکہ اِلٰہی حال اور قال اور جوش سے۔ اور ایسا ہی جب وُہ دیکھتے ہیں تو جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دیکھنے میں فِکر شامل ہے۔ اُن کی رؤیت اپنے دخل سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے نُور سے۔ اور وُہ ان کو ایک ایسی چیز دکھا دیتا ہے۔ جو دوسری پُرغور نظر بھی نہیں دیکھ سکتی۔

مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیئے

جیسے آیا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَتَ الْمُؤْمِنِ۔ یعنی مومن کی فراست سے بچو کیونکہ تمہاری آورد ہے اور اس کی آمد۔ تمہارا قال ہے اُس کا حال۔ جیسے ایک گھڑی چلتی ہے۔ اس کے پُرزے تو اُسے چلاتے رہیں گے۔ اب اگر تم تین بجے کی جگہ سات بجے کا وقت کہہ سکتے ہو۔ مگر گھڑی جو اسی مطلب کے لئے بنائی گئی ہے وُہ تو ٹھیک وقت بتلائے گی اور خطا نہ کرے گی۔ پس اگر اس سے جھگڑو گے تو بجز خِفّت کیا لو گے؟ اسی طرح سے یاد رکھو کہ متقی کا یہ کام نہیں کہ وہ اُن لوگوں سے جھگڑے اور مقابلہ کرے جو قُربِ اِلٰہی کا درجہ رکھتے ہیں اور دُنیا میں مختلف ناموں سے پُکارے جاتے ہیں۔ پس مومن کے مقابلہ کے وقت ڈرو۔ اِتَّقُوْا کے مصداق بنو۔ ایسا نہ ہو کہ تم جھوٹے نکلو اور پھر اس غلط کاری کے بدترین نتائج بُھگتو۔ کیونکہ مومن تو اللہ تعالیٰ کے نُور سے دیکھتا ہے۔ اور وہ نُور تم کو نہیں ملا۔ اس لئے تم ٹیڑھے چل سکتے ہو۔ مگر مومن ہمیشہ سیدھا ہی چلتا ہے۔ تم خود ہی بتلاؤ کہ کیا وہ شخص جو ایک تاریکی میں چل رہا ہے۔ اس آدمی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جو چراغ کی روشنی میں جا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے۔ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ[1] کیا اندھا اور بینا مُساوی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پس جب ہم اسباب کو دیکھتے ہیں۔ تو پھر کس قدر غلطی ہے کہ ہم اس سے فایدہ نہیں اُٹھاتے۔

غرض یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیئے۔ اور مقابلۂ مومن کے لئے تیار ہو جانا

[1] الانعام: ۵۱

دانشمند انسان کا کام نہیں ہے۔ اور مومن کی شناخت انہیں آثار و نشانات سے ہو سکتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کئے ہیں۔ اسی فراستِ الٰہیہ کا رُعب تھا جو صحابہ کرامؓ پر تھا۔ اور ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ رُعب بطور نشان الٰہی آتا ہے۔ وہ پُوچھ لیتے تھے کہ اگر یہ وحی الٰہی ہے تو ہم مخالفت نہیں کرتے اور وہ ایک ہیبت میں آجاتے تھے۔

متکلم کے قدر کے موافق اُس کے کلام میں ایک عظمت اور ہیبت ہوتی ہے۔ دیکھو دُنیاوی حکام کے سامنے جاتے وقت بھی ایک تکلیف اور رُعب ہوتا اور خیال ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اسی طرح پر جو لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ مومن کے ساتھ خدا ہے وہ اس کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تنہا بیٹھ کر اُس پر غور کرتے ہیں اور مقابلہ کر کے سوچتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری ہوتا ہے کہ واقفِ راہ اور روشنی والے کے لئے دوسرے تابع ہو جاویں۔ اور یہی حدیث اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ کا منشا اور مفہوم ہے۔ یعنی جب مومن کچھ بیان کرے تو خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بولتا ہے۔ مُدعا یہ ہے کہ مومن جب خدا سے محبت کرتا ہے تو الٰہی نور کا اُس پر احاطہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ نُور اُس کو اپنے اندر چُھپا لیتا اور اس کی بشریت کو ایک حد تک بھسم کر جاتا ہے جیسے آگ میں پڑا ہوا لوہا ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ عبُودیت اور بشریت معدوم نہیں ہو جاتی۔ یہی وُہ راز ہے جو "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" [1] کی تہ میں مرکوز ہے۔ بشریت تو ہوتی ہے مگر وُہ الُوہیت کے رنگ کے نیچے متواری ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے تمام قویٰ اور اعضاء الٰہی راہوں میں خدا تعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہو کر اس کی خواہشوں کی تصویر ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وُہ امتیاز ہے جو اُس کو کروڑہا مخلوق کی رُوحانی تربیت کا کفیل بنا دیتا ہے۔ اور ربُوبیت تامہ کا ایک مظہر قرار دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کبھی بھی ایک نبی اس قدر مخلوقات کیلئے ہادی اور رہبر نہ ہو سکے۔ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کل دنیا کے انسانوں کی روحانی تربیت کے لئے آئے تھے۔ اس لئے یہ رنگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ کمال موجود

[1] الکہف: ۱۱۱

تھا۔ اور یہی وُہ مرتبہ ہے جس پر قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حضور کی نسبت شہادت دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابل اور اُسی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔[1]

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا کے معنے

اور ایسا ہی فرمایا۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔[2] قرآن شریف کے دُوسرے مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اُمّی فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے آپؐ کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ مگر باایں ہمہ کہ آپؐ اُمّی تھے۔ حضور کے دین میں اُمّیّوْنَ اوسط درجہ کے آدمیوں کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور عالموں کو بھی کر دیا۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا[3] کے معنے نہایت ہی لطیف طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جَمِیْعًا کے دو معنے ہیں۔ اوّل تمام ہی نوعِ انسان یا تمام مخلوق۔ دوم تمام طبقہ کے آدمیوں کے لئے یعنی متوسط۔ ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور ہر ایک قسم کی عقل رکھنے والوں کے لئے۔ غرض ہر عقل اور ہر مزاج کا آدمی مجھ سے تعلق کر سکتا ہے۔

قرآن مجید ہر طرز کے طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچاتا ہے

قرآن کریم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُسی اُمّی نے کتاب اور حکمت ہی نہیں بتلائی بلکہ تزکیہ نفس کی راہوں سے واقف کیا اور یہانتک کہ ایدھم بروح منہ[4] تک پہنچا دیا۔ دیکھو اور پُرغور نظر سے دیکھو کہ قرآن شریف ہر طرز کے طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچاتا اور ہر راستی اور صداقت کے پیاسے کو سیراب کرتا ہے۔ لیکن خیال تو کرو۔ کہ یہ حکمت اور معرفت کا دریا، صداقت اور نُور کا چشمہ کس پر نازل ہوا؟ اسی محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جو ایک طرف تو اُمّی کہلاتا ہے اور دُوسری طرف وُہ کمالات اور حقائق اُس کے مُنہ سے نکل رہے ہیں کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر پائی نہیں جاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال فضل ہے۔ کہ تا لوگ محسوس کریں کہ اللہ تعالیٰ کے تعلقات انسان کے ساتھ کہانتک ہو سکتے ہیں؟ ہماری غرض

[1] الانبیاء: ۱۰۸ [2] الاعراف: ۱۵۹ [3] الاعراف ۱۵۹ [4] المجادلہ ۲۳

اِس بیان سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلقات بہت نازک درجہ تک پہنچ جاتے ہیں مقربین سے الوہیت کا ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ مخلوق پرست اِنسان اُن کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ بالکل درست اور صحیح ہے کہ ؎

مردانِ خدا، خُدا نباشند ❖ لیکن زخدا جُدا نباشند

خدا تعالیٰ اُن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ بغیر دعاؤں کے بھی اُن کی امداد کرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِنسان کا اعلیٰ درجہ وُہی نفس مطمئنّہ ہے جس پر مَیں نے گفتگو شروع کی ہے۔ اسی حالت میں اور تمام حالتوں سے اَیسے لوازم ہو جاتے ہیں کہ عام تعلق الٰہی سے بڑھ کر خاص تعلق ہو جاتا ہے جو زمینی اور سفلی نہیں ہوتا۔ بلکہ علوی اور سماوی تعلق ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ اطمینان جس کو فلاح اور استقامت بھی کہتے ہیں۔ اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ[1] میں بھی اِسی کی طرف اشارہ ہے اور اِسی راہ کی دُعا تعلیم کی گئی ہے۔ اور یہ استقامت کی راہ اُن لوگوں کی راہ ہے جو مُنعَم علیہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افضال و اکرام کے مورد ہیں۔ مُنعَم علیہم کی راہ کو خاص طور پر بیان کرنے سے یہ مطلب تھا کہ اِستقامت کی راہیں مختلف ہیں۔ مگر وہ استقامت جو کامیابی اور فلاح کی راہوں کا نام ہے۔ وہ انبیاء علیہم السّلام کی راہیں ہیں۔ اِس میں ایک اَور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں وُہ دُعا انسان کی زبان، قلب اور فعل سے ہوتی ہے۔ اور جب انسان خدا سے نیک ہونے کی دُعا کرے تو اُسے شرم آتی ہے مگر یہی ایک دُعا ہے جو اِن مُشکلات کو دُور کر دیتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[2]۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی امداد چاہتے ہیں۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر تقدم کی وجہ

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو تقدم اِس لئے ہے کہ اِنسان دُعا کے وقت تمام قویٰ سے کام لیکر خدا تعالیٰ کی طرف آتا ہے۔ یہ ایک بے ادبی اور گستاخی ہے کہ قویٰ سے کام نہ

[1] الفاتحہ: ۶ [2] الفاتحہ: ۵

لے کر اور قانونِ قدرت کے قواعد سے کام نہ لے کر آوے۔ مثلاً کسان اگر تخم ریزی کرنے سے پہلے ہی یہ دُعا کرے کہ الٰہی! اس کھیت کو ہرا بھرا کر اور پھل پھول لا۔ تو یہ شوخی اور ٹھٹھا ہے۔ اسی کو خدا کا امتحان اور آزمائش کہتے ہیں جس سے منع کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ خدا کو مت آزماؤ۔ جیسا کہ مسیح علیہ السّلام کے مائدہ مانگنے کے قصہ میں اس امر کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرو اور سوچو۔

دُعا کرنے سے پہلے انسان کو لازم ہے کہ اپنے اعتقاد۔ اعمال پر نظر کرے

یہ سچی بات ہے کہ جو شخص اعمال سے کام نہیں لیتا وُہ دُعا نہیں کرتا بلکہ خدا تعالیٰ کی آزمائش کرتا ہے۔ اس لئے دُعا کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کو خرچ کرنا ضروری ہے اور یہی معنی اس دُعا کے ہیں۔ پہلے لازم ہے کہ انسان اپنے اعتقاد۔ اعمال میں نظر کرے کیونکہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اصلاح اسباب کے پیرایہ میں ہوتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے کہ جو اصلاح کا موجب ہو جاتا ہے۔ وُہ لوگ اس مقام پر ذرا خاص غور کریں۔ جو کہتے ہیں کہ جب دُعا ہوئی تو اسباب کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نادان سوچیں کہ دُعا بجائے خود ایک مخفی سبب ہے جو دوسرے اسباب کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تقدم اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[1] پر جو کلمۂ دُعائیہ ہے اس امر کی خاص تشریح کر رہا ہے۔ غرض عادۃ اللہ ہم یُونہی دیکھ رہے ہیں کہ وہ خلقِ اسباب کر دیتا ہے۔ دیکھو پیاس کے بجھانے کے لئے پانی اور بھوک کے مٹانے کے لئے کھانا مہیّا کرتا ہے مگر اسباب کے ذریعے۔ پس یہ سلسلۂ اسباب یُونہی چلتا ہے اور خلقِ اسباب ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے یہ دو نام ہی ہیں۔ جیسا کہ مولوی محمد احسن صاحب نے ذکر کیا تھا کہ کان اللّٰہ عزیزاً حکیماً[2]۔ عزیز تو یہ ہے کہ ہر ایک کام کر دینا اور حکیم یہ کہ ہر ایک کام کسی حکمت سے موقع اور محل کے مُناسب اور موزوں کر دینا۔ دیکھو نباتات، جمادات میں قسم قسم کے خواص رکھے ہیں۔ تربد ہی کو دیکھو کہ وہ ایک دو تولہ تک دست لے آتی ہے ایسا ہی سقمونیا۔ اللہ

[1] الفاتحہ: ۵ [2] النساء: ۱۵۹

تعالیٰ اس بات پر تو قادر ہے کہ یُونہی دست آجائے یا پیاس بدُوں پانی ہی کے بجھ جائے۔ مگر چونکہ عجائباتِ قدرت کا علم کرانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ جس قدر واقفیت اور علم عجائباتِ قدرت کا وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر انسان اللہ تعالیٰ کی صفات پر اطلاع پاکر قربِ حاصل کرنے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔ طبابت، ہَیئت سے ہزارہا خواص معلوم ہوتے ہیں۔

علُوم خواص الاشیاء کا ہی نام ہے

علُوم ہیں ہی کیا؟ صرف خواص الاشیاء ہی کا تو نام ہے۔ سیّارہ۔ ستارہ نباتات کی تاثیریں اگر نہ رکھتا تو اللہ تعالیٰ کی صفت عَلِیْم پر ایمان لانا انسان کیلئے مشکل ہو جاتا۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد خواص الاشیاء ہے۔ اس سے یہ غرض ہے کہ ہم حکمت سیکھیں۔ علُوم کا نام حکمت بھی رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۝[1]

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ[2] کا مقصد

پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا مقصد یہی ہے کہ اس دُعا کے وقت اُن لوگوں کے اعمال، اخلاق، عقائد کی نقل کرنی چاہیئے جو منعم علیہ ہیں۔ جہانتک انسان سے ممکن ہو۔ عقائد، اخلاق اور اعمال سے کام لے۔ اس امر کو تُم مشاہدہ میں دیکھ سکتے ہو۔ کہ جبتک انسان اپنے قویٰ سے کام نہیں لیتا۔ وہ ترقی نہیں کر سکتا یا اُن کو اصل غرض اور مقصود سے ہٹا کر کوئی اَور کام اُن سے لیتا ہے۔ جس کے لئے وُہ خلق نہیں ہوئے۔ تو بھی وُہ ترقی کی راہ میں نہ بڑھیں گے۔

اگر آنکھ کو چالیس روز بند رکھا جاوے گا تو اس کے دیکھنے کی طاقت سلب ہو جاویگی پس یہ ضروری امر ہے کہ پہلے قویٰ کو اُن کے فِطرتی کاموں پر لگاؤ۔ تو اَور بھی ملے گا۔ ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جہانتک عملی طاقتوں سے کام لیا جاوے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر برکت نازل کرتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ اوّل عقائد، اخلاق، اعمال کو درست کرو۔ پھر اِھْدِنَا

[1] البقرہ: ۲۷۰ [2] الفاتحہ: ۶

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ[1] کی دُعا مانگو تو اُس کا اثر کابل طور پر ظاہر ہوگا+

اُمّتِ مرحُومہ کہنے کی وجہ

خاص طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمّتِ مرحُومہ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی ہے کہ جس کے لئے آفات پیدا ہونے لگی ہیں۔ انسان کی حرکت گناہوں اور معاصی کی طرف ایسی ہے۔ جیسے کہ ایک پتھر نیچے کو چلا جاتا ہے۔ اُمّتِ مرحُومہ اس لئے کہلاتی ہے کہ معاصی کا زور ہو گیا۔ جیسے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2]۔ اور دُوسری جگہ فرمایا۔ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[3]۔ ان سب آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دُو نقشے دکھائے ہیں۔ اوّل الذکر میں تو اس زمانہ کا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت بھی چونکہ دُنیا کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اخلاق۔ اعمال۔ عقائد سب کا نام و نشان اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے اس اُمّت کو مرحُومہ کہا گیا کیونکہ اس وقت بڑے ہی رحم کی ضرورت تھی۔ اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ[4]+

قابلِ رحم اس شخص کو کہتے ہیں جسے سانپوں کی زمین پر چلنے کا حکم ہو۔ یعنی خطراتِ عظیمہ اور آفاتِ شدیدہ درپیش ہوں۔ پس اُمّتِ مرحُومہ اس لئے کہا کہ یہ قابلِ رحم ہے۔ جب انسان کو مشکل کام دیا جاتا ہے تو وہ مشکل قابلِ رحم ہوتی ہے۔ شرارتوں میں تجربہ کار، بد اندیش خطا کاروں سے مقابلہ ٹھہرا۔ اور پھر اُمّی جیسے حضرت نے فرمایا کہ ہم اُمّی ہیں۔ اور حساب نہیں جانتے۔ پس اُمّیوں کو شریر قوموں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جو مکائد اور شرارتوں میں تجربہ کار تھے۔ اس لئے اس کا نام اُمّتِ مرحُومہ رکھا۔ مسلمانوں کو کس قدر خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قابلِ رحم سمجھا۔ پہلے واعظ۔ انبیاء ایسے وقتوں میں آتے تھے۔ کہ لوگ مکائد سے واقف نہ ہوتے تھے۔ اور بعض اپنی ہی قوم میں آتے تھے۔ لیکن اب لوگ مکائد اور دُنیا کے علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس میں پکّے ماہر ہیں اور راستبازوں کو اس جہان

[1] الفاتحہ: ۶ [2] الروم: ۴۲ [3] الروم: ۲۰ [4] الانبیاء: ۱۰۸

کے ظاہری علوم اور مادی عقلوں سے اور اُن کے پیچ در پیچ منصوبوں اور داؤں سے بہت کم مناسبت ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اے عیسٰیؑ! میں تیرے بعد ایک اُمت کو پیدا کرنے والا ہوں جو نہ عقل رکھے گی اور نہ علم۔ یعنی اُمّی ہو گی۔ آپؑ نے عرض کی۔ یَا رَبِّ۔ کَیْفَ یَعْرِفُوْنَکَ؟ اے اللہ! جبکہ وُہ علم اور عقل سے بہرہ ور نہ ہوں گے تو تجھے کیونکر پہچانیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنا علم اور عقل دُوں گا۔

مخالفینِ اسلام کو اَرضی علوم سے مناسبت ہے اور اہلِ اسلام کو سماوی علوم سے

اس سے بڑی بشارت ملتی ہے۔ جیسے ہمارے مخالفوں کو اَرضی علوم سے مناسبت ہے ایسے ہی اہلِ اسلام کو سماوی علوم سے۔ ایک گنوار مسلمان کی سچی رویا اور خوابیں بڑے بڑے فلاسفروں، بشپوں اور پنڈتوں کے خوابوں سے طاقت میں بڑھ کر ہیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ[1] پس مسلمانوں کو واجب ہے کہ اپنے اس مُحسنِ حقیقی کا شُکر کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ۔[2] یعنی اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں اپنی دی ہوئی نعمت کو زیادہ کروں گا۔ اور بصورتِ کُفر عذاب میرا سخت ہے۔ یاد رکھو کہ جب اُمت کو اُمتِ مرحُومہ قرار دیا ہے۔ اور علُوم لدنیہ سے اُسے سرفرازی بخشی ہے تو عملی طور پر شُکر واجب ہے۔ الغرض اِھدنا الصراط المستقیم میں تمام مسلمانوں کو لازم ہے کہ ایاک نعبد کا لحاظ رکھیں کیونکہ ایاکَ نعبد کو ایاکَ نستعین پر مقدم رکھا ہے۔ پس پہلے عملی طور پر شکریہ کرنا چاہیئے اور یہی مطلب اھدنا الصراط المستقیم میں رکھا ہے۔ یعنی دُعا سے پہلے اسباب ظاہری کی رعایت اور نگہداشت ضروری طور پر کی جاوے۔ اور پھر دُعا کی طرف رجُوع ہو۔ اوّلاً عقائد، اخلاق اور عادات کی اصلاح ہو۔ پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔

اخلاق انسان کے صالح ہونے کی نشانی ہیں

اب میں ایک اَور ضروری اور اشد ضروری بات بیان کرنی چاہتا ہوں۔ ہماری

[1] الجمعہ: ۵ [2] ابراھیم: ۸

جماعت کو چاہیئے کہ لاپرواہی اور عدم توجہی سے نہ سُنے۔ یاد رکھو کہ اخلاق انسان کے صالح ہونے کی نشانی ہیں۔ عام طور پر حدیث شریف میں مُسلمانوں کی یہی تعریف آئی ہے کہ مُسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مُسلمان سلامت رہیں ؁

یہانتک حضورؑ نے تقریر فرمائی تھی کہ نماز عصر کا وقت ہوگیا چنانچہ آپ نے اور کل حاضرین نے نہایت خلوص اور سچے جوش سے نماز عصر ادا کی اور پھر سب کے سب ہمہ تن گوش ہو کر مَردِ خُدا کی باتیں سُننے لگے اور آپ نے تقریر کو پھر شروع کیا۔ (ایڈیٹر)

مَیں نے اس ذِکر کو چھوڑا تھا کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی دُعا تعلیم کرنے میں اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔ کہ انسان تین پہلو ضرور مدِنظر رکھے۔ اوّل۔ اخلاقی حالت۔ دوم حالت عقائد۔ سوم اعمال کی حالت۔ مجموعی طور پر یُوں کہو کہ انسان خداداد قوتوں کے ذریعے سے اپنے حال کی اصلاح کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ یہ مطلب نہیں کہ اصلاح کی صُورت میں دُعا نہ کرے۔ نہیں اُس وقت بھی مانگتا رہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں فاصلہ نہیں ہے۔ البتہ ایاک نعبد میں تقدم زمانی ہے۔ کیونکہ جس حال میں اپنی رحمانیت سے بغیر ہماری دُعا اور درخواست کے ہمیں اِنسان بنایا اور انواع و اقسام کی قوتیں اور نعمتیں عطا فرمائیں۔ اس وقت ہماری دُعا نہ تھی اسوقت خدا کا فضل تھا اور یہی تقدم ہے۔

رَحم کی دُو قسمیں۔ رحمانیت و رحیمیت

یہ یاد رہے کہ رحم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک رحمانیت دوسرا رحیمیت کے نام سے موسُوم ہے۔ رحمانیت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجُود اور ہستی سے بھی پہلے ہی شروع ہوا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل اپنے علمِ قدیم سے دیکھ کر اس قسم کا زمین و آسمان اور ارضی اور سماوی اشیاء ایسی پیدا کی ہیں جو سب ہمارے کام آنے والی ہیں۔ اور کام آتی ہیں۔ اور ان سب اشیاء سے انسان ہی عام طور پر فائدہ اُٹھاتا ہے۔ بھیڑ۔ بکری اور دیگر

حیوانات جبکہ بجائے خود انسان کے لئے مفید شئے ہیں۔ تو وُہ کیا فائدہ اٹھاتے ہیں؟ دیکھو جسمانی اُمور میں انسان کیسی کیسی لطیف اور اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لئے ہے۔ ٹکڑے اور ہڈیاں کُتّوں کے واسطے۔ جسمانی طور پر جو حظوظ اور لذّات انسان کو حاصل ہیں گو حیوان بھی اس میں شریک ہیں مگر انسان کو وہ بدرجۂ اعلیٰ حاصل ہیں اور رُوحانی لذّات میں جانور شریک بھی نہیں ہیں۔ پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں۔ ایک وُہ جو ہمارے وجُود سے پہلے پیش از وقت کے طور پر تقدمہ کی صُورت میں عناصر وغیرہ اشیاء پیدا کیں جو ہمارے کام میں لگی ہوئی ہیں اور یہ ہمارے وجود، خواہش اور دُعا سے پہلے ہیں جو رحمانیت کے تقاضے سے پَیدا ہوئے ۔

اور دُوسری رحمت رحیمیت کی ہے۔ یعنی جب ہم دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قانونِ قدرت کا تعلق ہمیشہ سے دُعا کا تعلق ہے۔ بعض لوگ آجکل اس کو بدعت سمجھتے ہیں۔ ہماری دُعا کا جو تعلق خدا تعالیٰ سے ہے میں چاہتا ہوں کہ اُسے بھی بیان کروں ۔

ایک بچّہ جب بھُوک سے بیتاب ہوکر دُودھ کے لئے چلّاتا اور چیختا ہے۔ تو ماں کے پستان میں دُودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ بچّہ دُعا کا نام بھی نہیں جانتا لیکن اُس کی چیخیں دُودھ کو کیونکر کھینچ لاتی ہیں؟ اِس کا ہر ایک کو تجربہ ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دُودھ کو محسُوس بھی نہیں کرتیں۔ مگر بچّہ کی چلاہٹ ہے کہ دُودھ کو کھینچے لاتی ہے۔ تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں تو وہ کچھ بھی نہیں کھینچ کر لا سکتیں؟ آتا ہے اور سب کچھ آتا ہے۔ مگر آنکھوں کے اندھے جو فاضل اور فلاسفر بنے بیٹھے ہیں وُہ دیکھ نہیں سکتے۔ بچّہ کو جو مناسبت ماں سے ہے اس تعلق اور رِشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھ کر اگر دُعا کی فلاسفی پر غور کرے تو وہ بہت آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے دوسری قسم کا رحم یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک رحم مانگنے کے بعد پَیدا ہوتا ہے۔ مانگتے جاؤ گے

ملتا جاوے گا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] کوئی لفاظی نہیں بلکہ یہ انسانی سرشت کا ایک لازمہ ہے۔

مانگنا انسان کا خاصّہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا

مانگنا انسان کا خاصّہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا وُہ جھوٹا ہے۔ بچّہ کی مثال جو میں نے بیان کی ہے وہ دُعا کی فلاسفی خوب حل کر کے دکھاتی ہے۔ رحمانیت اور رحیمیّت دو نہیں ہیں۔ پس جو ایک کو چھوڑ کر دوسری کو چاہتا ہے اسے مل نہیں سکتا۔ رحمانیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہم میں رحیمیّت سے فیض اُٹھانے کی سکت پیدا کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ کافرِ نعمت ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے یہی معنی ہیں کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ ان ظاہری سامانوں اور اسباب کی رعایت سے جو تُو نے عطا کئے ہیں۔ دیکھو۔ یہ زبان جو عروق اور اعصاب سے خلق کی ہے اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دُعا کے واسطے عطا کی جو قلب کے خیالات تک کو ظاہر کر سکے اگر ہم دُعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں تو یہ ہماری شوربختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وُہ زبان کو لگ جاویں تو یکدفعہ ہی زبان اپنا کام چھوڑ بیٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان گُونگا ہو جاتا ہے۔ پس یہ کیسی رحیمیّت ہے کہ ہم کو زبان دے رکھی ہے۔ ایسا ہی کانوں کی بناوٹ میں فرق آجاوے تو خاک بھی سُنائی نہ دے۔ ایسا ہی قلب کا حال ہے وہ جو خشوُع و خضوُع کی حالت رکھی ہے۔ اور سوچنے اور تفکّر کی قوتیں رکھی ہیں اگر بیماری آجاوے تو وہ سب قریباً بیکار ہو جاتی ہیں۔ مجنونوں کو دیکھو کہ اُن کے قویٰ کیسے بیکار ہو جاتے ہیں۔ تو کیا یہ ہم کو لازم نہیں کہ ان خُداداد نعمتوں کی قدر کریں؟ اگر اُن قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل سے ہم کو عطا کئے ہیں۔ بیکار چھوڑ دیں تو لاریب ہم کافرِ نعمت ہیں۔ پس یاد رکھو کہ اگر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو معطّل چھوڑ کر دُعا کرتے ہیں۔ تو دُعا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ جب ہم نے پہلے عطیّہ سے کچھ کام نہیں لیا تو دوسرے

[1] المومن : ۶۱

کو کب اپنے لئے مُفید اور کار آمد بنا سکیں گے؟

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيۡمَ میں انسان کو خدا تعالیٰ سے سچی بصیرت مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے

پس اِیَّاکَ نَعۡبُدُ یہ بتلا رہا ہے کہ اے ربّ العالمین! تیرے پہلے عطیّہ کو بھی ہم نے بیکار اور برباد نہیں کیا۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيۡمَ میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ سے سچی بصیرت مانگے۔ کیونکہ اگر اُس کا فضل اور کرم دستگیری نہ کرے تو عاجز انسان ایسی تاریکی اور اندھکار میں پھنسا ہوا ہے کہ وُہ دُعا ہی نہیں کر سکتا۔ پس جب تک انسان خدا کے اُس فضل کو جو رحمانیت کے فیضان سے اُسے پہنچا ہے کام میں لا کر دُعا نہ مانگے۔ کوئی نتیجہ بہتر نہیں نکال سکتا۔

میں نے عرصہ ہوا۔ انگریزی قانون میں یہ دیکھا تھا کہ تعادی کے لئے پہلے کچھ سامان دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح قانونِ قدرت کی طرف دیکھو کہ جو کچھ ہم کو پہلے ملا ہے۔ اس سے کیا بنایا؟ اگر عقل و ہوش، آنکھ کان رکھتے ہوئے نہیں بہکے ہو۔ اور حُمق اور دیوانگی کی طرف نہیں گئے تو دُعا کرو اور بھی فیض الٰہی ملیگا۔ ورنہ محرُومی اور بدقسمتی کے لچھن ہیں۔

حکمت کے معنی

بسا اوقات ہمارے دوستوں کو عیسائیوں سے واسطہ پڑیگا۔ وہ دیکھیں گے۔ کہ کوئی بھی بات نادانوں میں ایسی نہیں جو حکیم خدا کی طرف منسوب ہو سکے۔ حکمت کے معنی کیا ہیں؟ وضع الشیئ فی محلّہٖ۔ مگر اُن میں دیکھو گے۔ کہ کوئی فعل اور حکم بھی اُس کا مصداق نظر نہیں آتا۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيۡمَ پر جب ہم پُر غور نظر کرتے ہیں تو اشارۃ النص کے طور پر پتہ لگتا ہے کہ بظاہر تو اس سے دُعا کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے کہ الصراط المستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے لیکن اِیَّاکَ نَعۡبُدُ

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اس کے سر پر بتلا رہا ہے کہ اِس سے فائدہ اُٹھائیں یعنی راہِ راست کے منازل کے لئے قوائے سلیم سے کام لیکر استعانتِ الٰہی کو مانگنا چاہیئے۔

اخلاق سے کیا مراد ہے

اب سوچنا چاہیئے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جو مانگنی چاہئیں۔ اوّل اخلاق۔ جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اخلاق سے کوئی صرف نرمی کرنا ہی مراد نہ لیلے۔ خُلق اور خَلق دو لفظ ہیں۔ جو بالمقابل معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔ خَلق ظاہری پیدائش کا نام ہے جیسے کان ناک۔ یہانتک کہ بال وغیرہ بھی سب خَلق میں شامل ہیں۔ اور خُلق باطنی پیدائش کا نام ہے۔ ایسا ہی باطنی قوی جو انسان اور غیر انسان میں مابہ الامتیاز ہیں۔ وُہ سب خُلق میں داخل ہیں۔ یہانتک کہ عقل فکر وغیرہ تمام قوتیں خُلق ہی میں داخل ہیں +

خُلق سے انسان اپنی انسانیت کو درست کرتا ہے۔ اگر انسانوں کے فرائض نہ ہوں تو فرض کرنا پڑیگا کہ آدمی ہے؟ گدھا ہے؟ یا کیا ہے؟ جب خُلق میں فرق آجاوے تو صُورت ہی رہتی ہے۔ مثلاً عقل ماری جاوے تو مجنون کہلاتا ہے۔ صرف ظاہری صورت سے ہی انسان کہلاتا ہے۔ پس اخلاق سے مراد خدا تعالیٰ کی رضا جوئی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عملی زندگی میں مجسّم نظر آتی ہے) کا حصول ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے طرز زندگی کے موافق اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرے یہ اخلاق بطور بنیاد کے ہیں اگر وہ متزلزل رہے تو اس پر عمارت نہیں بنا سکتے۔ اخلاق ایک اینٹ پر دوسری اینٹ کا رکھنا ہے۔ اگر ایک اینٹ ٹیڑھی ہو۔ تو ساری دیوار ٹیڑھی رہتی ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

خشتِ اول چُوں نہد معمار کج + تا ثریّا مے رَود دِیوار کج

سب سے اکمل نمونہ اور نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں جو جمیع اخلاق میں کامل ہیں

ان باتوں کو نہایت توجّہ سے سُننا چاہیئے۔ اکثر آدمیوں کو میں نے دیکھا اور غور سے

مُطالعہ کیا ہے۔ کہ بعض سخاوت تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی غصہ ور اور زُود رنج ھیں۔ بعض حلیم تو ہیں لیکن بخیل ہیں۔ بعض غضب اور طیش کی حالت میں ڈنڈے مار مار کر گھایٔل کر دیتے ہیں۔ مگر تواضع اور انکسار نام کو نہیں۔ بعض کو دیکھا ہے کہ تواضع اور انکسار تو اُن میں پرلے درجہ کا ہے مگر شجاعت نہیں ہے۔ یہانتک کہ طاعُون اور ہیضہ کا نام بھی سُن لیں تو دست لگ جاتے ہیں۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ جو ایسے طور پر شجاعت نہیں کرتا اس کا ایمان نہیں۔ صحابہ کرامؓ میں بھی بعض ایسے تھے کہ اُن کو لڑائی کی قوت اور جرأت نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو معذُور رکھتے تھے۔ یہ اخلاق بہت ہیں۔ میں نے جلسۂ مذاہب کی تقریر میں اُن سب کو واضح طور پر اور مفصل بیان کیا ہے۔ ہر انسان جامع صفات بھی نہیں اور بالکل محرُوم بھی نہیں ہے۔ سب سے اکمل نمُونہ اور نظیر آنحضرت صلعم ہیں۔ جو جمیع اخلاق میں کامل تھے۔ اسی لئے آپ کی شان میں فرمایا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[1]

رسُول کریمؐ اور حضرت مسیحؑ کے اخلاق کا مقابلہ

ایک وقت ہے کہ آپ فصاحت بیانی سے ایک گروہ کو تصویر کی صُورت حیران کر رہے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ تیر و تلوار کے مَیدان میں بڑھ کر شجاعت دکھاتے ہیں۔ سخاوت پر آتے ہیں۔ تو سونے کے پہاڑ بخشتے ہیں۔ حلم میں اپنی شان دکھاتے ہیں۔ تو واجبُ القتل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بےنظیر اور کامل نمُونہ ہے جو خدا تعالیٰ نے دکھا دیا ہے۔ اس کی مثال ایک بڑے عظیم الشّان درخت کی ہے۔ جس کے سایہ میں بیٹھ کر انسان اس کے ہر جُزو سے اپنی ضرورتوں کو پُورا کر لے۔ اس کا پھل اس کا پھُول۔ اور اس کی چھال، اس کے پتّے غرضکہ ہر چیز مُفید ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشّان درخت کی مثال ہیں جس کا سایہ ایسا ہے کہ کروڑ ہا مخلُوق اس میں مُرغی کے پروں کی طرح آرام اور پناہ لیتے ہیں۔ لڑائی میں سب سے بہادر وُہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلعم کے پاس ہوتا تھا۔ کیونکہ آپؐ بڑے خطرناک مقام میں ہوتے تھے۔ سُبحان اللہ کیا شان

[1] القلم: ۵

ہے۔ اُحد میں دیکھو کہ تلواروں پر تلواریں پڑتی ہیں۔ ایسی گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے کہ صحابہؓ برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر یہ مردِ میدان سینہ سپر ہو کر لڑ رہا ہے۔ اس میں صحابہ کا قصور نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشدیا۔ بلکہ اس میں بھید یہ تھا کہ تا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شجاعت کا نمونہ دکھایا جاوے۔ ایک موقع پر تلوار پر تلوار پڑتی تھی۔ اور آپ نبوت کا دعویٰ کرتے تھے۔ کہ محمد رسُول اللہ میں ہوں۔ کہتے ہیں حضرتؐ کی پیشانی پر ستر زخم لگے مگر زخم خفیف تھے۔ یہ خُلقِ عظیم تھا۔

ایک وقت آتا ہے کہ آپؐ کے پاس اس قدر بھیڑ بکریاں تھیں کہ قیصر و کسریٰ کے پاس بھی نہ ہوں۔ آپؐ نے وہ سب ایک سائل کو بخشدیں۔ اب اگر پاس نہ ہوتا تو کیا بخشتے۔ اگر حکومت کا رنگ نہ ہوتا تو یہ کیونکر ثابت ہوتا کہ آپ واجبُ القتل کفارِ مکّہ کو باوجود مقدرتِ انتقام کے بخش سکتے ہیں۔ جنہوں نے صحابہ کرامؓ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمان عورتوں کو سخت سے سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی تھیں۔ جب وہ سامنے آئے تو آپ نے فرمایا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ [1] میں نے آج تم کو بخشدیا۔ اگر ایسا موقع نہ ملتا تو ایسے اخلاق فاضلہ حضور کے کیونکر ظاہر ہوتے۔ یہ شان آپ کی اور صرف آپ کی ہی تھی۔ کوئی ایسا خلق بتلاؤ جو آپؐ میں نہ ہو اور پھر بدرجہ غایت کامل طور پر نہ ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اخلاق بالکل مخفی ہی رہے۔ شریر یہود جن کو گورنمنٹ کے ہاں کرسیاں ملتی تھیں اور رُومی گورنمنٹ ان کے گروہ کی وجہ سے عزّت کرتی تھی۔ مسیحؑ کو تنگ کرتے رہے۔ مگر کوئی اقتدار کا وقت حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ایسا نہ آیا جس سے معلوم ہو جاتا کہ وہ کہانتک باوجود مقدرت انتقام کے عفو سے کام لیتے ہیں۔ مگر بر خلاف اس کے آنحضرت صلعم کے اخلاق ایسے ہیں۔ کہ وہ مُشاہدہ اور تجربہ کی محک پر کامل العیار ثابت ہوئے۔ وہ صرف باتیں ہی نہیں بلکہ اُن کی صداقت کا ثبوت ہمارے ہاتھ میں ایسا ہی ہے۔ جیسے ہندسہ اور حساب کے

[1] یوسف : ۹۳

اصول صحیح اور یقینی ہیں اور ہم دو اور دو چار کی طرح اُن کو ثابت کر سکتے ہیں لیکن کسی اور نبی کا مُتبع ایسا نہیں کر سکتا۔ اِسی لئے آپ کی مثال ایک ایسے درخت سے دی جس کی جڑھ، چھال، پھل، پھول، پتے غرض ہر ایک چیز مُفید اور غایت درجہ مُفید۔ راحت رساں اور سرور بخش ہے۔ چونکہ جناب سرورِ کائنات علیہ التحیات کے بعد اُمت میں ایک تفرقہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے وہ جامعیت اخلاق بھی نہ رہی۔ بلکہ جُدا جُدا اور متفرق طور پر وہ مجموعۂ اخلاق پھیل گیا۔ اس لئے بعض آدمی بعض اخلاق کو آسانی سے صادر کر سکتے ہیں۔

تزکیۂ نفس اور فلاح

ہدایتِ الٰہی تو یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا[۱] نجات پائیگا وُہ شخص جس نے تزکیۂ نفس کیا اور ہلاک ہو گیا وُہ آدمی جس نے نفس کو بگاڑا۔ فلح چیرنے کو کہتے ہیں۔ فلاحت زراعت کو کہتے ہیں۔ تزکیۂ نفس میں بھی فلاحت ہے۔ مجاہدہ انسانی نفس کو اُس کی خرابیوں اور سختیوں سے صاف کر کے اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ اس میں ایمان صحیح کی تخم ریزی کی جاوے۔ پھر وُہ شجرِ ایمان بار آور ہونے کے لائق بن جاتا ہے۔ چونکہ ابتدائی مراحل اور منازل میں متقی کو بڑی بڑی مصائب اور مُشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے فلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ[۲] اللہ تعالیٰ کفّار کا حال بیان کرتا ہے کہ ستیاناس ہو گیا اٹکل بازیاں کرنے والوں کا جن کے نفُوس غمرہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ غمرہ دبانے والی چیز کو کہتے ہیں جو سر اُٹھانے نہ دے۔ کھیت پر بھی غمرہ پڑتا ہے۔ جیسے کھیتوں پر پڑتا ہے جسے کرنڈ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اٹکل بازیاں کرنے والوں کا ستیاناس ہو گیا۔ ہنوز اُن کے نفُوس غمرہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ مومنوں کو اس آیت میں ایک نظیر دے کر متنبّہ کیا جاتا ہے کہ جب تک غمرہ دُور نہ ہو تب تک علیٰ وجہ البصیرت کام نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اولُوا الابصار نہیں کہلاتے۔ قتل اس لئے فرمایا کہ وُہ رحم کی جگہ ہے۔

[۱] الشمس: ۱۰، ۱۱ [۲] الذّاریات: ۱۱، ۱۲

گویا وُہ فاعل بھی خود ہی ہیں۔ اپنے آپ کو خود ہلاک کیا۔ بعض آدمیوں میں خرّاص ہونے کا مادہ ہوتا ہے۔ وُہ بصیرت اور دُور اندیشی سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ ظنُون فاسدہ اور اٹکلوں سے کام لیتے ہیں۔ اور وُہ اِسی میں اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ میری غرض یہ تھی کہ حصّۂ اخلاق میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا کامل نمُونہ پیش کروں۔ جو ایک فردِ اکمل تھے۔ زاں بعد متفرق طور پر آپؐ کے اخلاق سے حصّہ لیا گیا۔ کسی نے ایک لیا اور دوسرے نے کوئی اَور۔ اور ایک کو دوسرے میں غمرہ ہو گیا۔ جس طرح کسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس غُمرہ کو دُور کرے۔ ورنہ اس کا نتیجہ دوسرے پودوں پر اچھا نہیں ہوگا۔ اِسی طرح ہر ایک انسان کو ضروری ہے کہ وہ اپنے اندرونی غُمرہ کو دُور کرے ورنہ اندیشہ ہے کہ دوسری صفاتِ حسنہ کو بھی نہ کھو بیٹھے۔

رسُولِ کریم کا قول لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ صرف ظاہری امراض ہی تک محدود نہیں

یہ بات ٹھیک نہیں کہ بعض اخلاق کے تبدیل پر انسان قادر ہے اور بعض پر نہیں۔ نہیں نہیں۔ ہر ایک مرض کا علاج موجُود ہے۔ لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ۔ افسوس۔ لوگ آپؐ کے اس مبارک قول کی قدر نہیں کرتے اور اس کو صرف ظاہری امراض ہی تک محدود سمجھتے ہیں۔ یہ کسقدر نادانی اور غلطی ہے۔ جس حال میں ایک فانی جسم کے لئے اس کی اصلاح اور بھلائی کے کُل سامان موجود ہیں تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان کی رُوحانی امراض کا مداوا اللہ تعالیٰ کے حضور کچھ بھی نہ ہو؟ ہے ! اور ضرور ہے !!

یہ ایک واقعی اور یقینی بات ہے کہ خدا تعالیٰ اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ لیکن جو کسل اور سُستی سے کام کرتے ہیں وُہ آخرکار ہلاک ہو جاتے ہیں۔

پیرانہ سالی کی دو قسمیں

اِنسان پر جیسے ایک طرف نقص فی الخلق کا زمانہ آتا ہے۔ جسے بڑھاپا کہتے ہیں اُس وقت آنکھیں اپنا کام چھوڑ دیتی ہیں اور کان شنوا نہیں ہو سکتے۔ غرض کہ ہر ایک عضوِ بدن اپنے کام سے عاری اور معطّل کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے یاد رکھو

کہ پیرانہ سالی دو قسم کی ہوتی ہے۔ طبعی اور غیر طبعی۔ طبعی تو وُہ ہے جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا۔ غیر طبعی وُہ ہے کہ کوئی اپنی امراض لاحقہ کا فکر نہ کرے۔ تو وُہ انسان کو کمزور کر کے قبل از وقت پیرانہ سال بنا دیں۔ جیسے نظامِ جسمانی میں یہ طریق ہے۔ ایسا ہی اندرُونی اور رُوحانی نظام میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے اخلاقِ فاسدہ کو اخلاقِ فاضلہ اور خصائلِ حَسَنہ سے تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو اس کی اخلاقی حالت بالکل گر جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد اور قرآن کریم کی تعلیم سے یہ امر بیداہت ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک مرض کی دوا ہے لیکن اگر کسل اور سُستی انسان پر غالب آجاوے تو بجز ہلاکت کے اَور کیا چارہ ہے ناگر ایسی بے نیازی سے زندگی بسر کرے۔ جیسی کہ ایک بوڑھا کرتا ہے۔ تو کیونکر بچاؤ ہو سکتا ہے۔

تبدیلِ اخلاق اسی صُورت میں کر سکتے ہیں جبکہ مُجاہدہ اور دُعا سے کام لیں

جب تک انسان مُجاہدہ نہ کریگا۔ دُعا سے کام نہ لے گا وہ غمرہ جو دل پر پڑ جاتا ہے دُور نہیں ہو سکتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ[1] یعنی خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی آفت اور بلا کو جو قوم پر آتی ہے دُور نہیں کرتا ہے جب تک خود قوم اس کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمت نہ کرے۔ شجاعت سے کام نہ لے تو کیونکر تبدیلی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک لاتبدیل سُنّت ہے جیسے فرمایا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا[2] پس ہماری جماعت ہو یا کوئی ہو وہ تبدیلِ اخلاق اُسی صُورت میں کر سکتے ہیں جبکہ مُجاہدہ اور دُعا سے کام لیں۔ ورنہ ممکن نہیں ہے۔

حکماء کے تبدیلِ اخلاق کے متعلق دو مذہب ہیں

حکماء کے تبدیلِ اخلاق پر دو مذہب ہیں۔ ایک تو وُہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ انسان تبدیلِ اخلاق پر قادر ہے اور دوسرے وُہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ وہ قادر نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسل اور سُستی نہ ہو۔ اور ہاتھ پَیر ہلاوے تو تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس مقام پر ایک حکایت یاد آئی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یُونانیوں کے مشہور فلاسفر افلاطُون

[1] الرعد : ۱۲ [2] الاحزاب : ۶۳

کے پاس ایک آدمی آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر اندر اطلاع کرائی۔ افلاطون کا قاعدہ تھا۔ کہ جبتک آنے والے کا حُلیہ اور نقوش چہرہ کو معلوم نہ کر لیتا تھا۔ اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ اور وہ قیافہ سے استنباط کر لیتا تھا کہ شخص مذکور کیسا ہے کس قسم کا ہے۔ نوکر نے آکر اس شخص کا حُلیہ حسب معمول بتلایا۔ افلاطون نے جواب دیا۔ کہ اُس شخص کو کہہ دو کہ چونکہ تم میں اخلاقِ رذیلہ بہت ہیں۔ میں ملنا نہیں چاہتا۔ اُس آدمی نے جب افلاطون کا یہ جواب سُنا تو نوکر سے کہا کہ تم جا کر کہدو کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ٹھیک ہے۔ مگر میں نے اپنی عادت رذیلہ کا قلع وقمع کر کے اصلاح کر لی ہے۔ اس پر افلاطون نے کہا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کو اندر بلایا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اُس سے ملاقات کی۔ جن حکماء کا یہ خیال ہے کہ تبدیلِ اخلاق ممکن نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ملازمت پیشہ لوگ جو رشوت لیتے ہیں جب وہ سچی توبہ کر لیتے ہیں۔ پھر اگر اُن کو کوئی سونے کا پہاڑ بھی دے تو اس پر نگاہ نہیں کرتے ۔

توبہ حصول اخلاق کیلئے بڑی محرک اور مؤید چیز ہے
توبہ کے لئے تین شرائط

توبہ دراصل حصولِ اخلاق کے لئے بڑی محرک اور مؤید چیز ہے اور انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔ یعنی جو شخص اپنے اخلاق سیئہ کی تبدیلی چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ توبہ کرے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ توبہ کے تین شرائط ہیں۔ بدون اُن کی تکمیل کے سچی توبہ جسے توبۃ النصوح کہتے ہیں۔ حاصل نہیں ہوتی۔ ان ہرسہ شرائط میں سے پہلی شرط جسے عربی زبان میں اقلاع کہتے ہیں۔ یعنی اُن خیالاتِ فاسدہ کو دُور کر دیا جاوے جو ان خصائل ردیہ کے محرک ہیں ۔

اصل بات یہ ہے کہ تصورات کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے کیونکہ حیطۂ عمل میں آنے سے پیشتر ہر ایک فعل ایک تصوری صورت رکھتا ہے۔ پس توبہ کے لئے پہلی شرط یہ ہے

کہ اُن خیالاتِ فاسدہ و تصورات بد کو چھوڑ دے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی عورت سے کوئی ناجائز تعلق رکھتا ہو۔ تو اُسے توبہ کرنے کے لئے پہلے ضروری ہے کہ اس کی شکل کو بدصورت قرار دے اور اس کی تمام خصائل رذیلہ کو اپنے دل میں مستحضر کرے کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے۔ تصورات کا اثر بہت زبردست اثر ہے۔ اور میں نے صوفیوں کے تذکروں میں پڑھا ہے کہ انہوں نے تصور کو یہانتک پہنچایا کہ انسان کو بندر یا خنزیر کی صورت میں دیکھا۔ غرض یہ ہے کہ جیسا کوئی تصور کرتا ہے ویسا ہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ پس جو خیالات بد لذات کا مُوجب سمجھے جاتے تھے۔ ان کا قلع قمع کرے۔ یہ پہلی شرط ہے۔

دوسری شرط ندم ہے یعنی پشیمانی اور ندامت ظاہر کرنا۔ ہر ایک انسان کا کانشنس اپنے اندر یہ قوت رکھتا ہے۔ کہ وہ اُس کو ہر بُرائی پر متنبہ کرتا ہے مگر بدبخت انسان اس کو معطل چھوڑ دیتا ہے۔ پس گناہ اور بدی کے ارتکاب پر پشیمانی ظاہر کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لذات عارضی اور چند روزہ ہیں اور پھر یہ بھی سوچے کہ ہر مرتبہ اس لذت اور حظ میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ بڑھاپے میں آکر جبکہ قویٰ بیکار اور کمزور ہو جائیں گے آخر ان سب لذاتِ دنیا کو چھوڑنا ہو گا۔ پس جبکہ خود زندگی ہی میں یہ سب لذات چھوٹ جانے والی ہیں تو پھر اُن کے ارتکاب سے کیا حاصل؟ بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو توبہ کی طرف رجُوع کرے اور جس میں اوّل اقلاع کا خیال پیدا ہو یعنی خیالات فاسدہ و تصوّرات بیہودہ کو قلع قمع کرے۔ جب یہ نجاست اور ناپاکی نکل جاوے تو پھر نادِم ہو۔ اور اپنے کئے پر پشیمان ہو۔

تیسری شرط عزم ہے۔ یعنی آئندہ کے لئے مصمم ارادہ کرلے کہ پھر ان بُرائیوں کی طرف رجُوع نہ کریگا۔ اور جب وُہ مداومت کریگا۔ تو خدا تعالیٰ اسے سچی توبہ کی توفیق عطا کرے گا۔ یہانتک کہ وہ سیئات اس سے قطعاً زایل ہو کر اخلاقِ حسنہ اور افعالِ حمیدہ اُس کی جگہ لے لیں گے۔ اور یہ فتح ہے اخلاق پر۔ اس پر قوت اور طاقت بخشنا اللہ تعالےٰ

کا کام ہے کیونکہ تمام طاقتوں اور قوتوں کا مالک وُہی ہے جیسے فرمایا۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا[1]
ساری قوتیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اور انسان ضعیف البنیان تو کمزور ہستی ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا[2] اُس کی حقیقت ہے۔ پس خدا تعالیٰ سے قوت پانے کے لئے مندرجہ بالا ہر سہ شرائط کو کامل کرکے انسان کسل اور سُستی کو چھوڑ دے اور ہمہ تن مستعد ہو کر خدا تعالیٰ سے دُعا مانگے۔ اللہ تعالیٰ تبدیل اخلاق کر دے گا۔

اصلی شہ زور اور بہادر کون ہے

ہماری جماعت میں شہزور اور پہلوانوں کی طاقت رکھنے والے مطلوب نہیں۔ بلکہ ایسی قوت رکھنے والے مطلوب ہیں جو تبدیل اخلاق کے لئے کوشش کرنے والے ہوں یہ ایک امر واقعی ہے کہ وہ شہزور اور طاقت والا نہیں جو پہاڑ کو جگہ سے ہٹا سکے۔ نہیں نہیں۔ اصلی بہادر وُہی ہے جو تبدیل اخلاق پر مقدرت پاوے۔ پس یاد رکھو کہ ساری ہمت اور قوت تبدیل اخلاق میں صرف کرو۔ کیونکہ یہی حقیقی قوت اور دلیری ہے۔

خُلق عظیم بڑی بھاری کرامت ہے

میں نے کل یا پرسوں بیان کیا تھا کہ خُلق عظیم بڑی بھاری کرامت ہے جو خوارق عادت اُمور کو بھی مُشتبہ کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر آج شقّ القمر کا مُعجزہ ہو۔ تو یہ ہَیئت و طبعی کے ماہر اور سائنس کے دلدادہ فی الفور اس کو کسوف خسوف کے اقسام میں داخل کرکے اس کی عظمت کو کم کرنا چاہیں گے۔ اور جو پُرانا معجزہ اب پیش کرتے ہیں تو اُسے قِصّہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کسوف خسوف دیکھو جو رمضان میں ہوا اور جو آیاتِ مہدی میں سے ایک سماوی نشان تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو علمِ ہیئت کی رُو سے ثابت تھا کہ رمضان میں ایسا ہو۔ یہ کہکر گویا وہ اُس حدیث کی جو امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ وقعت کم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ احمق اتنا نہیں سوچتے کہ نبوّت ہر ایک شخص نہیں کر سکتا۔ نبوّت پیشگوئی کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی

[1] البقرة : ۱۶۶ [2] النساء : ۲۹

ہر کس و ناکس کا یہ کام نہیں کہ وُہ پیشگوئیاں کرتا پھرے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ مدعی مہدویت و مسیحیت کے زمانہ میں یہ کسوف خسوف رمضان میں ہوگا۔ اور ابتدائے آفرینش سے آجتک کبھی نہیں ہوا۔ پس اگر عقلی طور پر کسی قِسم کا اِشتباہ ہو۔ تو ایسے مخالفوں کو چاہیئے کہ وُہ تاریخی طور پر اس پیشگوئی کی عظمت کو کم کر دکھائیں یعنی کسی ایسے وقت کا پتہ دیں جبکہ رمضان میں کسوف خسوف اس طور پر ہوا ہو کہ پہلے کسی مدعی نے دعویٰ بھی کیا ہو۔ اور جس امر کا دعویٰ کیا ہو۔ اس امر کے ثبوت میں رمضان کے کسوف خسوف کی پہلے کسی نبی کے زمانہ میں پیشگوئی بھی کی گئی ہو مگر یہ ممکن نہیں کہ کوئی دکھلا سکے۔

ہمارے رسول اللہ کو سب سے بڑا اور قوی اعجاز اخلاق ہی کا دیا گیا

میری غرض اِس واقعہ کے بیان سے صرف یہ تھی کہ خوارق پر تو کسی نہ کسی رنگ میں لوگ عذرات پیش کر دیتے ہیں اور اُس کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ لیکن اخلاقی حالت ایک ایسی کرامت ہے جس پر کوئی اُنگلی نہیں رکھ سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا اور قوی اعجاز اخلاق ہی کا دیا گیا۔ جیسے فرمایا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[1] یوں تو آنحضرت صلعم کے ہر ایک قسم کے خوارق قوت ثبوت میں جملہ انبیاء علیہم السلام کے مُعجزات سے بجائے خود بڑھے ہوئے ہیں مگر آپؐ کے اخلاقی اعجاز کا نمبر اُن سب سے اوّل ہے۔ جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ نہیں بتلا سکتی اور نہ پیش کر سکے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو اپنے اخلاق سیئہ کو چھوڑ کر عادات ذمیمہ کو ترک کر کے خصائل حسنہ کو لیتا ہے اس کے لئے وُہی کرامت ہے۔ مثلاً اگر بہت ہی سخت تُند مزاج اور غصّہ ور ان عادات بد کو چھوڑتا ہے۔ اور حلم اور عفو کو اختیار کرتا ہے یا امساک کو چھوڑ کر سخاوت، اور حسد کی بجائے ہمدردی حاصِل کرتا ہے تو بیشک یہ کرامت ہے۔ اور ایسا ہی خود ستائی اور خود پسندی کو چھوڑ کر جب انکساری اور فروتنی اختیار کرتا ہے تو یہ فروتنی ہی کرامت ہے۔ پس تُم میں سے کون ہے جو نہیں چاہتا کہ کراماتی بن جاوے۔ میں جانتا ہوں

[1] القلم: ۵

ہر ایک یہی چاہتا ہے۔ تو بس یہ ایک دائمی اور زندہ کرامت ہے۔ انسان اخلاقی حالت کو درست کرے کیونکہ یہ ایسی کرامت ہے جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا بلکہ نفع دُور تک پہنچتا ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ خلق اور خالق کے نزدیک اہلِ کرامت ہو جاوے۔ بہت سے رِند اور عیاش ایسے دیکھے گئے ہیں جو کسی خارق عادت نشان کے قائل نہیں ہوئے۔ لیکن اخلاقی حالت کو دیکھ کر اُنہوں نے بھی سر جھکا لیا ہے اور بجز اقرار اور قائل ہونے کے دوسری راہ نہیں ملی۔ بہت سے لوگوں کے سوانح میں اس امر کو پاؤ گے کہ اُنہوں نے اخلاقی کرامات ہی کو دیکھ کر دینِ حق کو قبول کر لیا[1]۔

ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور جانا ہے پس عُمدہ حالت میں اِس دُنیا سے کُوچ کرو

پس مَیں پھر پکار کر کہتا ہوں اور میرے دوست سُن رکھیں کہ وُہ میری باتوں کو ضائع نہ کریں اور اُن کو صرف ایک قصّہ گو یا داستان کی کہانیوں ہی کا رنگ نہ دیں بلکہ میں نے یہ ساری باتیں نہایت دلسوزی اور سچّی ہمدردی سے جو فطرتاً میری رُوح میں ہے کی ہیں۔ اُن کو گوشِ دِل سے سُنو اور اُن پر عمل کرو!

ہاں خوب یاد رکھو اور اِس کو سچ سمجھو کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور جانا ہے پس اگر ہم عُمدہ حالت میں یہاں سے کُوچ کرتے ہیں تو ہمارے لئے مُبارکی اور خوشی ہے۔ ورنہ خطرناک حالت ہے۔ یاد رکھو کہ جب انسان بُری حالت میں جاتا ہے۔ تو مکان لبید اُس کے لئے یہیں سے شروع ہو جاتا ہے یعنی نزع کی حالت ہی سے اُس میں تغیر شروع ہو جاتا

[1] فٹ نوٹ: حضرت اقدسؑ یہ تقریر نہایت جوش اور مؤثر طریق سے فرما رہے تھے کہ چند سکھ فقیرانہ لباس میں آئے۔ نشہ میں مدہوش تھے۔ اُنہوں نے آکر ایسی بکواس کی کہ ممکن تھا اس بہشتی مجلس میں بھنگ پڑے۔ مگر ہمارے صادق امام علیہ السلام نے اپنے عملی نمونہ سے یہ اخلاقی کرامت جس کی ہدایت فرما رہے تھے، دکھائی جس کا اثر سامعین پر ایسا پڑا۔ کہ اکثر اُن میں سے چلّا چلّا کر فرطِ جوش سے رو پڑے وہ شریر آخر پولیس کے ہاتھ جا کر پڑے۔ اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ (ایڈیٹر) ۱۲

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَلَا یَحۡیٰی[1] یعنی جو شخص مجرم بن کر آویگا۔ اُس کے لئے ایک جہنّم ہے جس میں نہ مریگا اور نہ زندہ رہے گا۔ یہ کیسی صاف بات ہے۔ اصل لذّت زندگی کی راحت اور خوشی ہی میں ہے۔ بلکہ اسی حالت میں وُہ زندہ متصوّر ہوتا ہے جبکہ ہر طرح کے امن و آرام میں ہو۔ اگر وُہ کسی درد مثلاً قولنج یا درد دانت ہی میں مبتلا ہو جاوے تو وہ مُردوں سے بدتر ہوتا ہے اور حالت ایسی ہوتی ہے کہ نہ تو مُردہ ہی ہوتا ہے اور نہ زندہ ہی کہلا سکتا ہے پس اِسی پر قیاس کر لو۔ کہ جہنّم کے دردناک عذاب میں کیسی بُری حالت ہوگی ؛

مُجرم وُہ ہے جو اپنی زندگی میں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلّق قطع کر لے

مُجرم وہ ہے جو اپنی زندگی میں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلّق کاٹ لیوے۔ اُس کو تو حکم تھا کہ وُہ خدا تعالیٰ کے لئے ہو جاتا اور صادقوں کے ساتھ ہو جاتا مگر وُہ ہوا و ہوس کا بندہ بن کر رہا اور شریروں اور دشمنانِ خدا و رسُول سے مُوافقت کرتا رہا۔ گویا اس نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ سے قطع تعلّق کر لیا ہے۔ یہ ایک عادۃُ اللہ ہے کہ انسان جدھر قدم اُٹھاتا ہے۔ اُس کی مخالف جانب سے وُہ دُور ہوتا جاتا ہے۔ وُہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الگ ہو کر اگر ہوا و ہوسِ نفسانی کا بندہ ہوتا ہے تو خدا اُس سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ اور جوں جوں اِدھر تعلقات بڑھتے ہیں اُدھر کم ہوتے ہیں۔ یہ مشہُور بات ہے۔ کہ دِل را بدِل رہیست پس اگر خدا تعالیٰ سے عملی طور پر بیزاری ظاہر کرتا ہے تو سمجھ لے کہ خدا تعالیٰ بھی اُس سے بیزار ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ سے محبّت کرتا ہے اور پانی کی طرح اس کی طرف جُھکتا ہے۔ تو سمجھ لے کہ وُہ مہربان ہے۔ محبّت کرنے والے سے زیادہ اللہ تعالیٰ اُس کو محبت کرتا ہے۔ وُہ وُہ خدا ہے کہ اپنے محبّوں پر برکات نازل کرتا ہے۔ اور اُن کو محسوس کرا دیتا ہے۔ کہ خدا اُن کے ساتھ ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے کلام میں، اُن کے لبوں میں برکت رکھ دیتا ہے اور لوگ اُن کے کپڑوں اور اُن کی ہر بات سے برکت پاتے ہیں۔ اُمّتِ محمدیہ میں اِس کا

[1] طٰہٰ : ۷۵

بیّن ثبوت اِس وقت تک موجُود ہے۔

جو خدا تعالیٰ کیلئے ہو جاتا ہے خدا تعالیٰ اُس کا ہو جاتا ہے

کہ جو خدا کے لئے ہوتا ہے خدا اُس کا ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی طرف آنے والے کی سعی اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہے کہ زمیندار اپنا کھیت ضائع کرلے۔ نوکر موقوف ہو کر نقصان پہنچا دے۔ اِمتحان دینے والا کامیاب نہ ہو۔ مگر خدا کی طرف سعی کرنے والا کبھی بھی ناکام نہیں رہتا۔ اس کا سچا وعدہ ہے۔ کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1]۔ خدا تعالیٰ کی راہوں کی تلاش میں جو جویا ہوا۔ وُہ آخر منزلِ مقصُود پر پہنچا۔ دُنیوی امتحانوں کے لئے تیاریاں کرنے والے، راتوں کو دِن بنا دینے والے طالبعلموں کی محنت اور حالت کو ہم دیکھ کر رحم کھا سکتے ہیں۔ تو کیا اللہ تعالیٰ جس کا رحم اور فضل بیحد اور بے اَنت ہے۔ اپنی طرف آنے والے کو ضائع کر دیگا؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ[2]۔ اور پھر فرماتا ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ[3]۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہزارہا طالب علم سالہا سال کی محنتوں اور مشقتوں پر پانی پھرتا ہوا دیکھ کر روتے رہ جاتے ہیں اور خودکشیاں کرلیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضلِ عمیم ایسا ہے کہ وُہ ذرا سے عمل کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ پھر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ انسان دُنیا میں ظنّی اور وہمی باتوں کی طرف تو اس قدر گرویدہ ہو کر محنت کرتا ہے کہ آرام اپنے اُوپر گویا حرام کر لیتا ہے۔ اور صرف خُشک امید پر کہ شاید کامیاب ہو جاویں۔ ہزارہا رنج اور دُکھ اُٹھاتا ہے۔ تاجر نفع کی امید پر لاکھوں روپے لگا دیتا ہے۔ مگر یقین اسے بھی نہیں ہوتا کہ ضرور نفع ہی ہوگا۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف جانے والے کی (جس کے وعدے یقینی اور حتمی ہیں کہ جس کی طرف قدم اٹھانے والے کی ذرا بھی محنت رائیگاں نہیں جاتی) مَیں اس قدر دوڑ دھوپ اور سرگرمی نہیں پاتا ہوں۔ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟ وہ کیوں نہیں ڈرتے۔ کہ آخر ایک دن مرنا ہے۔ کیا وہ ان ناکامیوں کو دیکھ کر

[1] العنکبوت: ۷۰ [2] التوبہ: ۱۲۰ [3] الزلزال: ۸

بھی اس تجارت کے فکر میں نہیں لگ سکتے۔ جہاں خسارہ کا نام و نشان ہی نہیں۔ اور نفع یقینی ہے۔ زمیندار کس قدر محنت سے کاشتکاری کرتا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ نتیجہ ضرور راحت ہی ہوگا۔

یاد رکھو کہ وہ راہ جہاں انسان کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔ وُہ خدا کی راہ ہے

اللہ تعالیٰ کیسا رحیم ہے اور یہ کیسا خزانہ ہے۔ کہ کوڑی بھی جمع ہو سکتی ہے۔ روپیہ اور اشرفی بھی۔ نہ چور چکار کا اندیشہ نہ یہ خطرہ ہے کہ دوالا نکل جاویگا۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ اگر کوئی ایک کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو اُس کا بھی ثواب اس کو دیا جاتا ہے اور پانی نکالتا ہوا اگر ایک ڈول اپنے بھائی کے گھڑے میں ڈالدے تو خدا تعالیٰ اُس کا بھی اجر ضائع نہیں کرتا۔ پس یاد رکھو کہ وُہ راہ جہاں انسان کبھی ناکام نہیں ہو سکتا وُہ خدا کی راہ ہے۔ دُنیا کی شاہراہ ایسی ہے جہاں قدم قدم پر ٹھوکریں اور ناکامیوں کی چٹانیں ہیں۔ وُہ لوگ جنہوں نے سلطنتوں تک کو چھوڑ دیا آخر بیوقوف تو نہ تھے۔ جیسے ابراہیم ادہم۔ شاہ شجاع۔ شاہ عبدالعزیز جو مجدّد بھی کہلاتے ہیں۔ حکومت، سلطنت، اور شوکتِ دُنیا کو چھوڑ بیٹھے۔ اُس کی یہی وجہ تو تھی کہ ہر قدم پر ایک ٹھوکر موجود ہے۔ خدا ایک موتی ہے اس کی معرفت کے بعد انسان دُنیاوی اشیاء کو ایسی حقارت اور ذلّت سے دیکھتا ہے کہ ان کے دیکھنے کے لئے بھی اسے طبیعت پر ایک جبر اور اکراہ کرنا پڑتا ہے۔ پس خدا تعالےٰ کی معرفت چاہو۔ اور اُس کی طرف ہی قدم اٹھاؤ کہ کامیابی اسی میں ہے۔

ایمان کا طریق کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ سے اصلاح چاہنا اور اپنی قوت خرچ کرنا یہی ایمان کا طریق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو یقین سے اپنا ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دُعا

ردّ نہیں کرتا ہے۔ پس خدا سے مانگو اور یقین اور صدق نیّت سے مانگو۔ میری نصیحت پھر یہی ہے کہ اچھے اخلاق ظاہر کرنا ہی اپنی کرامت ظاہر کرنا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں کراماتی بننا نہیں چاہتا تو یہ یاد رکھے کہ شیطان اُسے دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ کرامت سے عُجب اور پندار مُراد نہیں ہے۔ کرامت سے لوگوں کو اسلام کی سچائی اور حقیقت معلوم ہوتی ہے اور ہدایت ہوتی ہے۔ میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ عُجب اور پندار تو کرامتِ اخلاقی میں داخل ہی نہیں۔ پس یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دیکھو یہ کروڑہا مسلمان جو رُوئے زمین کے مختلف حصص میں نظر آتے ہیں۔ کیا یہ تلوار کے زور سے، جبر و اکراہ سے ہوئے ہیں؟ نہیں! یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اسلام کی کراماتی تاثیر ہے جو اُن کو کھینچ لائی ہے۔ کرامتیں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک اخلاقی کرامت بھی ہے جو ہر میدان میں کامیاب ہے۔ اُنہوں نے جو مُسلمان ہوئے۔ صرف راستبازوں کی کرامت ہی دیکھی۔ اور اُس کا اثر پڑا۔ اُنہوں نے اسلام کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا۔ نہ تلوار کو دیکھا۔ بڑے بڑے محقق انگریزوں کو یہ بات ماننی پڑی ہے۔ کہ اسلام کی سچائی کی رُوح ہی ایسی قوی ہے جو غیر قوموں کو اسلام میں آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ہماری جماعت کے لوگ پیر کے مُرید ہو کر مجھے بدنام نہ کریں

جو شخص اپنے ہمسایہ کو اپنے اخلاق میں تبدیلی دکھاتا ہے کہ پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ وُہ گویا ایک کرامت دکھاتا ہے۔ اُس کا اثر ہمسایہ پر بہت اعلیٰ درجہ کا پڑتا ہے۔ ہماری جماعت پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا ترقی ہو گئی ہے اور تہمت لگاتے ہیں کہ افترا، غیظ و غضب میں مُبتلا ہیں۔ کیا یہ اُن کے لئے باعث ندامت نہیں ہے کہ انسان عُمدہ سمجھ کر اس سلسلہ میں آیا تھا جیسا کہ ایک رشید فرزند اپنے باپ کی نیکنامی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ بیعت کرنے والا فرزند کے حکم میں ہوتا ہے اور اسی لئے آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات کو اُمّہات المومنین کہا ہے گویا کہ حضورؐ عامۃ المومنین کے باپ

ہیں۔ جسمانی باپ زمین پر لانے کا موجب ہوتا ہے اور حیاتِ ظاہری کا باعث۔ مگر رُوحانی باپ آسمان پر لے جاتا اور اس مرکزِ اصلی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو بدنام کرے؟ طوائف کے ہاں جاوے؟ اور قمار بازی کرتا پھرے۔ شراب پیوے یا اور ایسے افعالِ قبیحہ کا مرتکب ہو جو باپ کی بدنامی کا موجب ہوں۔ میں جانتا ہوں کوئی آدمی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس فعل کو پسند کرے۔ لیکن جب وہ ناخلف بیٹا ایسا کرتا ہے تو پھر زبانِ خلق بند نہیں ہو سکتی۔ لوگ اُس کے باپ کی طرف نسبت کر کے کہیں گے کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا فلاں بدکام کرتا ہے۔ پس وہ ناخلف بیٹا خود ہی باپ کی بدنامی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح پر جب کوئی شخص ایک سلسلہ میں شامل ہوتا ہے اور اُس سلسلہ کی عظمت اور عزت کا خیال نہیں رکھتا اور اس کے خلاف کرتا ہے۔ تو وُہ عند اللہ ماخوذ ہوتا ہے۔ کیونکہ وُہ صرف اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ دوسروں کے لئے ایک بُرا نمونہ ہو کر ان کو سعادت اور ہدایت کی راہ سے محروم رکھتا ہے۔ پس جہاں تک آپ لوگوں کی طاقت ہے۔ خدا تعالیٰ سے مدد مانگو اور اپنی پُوری طاقت اور ہمّت سے اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کرو۔ جہاں عاجز آجاوٗ وہاں صدق اور یقین سے ہاتھ اُٹھاوٗ کیونکہ خشوع اور خضوع سے اُٹھائے ہوئے ہاتھ جو صدق اور یقین کی تحریک سے اُٹھتے ہیں خالی واپس نہیں ہوتے۔ ہم تجربہ سے کہتے ہیں کہ ہماری ہزارہا دُعائیں قبول ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں *

یہ ایک یقینی بات ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنے اندر اپنے اَبنائے جنس کے لئے ہمدردی کا جوش نہیں پاتا وُہ بخیل ہے۔ اگر مَیں ایک راہ دیکھوں جس میں بھلائی اور خیر ہے۔ تو میرا فرض ہے کہ میں پُکار پُکار کر لوگوں کو بتلاؤں۔ اس اَمر کی پرواہ نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ کوئی اُس پر عمل کرتا ہے یا نہیں ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

میں تمہارے اندر ایک نمایاں تبدیلی چاہتا ہوں

اگر ایک شخص بھی زندہ طبیعت کا نکل آوے تو کافی ہے میں یہ بات کھول کر بیان کرتا ہوں کہ میرے مُناسب حال یہ بات نہیں ہے کہ جو کچھ میں آپ لوگوں کو کہتا ہوں مَیں ثواب کی نیّت سے کہتا ہوں۔نہیں! میں اپنے نفس میں اِنتہا درجہ کا جوش اور درد پاتا ہوں گو وُہ وجُوہ نامعلوم ہیں۔کہ کیوں یہ جوش ہے۔مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ جوش ایسا ہے کہ میں رُک نہیں سکتا۔اس لئے آپ لوگ اِن باتوں کو ایسے آدمی کی وصایا سمجھ کر کہ پھر شاید ملنا نصیب نہ ہو۔اُن پر ایسے کاربند ہوں کہ ایک نمونہ ہو اور ان آدمیوں کو جو ہم سے دُور ہیں۔اپنے فعل اور قول سے سمجھا دو۔اگر یہ بات نہیں ہے اور عمل کی ضرورت نہیں ہے۔تو پھر مجھے بتلاؤ۔کہ یہاں آنے سے کیا مطلب ہے۔میں مخفی تبدیلی نہیں چاہتا۔نمایاں تبدیلی مطلوب ہے۔تاکہ مخالف شرمندہ ہوں اور لوگوں کے دِلوں پر یک طرفہ روشنی پڑے اور وہ نااُمید ہو جاویں۔کہ یہ مخالف ضلالت میں پڑے ہیں۔رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بڑے بڑے شریر آکر تائب ہوئے وُہ کیوں ؟ اس عظیم الشّان تبدیلی نے جو صحابہؓ میں ہوئی اور ان کے واجب التقلید نمونوں نے اُن کو شرمندہ کیا۔

عکرمہ کا پاک نمونہ

عکرمہ کا حال تم نے سُنا ہوگا۔اُحد کی مصیبت کا بانی مبانی یہی تھا۔اور اُس کا باپ ابوجہل تھا۔لیکن آخر اُسے صحابہ کرامؓ کے نمونوں نے شرمندہ کر دیا۔میرا مذہب یہ ہے کہ خوارق نے ایسا اثر نہیں کیا جیسا صحابہ کرامؓ کے پاک نمونوں اور تبدیلیوں نے لوگوں کو حیران کیا۔لوگ حیران ہو گئے کہ ہمارا چچا زاد کہاں سے کہاں پہنچا۔آخر اُنہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ سمجھا۔

عکرمہ نے ایک وقت ذاتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا اور دوسرے وقت

لشکرِ کفار کو درہم برہم کیا۔ غرض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں صحابہؓ نے جو پاک نمونے دکھائے ہیں۔ ہم آج فخر کے ساتھ ان کو دلائل اور آیات کے رنگ میں بیان کر سکتے ہیں چنانچہ عکرمہ ہی کا نمونہ دیکھو کہ کفر کے دنوں میں کُفر۔ عُجب وغیرہ خصائل بد اپنے اندر رکھتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ بس چلے تو اسلام کو دُنیا سے نابود کر دے۔ مگر جب خدا تعالیٰ کے فضل نے اس کی دستگیری کی اور وہ مشرف باسلام ہوا۔ تو ایسے اخلاق پیدا ہوئے۔ کہ وہ عُجب اور پندار نام تک کو باقی نہ رہا اور فروتنی اور انکسار پیدا ہوا کہ وہ انکسار حجۃ الاسلام ہو گیا اور صداقت اسلام کے لئے ایک دلیل ٹھہرا۔ ایک موقع پر کفّار سے مقابلہ ہوا۔ عکرمہ لشکر اسلام کا سپہ سالار تھا۔ کفار نے بہت سخت مقابلہ کیا یہانتک کہ لشکر اسلام کی حالت قریب شکست کھانے کے ہو گئی۔ عکرمہ نے جب دیکھا تو گھوڑے سے اُترا۔ لوگوں نے کہا آپ کیوں اُترتے ہیں۔ شاید ادھر اُدھر ہونے کا وقت ہو تو گھوڑا مدد دے۔ تو اُس نے کہا۔ اِس وقت مجھے وُہ زمانہ یاد آگیا ہے جب میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقابلہ کرتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جان دے کر گُناہوں کا کفّارہ کروں۔ اب دیکھئے کہ کہاں سے کہاں تک حالت پہنچی کہ بار بار محامد سے یاد کیا گیا۔ یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی رضا ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ جو اُس کی رضا اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جا بجا اُن کو رضی اللہ عنہم کہا ہے۔ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر شخص ان اخلاق کی پابندی کرے۔

عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کو بھی مدِّنظر رکھو

علاوہ ازیں دو حصّے اَور بھی ہیں۔ جن کو مدِّنظر رکھنا صادق اخلاص مند کا کام ہونا چاہیئے۔ اُن میں سے ایک عقائدِ صحیحہ کا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال فضل ہے کہ اُس نے کامل اور مکمل عقائد کی راہ ہم کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بدُوں مشقت ومحنت کے دکھائی ہے۔ وُہ راہ جو آپ لوگوں کو اِس زمانہ میں دکھائی گئی ہے بہت سے عالم ابھی تک اُس سے محرُوم ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کے اِس فضل اور نعمت کا شکر کرو۔ اور وُہ

شکر یہی ہے کہ سچے دل سے اُن اعمالِ صالحہ کو بجالاؤ جو عقائدِ صحیحہ کے بعد دُوسرے حصّہ میں آتے ہیں اور اپنی عملی حالت سے مدد لے کر دُعا مانگو کہ وُہ ان عقائدِ صحیحہ پر ثابت قدم رکھے اور اعمالِ صالحہ کی توفیق بخشے حصّہ عبادات میں صوم ،صلوٰۃ وزکوٰۃ وغیرہ امُور شامل ہیں۔ اب خیال کرو کہ مثلاً نماز ہی ہے۔ یہ دُنیا میں آئی ہے لیکن دُنیا سے نہیں آئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ

قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ

نماز کے پانچ وقت دراصل رُوحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ جو پانچ وقت نماز کے لئے مقرر ہیں یہ کوئی تحکّم اور جبر کے طور پر نہیں۔ بلکہ اگر غور کرو تو یہ دراصل رُوحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ[۱] یعنی قائم کرو نماز کو دلوک الشمس سے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہاں قیامِ صلوٰۃ کو دلوک شمس سے لیا ہے۔ دلوک کے معنوں میں گو اختلاف ہے۔ لیکن دوپہر کے ڈھلنے کے وقت کا نام دلوک ہے۔ اب دلوک سے لے کر پانچ نمازیں رکھ دیں۔ اس میں حکمت اور ستر کیا ہے۔ قانونِ قدرت دکھاتا ہے کہ روحانی تذلّل اور انکسار کے مراتب بھی دلوک ہی سے شروع ہوتے ہیں اور پانچ ہی حالتیں آتی ہیں۔ لیں یہ طبعی نماز بھی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب حُزن اور ہَم و غم کے آثار شروع ہوتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ انسان پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے۔ تو کس قدر تذلّل اور انکساری کرتا ہے۔ اب اُس وقت اگر زلزلہ آوے تو تم سمجھ سکتے ہو۔ کہ طبیعت میں کیسی رقّت اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر سوچو کہ اگر مثلاً کسی شخص پر نالش ہو تو سمن یا وارنٹ آنے پر اس کو معلوم ہوگا کہ فلاں دفعہ فوجداری یا دیوانی میں نالش ہوئی ہے۔ اب بعد مطالعہ وارنٹ اس کی حالت میں گویا نصف النہار کے بعد زوال

[۱] بنی اسرائیل : ۷۹

شروع ہوا۔ کیونکہ وارنٹ یا سمن تک تو اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اب خیال پیدا ہوا کہ خدا جانے ادھر وکیل ہو یا کیا ہو؟ اس قسم کے تردّدات اور تفکرات سے جو زوال پیدا ہوتا ہے یہ وہی حالت دلوک ہے اور یہ پہلی حالت ہے جو نماز ظہر کے قائم مقام ہے۔ اور اُس کی عکسی حالت نماز ظہر ہے۔ اب دوسری حالت اُس پر وُہ آتی ہے جبکہ وُہ کمرہ عدالت میں کھڑا ہے فریق مخالف اور عدالت کی طرف سے سوالات جرح ہو رہے ہیں اور وُہ ایک عجیب حالت ہوتی ہے۔ یہ وُہ حالت اور وقت ہے۔ جو نماز عصر کا نمونہ ہے۔ کیونکہ عصر گھونٹنے اور نچوڑنے کو کہتے ہیں۔ جب حالت اَور بھی نازک ہو جاتی ہے اور فرد قرار دادِ جُرم لگ جاتی ہے۔ تو یاس اور نا اُمیدی بڑھتی ہے۔ کیونکہ اب خیال ہوتا ہے کہ سزا مل جاوے گی۔ یہ وُہ وقت ہے جو مغرب کی نماز کا عکس ہے۔ پھر جب حکم سُنایا گیا اور کنسٹبل یا کورٹ انسپکٹر کے حوالہ کیا گیا تو وہ رُوحانی طور پر نماز عشا کی عکسی تصویر ہے۔ یہانتک کہ نماز کی صُبح صادق ظاہر ہوتی اور اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا[1] کی حالت کا وقت آگیا۔ تو روحانی نماز فجر کا وقت آگیا۔ اور فجر کی نماز اس کی عکسی تصویر ہے۔

تم اپنے اخلاق و عادات میں ایک نمایاں تبدیلی کرو جو دوسروں کیلئے مُوجب ہدایت و سعادت ہو

القصہ میں پھر تم کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ تم جو میرے ساتھ ایک سچا تعلق پیدا کرتے ہو۔ اُس سے یہی غرض ہے کہ تم اپنے اخلاق میں، عادات میں ایک نمایاں تبدیلی کرو۔ جو دُوسروں کے لئے ہدایت اور سعادت کا مُوجب ہو۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی صفحہ ۱۴۰-۱۴۷)

۱۴ جنوری ۱۸۹۸ء۔ فرمایا۔ لوگوں کو لازم ہے کہ آخرت پر نظر رکھیں۔ عذاب سے پہلے ڈرنا چاہیئے ؎ مَرد آخر بیں مُبارک بندہ ایست

[1] الانشراح: ۷

ہماری جماعت آخرت پر نظر رکھے

دیکھو لوط وغیرہ قوموں کا انجام کیا ہوا۔ ہر ایک کو لازم ہے کہ دل اگر سخت بھی ہو۔ تو اس کو ملامت کر کے خشوع و خضوع کا سبق دے۔ ہماری جماعت کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اُن کو تازہ معرفت ملتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ تو معرفت کا کرے مگر اس پر چلے نہیں تو یہ لاف و گزاف ہی ہے۔ اس لئے ہماری جماعت دوسروں کی غفلت سے خود غافل نہ رہے اور اُن کی محبت کو سرد دیکھ کر اپنی محبّت کو ٹھنڈا نہ کرے۔ انسان بہت تمنّائیں رکھتا ہے غیب کی قضاو قدر کی کِس کو خبر ہے۔ آرزوؤں کے موافق زندگی کبھی نہیں چلتی ہے۔ آرزوؤں کا سلسلہ اَور ہے اور قضاء و قدر کا سلسلہ اَور ہے اور یہی سلسلہ سچّا ہے۔ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے پاس انسان کے سوانح سچّے ہیں۔ اُسے کیا معلوم ہے کہ اس میں کیا کیا لکھا ہے۔ اس لئے دِل کو جگا جگا کر متوجّہ کرنا چاہیئے۔

مصائب دُور نہ ہوں گی جبتک لوگوں کی ضد اور اَڑ دُور نہ ہو

فرمایا۔ افسوس کی بات ہے کہ عام طور پر مصائب کے آنے کی وجہ سے لوگوں کا عُجب و نخوت دُور نہیں ہوا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ دُور نہ ہونگی جبتک لوگوں کی ضِد اور اَڑ دور نہ ہوگی۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ خدا تعالیٰ سے پُوری مصالحت کے لئے تیار نہیں ہیں قحط کے دَوران میں لوگوں نے محسُوس نہیں کیا۔ ابتدا میں مکّہ و مدینہ کا فتویٰ بھی ڈرا دیا کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی کہتا کہ مکّہ معظمہ سے یہ فتویٰ آیا ہے تو لوگ ڈر جاتے تھے۔ لیکن اب ان مصائب کو دیکھ کر بھی لوگ نہیں ڈرتے۔ میری رائے ہے جبتک لوگ کامل طور پر رجُوع نہ کریں۔ تقدیر نہ بدلیگی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ [1]

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

شیعہ مذہب کے مخالف اسلام عقاید

۱۵ر جنوری ۱۸۹۸ء۔ فرمایا۔ شیعہ مذہب اِسلام کا سخت مخالف ہے۔ اوّل۔ شیعہ

[1] الرعد: ۱۲

کا اعتقاد ہے کہ جبرائیل وحی لانے میں غلطی کھا گیا ہے۔ دوم۔ صحابہؓ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کے بعد حاصل ہوئے تھے اُن کے نزدیک معاذ اللہ مسلمان نہ تھے۔ سوم۔ قرآن شریف جو اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب ہے اور جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالےٰ وعدہ کر چکا ہے۔ شیعہ کے اعتقاد کے موافق قرآن شریف اصلی نہیں ہے۔ امام مہدی اصل قرآن غار میں لے جا کر چھپ رہے چہارم۔ بارہ اماموں تک ولایت ختم ہو چکی۔ باقی قیامت تک آدمی وحشیوں کی طرح رہے اور خدا کو اُن سے محبت نہیں۔ پنجم۔ خدا تعالیٰ کے حبیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو گالیاں دینا دُرود شریف کے پڑھنے سے بھی زیادہ ثواب سمجھتے ہیں۔ ششم۔ کسی اکابر اور اہل اللہ کو نیک نہیں سمجھتے۔ میں نے اپنے اُستاد سے حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ کی نسبت سُنا ہے کہ وُہ گالیاں دیتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ بدنام یزید ہے۔ اگر اُس کی شراکت سے امام حسینؓ کی شہادت ہوئی تو بُرا کیا۔ لیکن آج کل کے شیعہ مل کر بھی وہ دینی کام نہیں کر سکتے۔ جو اُس نے کیا۔

اہلِ کتاب

اہل کتاب کے کھانا کھانے پر بابو محمد افضل صاحب کے سوال پر حضرت اقدس نے جواب دیا کہ "تمدن کے طور پر ہندوؤں کی چیز بھی کھا لیتے ہیں۔ اِسی طرح عیسائیوں کا کھانا بھی درست ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ خیال ضروری ہے کہ برتن پاک ہوں۔ کوئی ناپاک چیز نہ ہو۔"

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ پرچہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

تین قسم کی خوشیاں

۱۵ جنوری ۱۸۹۸ء کو خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے کے ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں کامیاب ہونے کی خبر آئی۔ فجر کی نماز کے بعد حضرت اقدس امام ہمام علیہ السلام بیٹھ گئے۔ اور مندرجہ ذیل مختصر سی تقریر فرمائی:۔

انسان کو ہر قسم کی کامیابی کے موقع پر ایک خوشی ہوتی ہے۔ قرآن شریف سے تین قسم کی خوشیاں لہو، لعب، تفاخر معلوم ہوتی ہیں۔ لہو میں اشیاء خوردنی شامل ہیں۔ اور لعب میں شادی وغیرہ کی خوشیاں اور تفاخر میں مال وغیرہ کی خوشیاں۔ یہ تین قسم کی خوشیاں ہیں۔ ان سے باہر کوئی خوشی نہیں ہے۔ مگر یاد رکھو کہ کامیابیاں اور یہ خوشیاں دائمی نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ اُن کے ساتھ دِل لگاؤ گے تو سخت حرج ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ ایک وقت آجاتا ہے کہ اِن خوشیوں کا زمانہ تلخیوں سے بدلنے لگتا ہے۔

دُنیا کی کامیابیاں ابتلا سے خالی نہیں ہوتیں

دُنیا کی کامیابیاں ابتلا سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ [1] (پ۲۹) یعنی موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ ہم تمہیں آزمائیں۔ کامیابی اور ناکامی بھی زندگی اور موت کا سوال ہوتا ہے۔ کامیابی ایک قسم کی زندگی ہوتی ہے۔ جب کسی کو اپنے کامیاب ہونے کی خبر پہنچتی ہے تو اس میں جان پڑجاتی ہے۔ اور گویا نئی زندگی ملتی ہے اور اگر ناکامی کی خبر آجائے تو زندہ ہی مرجاتا ہے۔ اور بسا اوقات بہت سے کمزور دِل آدمی ہلاک بھی ہوجاتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عام زندگی اور موت تو ایک آسان امر ہے۔ لیکن جہنمی زندگی اور موت دُشوار ترین چیز ہے۔ سعید آدمی ناکامی کے بعد کامیاب ہوکر اور بھی سعید ہوجاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ پر ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اُس کو ایک مزہ آتا ہے۔ جب وُہ غور کرتا ہے۔ کہ میرا خدا کیسا ہے۔ اور دُنیا کی کامیابی خداشناسی کا ایک بہانہ ہوجاتا ہے۔ ایسے آدمیوں کے لئے یہ دُنیوی کامیابیاں حقیقی کامیابی کا (جس کو اسلام کی اصطلاح میں فلاح کہتے ہیں) ایک ذریعہ ہوجاتی ہیں۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ سچی خوشحالی سچی راحت دُنیا اور دُنیا کی چیزوں میں ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ دُنیا کے تمام شعبے دیکھ کر بھی انسان سچا اور دائمی سرور حاصل نہیں

[1] الملک : ۳

کر سکتا۔ تُم دیکھتے ہو کہ دولتمند زیادہ مال و دَولت رکھنے والے ہر وقت خنداں رہتے ہیں۔ مگر اُن کی حالت جرب یعنی خارش کے مریض کی سی ہوتی ہے۔ جس کو کھجلانے سے راحت ملتی ہے۔ لیکن اس خارش کا آخری نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ خُون نکل آتا ہے۔ پس اِن دُنیوی اور عارضی کامیابیوں پر اس قدر خوش مت ہو۔ کہ حقیقی کامیابی سے دُور چلے جاؤ۔ بلکہ اِن کامیابیوں کو خداشناسی کا ایک ذریعہ قرار دو۔ اپنی ہمّت اور کوشش پر نازمت کرو اور مت سمجھو کہ یہ کامیابی ہماری کسی قابلیّت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ سوچو کہ اس رحیم خدا نے جو کبھی کسی کی سچّی محنت کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ ہماری محنت کو بارور کیا۔ ورنہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ صدہا طالب علم آئے دن امتحانوں میں فیل ہوتے ہیں۔ کیا وُہ سب کے سب محنت نہ کرنے والے اور بالکل غبی اور بلید ہی ہوتے ہیں؟ نہیں بلکہ بعض ایسے ذکی اور ہوشیار ہوتے ہیں کہ پاس ہونے والوں میں سے اکثر کے مقابلہ میں ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس لئے واجب اور ضروری ہے کہ ہر کامیابی پر مومن خدا تعالیٰ کے حضور سجدات شکر بجا لائے۔ کہ اُس نے محنت کو اکارت تو نہیں جانے دیا۔ اس شکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ سے محبّت بڑھے گی اور ایمان میں ترقی ہوگی اور نہ صرف یہی بلکہ اَور بھی کامیابیاں ملیں گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر کرو گے تو البتّہ میں نعمتوں کو زیادہ کروں گا۔ اور اگر کُفرانِ نعمت کرو گے۔ تو یاد رکھو عذاب سخت میں گرفتار ہوگے۔

مومن اور کافر کی کامیابی میں فرق

اس اُصول کو ہمیشہ مدّنظر رکھو۔ مومن کا کام یہ ہے کہ وُہ کسی کامیابی پر جو اُسے دی جاتی ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے اور خدا کی حمد کرتا ہے کہ اُس نے اپنا فضل کیا۔ اور اس طرح پر وہ قدم آگے رکھتا ہے اور ہر ابتلا میں ثابت قدم رہ کر ایمان پاتا ہے۔ بظاہر ایک ہندو اور مومن کی کامیابی ایک رنگ میں مُشابہ ہوتی ہے لیکن یاد رکھو کہ کافر کی کامیابی

ضلالت کی راہ ہے اور مومن کی کامیابی سے اُس کے لئے نعمتوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ کافر کی کامیابی اِس لئے ضلالت کی طرف لے جاتی ہے کہ وُہ خدا کی طرف رجُوع نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی محنت، دانش اور قابلیّت کو خدا بنا لیتا ہے۔ مگر مومن خدا کی طرف رجُوع کر کے خدا سے ایک نیا تعارف پیدا کرتا ہے اور اِس طرح پر ہر ایک کامیابی کے بعد اُس کا خدا سے ایک نیا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُس میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا[1] خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے جو متّقی ہوتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن شریف میں تقویٰ کا لفظ بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس کے معنی پہلے لفظ سے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مَعَ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی جو خدا کو مقدّم سمجھتا ہے خدا اس کو مقدّم رکھتا ہے۔ اور دُنیا میں ہر قسم کی ذلّتوں سے بچا لیتا ہے۔ میرا ایمان یہی ہے کہ اگر انسان دُنیا میں ہر قسم کی ذلّت اور سختی سے بچنا چاہے تو اُس کے لئے ایک ہی راہ ہے کہ متّقی بن جائے۔ پھر اُس کو کسی چیز کی کمی نہیں۔ پس مومن کی کامیابیاں اُس کو آگے لے جاتی ہیں اور وُہ وہیں پر نہیں ٹھہر جاتا۔

کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی کرنی چاہیئے

اکثر لوگوں کے حالات کتابوں میں لکھے ہیں کہ اوائل میں دُنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شدید تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے کوئی دُعا کی اور وُہ قبول ہو گئی۔ اِس کے بعد ان کی حالت ہی بدل گئی۔ اِس لئے اپنی دُعاؤں کی قبولیت اور کامیابیوں پر نازاں نہ ہو بلکہ خدا کے فضل اور عنایت کی قدر کرو۔ قاعدہ ہے کہ کامیابی پر ہمّت اور حوصلہ میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے۔ اس زندگی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور اِس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ سب سے اعلیٰ درجہ کی بات جو کام آنے والی ہے وہ یہی معرفتِ الٰہی ہے اور یہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر غور کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا۔

[1] النحل : ۱۲۹

بہت تنگدستی بھی انسان کو مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے۔ اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ۔ ایسے لوگ میں نے خود دیکھے ہیں۔ جو اپنی تنگدستیوں کی وجہ سے دہریہ ہو گئے ہیں۔ مگر مومن کسی تنگی پر بھی خدا سے بدگمان نہیں ہوتا اور اس کو اپنی غلطیوں کا نتیجہ قرار دے کر اُس سے رحم اور فضل کی درخواست کرتا ہے اور جب وُہ زمانہ گذر جاتا ہے اور اُس کی دعائیں بارور ہوتی ہیں۔ تو وُہ اس عاجزی کے زمانہ کو بھولتا نہیں۔ بلکہ اُسے یاد رکھتا ہے۔ غرض اگر اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کام پڑتا ہے۔ تو تقویٰ کا طریق اختیار کرو۔ مُبارک وُہ ہے جو کامیابی اور خوشی کے وقت تقویٰ اختیار کرلے۔ اور بدقسمت وُہ ہے جو ٹھوکر کھا کر اُس کی طرف نہ جُھکے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳۔ صفحہ ۱، ۲۔ پرچہ ۲۴ جون ۱۹۰۱ء)

تقریر حضرت اقدس علیہ السّلام

۱۸ جنوری ۱۸۹۸ء۔

تقدیر

تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام معلّق ہے۔ اور دوسری کو مُبرم کہتے ہیں۔ اگر کوئی تقدیر معلّق ہو تو دُعا اور صدقات اُس کو ٹلا دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُس تقدیر کو بدل دیتا ہے۔ مُبرم ہونے کی صُورت میں وہ صدقات اور دُعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں وُہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وُہ اس دُعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرائے میں اُس کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقّف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔

قضائے معلّق اور مُبرم

قضائے معلّق اور مُبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یہ الفاظ گو نہیں مثلاً قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔[1] ترجمہ " دُعا مانگو۔ میں قبول کرونگا" اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دُعا قبول ہو سکتی ہے اور دُعا سے عذاب ٹل جاتا ہے۔ اور ہزارہا کیا کُل کام دُعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کُل چیزوں پر قادرانہ تصرّف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ اس کی پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو۔ مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزارہا دردمندوں کی دُعا کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں۔ کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرّف ہے۔ وُہ جو چاہتا ہے۔ محو کرتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے۔ اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ امر ضروری نہیں کہ ہم اس کی تہ تک پہنچیں اور اس کی کُنہ اور کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شے ہونے والی ہے۔ اس لئے ہم کو جھگڑے اور مباحثے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے قضاء و قدر کو مشروط کر رکھا ہے جو توبہ۔ خشوع۔ خضوع سے ٹل سکتی ہیں۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے تو وہ فطرتاً اور طبعاً اعمالِ حسنہ کی طرف رجُوع کرتا ہے۔ اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسُوس کرتا ہے۔ جو اسے بیدار کرتا اور نیکیوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے اور گناہ سے ہٹاتا ہے۔ جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربے کے ذریعہ سے پا لیتے ہیں۔ اسی طرح پر ایک مُضطرب الحال انسان جب خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہایت تذلّل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے اور رَبِّیْ رَبِّیْ کہکر اس کو پکارتا اور دُعائیں مانگتا ہے۔ تو وہ رؤیائے صالحہ یا الہام صحیحہ کے ذریعہ سے ایک بشارت اور تسلّی پا لیتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے دُعا انتہا کو پہنچے۔ تو وُہ قبول ہو جاتی ہے۔ دُعا صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایسی ثابت شدہ صداقت ہے۔ جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کا اتفاق ہے۔ اور کروڑہا صُلحا اور اتقیا اور اَولیاء اللہ کے ذاتی تجربے اس

[1] المومن : ۶۱

امر پر گواہ ہیں۔

نماز کی حقیقت

نماز کیا ہے؟ یہ ایک خاص دُعا ہے۔ مگر لوگ اِس کو بادشاہوں کا ٹیکس سمجھتے ہیں۔ نادان اتنا نہیں جانتے کہ بھلا خدا تعالیٰ کو ان باتوں کی کیا حاجت ہے۔ اسکے غنا رذاتی کو اس بات کی کیا حاجت ہے کہ انسان دعا، تسبیح اور تہلیل میں مصروف ہے بلکہ اس میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے کہ وہ اس طریق پر اپنے مطلب کو پہنچ جاتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ آجکل عبادات اور تقویٰ اور دینداری سے محبت نہیں ہے۔ اِس کی وجہ ایک عام زہریلا اثر رسم کا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سرد ہو رہی ہے۔ اور عبادت میں جس قسم کا مزا آنا چاہیئے۔ وُہ مزا نہیں آتا۔ دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں لذت اور ایک خاص حظ اللہ تعالےٰ نے نہ رکھا ہو۔ جس طرح پر ایک مریض ایک عُمدہ سے عُمدہ خوش ذائقہ چیز کا مزہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اور وُہ اسے تلخ یا بالکل پھیکا سمجھتا ہے۔ اسی طرح وُہ لوگ جو عبادت الٰہی میں حظ اور لذت نہیں پاتے۔ اُن کو اپنی بیماری کا فکر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی لذت نہ رکھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ اس عبادت میں اُس کے لئے لذت اور سرُور نہ ہو۔ لذت اور سرُور تو ہے مگر اُس سے حظ اٹھانے والا بھی تو ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔[1] اب اِنسان جبکہ عبادت ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ عبادت میں لذت اور سرُور بھی درجہ غایت کا رکھا ہو۔ اِس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربے سے خوب سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً دیکھو اناج اور تمام خوردنی اور نوشیدنی اشیاء انسان کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ تو کیا اُن سے وُہ ایک لذت اور حظ نہیں پاتا ہے؟ کیا اس ذائقہ، مزے اور اِحساس کے لئے اُس کے مُنہ میں زبان موجود نہیں۔ کیا وُہ خوبصورت اشیاء دیکھ کر نباتات

[1] الذّٰریٰت : ۵۷

ہوں یا جمادات۔ حیوانات ہوں یا انسان حظّ نہیں پاتا؟ کیا دل خوش کُن اور سُریلی آوازوں سے اس کے کان محظوظ نہیں ہوتے؟ پھر کیا کوئی دلیل اَور بھی اِس امر کے اثبات کے لئے مطلوب ہے۔ کہ عبادت میں لذّت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے **عورت** اور **مَرد** کو جوڑا پیدا کیا۔ اور مَرد کو رغبت دی ہے۔ اب اس میں زبردستی نہیں کی بلکہ ایک لذّت بھی دکھلائی ہے۔ اگر محض توالد و تناسل ہی مقصود بالذّات ہوتا تو مطلب پُورا نہ ہو سکتا۔ عورت اور مَرد کی برہنگی کی حالت میں اُن کی غیرت قبول نہ کرتی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلّق پیدا کریں۔ مگر اس میں اُن کے لئے ایک حظ ہے۔ اور ایک لذّت ہے۔ یہ حظّ اور لذّت اِس درجہ تک پہنچی ہے۔ کہ بعض کوتاہ اندیش انسان اولاد کی بھی پروا اور خیال نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو صرف حظّ ہی سے کام اور غرض ہے۔ خدا تعالیٰ کی علّت غائی بندوں کا پَیدا کرنا تھا۔ اور اس سبب کے لئے ایک تعلّق عورت مَرد میں قائم کیا اور ضمناً اس میں ایک حظّ رکھ دیا جو اکثر نادانوں کے لئے مقصود بالذّات ہوگیا ہے۔ اسی طرح سے خوب سمجھ لو۔ کہ عبادت بھی کوئی بوجھ اور ٹیکس نہیں۔ اس میں بھی ایک لذّت اور سرُور ہے اور یہ لذّت اور سرُور دُنیا کی تمام لذّتوں اور تمام حظوظ نفس سے بالاتر اور بُلند ہے جیسے عورت اور مَرد کے باہمی تعلّقات میں ایک لذّت ہے۔ اور اس سے وہی بہرہ مند ہو سکتا ہے جو مرد اپنے قویٰ صحیحہ رکھتا ہے۔ ایک نامرد اور مخنّث وہ حظ نہیں پا سکتا۔ اور جیسے ایک مریض کسی عُمدہ سے عُمدہ خوش ذائقہ غذا کی لذّت سے محروم ہے۔ اسی طرح پر ہاں ٹھیک ایسا ہی وہ کمبخت انسان ہے جو عبادت الٰہی سے لذّت نہیں پا سکتا۔

عبودیّت اور ربوبیّت کے رشتہ کی حقیقت

عورت اور مرد کا جوڑا تو باطل اور عارضی جوڑا ہے۔ میں کہتا ہوں حقیقی۔ ابدی اور لذّت مجسّم جو جوڑ ہے۔ وُہ اِنسان اور خدا تعالیٰ کا ہے۔ مجھے سخت اضطراب ہوتا اور کبھی کبھی یہ رنج میری جان کو کھانے لگتا ہے کہ ایک دن اگر کسی کو روٹی یا کھانے

کا مزا نہ آئے۔ تو طبیب کے پاس جاتا اور کیسی کیسی منّتیں اور خوشامدیں کرتا ہے۔ روپیہ خرچ کرتا۔ دُکھ اٹھاتا ہے کہ وُہ مزا حاصل ہو۔ وہ نامرد جو اپنی بیوی سے لذّت حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض اَوقات گھبرا گھبرا کر خودکشی کے ارادے تک پہنچ جاتا اور اکثر موتیں اس قسم کی ہو جاتی ہیں۔ مگر آہ! وُہ مریضِ دِل وُہ نامراد کیوں کوشش نہیں کرتا جس کو عبادت میں لذّت نہیں آتی؟ اُس کی جان کیوں غم سے نڈھال نہیں ہو جاتی۔ دُنیا اور اُس کی خوشیوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔ مگر ابدی اور حقیقی راحتوں کی وُہ پیاس اور تڑپ نہیں پاتا۔ کس قدر بے نصیب ہے۔ کیسا ہی محرُوم ہے! عارضی اور فانی لذّتوں کے علاج تلاش کرتا ہے اور پا لیتا ہے۔ کیا ہو سکتا ہے کہ مُستقل اور ابدی لذّت کے علاج نہ ہوں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تلاشِ حق میں مستقل اور پویہ قدم درکار ہیں۔ قرآن کریم میں ایک موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے صالحین کی مثال عورتوں سے دی ہے۔ اس میں بھی سِرّ اور بھید ہے۔ ایمان لانے والوں کو مریم اور آسیہ سے مثال دی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ مُشرکین میں سے مومنوں کو پیدا کرتا ہے۔ بہرحال عورتوں سے مثال دینے میں دراصل ایک لطیف راز کا اظہار ہے یعنی جس طرح عورت اور مَرد کا باہم تعلّق ہوتا ہے۔ اسی طرح پر عبودیّت اور ربوبیّت کا رشتہ ہے۔ اگر عورت اور مَرد کی باہم موافقت ہو اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو تو وُہ جوڑا ایک مُبارک اور مفید ہوتا ہے۔ ورنہ نظامِ خانگی بگڑ جاتا ہے اور مقصُود بالذّات حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرد اَور جگہ خراب ہوتا ہے۔ صدہا قسم کی بیماریاں لے آتا ہے آتشک سے مجذُوم ہو کر دُنیا میں ہی محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر اَولاد ہو بھی جاوے تو کئی پُشت تک یہ سلسلہ برابر چلا جاتا ہے۔ اور اُدھر عورت بےحیائی کرتی پھرتی ہے۔ اور عزّت و آبرُو کو ڈبو کر بھی سچّی راحت حاصل نہیں کر سکتے۔ غرض اس جوڑے سے الگ ہو کر کس قدر بدنتائج اور فِتنے پَیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر انسان رُوحانی جوڑے سے الگ ہو کر مجذُوم اور مخذُول ہو جاتا ہے۔ دُنیاوی جوڑے سے زیادہ رنج و مصائب کا نشانہ بنتا ہے۔ جیسا کہ

عورت اور مرد کے جوڑے سے ایک قسم کی بقاء کے لئے حظ ہے۔ اسی طرح پر عبودیت اور ربوبیت کے جوڑے میں ایک ابدی بقار کے لئے حظ موجود ہے۔ صُوفی کہتے ہیں۔ جس کو یہ حظ نصیب ہو جاوے وُہ دُنیا و مافیہا کے تمام حظُوظ سے بڑھ کر ترجیح رکھتا ہے۔ اگر ساری عُمر میں ایکبار بھی اس کو معلوم ہو جاوے تو اُس میں ہی فنا ہو جاوے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ دُنیا میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ اور اُن کی نمازیں صرف ٹکریں ہیں اور اوپرے دِل کے ساتھ ایک قسم کی قبض اور تنگی سے صرف نشست و برخاست کے طور پر ہوتی ہیں۔ مجھے اَور بھی افسوس ہوتا ہے جب مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ صرف اس لئے نمازیں پڑھتے ہیں کہ وہ دُنیا میں معتبر اور قابلِ عزت سمجھے جاویں۔ اور پھر اس نماز سے یہ بات اُن کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی وُہ نمازی اور پرہیزگار کہلاتے ہیں۔ پھر اُن کو کیوں یہ کھا جانے والا غم نہیں لگتا کہ جب جھوٹ مُوٹ اور بیدِل کی نماز سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں ایک سچے عابد بننے سے ان کو عزت نہ ملیگی اور کیسی عزت ملیگی۔

نماز میں لذّت نہ آنے کی وجہ اور اُس کا علاج

غرض میں دیکھتا ہوں کہ لوگ نمازوں میں غافل اور سُست اس لئے ہوتے ہیں کہ اُن کو اس لذّت اور سرُور سے اطلاع نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر رکھا ہے اور بڑی بھاری وجہ اس کی یہی ہے۔ پھر شہروں اور گاؤں میں تو اور بھی سُستی اور غفلت ہوتی ہے۔ سو پچاسواں حصہ بھی تو پُوری مُستعدی اور سچی محبت سے اپنے مولا حقیقی کے حضُور سر نہیں جھکاتا۔ پھر سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ اُن کو اس لذّت کی اطلاع نہیں۔ اور نہ کبھی اُنہوں نے اس مزہ کو چکھا۔ اور مذاہب میں ایسے احکام نہیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے کاموں میں مُبتلا ہوتے ہیں اور مؤذّن اذان دے دیتا ہے۔ پھر وہ سُننا بھی نہیں چاہتے۔ گویا ان کے دل دُکھتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی قابلِ

رحم ہیں۔ بعض لوگ یہاں بھی ایسے ہیں کہ اُن کی دُکانیں دیکھو تو مسجدوں کے نیچے ہیں۔ مگر کبھی جا کر کھڑے بھی تو نہیں ہوتے۔ پس مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ سے نہایت سوز اور ایک جوش کے ساتھ یہ دُعا مانگنی چاہیئے کہ جس طرح پھلوں اور اشیاء کی طرح طرح کی لذتیں عطا کی ہیں۔ نماز اور عبادت کا بھی ایکبار مزہ چکھا دے۔ کھایا ہوا یاد رہتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص کسی خوبصورت کو ایک سرور کے ساتھ دیکھتا ہے۔ تو وہ اُسے خوب یاد رہتا ہے۔ اور پھر اگر کسی بدشکل اور مکروہ ہیئت کو دیکھتا ہے۔ تو اُس کی ساری حالت بہ اعتبار اس کے مجسّم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ہاں۔ اگر کوئی تعلق نہ ہو تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اسی طرح بے نمازوں کے نزدیک نماز ایک تاوان ہے کہ ناحق صبح اٹھ کر سردی میں وضو کر کے خواب راحت چھوڑ کر کئی قسم کی آسائشوں کو کھو کر پڑھنی پڑتی ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اُسے بیزاری ہے وُہ اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ اُس لذّت اور راحت سے جو نماز میں ہے۔ اُس کو اطلاع نہیں ہے پھر نماز میں لذّت کیونکر حاصل ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک شرابی اور نشہ باز انسان کو جب سرُور نہیں آتا تو وُہ پے در پے پیالے پیتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اُس کو ایک قسم کا نشہ آجاتا ہے۔ دانشمند اور بزرگ انسان اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور وُہ یہ کہ نماز پر دوام کرے اور پڑھتا جاوے۔ یہانتک کہ اُس کو سرُور آجاوے۔ اور جیسے شرابی کے ذہن میں ایک لذّت ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود بالذّات ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ذہن میں اور ساری طاقتوں کا رُجحان نماز میں اُسے سرور کا حاصل کرنا ہو۔ اور پھر ایک خلوص اور جوش کے ساتھ کم ازکم اس نشہ باز کے اضطراب اور قلق و کرب کی مانند ہی ایک دُعا پیدا ہو۔ کہ وہ لذّت حاصل ہو تو میں کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً وُہ لذّت حاصل ہو جاوے گی۔ پھر نماز پڑھتے وقت اُن مفاد کا حاصل کرنا بھی ملحوظ ہو جو اُس سے ہوتے ہیں اور احسان پیش نظر رہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ[1] - نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ پس ان حسنات کو اور لذّات کو دل میں رکھ کر دُعا کرے۔ کہ وُہ نماز جو

[1] ھود : ۱۱۵

کہ صدیقوں اور محسنوں کی ہے۔ وُہ نصیب کرے۔ یہ جو فرمایا ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ [1] یعنی نیکیاں یا نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے یا دوسرے مقام پر فرمایا ہے نماز فواحش اور بُرائیوں سے بچاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیاں کرتے ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ وُہ نمازیں پڑھتے ہیں مگر نہ رُوح اور راستی کے ساتھ۔ وُہ صرف رسم اور عادت کے طور پر ٹکریں مارتے ہیں۔ اُن کی رُوح مُردہ ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام حَسنات نہیں رکھا۔ اور یہاں جو حسنات کا لفظ رکھا الصلوٰۃ کا لفظ نہیں رکھا۔ باوجودیکہ معنے وُہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تا نماز کی خوبی اور حُسن وجمال کی طرف اشارہ کرے۔ کہ وُہ نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے جو اپنے اندر ایک سچائی کی رُوح رکھتی ہے۔ اور فیض کی تاثیر اُس میں موجود ہے۔ وُہ نماز یقیناً یقیناً برائیوں کو دُور کرتی ہے۔ نماز نشست و برخاست کا نام نہیں ہے۔ نماز کا مغز اور رُوح وُہ دُعا ہے جو ایک لذّت اور سرور اپنے اندر رکھتی ہے۔

ارکان نماز دراصل آداب خدمتگاراں ہیں

ارکانِ نماز دراصل رُوحانی نشست و برخاست ہیں۔ انسان کو خدا تعالیٰ کے رُوبرو کھڑا ہونا پڑتا ہے اور قیام بھی آداب خدمتگاراں میں سے ہے۔ رکوع جو دوسرا حصّہ ہے بتلاتا ہے کہ گویا تیاری ہے کہ وہ تعمیلِ حکم کو کس قدر گردن جُھکاتا ہے اور سجدہ کمال آداب اور کمال تذلّل اور نیستی کو جو عبادت کا مقصود ہے ظاہر کرتا ہے۔ یہ آداب اور طرق ہیں۔ جو خدا تعالیٰ نے بطور یادداشت کے مقرر کر دیئے ہیں اور جسم کو باطنی طریق سے حصہ دینے کی خاطر ان کو مقرر کیا ہے۔ علاوہ ازیں باطنی طریق کے اثبات کی خاطر ایک ظاہری طریق بھی رکھ دیا ہے۔ اب اگر ظاہری طریق میں (جو اندرونی اور باطنی طریق کا ایک عکس ہے) صرف نقال کی طرح نقلیں اتاری جاویں اور اسے ایک بارِ گراں سمجھ کر اُتار پھینکنے کی کوشش کی جاوے۔ تو تم ہی بتاؤ۔ اس میں کیا لذّت اور حظ آسکتا ہے۔ اور جبتک لذّت اور سرور

[1] هود : ۱۱۵

نہ آئے۔ اُس کی حقیقت کیونکر متحقق ہوگی۔ اور یہ اُس وقت ہوگا۔ جبکہ رُوح بھی ہمہ نیستی اور تذلّل تام ہوکر آستانہ الوہیت پر گرے اور جو زبان بولتی ہے رُوح بھی بولے۔ اُس وقت ایک سرُور اور نُور اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ مَیں اُس کو اَور کھول کر لکھنا چاہتا ہوں کہ انسان جس قدر مراتب طے کر کے انسان ہوتا ہے یعنی کہاں نُطفہ۔ بلکہ اس سے بھی پہلے نُطفہ کے اجزا یعنی مختلف قسم کی اغذیہ اور اُن کی ساخت اور بناوٹ۔ پھر نُطفہ کے بعد مختلف مدارج کے بعد بچّہ۔ پھر جوان۔ بُوڑھا۔ غرض ان تمام عالموں میں جو اُس پر مختلف اوقات میں گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت کا معترف ہو۔ اور وہ نقشہ ہر آن اس کے ذہن میں کھنچا رہے۔ تو بھی وُہ اس قابل ہوسکتا ہے۔ کہ ربوبیّت کے مدّمقابل میں اپنی عبُودیّت کو ڈال دے۔ غرض مدّعا یہ ہے کہ نماز میں لذّت اور سرُور بھی عبُودیّت اور ربوبیّت کے ایک تعلّق سے پَیدا ہوتا ہے۔ جبتک اپنے آپ کو عدم محض یا مشابہ بالعدم قرار دے کر جو ربوبیّت کا ذاتی تقاضا ہے نہ ڈال دے۔ اُس کا فیضان اور پرتَو اُس پر نہیں پڑتا۔ اور اگر ایسا ہو تو پھر اعلیٰ درجہ کی لذّت حاصل ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں ہے۔ اس مقام پر انسان کی رُوح جب ہمہ نیستی ہو جاتی ہے تو وُہ خدا کی طرف ایک چشمہ کی طرح بہتی ہے۔ اور ماسویٰ اللہ سے اُسے انقطاعِ تام ہو جاتا ہے۔ اُس وقت خدا تعالیٰ کی محبّت اُس پر گِرتی ہے۔ اس اتّصال کے وقت ان دو جوشوں سے جو اُوپر کی طرف سے ربُوبیّت کا جوش اور نیچے کی طرف سے عبُودیّت کا جوش ہوتا ہے۔ ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نام صلوٰۃ ہے پس یہی وُہ صلوٰۃ ہے۔ جو سَیّئات کو بھَسم کر جاتی ہے۔ اور اپنی جگہ ایک نُور اور چمک چھوڑ دیتی ہے۔ جو سالِک کو راستہ کے خطرات اور مُشکلات کے وقت ایک منوّر شمع کا کام دیتی ہے۔ اور ہر قسم کے خس و خاشاک اور ٹھوکر کے پتھروں اور خار و خس سے جو اس کی راہ میں ہوتی ہیں۔ آگاہ کر کے بچاتی ہے اور یہی وُہ حالت ہے۔ جبکہ اِنَّ

اَلصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ [1] کا اطلاق اس پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کے ہاتھ میں نہیں اُس کے دل میں ایک روشن چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اور یہ درجہ کامل تذلّل، کامل نیستی اور فروتنی اور پُوری اطاعت سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر گناہ کا خیال اُسے کیونکر آسکتا ہے۔ اور انکار اُس میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ فحشار کی طرف اس کی نظر اُٹھ ہی نہیں سکتی غرض ایک ایسی لذّت ایسا سرُور حاصل ہوتا ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُسے کیونکر بیان کروں۔

غیر اللہ سے دُعا اور سوال غیر مومنانہ طریق ہے

پھر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ نماز جو اپنے اصلی معنوں میں نماز ہے دُعا سے حاصل ہوتی ہے۔ غیر اللہ سے سوال کرنا مومنانہ غیرت کے صریح اور سخت مخالف ہے کیونکہ یہ مرتبہ دُعا کا اللہ ہی کے لئے ہے۔ جبتک انسان پُورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اُسی سے نہ مانگے۔ سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مُسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اِسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرُونی ہوں یا بیرونی، سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی کلوں کو چلاتا ہے۔ پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکُون کو اُسی انجن کی طاقتِ عظمٰی کے ماتحت نہ کر لیوے وُہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کا قائل ہو سکتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ [2] کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے مُنہ سے کہتا ہے۔ ویسے ہی ادھر کی طرف متوجہ ہو تو لَا رَیْب وہ مُسلم ہے۔ وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے۔ اور ادھر بھی جُھکتا ہے وہ یاد رکھے کہ بڑا ہی بدقسمت اور محروم ہے کہ اُس پر وُہ وقت آجانے والا ہے کہ وہ زبانی اور نمائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف نہ جُھک سکے۔

ترکِ نماز کی عادت اور کسل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کیونکہ جب انسان غیر اللہ کی طرف

[1] العنکبوت: ۴۶ [2] الانعام: ۸۰

جُھکتا ہے۔ تو رُوح اور دل کی طاقتیں اُس درخت کی طرح جس کی شاخیں ابتداءً ایک طرف کر دی جاویں اور اُس طرف جُھک کر پرورش پالیں، ادھر ہی جُھکتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک سختی اور تشدّد اس کے دل میں پیدا ہو کر اُسے مُنجمد اور پتھر بنا دیتا ہے۔ جیسے وُہ شاخیں۔ پھر دوسری طرف مُڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح پر دل اور رُوح دِن بدن خدا تعالیٰ سے دُور ہوتی جاتی ہے۔ پس یہ بڑی خطرناک اور دل کو کپکپا دینے والی بات ہے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے سے سوال کرے۔ اسی لئے نماز کا التزام اور پابندی بڑی ضروری چیز ہے۔ تاکہ اوّلاً وہ ایک عادتِ راسخہ کی طرح قائم ہو اور رجُوع الی اللہ کا خیال ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وُہ وقت خود آجاتا ہے۔ جبکہ اِنقطاعِ کلّی کی حالت میں انسان ایک نُور اور ایک لذّت کا وارث ہو جاتا ہے۔ میں اس امر کو پھر تاکید سے کہتا ہوں افسوس ہے کہ مجھے وُہ لفظ نہیں ملے۔ جس میں غیر اللہ کی طرف رجُوع کرنے کی بُرائیاں بیان کر سکوں۔ لوگوں کے پاس جا کر منّت خوشامد کرتے ہیں۔ یہ بات خدا تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لاتی ہے۔ کیونکہ یہ تو لوگوں کی نماز ہے۔ پس وہ اُس سے ہٹتا اور اُسے دُور پھینک دیتا ہے۔ میں موٹے الفاظ میں اس کو بیان کرتا ہوں گو یہ امر اس طرح پر نہیں ہے مگر سمجھ میں خوب آسکتا ہے۔ کہ جیسے ایک مردِ غیور کی غیرت تقاضا نہیں کرتی۔ کہ وُہ اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہوئے دیکھ سکے اور جس طرح پر وُہ مرد ایسی حالت میں اس نابکار عورت کو واجب القتل سمجھتا۔ بلکہ بسا اوقات ایسی وارداتیں ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی جوش اور غیرت اُلوہیّت کا ہے۔ عبُودیّت اور دُعا خاص اسی ذات کے مدّمقابل ہیں۔ وُہ پسند نہیں کر سکتا کہ کسی اَور کو معبُود قرار دیا جاوے یا پکارا جاوے۔ پس خوب یاد رکھو! اور پھر یاد رکھو! کہ غیر اللہ کی طرف جُھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی کہو۔ کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے۔ اُس وقت بے برکت اور بیسُود ہوتی ہے۔ جب اُس میں نیستی اور

تذلّل کی رُوح اور حنیف دِل نہ ہو۔

دُعامیں اسباب کی رعایت ضروری ہے

سُنو! وُہ دُعا جس کے لئے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] فرمایا ہے۔ اُس کے لئے یہی سچی رُوح مطلوب ہے۔ اگر اس تضرّع اور خشوع میں حقیقت کی رُوح نہیں۔ تو وہ ٹیں ٹیں سے کم نہیں ہے پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسباب کی رعایت ضروری نہیں ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ شریعت نے اسباب کو منع نہیں کیا ہے اور سچ پوچھو تو کیا دُعا اسباب نہیں؟ یا اسباب دُعا نہیں؟ تلاشِ اسباب بجائے خود ایک دُعا ہے۔ اور دُعا بجائے خود عظیم الشّان اسباب کا چشمہ ہے۔ انسان کی ظاہری بناوٹ اس کے دو ہاتھ دو پاؤں کی ساخت ایک دوسرے کی امداد کا ایک قدرتی راہنما ہے۔ جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے۔ پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی[2] کے معنے سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے۔

ہاں! میں کہتا ہوں کہ تلاشِ اسباب بھی بذریعہ دُعا کرو۔ امداد باہمی۔ میں نہیں سمجھتا۔ کہ جب میں تمہیں تمہارے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ کا ایک قائم کردہ سلسلہ اور کامل راہنما سلسلہ دکھاتا ہوں۔ تم اس سے انکار کرو۔ اللہ تعالےٰ نے اسباب کو اَور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دُنیا پر کھول دینے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دُنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وُہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسُولوں کو باقی نہ رہنے دے۔ مگر پھر بھی ایک وقت اُن پر آتا ہے کہ وہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ[3] کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایک ٹکڑ گدا فقیر کی طرح صدا دیتے ہیں؟ نہیں مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کو رعایتِ اسباب سکھانا چاہتے ہیں جو دُعا کا ایک شعبہ ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ پر اُن کو کامل ایمان اور اُس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے۔ وُہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ

[1] المومن: ۶۱ [2] المائدۃ: ۳ [3] الصّف: ۱۵

اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا[1] ایک یقینی اور حتمی وعدہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دل میں مدد کا خیال نہ ڈالے تو کوئی کیونکر مدد کرسکتا ہے۔

توحید حقیقی کیا ہے

اصل بات یہی ہے کہ حقیقی معاون و ناصر وُہی پاک ذات ہے جس کی شان نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ[2] وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ[3] ہے۔ دُنیا اور دُنیا کی مددیں اُن لوگوں کے سامنے کالمیّت ہوتی ہیں۔ اور وُہ مردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن دُنیا کو دُعا کا ایک موٹا طریق بتلانے کیلئے وہ یہ راہ بھی اختیار کرتے ہیں حقیقت میں وُہ اپنے کاروبار کا متولّی خدا تعالیٰ ہی کو جانتے ہیں۔ اور یہ بات بالکل سچ ہے۔ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کو مامور کر دیتا ہے۔ کہ وُہ اپنے کاروبار کو دوسروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔ ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مقامات پر مدد کا وعظ کرتے تھے۔ اِس لئے کہ وقت نُصرتِ الٰہی کا تھا۔ اُس کو تلاش کرتے تھے کہ وُہ کس کے شامل حال ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑی غور طلب بات ہے۔ دراصل مامُور مِنَ اللہ لوگوں سے مدد نہیں مانگتا۔ بلکہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ[4] کہکر وہ اُس نُصرت کا اِستقبال کرنا چاہتا ہے اور ایک فرطِ شوق سے بیقرار دل کی طرح اس کی تلاش میں رہتا ہے۔ نادان اور کوتہ اندیش لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وُہ لوگوں سے مدد مانگتا ہے۔ بلکہ اسی طرح پر اس شان میں وُہ کسی دل کے لئے جو اس نُصرت کا مُوجب ہوتا ہے ایک برکت اور رحمت کا مُوجب ہوتا ہے۔ پس مامُور من اللہ کی طلب امداد کا اصل سِرّ اور راز یہ ہی ہے جو قیامت تک اسی طرح پر رہے گا۔ اشاعت دین میں مامُور من اللہ دوسروں سے مدد چاہتے ہیں۔ مگر کیوں؟ اپنے ادائے فرض کے لئے۔ تاکہ دلوں میں خدا تعالیٰ کی عظمت پیدا کریں۔ ورنہ یہ ایک ایسی بات ہے کہ قریب بہ کُفر پہنچ جاتی ہے۔ اگر غیر اللہ کو متولّی قرار دیں۔ اور ان نفوسِ قدسیہ سے ایسا اِمکان؟ مُحال مطلق ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ توحید تب ہی پُوری ہوتی ہو

[1] المومن: ۵۲ [2] الانفال: ۴۱ [3] آل عمران: ۱۷۴ [4] الصف: ۱۵

کہ کل مُرادوں کا مُعطی اور تمام امراض کا چارہ اور مدار وُہی ذات واحد ہو۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنی یہی ہیں۔ صُوفیوں نے اس میں اِلٰہ کے لفظ سے محبُوب، مقصُود، معبُود مُراد لی ہے۔

بے شک اصل اور سچ یُونہی ہے۔ جبتک انسان کامل طور پر توحید پر کاربند نہیں ہوتا۔ اس میں اسلام کی محبّت اور عظمت قائم نہیں ہوتی۔ اور پھر میں اصل ذکر کی طرف رجُوع کرکے کہتا ہوں کہ نماز کی لذّت اور سرُور اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مدار اسی بات پر ہے کہ جبتک بُرے ارادے، ناپاک اور گندے منصوبے بھَسم نہ ہوں۔ انانیّت اور شیخی دور ہو کر نیستی اور فروتنی نہ آئے۔ خدا کا سچّا بندہ نہیں کہلا سکتا اور عبُودیّت کاملہ کے سکھانے کے لئے بہترین معلّم اور افضل ترین ذریعہ نماز ہی ہے۔

میں پھر تمہیں بتلاتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ سے سچّا تعلق۔ حقیقی اِرتباط قائم کرنا چاہتے ہو تو نماز پر کاربند ہو جاؤ۔ اور ایسے کاربند ہو۔ کہ تمہارا جسم نہ تمہاری زبان بلکہ تمہاری رُوح کے ارادے اور جذبے سب کے سب ہمہ تن نماز ہو جائیں“۔

(الحکم جلد ۳۔ نمبر ۱۳ صفحہ ۔ پرچہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء)

۱۹ جنوری ۱۸۹۸ء۔

یَکسِرُ الصَّلِیبَ کے معنے

بعد نماز مغرب فرمایا۔ ”عیسائیوں کا فتنہ اُمّ الفتن ہے۔ اس لئے چودھویں صدی کے مجدّد کا کام یَکسِرُ الصَّلِیبَ ہے۔ پھر چونکہ یہ علامت اُس پر صادق آئی۔ اس لئے چودھویں صدی کا مجدّد مسیح موعُود قرار پایا۔ کیونکہ احادیث سے مسیح موعود کا کام یَکسِرُ الصَّلِیبَ ثابت ہوتا ہے۔ اب جبکہ ہمارے مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ چودہویں صدی کے مجدّد کا کام یکسر الصلیب ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے سامنے یہی مصیبت ہے۔ پھر انکار کے لئے کونسی گنجائش ہے کہ مسیح موعود چودہویں صدی

کا مجدّد ہی ہوگا۔ ہماری توجہ اُن لوگوں کی طرف ہے جن کو حق کی پیاس ہے۔ لیکن جو حق کی تلاش نہیں چاہتے۔ جن کی طبیعتیں معکوس ہیں وہ ہم سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یاد رکھو ہدایت تو اُن کو ہوتی ہے جو تعصب سے کام نہیں لیتے۔ وُہ لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے جو تدبر نہیں کرتے۔ پس طالب ہدایت سمجھ لے کہ موجودہ حالتوں میں چودھویں صدی کے مجدّد کا یہ کام ہے کہ کسرِ صلیب کرے۔ کیونکہ صلیبی فتنہ خطرناک پھیلا ہوا ہے۔ اِسلام ایسا دین تھا کہ اگر ایک بھی اِس سے مُرتد ہو جاتا تو قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ لیکن اب کِس قدر افسوس ہے کہ مُرتد ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے اور وُہ لوگ جو مُسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم جیسے کامِل انسان کی نِسبت جس کی پاک باطنی کی کوئی نظیر دُنیا میں موجود نہیں۔ قِسم قِسم کے دل آزار بہتان لگا رہے ہیں کہ کروڑوں کتابیں اس سیّد المعصُومین کی تکذیب میں اُس گروہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ بہت سے مُستقل ہفتہ وار اور ماہوار اخبار اور رسالے اِس غرض کے لئے جاری کر رکھے ہیں۔

مجدّد کی ضرورت

پھر کیا ایسی حالت میں خدا تعالیٰ کوئی مجدّد نہ بھیجتا؟ اور پھر اگر کوئی مجدّد آتا تو تم ہی خُدا کے واسطے سوچکر بتاؤ کہ کیا اُس کا کام یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وُہ رفعِ یدین کے جھگڑے کرے یا آمین بالجہر پر مرتا پھرے؟

غور تو کرو جو مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے طبیب اُس کا عِلاج کریگا۔ نہ کسی اَور مرض کا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی توہین کی حد ہو چکی۔ لکھا ہے کہ ایک صحابی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی توہین اپنی ماں سے سُن کر اس کو مار دیا تھا۔ یہ غیرت اور حمیّت تھی مُسلمانوں کی۔ مگر آج یہ حال ہو گیا ہے کہ توہین کی کتابیں پڑھتے اور سُنتے ہیں۔ غیرت نہیں آتی۔ اور اتنا نہیں ہو سکتا کہ اُن سے نفرت ہی کریں۔ بلکہ اُلٹا جس شخص کو خُدا

نے خاص اِس فتنہ کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔اور جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت اور جلال کے لئے خاص قِسم کی غیرت لیکر آیا ہے۔ اُس کی مخالفت کرتے ہیں اور اُس پر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔خدا تعالےٰ ہی اُن لوگوں کو بصیرت کی آنکھ دے۔آمین"

اسلام پر اصحابُ الفیل کی طرح حملے

فرمایا۔" اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں ایک سُورۃ بھیج کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا عُلُوّ اور مرتبہ ظاہر کیا ہے۔اور وُہ سُورۃ ہے۔اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ[1]۔یہ سُورۃ اس حالت کی ہے کہ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم مصائب اور دُکھ اٹھا رہے تھے۔اللہ تعالیٰ اِس حالت میں آپ کو تسلّی دیتا ہے کہ میں تیرا مؤیّد و ناصر ہوں۔اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے ربّ نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا کیا۔یعنی اُن کا مکر اُلٹا کر اُن پر ہی مارا۔اور چھوٹے چھوٹے جانور اُن کے مارنے کے لئے بھیج دیئے۔ان جانوروں کے ہاتھوں میں کوئی بندوقیں نہ تھیں۔بلکہ مِٹی تھی سِجّیل بھیگی ہوئی مِٹی کو کہتے ہیں۔اِس سُورۃ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ قرار دیا ہے۔اور اصحابُ الفیل کے واقعہ کو پیش کر کے آپ کی کامیابی اور تائید اور نصرت کی پیشگوئی کی ہے۔

یعنی آپ کی ساری کارروائی کو برباد کرنے کے لئے جو سامان کرتے ہیں اور تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔اُن کے تباہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اُن کی ہی تدبیروں کو اور کوششوں کو اُلٹا کر دیتا ہے۔کسی بڑے سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔جیسے ہاتھی والوں کو چڑیوں نے تباہ کر دیا۔ایسا ہی یہ پیشگوئی قیامت تک جائے گی۔جب کبھی کوئی اصحاب الفیل پیدا ہو۔تب ہی اللہ تعالیٰ اُن کے تباہ کرنے کے لئے اُن کی کوششوں کو خاک میں ملا دینے کے سامان کر دیتا ہے۔

[1] الفیل:۲

پادریوں کا اُصول یہی ہے۔ اُن کی چھاتی پر اسلام ہی پتھر ہے۔ ورنہ باقی تمام مذاہب اُن کے نزدیک نامرد ہیں۔ ہندو بھی عیسائی ہو کر اسلام کے ہی رد میں کتابیں لکھتے ہیں۔ رامچندر اور ٹھاکرداس نے اسلام کی تردید میں اپنا سارا زور لگا کر کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُن کا کانشنس کہتا ہے کہ اُن کی ہلاکت اسلام ہی سے ہے۔ طبعی طور پر خوف اُنہی کا پڑتا ہے۔ جن کے ذریعہ ہلاکت ہوتی ہے۔ ایک مُرغی کا بچہ بلّی کو دیکھتے ہی چلّانے لگتا ہے۔ اسی طرح پر مختلف مذاہب کے پَیرو عموماً اور پادری خصوصاً جو اسلام کی تردید میں زور لگا رہے ہیں۔ یہ اسی لئے ہے کہ اُن کو یقین ہے بلکہ اندر ہی اندر اُن کا دل اُن کو بتاتا ہے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے۔ جو ملل باطلہ کو پیس ڈالے گا۔

اِس وقت اصحاب الفیل کی شکل میں اسلام پر حملہ کیا گیا ہے مسلمانوں میں بہت کمزوریاں ہیں۔ اسلام غریب ہے اور اصحاب فیل زور میں ہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ وُہی نمونہ پھر دکھانا چاہتا ہے۔ چڑیوں سے وُہی کام لیگا۔ ہماری جماعت اُن کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اُن کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اُن کے اتفاق اور طاقت اور دولت کے سامنے نام بھی نہیں رکھتے۔ لیکن ہم اصحاب الفیل کا واقعہ سامنے دیکھتے ہیں کہ کیسی تسلّی کی آیات نازل فرمائی ہیں۔

اسلام اور ایمان یہی ہے کہ خدا کی رائے سے رائے ملائے

مجھے یہی الہام ہوا ہے جس سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور تائید اپنا کام کر کے رہیگی۔ ہاں اُس پر وُہی یقین رکھتے ہیں۔ جن کو قرآن سے محبت ہے۔ جسے قرآن سے محبّت نہیں۔ اسلام سے اُلفت نہیں وہ اِن باتوں کی کب پروا کر سکتا ہے۔ اسلام اور ایمان یہی ہے کہ خدا کی رائے سے رائے ملائے۔ جو اسلام کی عزت اور اُس کے لئے غیرت نہیں رکھتا۔ خواہ وُہ کوئی ہو، خدا کو اُس کی عزت اور اُس کی غیرت کی پروا

نہیں ہوتی۔ اور وُہ دیندار مسلمان نہیں۔ خدا کی باتوں کو حقیر مَت سمجھو۔ اور ان لوگوں کو قابلِ رحم سمجھو جنہوں نے تعصّب کی وجہ سے حق کا انکار کر دیا۔ اور کہدیا کہ امن کے زمانہ میں کسی کے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ افسوس اُن پر۔ وُہ نہیں دیکھتے کہ اسلام کس طرح دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے۔ چاروں طرف سے اُس پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کی توہین کی جاتی ہے پھر بھی کہتے ہیں کہ کسی کی ضرورت نہیں۔

قانُون سڈیشن سے فائدہ جماعت احمدیہ ہی اٹھا سکتی ہے

قانُونِ سڈیشن ہمارے لئے بہت مُفید ہے۔ صرف ہم ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ دوسرے مذہبوں کو ہلاک کرنے کے لئے یہ بھی ایک ذریعہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس تو حقائق اور معارف کے خزانے ہیں ہم ان کا ایک ایسا سلسلہ جاری رکھیں گے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ مگر آریہ یا پادری کونسے معارف پیش کرینگے۔ پادریوں نے گذشتہ پچاس سال کے اندر کیا دکھایا ہے۔ کیا گالیوں کے سوا وُہ اَور کچھ پیش کر سکتے ہیں۔ جو آئندہ کریں گے؟ ہندُوؤں کے ہاتھوں میں بھی اعتراضوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم دعوےٰ سے کہتے ہیں کہ اگر کسی آریہ یا پادری کو اپنے مذہب کے کمالات اور خوبیاں بیان کرنے کو بُلایا جائے تو وُہ ہمارے مقابلہ میں ایک ساعت بھی نہ ٹھہر سکے۔" (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۶ پرچہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۱ء)

۱۹ جنوری ۱۸۹۸ء۔

مذہب کی اوّل اینٹ خدا شناسی ہے

مذہب کی اوّل اینٹ خداشناسی ہے۔ جبتک وُہ درست نہ ہو۔ دوسرے اعمال کیونکر پاک ہو سکتے ہیں۔ عیسائی دوسروں کی پاک باطنی پر بڑے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ اور کفّارہ کا اخلاق سوز مسئلہ مان کر اعتراض کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ جب کفّارہ کا عقیدہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے مُواخذہ کا خوف رہ کیونکر سکتا ہے؟ کیا سچ نہیں ہے کہ ہمارے گنُاہوں کے بدلے مسیح پر سب کچھ وارد ہو گیا۔ یہانتک کہ اُسے

ملعُون قرار دیا اور تین دن ہاویہ میں رکھا۔ ایسی حالت میں اگر گناہوں کے بدلے سزا ہو تو پھر کفارہ کا کیا فائدہ ہوا۔ اصُول کفارہ ہی چاہتا ہے کہ گناہ کیا جاوے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ اصُول کا اثر بہت پڑتا ہے۔ دیکھو۔ ہندوؤں کے نزدیک گائے بہت پوتر اور قابلِ تعظیم ہے اور اُس کا اثر اُن میں اِس حد تک ہے کہ اُس کا پیشاب اور گوبر بھی پوتر کرنے والا اُن میں قرار دیا گیا ہے۔ اور گائے کے متعلق اِس قدر جوش اُن میں ہے جس کی کچھ بھی حد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امر اُن میں بطور اصُول داخل کیا گیا ہے۔ یاد رکھو۔ اصُول بطور ماں کے ہوتے ہیں اور اعمال بطور اَولاد کے۔ جب مسیح کفارہ ہو گیا ہے اور اُس نے تمام گناہ ایمان لانے والوں کے اُٹھا لئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ گناہ نہ کئے جاویں۔ تعجب کی بات ہے کہ عیسائی جب کفارہ کا اصُول بیان کیا کرتے ہیں تو اپنی تقریر کو خدا تعالیٰ کے رحم اور عدل سے شروع کیا کرتے ہیں۔ مگر میں پُوچھتا ہوں کہ جب زید کے بدلے پھانسی بکر کو ملی تو یہ کونسا انصاف اور رحم ہے جب یہ اصول قرار دیدیا۔ کہ سب گناہ اُس نے اٹھا لئے پھر گناہ نہ کرنے کے لئے کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ہدایت ہوتی کہ اُس وقت کے گناہ عیسائیوں کے لئے کفارہ ہوئے ہیں تو یہ اَور بات تھی۔ مگر جب یہ مان لیا گیا ہے۔ کہ قیامت تک پیدا ہونے والوں کے گناہوں کی گٹھڑی یسُوع اُٹھا کر لے گیا۔ اور اُس نے سزا بھی اُٹھا لی۔ پھر گنہگار کو پکڑنا کس قدر ظُلم ہے۔ اوّل تو بیگناہ کو گنہگار کے بدلے سزا دینا ہی ظُلم ہے اور پھر دوسرا ظُلم یہ ہے کہ اوّل گنہگاروں کے گناہوں کی گٹھڑی یسُوع کے سر پر رکھدی اور گنہگاروں کو مُژدہ سُنا دیا کہ تمہارے گناہ اُس نے اُٹھا لئے اور پھر وُہ گناہ کریں تو پکڑے جاویں۔ یہ عجیب دھوکا ہے۔ جس کا جواب عیسائی کبھی نہیں دے سکیں گے۔

مسئلہ کفارہ اور عملی دُنیا

اگر کوئی یہ کہے کہ کفارہ پر ایمان لانے سے انسان گناہ کی زندگی سے نجات پا سکتا ہے اور گناہ کی قوّت اس میں نہیں رہتی۔ تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کا کوئی ثبُوت

نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ اصُول ہی اپنی جڑھ میں گُناہ رکھتا ہے۔ گناہ سے بچنے کی قوت پیدا ہوتی ہے مؤاخذہُ الٰہی کے خوف سے لیکن وہ مؤاخذہ کا خوف کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ یہ مان لیا جاوے کہ ہمارے گناہ لیسُوع نے اُٹھا لئے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ ایسے اصُول کا انسان کبھی متقی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وُہ ہر ایک کام کو جس کی بنا تقویٰ کے اصُولوں پر ہو ضروری نہ سمجھے گا۔ یہ خوب یاد رکھو کہ پاک باطنی ہمیشہ اصُولوں ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ورنہ

خُبث نفس نہ گردد بسالہا معلوم

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کفارہ کا مسئلہ ماننے والوں نے پاک باطنی کی عملی نظیریں کیا قائم کی ہیں؟ یورپ کی بداعمالیاں سب کو معلوم ہیں۔ شراب جو اُمّ الخبائث ہے۔ اس کی یورپ میں اس قدر کثرت ہے کہ اُس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ اگر لندن کی شراب کی دوکانوں کو ایک لائن میں رکھا جائے۔ تو پچھتر میل تک چلی جاویں۔ جس حالت میں اُن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر ایک گناہ کی معافی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے اور جس قدر گناہ کوئی کرے معاف ہیں تو اب سوچ کر عیسائی ہم کو جواب دیں کہ اس کا اثر کیا پڑے گا۔

شیعوں کی حالت

اگر نعوذ باللہ ہمارا یہ اصول ہوتا تو ہم پر اس کا کتنا بُرا اثر پڑتا۔ نفس امارہ تو بہانہ ہی تلاش کرتا ہے جیسے شیعوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کا سہارا لے لیا۔ اور تقیہ کی آڑ میں جو کچھ کرلیں سو تھوڑا ہے۔ میں اسی تقیہ اور امام حسینؓ کے فدیہ کے اصول کی بنا پر دلیری سے کہتا ہوں کہ شیعوں میں متقی کم نکلیں گے۔ خلیفہ محمد حسین صاحب نے لکھا ہے کہ فَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ[1] سے جو قرآن میں آیا ہے۔ امام حسینؓ کا شہید ہونا نکلتا ہے! اور اس نکتہ پر بہت خوش ہوئے ہیں کہ گویا قرآن شریف کے مغز کو پہنچ گئے ہیں۔

[1] الصّٰفّٰت ۱۰۸

اُن کی اس نکتہ دانی پر مجھے ایک پوستی کی حکایت یاد آئی۔ وُہ یہ ہے۔ کہ ایک پوستی کے پاس ایک لوٹا تھا۔ اور اُس میں ایک سُوراخ تھا۔ جب رفع حاجت کو جاتا۔ اس سے پیشتر کہ وہ فارغ ہو کر طہارت کرے۔ سارا پانی لوٹے سے نکل جاتا تھا۔ آخر کئی دن کی سوچ اور فکر کے بعد اس نے یہ تجویز نکالی کہ پہلے طہارت ہی کر لیا کریں۔ اور اپنی اس تجویز پر بہت ہی خوش ہوا۔ اسی قسم کا نکتہ اور نسخہ ان کو ملا ہے۔ جو فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ[1] سے امام حسینؓ کی شہادت نکالتے ہیں۔ شیعہ لوگوں کی مسجدیں تک تو صاف نہیں رہ سکتی ہیں۔ ہم ایک شیعہ اُستاد سے پڑھا کرتے تھے اور وہاں کُتّے پیشاب و پاخانہ پھر جاتے تھے۔ اور مجھے یاد نہیں۔ کہ کسی نے کبھی وہاں نماز پڑھی ہو۔ شیعہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارے لئے امام حسینؓ اور اہلِ بیت شہید ہو چکے ہیں۔ اُن کے غم میں رو لینا اور ماتم کر لینا بس یہی کافی ہے۔ جنّت کے لئے اور کسی عمل کی بجز اس کے ضرورت نہیں اور ایسا ہی عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح کا خون ہمارے لئے مُنجی ہوا۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارے گناہوں پر بھی باز پُرس ہونی ہے اور تمہیں ان کی سزا بھگتنی ہے تو پھر یہ نجات کیسی ہے؟

اس اُصول کا اثر درحقیقت بہت بُرا پڑتا ہے۔ اگر یہ اصُول نہ ہوتا۔ تو یورپ کے ملکوں میں اس کثرت سے فسق و فجور نہ ہوتا۔ اور اس طرح پر بدکاری کا سیلاب نہ آتا جیسے اب آیا ہوا ہے۔ لندن اور پیرس کے ہوٹلوں اور پارکوں میں جا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ اور ان لوگوں سے پوچھو جو وہاں سے آتے ہیں آئے دن اخبارات میں ان بچّوں کی فہرستیں جن کی ولادت ناجائز ولادت ہوتی ہے۔ شائع ہوتی ہیں۔

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ کی تفسیر

اب ہم تو اصُول ہی کو دیکھیں گے ہمارے اصُول میں تو یہ لکھا ہے۔ کہ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ[2]۔ اب اس کا اثر تم خود سوچ لوگے۔ کیا پڑیگا۔ یہی کہ انسان اعمال کی ضرورت محسوس کریگا۔ اور نیک عمل کرنے کی سعی کریگا۔ برخلاف اِس کے جب یہ کہا جاوے گا

[1] الصّٰفّٰت: ۱۰۸ [2] الزلزال: ۸

کہ انسان اعمال سے نجات نہیں پا سکتا تو یہ اصُول انسان کی ہمّت اور سعی کو پست کر دیگا۔ اور اس کو بالکل مایوس کر کے بے دست و پا بنا دے گا۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کا اصول انسانی قویٰ کی بھی بیخ کنی کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قویٰ میں ایک ترقی کا مادہ رکھا ہے۔ لیکن کفارہ اس کو ترقی سے روکتا ہے۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ کفارہ کا اعتقاد رکھنے والوں کے حالات آزادی اور بے قیدی کو جو دیکھتے ہیں تو یہ اسی اصول کی وجہ سے ہے کہ کتّے اور کتیوں کی طرح بدکاریاں ہوتی ہیں۔ لنڈن کے ہائیڈ پارک میں علانیہ بدکاریاں ہوتی ہیں اور حرامی بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ پس ہم کو صرف قیل و قال تک ہی محدُود نہ رکھنا چاہیئے بلکہ اعمال ساتھ ہونے چاہئیں۔ جو اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ سخت ناعاقبت اندیش اور نادان ہے۔ قانون قدرت میں اعمال اور اُن کے نتائج کی نظیریں تو موجود ہیں۔ کفارہ کی نظیر کوئی موجود نہیں۔ مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا لینے کے بعد وہ فرو ہو جاتی ہے۔ یا پیاس لگتی ہے، پانی سے جاتی رہتی ہے تو معلوم ہوا کہ کھانا کھانے یا پانی پینے کا نتیجہ بھوک کا جاتے رہنا یا پیاس کا بُجھ جانا ہوا۔ مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ بھُوک لگے زیدؔ کو اور بکرؔ روٹی کھائے اور زیدؔ کی بھُوک جاتی رہے۔ اگر قانون قدرت میں اس کی کوئی نظیر موجود ہوتی تو شاید کفارہ کا مسئلہ مان لینے کی گنجائش نکل آتی۔ لیکن جب قانُون قدرت میں اس کی کوئی نظیر ہی نہیں ہے تو انسان جو نظیر دیکھ کر ماننے کا عادی ہے۔ اسے کیونکر تسلیم کر سکتا ہے۔ عام قانون انسانی میں بھی تو اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ زیدؔ نے خُون کیا ہو اور خالد کو پھانسی ملی ہو۔ غرض یہ ایک ایسا اصُول ہے جس کی کوئی نظیر ہرگز موجود نہیں ۔

جماعت کو تقویٰ کی نصیحت

میں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اعمالِ صالحہ کی۔ خدا تعالیٰ کے حضور اگر کوئی چیز جا سکتی ہے تو وہ یہی اعمالِ صالحہ ہیں۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ[1] (سورۃ فاطر) خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِس وقت ہمارے قلم رسول اللہ

[1] فاطر : ۱۱

صلے اللہ علیہ وسلم کی تلواروں کے برابر ہیں۔ لیکن فتح اور نصرت اسی کو ملتی ہے جو متقی ہو۔ خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ فرما دیا ہے۔ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ[1]۔ مومنوں کی نصرت ہمارے ذمہ ہے۔ اور لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا[2] اللہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دیتا۔ اس لئے یاد رکھو کہ **تمہاری فتح تقویٰ سے ہے۔** ورنہ عرب تو نرے لکچرار اور خطیب اور شاعر ہی تھے۔ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتے ان کی امداد کے لئے نازل کئے۔ تاریخ کو اگر انسان پڑھے تو اُسے نظر آ جائیگا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس قدر فتوحات کیں وہ انسانی طاقت اور سعی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بیس[۲۰] سال کے اندر ہی اندر اسلامی سلطنت عالمگیر ہو گئی۔ اب ہم کو کوئی بتا دے کہ انسان ایسا کر سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ[3] بھی ہوں۔ متقی کے معنی ہیں ڈرنے والا۔ ایک ترکِ شر ہوتا ہے اور ایک اِفاضۂ خیر۔ متقی ترکِ شر کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور مُحسن افاضۂ خیر کو چاہتا ہے۔ میں نے اِس کے متعلق ایک حکایت پڑھی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی کی دعوت کی اور اپنی طرف سے مہمان نوازی کا پُورا اہتمام کیا اور حق ادا کیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو بزرگ نے بڑے انکسار سے کہا کہ میں آپ کے لائق خدمت نہیں کر سکا۔ مہمان نے کہا کہ آپ نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ میں نے احسان کیا ہے کیونکہ جس وقت تم مصروف تھے میں تمہاری املاک کو آگ لگا دیتا تو کیا ہوتا۔ غرض متقی کا کام یہ ہے کہ بُرائیوں سے باز آوے۔ اس سے آگے دوسرا درجہ افاضۂ خیر کا ہے۔ جس کو یہاں مُحسنون کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے کہ نیکیاں بھی کرے۔ پُورا راستباز انسان تب ہوتا ہے جب بدیوں سے پرہیز کر کے یہ مطالعہ کرے کہ نیکی کونسی کی ہے؟

محبوبِ الٰہی وہی ہوتے ہیں جو کظم اور عفو کے بعد نیکی بھی کرتے ہیں

کہتے ہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوکر چاء کی پیالی لایا۔ جب قریب آیا تو غفلت

[1] الروم: ۴۸ [2] النساء: ۱۴۲ [3] النحل: ۱۲۹

سے وُہ پیالی آپؓ کے سر پر گر پڑی۔آپ نے تکلیف محسوس کر کے ذرا تیز نظر سے غلام کی طرف دیکھا۔غلام نے آہستہ سے پڑھا۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ۔[1] یہ سُن کر امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کظمت۔ غلام نے پھر کہا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ۔[2] کظم میں انسان غصہ دبا لیتا ہے اور اظہار نہیں کرتا ہے۔مگر اندر سے پُوری رضامندی نہیں ہوتی۔اس لئے عفو کی شرط لگا دی ہے آپ نے کہا کہ میں نے عفو کیا۔پھر پڑھا۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔[3] محبوب الٰہی وُہی ہوتے ہیں جو کظم اور عفو کے بعد نیکی بھی کرتے ہیں۔آپ نے فرمایا۔جا آزاد بھی کیا۔راستبازوں کے نمونے ایسے ہیں کہ چائے کی پیالی گرا کر آزاد ہوا۔اب بتاؤ کہ یہ نمونہ اصول کی عُمدگی ہی سے پَیدا ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ۔[4] یعنی سیدھا ہو جا۔کسی قسم کی بداعمالی کی کجی نہ رہے۔پھر راضی ہوں گا۔آپ بھی سیدھا ہو جا اور دُوسروں کو بھی سیدھا کر۔عَرب کے لئے سیدھا کرنا کس قدر مشکل تھا۔

آنحضرت صلعم کی قوّت قُدسی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے پُوچھنے پر فرمایا کہ مجھے سُورہ ہُود نے بوڑھا کر دیا۔کیونکہ اس حکم کے رُو سے بڑی بھاری ذمّہ داری میرے سپرد ہوئی ہے۔اپنے آپ کو سیدھا کرنا۔اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پُوری فرمانبرداری کرنا۔جہانتک انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہے،ممکن ہے کہ وُہ اس کو پورا کرے۔لیکن دوسروں کو ویسا ہی بنانا آسان نہیں ہے۔اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بلند شان اور قوّت قُدسی کا پتہ لگتا ہے چنانچہ آپؐ نے اس حکم کی کیسی تعمیل کی۔صحابہ کرامؓ کی وہ پاک جماعت تیار کی کہ اُن کو کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[5] کہا گیا۔اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ[6] کی آواز اُن کو آ گئی۔آپؐ کی زندگی میں کوئی بھی منافق مدینہ طیّبہ میں نہ رہا۔غرض ایسی کامیابی آپ کو ہوئی کہ اُس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے واقعاتِ زندگی میں نہیں ملتی۔اس سے اللہ

[1-2-3] آل عمران: ۱۳۵ [4] ھود: ۱۱۳ [5] آل عمران: ۱۱۱ [6] البیّنة: ۹

تعالیٰ کی غرض یہ تھی کہ قیل وقال ہی تک بات نہ رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر نرے قیل وقال اور ریاکاری تک ہی بات ہو تو دوسرے لوگوں اور ہم میں پھر امتیاز کیا ہوگا اور دوسروں پر کیا شرف! تم صرف اپنا عملی نمونہ دکھاؤ۔ اور اُس میں ایک ایسی چمک ہو کہ دوسرے اس کو قبول کر لیں کیونکہ جبتک اس میں چمک نہ ہو کوئی اُس کو قبول نہیں کرتا۔ کیا کوئی انسان مَیلی چیز پسند کر سکتا ہے؟ جبتک کپڑے میں ایک داغ بھی ہو وہ اچھا نہیں لگتا۔ اسی طرح جبتک تمہاری اندرونی حالت میں صفائی اور چمک نہ ہوگی کوئی خریدار نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص عمدہ چیز کو پسند کرتا ہے اسی طرح جبتک تمہارے اخلاق اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں۔ کسی مقام تک نہیں پہنچ سکو گے۔

کفّار کی زندگی چوپاؤں کی طرح ہوتی ہے

سورۃ عصر میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور مومنوں کی زندگی کے نمونے بتائے ہیں۔ کفّار کی زندگی بالکل چوپاؤں کی سی زندگی ہوتی ہے۔ جن کو کھانے اور پینے اور شہوانی جذبات کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ[1]۔ مگر دیکھو اگر ایک بیل چارہ تو کھالے لیکن ہل چلانے کے وقت بیٹھ جائے۔ اِس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی ہوگا۔ کہ زمیندار اسے بوچڑخانے میں جا کر بیچ دیگا۔ اسی طرح اُن لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی یا پرواہ نہیں کرتے۔ اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گزارتے ہیں) فرماتا ہے۔ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُکُمْ[2]۔ یعنی میرا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے اگر تم اُس کی عبادت نہ کرو۔ یہ امر بحضور دِل یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے محبت کی ضرورت ہے اور محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک محبت تو ذاتی ہوتی ہے اور ایک اغراض سے وابستہ ہوتی ہے یعنی اس کا باعث صرف چند عارضی باتیں ہوتی ہیں جن کے دُور ہوتے ہی وہ محبت سرد ہو کر رنج و غم کا باعث ہو جاتی ہے۔ مگر ذاتی محبت سچی راحت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پیدا ہوا۔ جیسا کہ فرمایا۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[3]۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہوا ہے اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے

[1] محمّد: ۱۳ [2] الفرقان: ۷۸ [3] الذٰریٰت: ۵۷

لئے بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے تمہاری پیدائش کی اصلی غرض یہ رکھی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو مگر جو لوگ اپنی اس اصلی اور فطری غرض کو چھوڑ کر حیوانوں کی طرح زندگی کی غرض صرف کھانا پینا اور سو رہنا سمجھتے ہیں۔ وُہ خدا تعالیٰ کے فضل سے دُور جا پڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذمّہ داری اُن کے لئے نہیں رہتی۔ وُہ زندگی جو ذمّہ داری کی ہے یہی ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[1]۔ پر ایمان لاکر زندگی کا پہلو بدل لے موت کا اعتبار نہیں ہے۔ سعدیؒ کا شعر سچا ہے ؎

مکُن تکیہ بر عُمرِ ناپائیدار ؞ مباش ایمن از بازیٔ روزگار

عُمرِ ناپائیدار پر بھروسہ کرنا عقلمند کا کام نہیں

عُمرِ ناپائیدار پر بھروسہ کرنا دانشمند کا کام نہیں ہے۔ موت یونہی آکر لتاڑ جاتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں لگتا جبکہ انسان اس طرح پر موت کے پنجہ میں گرفتار ہے پھر اُس کی زندگی کا خدا تعالیٰ کے سوا کون ذمّہ دار ہو سکتا ہے۔ اگر زندگی خدا کے لئے ہو تو اس کی حفاظت کریگا۔ بخاری میں ایک حدیث ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے محبّت کا رابطہ پیدا کر لیتا ہے۔ خدا تعالےٰ اُس کے اعضاء ہو جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اُس کی دوستی یہانتک ہوتی ہے کہ میں اُس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ حتّٰی کہ اُس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وُہ بولتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب انسان جذباتِ نفس سے پاک ہو جاتا ہے اور نفسانیّت چھوڑ کر خدا کے ارادوں کے اندر چلتا ہے اس کا کوئی فعل ناجائز نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک فعل خدا کے منشاء کے موافق ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ اُسے اپنا فعل ہی قرار دیتا ہے ؛

وحدتِ وجُود کا مسئلہ غلط فہمی پر مبنی ہے

یہ ایک مقام ہے قربِ الٰہی کا جہاں پہنچ کر سلوک کی منزلوں کو پورے طور پر طے نہ کرنے والوں نے یا تو ٹھوکر کھائی ہے یا الٰہیات سے ناواقف اور قربِ الٰہی کے مفہوم کو نہ

[1] الذّٰریٰت ۵۷

سمجھنے والوں نے غلط فہمی سے کام لیا ہے اور وحدت وجود کا مسئلہ گھڑ لیا ہے۔ اس بات کو بھی ہرگز بھولنا نہ چاہیئے۔ کہ جہاں انسان ابتلا میں پڑتا ہے وُہ فعل خدا کے ارادہ سے موافق نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کی رضا اُس کے خلاف ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنے جذبات کے نیچے ہوتا ہے نہ کہ منشائے الٰہی کے ماتحت۔ لیکن وُہ انسان جو اللہ تعالیٰ کا ولی کہلاتا ہے۔ اور خدا جس کی زندگی کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ وہ وُہ ہوتا ہے جس کی کوئی حرکت و سکون بلا استصواب کتابِ الٰہی نہیں ہوتی۔ وُہ اپنی ہر بات اور ارادہ پر کتاب اللہ کی طرف رجُوع کرتا ہے۔ اور اُس سے مشورہ لیتا ہے ؎

پھر آگے کہا ہے کہ اُس کی جان نکالنے میں اللہ تعالیٰ کو بڑا تردّد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تردّد سے پاک ہے مطلب یہ ہے کہ ایک مصلحت کے لئے اُس کو موت دی جاتی ہے۔ اور ایک عظیم مصلحت کے لئے اُس کو دوسرے جہان میں لے جاتا ہے۔ نہیں تو اُس کی بقا خدا کو بڑی پیاری لگتی ہے۔ پس اگر انسان کی ایسی زندگی نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اُس کی جان لینے میں تردّد ہو تو وُہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ ایک بکری سے بہت سے آدمی گزارہ کر سکتے ہیں اور اس کا چمڑہ بھی کام آسکتا ہے۔ اور انسان کسی حالت میں کیا مَر کر بھی کام نہیں آتا۔ مگر صالح آدمی کا اثر اس کی ذریت پر بھی پڑتا ہے اور وُہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ درحقیقت وُہ مرتا ہی نہیں۔ مرنے پر بھی اُس کو ایک نئی زندگی دی جاتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا ہے کہ میں بچہ تھا بوڑھا ہوا میں نے کسی خدا پرست کو ذلیل حالت میں نہیں دیکھا۔ اور نہ اُس کے لڑکوں کو دیکھا کہ وُہ ٹکڑے مانگتے ہوں گویا متقی کی اَولاد کا بھی خدا تعالیٰ ذمّہ دار ہوتا ہے لیکن حدیث میں آیا ہے ظالم اپنے اہل و عیال پر بھی ظلم کرتا ہے کیونکہ ان پر اس کا بد اثر پڑتا ہے ؎

انسانی پیدائش کی غرض عبادت ہے

پس کس قدر ضرورت ہے کہ تم اس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے پیدا کرنے سے خدا تعالےٰ کی غرض یہ ہے کہ تم اُس کی عبادت کرو۔ اور اُس کے لئے بن جاؤ۔ دُنیا تمہاری مقصود بالذّات نہ ہو

مَیں اِس لئے بار بار اِس ایک امر کو بیان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی ایک بات ہے جس کے لئے انسان آیا ہے اور یہی بات ہے جس سے وہ دُور پڑا ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دُنیا کے کاروبار چھوڑ دو۔ بیوی بچّوں سے الگ ہو کر کسی جنگل یا پہاڑ میں جا بیٹھو۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا اور رہبانیّت اسلام کا منشا نہیں۔ اسلام تو انسان کو چُست اور ہوشیار اور مُستعد بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو جدّوجہد سے کرو۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ جس کے پاس زمین ہو اور وُہ اس کا تردّد نہ کرے تو اس سے مواخذہ ہوگا۔ پس اگر کوئی اس سے یہ مُراد لے کہ دُنیا کے کاروبار سے الگ ہو جائے وُہ غلطی کرتا ہے۔ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کاروبار جو تم کرتے ہو۔ اس میں دیکھ لو کہ خدا تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور اُس کے اِرادہ سے باہر نکل کر اپنی اغراض و جذبات کو مقدّم نہ کرو۔

پس اگر انسان کی زندگی کا یہ مدعا ہو جائے کہ وہ صرف تنعّم کی زندگی بسر کرے اور اس کی ساری کامیابیوں کی انتہا خورد و نوش اور لباس و خواب ہی ہو۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے کوئی خانہ اُس کے دل میں باقی نہ رہے۔ تو یہ یاد رکھو کہ ایسا شخص فِطرۃ اللّٰہ کا مقلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وُہ رفتہ رفتہ اپنے قویٰ کو بیکار کر لیگا۔ یہ صاف بات ہے کہ جس مطلب کے لئے کوئی چیز ہم لیتے ہیں اگر وہ وہی کام نہ دے تو اسے بیکار قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک لکڑی کرسی یا میز بنانے کے واسطے لیں اور اس کام کے ناقابل ثابت ہو تو ہم اُسے ایندھن ہی بنالیں گے۔ اسی طرح پر انسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادت الٰہی ہے۔ لیکن اگر وُہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کر کے بیکار کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ۔[1] میں نے ایکبار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ میں ایک جنگل میں کھڑا ہوں۔ شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلّط ہے۔ ہاتھ میں چھُری ہے۔ جو انہوں نے اُن کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور

[1] الفرقان: ۷۸

آسمان کی طرف مُنہ کیا ہوا ہے۔ میں اُن کے پاس ٹہل رہا ہوں۔ میں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ آسمانی حکم کے منتظر ہیں تو میں نے یہی آیت پڑھی۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ[1] یہ سُنتے ہی اُن قصابوں نے فی الفور چھُریاں چلا دیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا۔ آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔

غرض خدا تعالیٰ متقی کی زندگی کی پروا کرتا ہے اور اس کی بقار کو عزیز رکھتا ہے۔ اور جو اُس کی مرضی کے برخلاف چلے وُہ اس کی پروا نہیں کرتا اور اُس کو جہنم میں ڈالتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو شیطان کی غلامی سے باہر کرے۔ جیسے کلورا فارم نیند لاتا ہے اسی طرح پر شیطان انسان کو تباہ کرتا ہے اور اُسے غفلت کی نیند سُلاتا ہے۔ اور اسی میں اس کو ہلاک کر دیتا ہے ؏

سورۃ العصر میں دو سلسلوں کا ذکر

میں پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ سورۃ والعصر میں دو سلسلوں کا ذکر فرمایا ہے ایک ابرار و خیار کا سلسلہ ہے اور دوسرا فجار کا۔ کفار اور فجار کے سلسلہ کا ذکر یوں فرمایا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ[2] اور دوسرے سلسلہ کو اس طرح پر الگ کیا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ[3]۔ یعنی ایک وُہ ہیں جو خسران میں ہیں مگر خسران میں مومن اور عمل صالح کرنیوالے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خسران میں وہ ہیں جو مومن اور عملِ صالح کرنے والے نہیں ہیں۔ یاد رکھو کہ صلاح کا لفظ وہاں آتا ہے۔ جہاں فساد کا بالکل نام و نشان نہ رہے۔ انسان کبھی صالح نہیں کہلا سکتا جب تک وہ عقاید ردیہ اور فاسدہ سے خالی نہ ہو اور پھر اعمال بھی فساد سے خالی ہو جائیں۔ متقی کا لفظ باب افتعال سے آتا ہے۔ اور یہ باب تصنع کے لئے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی کو بڑا مجاہدہ اور کوشش کرنی پڑتی ہے اور اس حالت میں وہ نفس لوامہ کے نیچے ہوتا ہے اور جب حیوانی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس وقت امارہ کے نیچے ہوتا ہے۔ اور مجاہدہ کی حالت سے نکل کر جب غالب آ جاتا ہے تو مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ متقی نفس امارہ کی حالت سے نکل کر آتا ہے۔ اور لوامہ کے نیچے ہوتا ہے۔ اسی لئے متقی کی شان میں آیا ہے کہ وہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں۔ گویا اس میں بھی ایک

[1] الفرقان: ۷۸ [2] العصر: ۳ [3] العصر: ۴

قسم کی لڑائی ہی کی حالت ہوتی ہے۔ وساوس اور اَوہام آآ کر حیران کرتے ہیں مگر وُہ گھبراتا نہیں اور یہ وساوس اُس کو درماندہ نہیں کر سکتے۔ وُہ بار بار خدا تعالیٰ کی استعانت چاہتا ہے۔ اور خدا کے حضور چلّاتا اور روتا ہے۔ یہانتک کہ غالب آ جاتا ہے۔ ایسا ہی مال کے خرچ کرنے میں بھی شیطان اس کو روکتا ہے اور اسراف اور انفاق فی سبیل اللہ کو یکساں دکھاتا ہے۔ حالانکہ اِن دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسراف کرنے والا اپنے مال کو ضائع کرتا ہے۔ مگر فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا اس کو پھر پاتا ہے اور خرچ سے زیادہ پاتا ہے۔ اس لئے ہی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] فرمایا ہے ؁

صراطِ مستقیم

بات یہ ہے کہ صلاح کی حالت میں انسان کو ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کے فساد سے خواہ وہ عقاید کے متعلق ہو یا اعمال کے متعلق، پاک ہو۔ جیسے انسان کا بدن صلاحیت کی حالت اس وقت رکھتا ہے جبکہ سب اخلاط اعتدال کی حالت پر ہوں اور کوئی کم زیادہ نہ ہو لیکن اگر کوئی خلط بھی بڑھ جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح پر رُوح کی صلاحیت کا مدار بھی اعتدال پر ہے۔ اسی کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں الصراط المستقیم ہے۔ صلاح کی حالت میں انسان محض خدا کا ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت تھی اور رفتہ رفتہ صالح انسان ترقی کرتا ہوا مطمئنّہ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور یہاں ہی اس کا انشراح صدر ہوتا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ[2]۔ ہم انشراح صدر کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے ؁

انسان کا سینہ بیت اللہ ہے اور دِل حجرِ اسود

یہ بات بحضورِ دل یاد رکھو کہ جیسے بیت اللہ میں حجر اسود پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح قلب سینہ میں پڑا ہوا ہے۔ بیت اللہ پر بھی ایک زمانہ آیا ہوا تھا کہ کفار نے وہاں بُت رکھ دیئے تھے۔ ممکن تھا کہ بیت اللہ پر یہ زمانہ نہ آتا۔ مگر نہیں اللہ نے اس کو ایک نظیر کے طور پر رکھا۔

[1] البقرۃ: ۴ [2] الم نشرح: ۲

قلبِ انسانی بھی حجرِ اسود کی طرح ہے اور اس کا سینہ بیت اللہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ ماسویٰ اللہ کے خیالات وہ بُت ہیں جو اس کعبہ میں رکھے گئے ہیں۔ مکّہ معظمہ کے بتوں کا قلع قمع اُس وقت ہوا تھا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ وہاں جا پڑے تھے اور مکّہ فتح ہو گیا تھا۔ اِن دس ہزار صحابہ کو پہلی کتابوں میں ملائکہ لکھا ہے۔ اور حقیقت میں اُن کی شان ملائکہ ہی کی سی تھی۔ انسانی قویٰ بھی ایک طرح پر ملائکہ ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ جیسے ملائکہ کی یہ شان ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ[1]۔ اسی طرح پر انسانی قویٰ کا خاصہ ہے کہ جو حکم اُن کو دیا جائے اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایسا ہی تمام قویٰ اور جوارح حکمِ انسانی کے نیچے ہیں۔ پس ماسویٰ اللہ کے بُتوں کی شکست اور استیصال کے لئے ضروری ہے کہ اُن پر اسی طرح سے چڑھائی کی جائے۔ یہ لشکر تزکیہ نفس سے تیار ہوتا ہے اور اسی کو فتح دی جاتی ہے جو تزکیہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا[2]۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو کُل جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ کیسی سچی بات ہے۔ آنکھ۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ زبان وغیرہ جس قدر اعضاء ہیں۔ وہ دراصل قلب کے ہی فتوے پر عمل کرتے ہیں۔ ایک خیال آتا ہے۔ پھر وُہ جس عضو کے متعلق ہو وُہ فوراً اس کی تعمیل کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ

غرض اس خانہ کو بتوں سے پاک وصاف کرنے کے لئے ایک جہاد کی ضرورت ہے۔ اور اس جہاد کی راہ مَیں تمہیں بتاتا ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں۔ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو ان بتوں کو توڑ ڈالو گے۔ اور یہ راہ میں اپنی خود تراشیدہ نہیں بتاتا۔ بلکہ خدا نے مجھے مامُور کیا ہے کہ میں بتاؤں۔ اور وُہ راہ کیا ہے؟ میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔ یہ آواز نئی آواز نہیں ہے۔ مکّہ کو بُتوں سے پاک کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی کہا تھا۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ[3] اسی

[1] النحل: ۵۱ [2] الشمس: ۱۰ [3] آل عمران: ۳۲

طرح پر۔ اگر تم میری پیروی کروگے تو اپنے اندر کے بُتوں کو توڑ ڈالنے کے قابل ہو جاؤگے اور اس طرح پر سینہ کو جو طرح طرح کے بُتوں سے بھرا پڑا ہے پاک کرنے کے لائق ہو جاؤگے تزکیہ نفس کے لئے چلّہ کشیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ نے چلہ کشیاں نہیں کی تھیں۔ ارّہ اور نفی واثبات وغیرہ کے ذکر نہیں کئے تھے۔ بلکہ اُن کے پاس ایک اَور ہی چیز تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں محو تھے۔ جو نُور آپؐ میں تھا۔ وُہ اس اطاعت کی نالی میں سے ہو کر صحابہؓ کے قلب پر گرتا اور ماسوی اللہ کے خیالات کو پاش پاش کرتا جاتا تھا۔ تاریکی کے بجائے اُن سینوں میں نُور بھرا جاتا تھا۔ اس وقت بھی خوب یاد رکھو وُہی حالت ہے۔ جبتک کہ وُہ نور جو خدا کی نالی میں سے آتا ہے تمہارے قلب پر نہیں گرتا، تزکیہ نفس نہیں ہو سکتا۔ انسان کا سینہ مھبطُ الأنوار ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ بیت اللہ کہلاتا ہے۔ بڑا کام یہی ہے کہ اس میں جو بُت ہیں۔ وُہ توڑے جائیں۔ اور اللہ ہی اللہ رہ جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ اَللّٰہُ اَللّٰہُ فِیْ اَصْحَابِیْ۔ میرے صحابہؓ کے دلوں میں اللہ ہی اللہ ہے۔ دل میں اللہ ہی اللہ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ انسان وحدت وجُود کے مسئلہ پر عمل کرے اور ہر کتّے اور گدھے کو معاذاللہ خدا قرار دے بیٹھے۔ نہیں نہیں۔ اس سے اصل غرض یہ ہے کہ انسان کا جو کام ہو۔ اس میں مقصود فی الذّات اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہو۔ اور نہ کچھ اَور۔ اور یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو ؎

بر کریماں کارہا دُشوار نیست

قرآن کریم میں علمی اور عملی تکمیل کی ہدایت ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں علمی اور عملی تکمیل کی ہدایت ہے۔ چنانچہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ[1] میں تکمیلِ علمی کی طرف اشارہ ہے اور تکمیلِ عملی کا بیان صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ[2] میں فرمایا کہ جو نتائج اکمل اور اتم ہیں۔ وُہ حاصل ہو جائیں۔ جیسے ایک پودا

[1] الفاتحہ: ۶ [2] الفاتحہ: ۷

جو لگایا گیا ہے جبتک پُورا نشوونما حاصل نہ کرے اس کو پھل پھُول نہیں لگ سکتے۔اسی طرح اگر کسی ہدایت کے اعلیٰ اور اکمل نتائج موجود نہیں ہیں وہ ہدایت مُردہ ہدایت ہے جس کے اندر کوئی نشوونما کی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ جیسے اگر کسی کو وید کی ہدایت پر پُورا عمل کرنے سے کبھی یہ امید نہیں ہو سکتی کہ وُہ ہمیشہ کی مکتی یا نجات حاصل کر لیگا۔اور کیڑے مکوڑے بننے کی حالت سے نکل کر دائمی سرور پا لیگا۔ تو اس ہدایت سے کیا حاصل۔مگر قرآن شریف ایک ایسی ہدایت ہے کہ اُس پر عمل کرنے والا اعلیٰ درجہ کے کمالات حاصل کر لیتا ہے۔اور خدا تعالےٰ سے اس کا ایک سچا تعلق پیدا ہونے لگتا ہے۔یہاں تک کہ اُس کے اعمال صالحہ جو قرآنی ہدایتوں کے موافق کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک شجر طیّب کی مثال جو قرآن شریف میں دی گئی ہے۔بڑھتے ہیں اور پھَل پھُول لاتے ہیں۔ایک خاص قسم کی حلاوت اور ذائقہ اُن میں پیدا ہوتا ہے۔

جو لوگ میری مخالفت کرنے والے ہیں، وہ میری نہیں، خدا تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہیں

پس اگر کوئی شخص اپنے ایمان میں نشوونما کا مادہ نہیں رکھتا۔بلکہ اس کا ایمان مُردہ ہے تو اس پر اعمال صالحہ کے طیّب اشجار کے بارور ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ[1] کہہ کر ایک قید لگا دی ہے یعنی یہ راہ کوئی بے ثمر اور حیران اور سرگردان کرنے والی نہیں ہے بلکہ اس پر چل کر انسان بامُراد اور کامیاب ہوتا ہے اور عبادت کے لئے تکمیل عملی ضروری شے ہے۔ ورنہ وہ محض ایک کھیل ہوگا۔کیونکہ درخت اگر پھَل نہ دے خواہ وُہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو۔مفید نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مخالفوں کی حالت ایسی ہے جس سے سلب ایمان کا اندیشہ ہے۔کیونکہ وہ نیک کو بُرا اور مامور من اللہ کو کذّاب سمجھتے ہیں جس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اب یہ صاف امر ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے مامور اور مسیح موعُود کے نام سے دُنیا میں بھیجا

[1] الفاتحہ ۷

ہے۔ جو لوگ میری مخالفت کرنے والے ہیں وُہ میری نہیں خدا تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ جبتک میں نے دعویٰ نہ کیا تھا۔ بہت سے اُن میں سے مجھے عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنے ہاتھ سے لوٹا لیکر وضو کرانے کو ثواب اور فخر جانتے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو میری بیعت میں آنے کے لئے زور دیتے تھے۔ لیکن جب خدا تعالیٰ کے نام اور اعلام سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ تو وُہی مخالفت کے لئے اُٹھے۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ اُن کی ذاتی عداوت میرے ساتھ نہ تھی بلکہ عداوت اُن کو خدا تعالیٰ سے ہی تھی۔ اگر خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کو سچّا تعلق تھا تو اُن کی دینداری اور اتّقار اور خدا ترسی کا تقاضا یہ ہوتا چاہیئے تھا۔ کہ سبسے اوّل وُہ میرے اس اعلان پر لبّیک کہتے اور سجدات شکر کرتے ہوئے میرے ساتھ مُصافحہ کرتے۔ مگر نہیں۔ وُہ اپنے ہتھیاروں کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ اور اُنہوں نے مخالفت کو یہانتک پہنچایا کہ مجھے کافر کہا اور بیدین کہا۔ دجّال کہا۔ افسوس! اِن احمقوں کو یہ معلوم نہ ہوا۔ کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ تَوْحِیْدِیْ وَ تَفْرِیْدِیْ کی آوازیں سُنتا ہو۔ وہ اُن کی بدگوئی اور گالیوں کی کیا پرواہ کرسکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان نادانوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ کفر اور ایمان کا تعلق دُنیا سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اور خدا تعالیٰ میرے مومن اور مامُور ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر ان بیہودگیوں کی مجھے پروا کیا ہوسکتی ہے۔

ولی کی مخالفت سے سلب ایمان ہوتا ہے

غرض اِن باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ لوگ میرے مخالف نہ تھے بلکہ خدا تعالےٰ کی باتوں کی اُنہوں نے مخالفت کی اور یہی وجہ ہے جس سے مامُور من اللہ کے مخالفوں کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اب یہ صاف بات ہے کہ میرے مخالف خدا تعالیٰ سے مخالفت کر رہے ہیں۔ میں اگر روشنی کی طرف آرہا ہوں اور یہ یقینی امر ہے کہ میں روشنی کی طرف آتا ہوں کیونکہ خدا تعالیٰ کے بے شمار نشان میری تائید میں ظاہر ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ بارش

کی طرح یہ نشان آسمان سے اُتر رہے ہیں۔ تو پھر یہ بھی یقینی امر ہے کہ میرے مخالف تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔ روشنی اور نور رُوح القدس کو لاتا ہے اور تاریکی شیطان کی قربت پیدا کرتی ہے۔ اور اس طرح پر ولی کی مخالفت سلب ایمان کر دیتی ہے۔ اور بِئسَ الْقَرِیْن سے جا ملاتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اصلاح تب ہوتی ہے کہ تکمیلِ عملی کے مراتب حاصل ہو جائیں۔ پس سورۃ العصر میں جو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ[۱] فرمایا ہے۔ اس میں اٰمَنُوْا سے تکمیلِ علمی کی طرف ارشاد فرمایا۔ اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے تکمیلِ عملی کی طرف رہبری کی۔ حکمت کے بھی دو ہی حصے ہیں۔ ایک علم اکمل اور اتم ہو۔ دوسرے عمل اتم اور اکمل ہو۔

پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ خسر سے محفوظ رہتے ہیں۔ اول وہ تکمیلِ علمی کرتے ہیں اور پھر عمل بھی گندے نہیں کرتے بلکہ علمی تکمیل کو عملی تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور پھر یہ کہ جب انہیں کامل بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور ان کے کمالِ علم کا ثبوت کمالِ عمل سے ملتا ہے تو پھر وہ بخل نہیں کرتے۔ بلکہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ[۲] پر عمل کرتے ہیں۔ لوگوں کو بھی اس حق کی دعوت کرتے ہیں جو انہوں نے پایا ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اعمال کی روشنی سے بھی دکھاتے ہیں۔ واعظ اگر خود عمل نہیں کرتا تو اُس کی باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ بھی قاعدہ کی بات ہے۔ کہ اگر خود آدمی کہے اور کرے نہیں تو اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر زناکار زِنا سے منع کرے تو اُس کی اِس حالت کے ثابت ہو جانے پر سُننے والوں کے دہریہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ وُہ خیال کریں گے کہ اگر زِناکاری واقعی خطرناک چیز ہوتی۔ اور خدا تعالےٰ کے حضور اس ناپاکی پر سزا ملتی ہے اور خدا واقعی ہوتا۔ تو پھر یہ جو منع کرتا تھا۔ خود کیوں اس سے پرہیز نہ کرتا۔

تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[۳] کی تفسیر

مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص ایک مولوی کی صُحبت کے باعث مسلمان ہونے لگا۔ ایک روز

۱-۲-۳ العصر : ۴

اُس نے دیکھا کہ وُہی مولوی شراب پی رہا تھا تو اس کا دل سخت ہوگیا اور وہ رُک گیا۔غرض
تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ[1] میں یہ فرمایا کہ وُہ اپنے اعمال کی روشنی سے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں۔
اور پھر اُن کا شیوہ یہ ہوتا ہے۔ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[1] یعنی صبر کے ساتھ وعظ و نصیحت کا شیوہ
اختیار کرتے ہیں جلدی جھاگ منہ پر نہیں لاتے۔اگر کوئی مولوی اور پیش رَو ہو کر، اِمام اور
رہنما بن کر جلدی بھڑک اُٹھتا ہے اور اس میں برداشت اور صبر کی طاقت نہیں تو وُہ لوگوں
کو کیوں نقصان پہنچاتا ہے۔ دوسرے یہ بھی مطلب ہے کہ جو باتیں سُننے والا صبر سے نہ سُنے
وُہ فائدہ نہیں اٹھاتا۔ہمارے مخالف بُردباری کا دِل لے کر نہیں آتے اور صبر سے اپنی مشکلات
پیش نہیں کرتے۔بلکہ اُن کا تو یہ حال ہے کہ وہ کتاب تک تو دیکھنا نہیں چاہتے اور شور مچا
کر حق کو ملتبس کرنے کی سعی کرتے ہیں پھر وُہ فائدہ اٹھائیں تو کیونکر اٹھائیں۔ ابوجہل اور
ابولہب میں کیا تھا؟ یہی بے صبری اور بیقراری تو تھی۔ کہتے تھے کہ تو خدا کی طرف سے آیا
ہے تو کوئی نہر لے آ۔ اِن کم بختوں نے صبر نہ کیا اور ہلاک ہو گئے۔ ورنہ زبیدہ والی نہر تو آ
ہی گئی۔اسی طرح پر ہمارے مخالف بھی کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دُعا کرو اور وہ معاً قبول
ہو جائے۔اور پھر اس کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہیں اور اپنی طرف سے بعض امور پیش
کرکے کہتے ہیں کہ یہ ہو جائے اور وہ ہو جائے تو مان لیں۔لیکن آپ کسی شرط کے نیچے
نہیں آتے۔افسوس یہی لوگ ہیں جو لَا یَخَافُ عُقْبٰهَا[2] کے مِصداق ہیں۔ یاد رکھو صابر
ہی شرح صدر کا رُتبہ پاتا ہے۔جو صبر نہیں کرتا وہ گویا خدا پر حکومت کرتا ہے۔خود اس
کی حکومت میں رہنا نہیں چاہتا۔ ایسا گُستاخ اور دلیر جو خدا تعالیٰ کے جلال اور عظمت
سے نہیں ڈرتا وُہ محروم کر دیا جاتا ہے اور اُسے کاٹ دیا جاتا ہے۔پھر یہ بات بھی یاد رکھنی
چاہئیے کہ صبر کی حقیقت میں سے یہ بھی ضروری بات ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ[3]۔ صادقوں
کی صُحبت میں رہنا ضروری ہے۔بہت سے لوگ ہیں جو دُور بیٹھ رہتے ہیں اور کہدیتے ہیں
کہ کبھی آئیں گے اس وقت فُرصت نہیں ہے۔بھلا تیرہ سو سال کے موعُود سلسلہ کو جو لوگ پا

[1] العصر: ۴ [2] الشمس: ۱۶ [3] التوبۃ: ۱۱۹

ہیں اور اُس کی نصرت میں شامل نہ ہوں اور خدا اور رسُولؐ کے موعُود کے پاس نہ بیٹھیں وہ فلاح پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دوں　　این خیال است و مُحال است و جنوں

جماعت کو نصیحت

دین تو چاہتا ہے کہ مصاحبت ہو۔ پھر مصاحبت سے گریز ہو تو دینداری کے حصول کی امید کیوں رکھتا ہے۔ ہم نے بارہا اپنے دوستوں کو نصیحت کی ہے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ وہ بار بار یہاں آکر رہیں اور فائدہ اٹھائیں۔ مگر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ لوگ ہاتھ میں ہاتھ دے کر دین کو دُنیا پر مقدم کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی پَروا کچھ نہیں کرتے۔ یاد رکھو قبریں آوازیں دے رہی ہیں اور موت ہر وقت قریب ہوتی جاتی ہے۔ ہر ایک سانس تمہیں موت کے قریب کرتا جاتا ہے اور تم اُسے فرصت کی گھڑیاں سمجھتے جاتے ہو۔ اللہ تعالےٰ سے مکر کرنا مومن کا کام نہیں ہے۔ جب موت کا وقت آگیا پھر ایک ساعت آگے پیچھے نہ ہو گی۔ وہ لوگ جو اس سِلسِلہ کی قدر نہیں کرتے اور انہیں کوئی عظمت اُس کی معلوم ہی نہیں ان کو جانے دو۔ مگر ان سب سے بدقسمت اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا تو وُہ ہے جس نے اس سلسلہ کو شناخت کیا اور اُس میں شامل ہونے کی فکر کی۔ لیکن اُس نے کچھ قدر نہ کی۔ وہ لوگ جو یہاں آکر میرے پاس کثرت سے نہیں رہتے اور اُن باتوں سے جو خدا تعالےٰ ہر روز اپنے سلسلہ کی تائید میں ظاہر کرتا ہے نہیں سُنتے اور دیکھتے۔ وہ اپنی جگہ پر کیسے ہی نیک اور متقی اور پرہیزگار ہوں۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ جیسا چاہیئے انہوں نے قدر نہیں کی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تکمیلِ علمی کے بعد تکمیلِ عملی کی ضرورت ہے۔ پس تکمیلِ عملی بدُون تکمیلِ علمی کے مُحال ہے۔ اور جبتک یہاں آکر نہیں رہتے تکمیلِ علمی مشکل ہے۔ بارہا خطوط آتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اعتراض کیا اور ہم جواب نہ دے سکے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ وُہ لوگ یہاں نہیں آتے۔ اور اُن باتوں کو نہیں سُنتے جو خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کی تائید میں علمی طور پر ظاہر کر رہا ہے۔

پس اگر تم واقعی اس سلسلہ کو شناخت کرتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو اور دین کو دُنیا پر مقدّم کرنے کا سچّا وعدہ کرتے ہو تو میں پُوچھتا ہوں کہ اس پر عمل کیا ہوتا ہے کیا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ[1] کا حکم منسُوخ ہو چکا ہے۔ اگر تم واقعی ایمان لاتے ہو۔ اور سچّی خوش قسمتی یہی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو مقدّم کر لو۔ اگر ان باتوں کو ردّی اور فضُول سمجھو گے تو یاد رکھو خدا تعالیٰ سے ہنسی کرنے والے ٹھیرو گے۔

سورۂ فاتحہ قرآن شریف کا باریک نقشہ ہے

سورۂ فاتحہ پر جو قرآن شریف کا باریک نقشہ ہے اور اُمّ الکتاب بھی جس کا نام ہے خوب غور کرو۔ کہ اس میں اجمال کے ساتھ قرآن کریم کے تمام معارف درج ہیں چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے اس کو شروع کیا گیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ تمام محامد اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ تمام منافع اور تمدّنی زندگی کی ساری بہبُودگیاں اللہ ہی کی طرف سے آتی ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کی ستائش کا سزاوار جبکہ وُہی ہے تو مُعطی حقیقی بھی وُہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ لازم آئیگا کہ کسی قسم کی تعریف و ستائش کا مستحق وُہ نہیں بھی ہے جو کفر کی بات ہے۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں کیسی توحید کی جامع تعلیم پائی جاتی ہے جو انسان کو دُنیا کی تمام چیزوں کی عبُودیّت اور بالذات نفع رساں نہ ہونے کی طرف لے جاتی ہے اور واضح اور بیّن طور پر ذہن نشین کرتی ہے کہ ہر نفع اور سُود حقیقی اور ذاتی طور پر خدا تعالےٰ ہی کی طرف سے آتا ہے کیونکہ تمام محامد اسی کے لئے سزاوار ہیں۔ پس ہر نفع اور سُود میں خدا تعالیٰ ہی کو مقدّم کرو۔ اس کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ کی رضا کے اگر خلاف ہو تو اَولاد بھی دشمن ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ پھر اسی سُورۂ فاتحہ میں اس خدا کا نقشہ دکھایا گیا ہے جو قرآن شریف منوانا چاہتا ہے اور جس کو وہ دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

سُورۂ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے

چنانچہ اس کی چار صِفات کو ترتیب وار بیان کیا ہے جو اُمّہات الصّفات کہلاتی ہیں

[1] التوبۃ : ۱۱۹

جیسے سُورۂ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے ویسے ہی جو صفات اللہ تعالیٰ کی اس میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ بھی اُمّ الصّفات ہی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ[1]۔ اِن صفاتِ اربعہ پر غور کرنے سے خدا تعالیٰ کا گویا چہرہ نظر آجاتا ہے۔ ربُوبیّت کا فیضان بہت ہی وسیع اور عام ہے اور اس میں کُل مخلوق کی کُل حالتوں تربیّت اور اس کی تکمیل کے تکفّل کی طرف اشارہ ہے۔ غور تو کرو۔ جب انسان اللہ تعالےٰ کی ربُوبیّت پر نظر کرتا ہے تو اس کی امید کس قدر وسیع ہوجاتی ہے۔ اور پھر رحمانیّت یہ ہے کہ بدُوں کسی عملِ عامل کے اُن اسباب کو مہیّا کرتا ہے جو بقائے وجود کے لئے ضروری ہیں۔ دیکھو چاند۔ سُورج۔ ہوا۔ پانی وغیرہ بدُوں ہماری دُعا اور التجا کے اور بغیر ہمارے کسی عمل اور فعل کے اس نے ہمارے وجُود کے بقا کے لئے کام میں لگا رکھے ہیں اور پھر رحیمیت یہ ہے کہ اعمال کو ضائع نہ کرے اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا تقاضا یہ ہے کہ بامُراد کردے۔ جیسے ایک شخص امتحان کے لئے بہت محنت سے تیاری کرتا ہے مگر امتحان میں دو چار نمبروں کی کمی رہ جاتی ہے۔ تو دُنیوی نظام اور سلسلہ میں تو اس کا لحاظ نہیں کرتے اور اس کو گرا دیتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت اس کی پردہ پوشی فرماتی ہے اور اس کو پاس کرا دیتی ہے۔ رحیمیت میں ایک قسم کی پردہ پوشی بھی ہوتی ہے۔ عیسائیوں کا خدا ذرّہ بھی پردہ پوش نہیں ہے ورنہ کفّارہ کی کیا ضرورت رہتی ایسا ہی آریوں کا خدا نہ رب ہے نہ رحمان ہے۔ کیونکہ وہ تو بلا مُزد اور بلا عمل کچھ بھی کسی کو عطا نہیں کرسکتا۔ یہانتک کہ ویدوں کے اصول کے موافق گناہ کرنا بھی ضروری معلوم دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اگر کسی اُس کے عمل کے معاوضہ میں گائے کا دُودھ دینا مطلوب ہے۔ تو بالمقابل یہ بھی ضرور ہے کہ کوئی برہمنی (اگر یہ روایت صحیح ہو) زنا کرے۔ تاکہ اس فسق وفحش کے بدلہ میں وہ گائے کی جُون میں جائے اور اس عامل کو دُودھ پلائے خواہ وہ اُس کا خاوند ہی کیوں نہ ہو۔ غرض جبتک ایسا سلسلہ نہ ہوگا۔ کوئی عامل اپنے عمل کی جزا ویدک ایشر کے خزانہ سے پا نہیں سکتا۔ کیونکہ اُس کا سارا سلسلہ جوڑ توڑ ہی سے چلتا ہے۔

[1] الفاتحہ : ۲ تا ۴

اسلام نے وہ خدا پیش کیا ہے جو جمیع محامد کا سزاوار ہے

مگر اسلام نے وُہ خدا پیش کیا ہے جو جمیع محامد کا سزاوار ہے اس لئے مُعطی حقیقی ہے وُہ رحمٰن ہے بدُوں عملِ عامل کے اپنا فضل کرتا ہے۔ پھر مالکیّت یوم الدّین جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ بامُراد کرتی ہے۔ دُنیا کی گورنمنٹ کبھی اس امر کا ٹھیکہ نہیں لے سکتی کہ ہر ایک بی۔ اے پاس کرنے والے کو ضرور نوکری دے گی مگر خدا تعالےٰ کی گورنمنٹ کامل گورنمنٹ اور لاانتہا خزائن کی مالک ہے۔ اس کے حضور کوئی کمی نہیں۔ کوئی عمل کرنے والا ہو۔ وہ سب کو فائز المرام کرتا ہے اور نیکیوں اور حسنات کے مقابلہ میں بعض ضعفوں اور سقموں کی پردہ پوشی بھی فرماتا ہے۔ وہ توّاب بھی ہے اور ستّی بھی ہے۔ اللہ تعالےٰ کو ہزارہا عیب اپنے بندوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ بیباک ہو کر انسان اپنے عیبوں میں ترقی پر ترقی کرتا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی حیا اور پردہ پوشی سے نفع نہیں اٹھاتا بلکہ دہریّت کی رگ اس میں زور پکڑتی جاتی ہے۔ تب اللہ تعالےٰ کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس بیباک کو چھوڑا جائے اس لئے وُہ ذلیل کیا جاتا ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب غزنوی کو محمد حسین کی نسبت الہام ہوا کہ اس میں کوئی عیب ہے اس نے چاہا کہ وہ ظاہر کردیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی حیا مانع ہے۔ پھر انہوں نے اس کی نسبت ایک رؤیا میں دیکھا کہ اس کے کپڑے پھٹ گئے ہیں چنانچہ اب وہ رؤیا پوری ہو گئی۔

میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ رحیمیّت میں ایک خاصہ پردہ پوشی کا بھی ہے۔ مگر اس پردہ پوشی سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی عمل ہو اور اس عمل کے متعلق اگر کوئی کمی یا نقص رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحیمیّت سے اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ رحمانیت اور رحیمیّت میں فرق یہ ہے کہ رحمانیّت میں فعل اور عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا مگر رحیمیّت میں فعل و عمل کو دخل ہے۔ لیکن کمزوری بھی ساتھ ہی ہے۔ خدا کا رحم چاہتا ہے کہ پردہ پوشی کرے۔ اسی طرح مالکِ یوم الدّین وُہ ہے کہ اصل مقصد کو پُورا کرے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ اُمّہات الصّفات رُوحانی طور پر خدا

نُما تصویر ہیں۔ان پر غور کرتے ہی معاً خدا سامنے ہو جاتا ہے۔اور رُوح ایک لذّت کے ساتھ اُچھل کر اُس کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے جو شروع کیا گیا تھا تو غائب کی صُورت میں ذکر کیا ہے۔لیکن ان صفاتِ اربعہ کے بیان کے بعد معاً صُورتِ بیان تبدیل ہو گئی ہے۔کیونکہ ان صفات نے خدا کو سامنے حاضر کر دیا ہے۔اس لئے حق تھا اور فصاحت کا تقاضا تھا کہ اب غائب نہ رہے بلکہ حاضر کی صورت اختیار کیجائے پس اس دائرہ کی تکمیل کے تقاضا نے مخاطب کی طرف منہ پھیرا۔اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہا۔یاد رکھنا چاہیئے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[1] میں کوئی فاصلہ نہیں ہے ہاں اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں ایک قسم کا تقدم زمانی ہے۔کیونکہ جس حال میں محض اپنی رحمانیت سے بغیر ہماری دُعاء اور درخواست کے ہمیں انسان بنایا اور انواع و اقسام کی قوتیں اور نعمتیں عطا فرمائیں۔اس وقت ہماری دُعا نہ تھی بلکہ محض اس کا فضل ہمارے شاملِ حال تھا اور یہی تقدم ہے ٭

رحم دو قسم کا ہوتا ہے

میں پھر بیان کرتا ہوں اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رحم دو قسم کا ہوتا ہے اوّل رحمانیت دوسرا رحیمیّت کے نام سے موسُوم ہے۔رحمانیت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجُود اور ہستی سے بھی پہلے شروع ہوا۔مثلاً اللہ تعالےٰ نے ہمارے وجُود سے پیشتر ہی زمین و آسمان، چاند و سُورج اور دیگر اشیاء ارضی و سماوی پیدا کی ہیں۔جو سب کی سب ہمارے کام آنے والی ہیں اور کام آتی ہیں۔دوسرے حیوانات بھی ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر وُہ جبکہ بجائے خود انسان ہی کے لئے مُفید ہیں۔اور انسان ہی کے کام آتے ہیں۔تو گویا مجموعی طور پر انسان ہی اُن سب سے فائدہ اٹھانے والا ٹھیرا۔دیکھو جسمانی امور میں کیسی اعلےٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے۔اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لئے ہے ٹکڑے اور ہڈیاں کتّوں کے واسطے جسمانی طور پر تو کسی حد تک حیوان بھی شریک ہیں۔مگر رُوحانی لذات میں

[1] الفاتحۃ : ۵

جانور شریک نہیں ہیں۔ پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے وجود سے پہلے ہی عطا ہوئی ہیں اور دوسری وہ جو رحیمیت کی شان کے نمونے ہیں اور وہ دعا کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اُن میں ایک فعل کی ضرورت ہوتی ہے ؎

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کو بیان کر دیا جائے کہ قانونِ قدرت میں ہمیشہ دعا کا تعلق ہے۔ آجکل کے نیچری طبع لوگ جو علوم حقّہ سے محض بے خبر اور ناواقف ہیں۔ اور اُن کی ساری تگ ودو کا نتیجہ یورپ کے طرزِ معاشرت کی نقل اُتارنا ہے۔ دعا کو ایک بدعت سمجھتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے تعلق پر کچھ مختصر سی بحث کی جائے ؎

دعا کی فلاسفی

دیکھو ایک بچہ بھوک سے بیتاب اور بیقرار ہو کر دودھ کے لئے چلّاتا ہے اور چیختا ہے تو ماں کی پستان میں دودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ حالانکہ بچہ تو دعا کا نام بھی نہیں جانتا لیکن یہ کیا سبب ہے کہ اُس کی چیخیں دودھ کو جذب کر لیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ عموماً ہر ایک صاحب کو اِس کا تجربہ ہے۔ بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنی چھاتیوں میں دودھ کو محسوس بھی نہیں کرتی ہیں۔ اور بسا اوقات ہوتا بھی نہیں۔ لیکن جونہی بچہ کی دردناک چیخ کان میں پہنچی۔ فوراً دودھ اُتر آیا ہے۔ جیسے بچہ کی اِن چیخوں کو دودھ کے جذب اور کشش کے ساتھ ایک علاقہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالےٰ کے حضور ہماری چلّاہٹ ایسی ہی اضطراری ہو تو وہ اُس کے فضل اور رحمت کو جوش دلاتی ہے۔ اور اس کو کھینچ لاتی ہے۔ اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور رحمت کو جو قبولیّتِ دعا کی صورت میں آتا ہے میں نے اپنی طرف کھینچتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دیکھا ہے۔ ہاں آج کل کے زمانہ کے تاریک دماغ فلاسفر اس کو محسوس نہ کر سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔ تو یہ صداقت دُنیا سے اُٹھ نہیں سکتی۔ اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میں قبولیّتِ دعاء کا نمونہ دکھانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔

قانونِ قدرت میں قبولیّت دُعا کی نظیریں موجود ہیں

تو غرض یہ ہے کہ قانونِ قدرت میں قبولیّتِ دُعا کی نظیریں موجود ہیں۔ اور ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ زندہ نمونے بھیجتا ہے۔ اسی لئے اس نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ[1] کی دُعا تعلیم فرمائی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا منشاء اور قانون ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس کو بدل سکے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دُعا سے پایا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اتم کر۔ اِن الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر تو اشارۃُ النص کے طور پر اس سے دُعا کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ صراطِ مُستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے لیکن اس کے سر پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[2] بتا رہا ہے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں یعنی صراطِ مُستقیم کے منازل کے لئے قویٰ سلیم سے کام لے کر استعانت الٰہی کو مانگنا چاہیئے۔ پس ظاہری اسباب کی رعایت ضروری ہے۔ جو اس کو چھوڑتا ہے وہ کافرِ نعمت ہے۔ دیکھو! یہ زبان جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور عروق و اعصاب سے اس کو بنایا ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دُعا کے لئے عطا کی جو قلب کے خیالات اور ارادوں کو ظاہر کر سکے۔ اگر ہم دُعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں تو ہماری شوربختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں۔ کہ اگر وُہ زبان کو لگ جائیں تو وہ یکدفعہ ہی کام چھوڑ بیٹھتی ہے۔ یہ رحیمیّت ہے ایسا ہی قلب میں خشوُع و خضوُع کی حالت رکھی اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں ودیعت کی ہیں پس یاد رکھو۔ اگر ہم ان قوتوں اور طاقتوں کو معطّل چھوڑ کر دُعا کرتے ہیں تو یہ دُعا کچھ بھی مفید اور کارگر نہ ہوگی۔ کیونکہ جب پہلے عطیہ سے کچھ کام نہیں لیا تو دوسرے سے کیا نفع اٹھائیں گے اس لئے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے پہلے اِیَّاکَ نَعْبُدُ بتا رہا ہے کہ ہم نے تیرے پہلے عطیوں اور قوتوں کو بیکار اور برباد نہیں کیا۔ یاد رکھو۔ رحمانیّت کا خاصہ یہی ہے۔ کہ وہ رحیمیّت سے فیض اٹھانے کے قابل بنا دے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے جو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[3] فرمایا۔ یہ نِری لفاظی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی شرف اسی کا متقاضی ہے۔ مانگنا انسانی خاصہ ہے۔ اور جو

[1] الفاتحہ: ۶،۷ [2] الفاتحہ: ۵ [3] المومن: ۶۱

استجابت جو اللہ تعالیٰ کا نہیں وُہ ظالم ہے۔ دُعا ایک ایسی سرور بخش کیفیت ہے۔ کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں کن الفاظ میں اس لذت اور سرور کو دُنیا کو سمجھاؤں۔ یہ تو محسوس کرنے ہی سے پتہ لگیگا۔ مختصر یہ کہ دُعا کے لوازمات سے اوّل ضروری یہ ہے کہ اعمال صالحہ اور اعتقاد پیدا کریں۔ کیونکہ جو شخص اپنے اعتقادات کو درست نہیں کرتا اور اعمال صالحہ سے کام نہیں لیتا اور دُعا کرتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ کی آزمائش کرتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ[1] کی دُعا میں یہ مقصود ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اتم کر اور پھر یہ کہہ کر کہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ[2] اور بھی صراحت کر دی کہ ہم اس صراط کی ہدایت چاہتے ہیں جو منعم علیہ گروہ کی راہ ہے اور مغضوب گروہ کی راہ سے بچا۔ جن پر بد اعمالیوں کی وجہ سے عذاب الٰہی آگیا۔ اور الضّالین کہہ کر یہ دعا تعلیم کی کہ اس سے بھی محفوظ رکھ کہ تیری حمایت کے بدُوں بھٹکتے پھریں۔ ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ لَفّ و نشر مرتّب ہے۔ اوّل اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہ اللہ مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ، ہر ایک خوبی کو اپنے اندر رکھنے والا اور ہر ایک عیب اور نقص سے منزّہ ہے دوم۔ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ سوم اَلرَّحۡمٰنِ۔ چہارم۔ اَلرَّحِیۡمِ پنجم مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ[3]۔ اب اس کے بعد جو درخواستیں ہیں وہ ان پانچوں کے ماتحت ہیں۔ اب سلسلہ یُوں شروع ہوتا ہے اِیَّاكَ نَعۡبُدُ یہ فقرہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کے مقابل ہے یعنی اے اللہ تو جو ساری صفاتِ حمیدہ کا جامع ہے اور تمام بدیوں سے منزّہ ہے۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مسلمان اس خدا کو جانتا ہے جس میں وہ تمام خوبیاں جو انسانی ذہن میں آسکتی ہیں موجود ہیں اور اس سے بالاتر اور ارفع ہے۔ کیونکہ یہ سچّی بات ہے کہ انسانی عقل اور فکر اور ذہن خدا تعالیٰ کی صفات کا احاطہ ہرگز ہرگز نہیں کرسکتے۔ ہاں تو مسلمان ایسے کامل الصّفات خدا کو مانتا ہے کہ تمام قومیں مجلسوں میں اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے شرمندہ ہوجاتی ہیں اور انہیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

ہندوؤں کا خدا

مثلاً ہندوؤں کا خدا جو انہوں نے مانا ہے اور کہا ہے کہ ویدوں سے ایسے خدا ہی کا پتہ

[1] الفاتحہ: ۶ [2] الفاتحہ: ۷ [3] الفاتحہ: ۲تا۴

لگتا ہے جب اُس کی نسبت وُہ یہ ذکر کریں گے کہ اُس نے دُنیا کا ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کیا اور نہ اس نے رُوحوں کو پیدا کیا ہے تو کیا ایسے خدا کے ماننے والے کے لئے کوئی مفر رہ سکتا ہے جب اُسے کہا جائے کہ ایسا خدا اگر مرجائے تو کیا حرج ہے۔ کیونکہ جب یہ اشیاء اپنا وجود مستقل رکھتی ہیں اور قائم بالذات ہیں۔ پھر خدا کی زندگی کی اُن کی زندگی اور بقا کے لئے کیا ضرورت ہے۔ جیسے ایک شخص اگر تیر چلائے اور وُہ تیر ابھی جا ہی رہا ہو کہ اُس شخص کا دم نکل جائے تو بتاؤ اس تیر کی حالت میں کیا فرق آئیگا۔ ہاتھ سے نکلنے کے بعد وہ چلانے والے کے وجود کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح پر ہندوؤں کے خدا کے لئے اگر یہ تجویز کیا جائے کہ وُہ ایک وقت مرجائے تو کوئی ہندو اس کی موت کا نقصان نہیں بتا سکتا۔ مگر ہم خدا کے لئے ایسا تجویز نہیں کرسکتے کیونکہ اللّٰہ کے لفظ سے ہی پایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی نقص اور بدی نہ ہو۔ ایسا ہی جبکہ آریہ مانتا ہے کہ اجسام اور رُوحیں انادی ہیں یعنی ہمیشہ سے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارا یہ اعتقاد ہے۔ پھر خدا کی ہستی کا ثبوت ہی کیا دے سکتے ہو؟ اگر کہو کہ اس نے جوڑا جاڑا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ جب تم پرمانو اور پرکرتی کو قدیم سے مانتے ہو۔ اور ان کے وجود کو قائم بالذات کہتے ہو تو پھر جوڑنا جاڑنا تو ادنیٰ فعل ہے وُہ جُڑ بھی سکتے ہیں اور ایسا ہی جب وہ یہ تعلیم بتاتے ہیں کہ خدا نے وید میں مثلاً یہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی عورت کے ہاں اپنے خاوند سے بچّہ پیدا نہ ہو سکتا ہو تو وہ کسی دُوسرے سے ہمبستر ہو کر اَولاد پیدا کر لے۔ تو بتاؤ ایسے خدا کی نسبت کیا کہا جائے گا؟ یا مثلاً یہ تعلیم پیش کی جائے کہ خدا کسی اپنے پریمی اور بھگت کو ہمیشہ کے لئے مکتی یعنی نجات نہیں دے سکتا بلکہ مہاپرلے کے وقت اس کو ضروری ہوتا ہے کہ مکتی یافتہ انسانوں کو پھر اُسی تناسخ کے چکر میں ڈالے یا مثلاً خدا کی نسبت یہ کہنا کہ وُہ کسی کو اپنے فضل وکرم سے کچھ بھی عطا نہیں کرسکتا بلکہ ہر ایک شخص کو وُہی ملتا ہے جو اُس کے اعمال کے نتائج ہیں پھر ایسے خدا کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ غرض ایسا خدا ماننے والے کو سخت شرمندہ ہونا پڑے گا۔

عیسائیوں کا خدا

ایسا ہی عیسائی بھی جب یہ پیش کریں گے کہ ہمارا خدا یسوع ہے۔ اور پھر اُس کی نسبت وُہ یہ بیان کریں گے کہ یہودیوں کے ہاتھوں سے اُس نے ماریں کھائیں شیطان اُسے آزماتا رہا۔ بھوک اور پیاس کا اثر اس پر ہوتا رہا۔ آخر ناکامی کی حالت میں پھانسی پر چڑھایا گیا۔ تو کون دانشمند ہوگا جو ایسے خدا کے ماننے کے لئے تیار ہوگا۔ غرض اسی طرح پر تمام قومیں اپنے مانے ہوئے خدا کا ذکر کرتی ہوئی شرمندہ ہو جاتی ہیں۔ مگر مسلمان کبھی اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو خوبی اور عمدہ صفت ہے۔ وہ اُن کے مانے ہوئے خدا میں موجود اور جو نقص اور بدی ہے اُس سے وہ منزّہ ہے جیسا کہ سُورۃُ الفَاتِحہ میں اللہ کو تمام صفاتِ حمیدہ کا موصُوف قرار دیا ہے۔ تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے مقابل میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہے۔ اس کے بعد ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ربوبیّت کا کام ہے تربیت اور تکمیل جیسے ماں اپنے بچّہ کی پرورش کرتی ہے اس کو صاف کرتی ہے ہر قسم کے گند اور آلائش سے دُور رکھتی ہے اور دُودھ پلاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یُوں کہو کہ وہ اس کی مدد کرتی ہے۔ اب اس کے مقابل میں یہاں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے۔ پھر اَلرَّحْمٰن ہے جو بغیر خواہش بدُوں درخواست اور بغیر اعمال کے اپنے فضل سے دیتا ہے۔ اگر ہمارے وجود کی ساخت ایسی نہ ہوتی تو ہم سجدہ نہ کر سکتے اور رکُوع نہ کر سکتے۔ اس لئے ربوبیّت کے مقابلہ میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ فرمایا۔ جیسے باغ کا نشو و نما پانی کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح پر اگر خدا کے فیض کا پانی نہ پہنچے تو ہم نشو و نما نہیں پا سکتے۔ درخت پانی کو چُوستا ہے۔ اس کی جڑوں میں دہانے اور سُوراخ ہوتے ہیں۔ علم طبعی میں یہ مسئلہ ہے کہ درخت کی شاخیں پانی کو جذب کرتی ہیں۔ اُن میں قوت جاذبہ ہے۔ اسی طرح پر عبُودیّت میں ایک قوت جاذبہ ہوتی ہے جو خدا کے فیضان کو جذب کرتی ہے اور چُوستی ہے۔ پس اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے۔ یعنی اگر اس کی رحمانیّت ہمارے شامل حال نہ ہوتی۔ اگر یہ قویٰ اور طاقتیں اُس نے عطا نہ کی

ہوتیں تو ہم اس فیض سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتے ۔

ہدایت رحمانیت الٰہی سے ملتی ہے

پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۔ اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل ہے کیونکہ ہدایت پانا کسی کا حق تو نہیں ہے بلکہ محض رحمانیتِ الٰہی سے یہ فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ اَلرَّحِيْم کے بالمقابل ہے۔ کیونکہ اس کا وِرد کرنے والا رحیمیت کے چشمہ سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے یہ معنی ہیں کہ اے رحم خاص سے دُعاؤں کے قبول کرنے والے ان رسولوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحوں کی راہ ہم کو دکھا جنہوں نے دُعا اور مجاہدات میں مصروف ہو کر تجھ سے انواع و اقسام کے معارف اور حقائق اور کشوف اور الہامات کا انعام پایا۔ اور دائمی دُعا اور تضرع اور اعمال صالحہ سے معرفت تامہ کو پہنچے ۔

رحیمیت کے مفہوم میں نقصان کا تدارک کرنا لگا ہوا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ اگر فضل نہ ہوتا تو نجات نہ ہوتی۔ ایسا ہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ سے سوال کیا کہ یا حضرت کیا آپؐ کا بھی یہی حال ہے۔ آپؐ نے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور فرمایا۔ ہاں۔ نادان اور احمق عیسائیوں نے اپنی نافہمی اور ناواقفی کی وجہ سے اعتراض کئے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ یہ آپؐ کی کمال عبودیت کا اظہار تھا جو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کو جذب کر رہا تھا۔ ہم نے خود تجربہ کر کے دیکھا ہے اور متعدد مرتبہ آزمایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ جب انکسار اور تذلل کی حالت انتہا کو پہنچی ہے اور ہماری رُوح اس عبودیت اور فروتنی میں بہ نکلتی ہے اور آستانہ حضرت واہب العطایا پر پہنچ جاتی ہے تو ایک روشنی اور نُور اُوپر سے اُترتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نالی کے ذریعہ سے مصفّا پانی دوسری نالی میں پہنچتا ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت جس قدر بعض مقامات پر فروتنی اور انکساری میں کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدر آپؐ رُوح القدس کی تائید اور روشنی سے مؤیّد اور منوّر ہیں جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اور فعلی حالت سے دکھایا

ہے یہانتک کہ آپؐ کے انوار و برکات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ابدالآباد تک اس کا نمونہ اور ظِلّ نظر آتا ہے چنانچہ اس زمانہ میں بھی جو کچھ خدا تعالیٰ کا فیض اور فضل نازل ہو رہا ہے۔ وہ آپؐ ہی کی اطاعت اور آپؐ ہی کی اتّباع سے ملتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور خدا تعالیٰ کی رضا کو پانے والا نہیں ٹھہر سکتا۔ اور ان انعام و برکات اور معارف اور حقایق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ جو اعلیٰ درجہ کے تزکیہ نفس پر ملتے ہیں جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع میں کھویا نہ جائے۔ اور اس کا ثبوت خود خدا تعالیٰ کے کلام سے ملتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1]

اپنا دعوےٰ

اور خدا تعالیٰ کے اس دعویٰ کی عملی اور زندہ دلیل میں ہوں۔ ان نشانات کے ساتھ جو خدا تعالیٰ کے محبوبوں اور ولیوں کے قرآن شریف میں مقرر ہیں مجھے شناخت کرو غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کمال یہانتک ہے کہ اگر کوئی بڑھیا بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑتی تھی تو آپؐ کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اُس کی باتوں کو نہایت توجّہ سے سُنتے اور جبتک وہ خود آپؐ کو نہ چھوڑتی آپؐ نہ چھوڑتے تھے۔ اور پھر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے مقابل ہے اس کا وِرد کرنے والا چشمہ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے فیض پاتا ہے جس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اے جزا و سزا کے دِن کے مالک۔ ہمیں اس سے بچا کہ یہودیوں کی طرح جو دُنیا میں طاعون وغیرہ بلاؤں کا نشانہ ہوئے۔ اور اس کے غضب سے ہلاک ہو گئے۔ یا نصاریٰ کی طرح نجات کی راہ کھو بیٹھیں۔ اس میں یہود کا نام مغضوب اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کی شامتِ اعمال سے بھی اُن پر عذاب آیا۔ کیونکہ اُنہوں نے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں اور راستبازوں کی تکذیب کی اور بہت سی تکلیفیں پہنچائیں اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے جو یہاں سُورۂ فاتحہ میں یہودیوں کی راہ سے بچنے کی

[1] آلِ عمران: ۳۲

ہدایت فرمائی۔ اور اس سورہ کو اَلضَّآلِّیْنَ پر ختم کیا یعنی اُن کی راہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ تو اس میں کیا سِر تھا۔ اس میں یہی راز تھا کہ اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی قسم کا زمانہ آنے والا ہے جبکہ یہود کی تتبع کرنے والے ظاہر پرستی کریں گے۔ اور استعارات کو حقیقت پر حمل کر کے خدا کے راستباز کی تکذیب کے لئے اٹھیں گے جیسا کہ یہود نے مسیح ابن مریم کی تکذیب کی تھی۔ اور انہیں یہی مصیبت پیش آئی کہ انہوں نے اس کی تاویل پر ٹھٹھا کیا اور کہا کہ اگر خدا کا یہی مطلب تھا کہ ایلیا کا مثیل آئے گا تو کیوں خدا نے اپنی پیشگوئی میں اس کی صراحت نہ کی۔ غرض اسی روش اور طریق پر اس وقت ہمارے مخالفوں نے بھی قدم مارا ہے۔ اور میری تکذیب اور ایذا دہی میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میرے قتل کے فتوے دیئے۔ اور طرح طرح کے حیلوں اور مکروں سے مجھے ذلیل کرنا اور نابود کرنا چاہا۔ اگر خدا تعالیٰ کے فضل سے گورنمنٹ برطانیہ کا اس ملک میں راج نہ ہوتا۔ تو یہ مدت سے میرے قتل سے دل خوش کر لیتے۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان کو ہر مُراد میں نامُراد کیا۔ اور وہ جو اس کا وعدہ تھا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ[1] وہ پورا ہوا۔

غرض اس دُعا میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ کا فرقہ مسلمانوں کے ایک گروہ کی اس حالت کا پتہ دیتا ہے۔ جو وہ مسیح موعود کے مقابل مخالفت اختیار کریگا۔ اور ایسا ہی اَلضَّآلِّیْنَ سے مسیح موعود کے زمانہ کا پتہ لگتا ہے کہ اس وقت صلیبی فتنہ کا زور اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ جائے گا۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے جو سلسلہ قائم کیا جائے گا وہ مسیح موعود ہی کا سلسلہ ہوگا۔ اور اسی لئے احادیث میں مسیح موعود کا نام خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاسر الصلیب رکھا ہے۔ کیونکہ یہ سچی بات ہے کہ ہر ایک مجدّد فتن موجودہ کی اصلاح کے لئے آتا ہے۔ اب اس وقت خدا کے لئے سوچو تو کیا معلوم نہ ہوگا کہ صلیبی نجات کی تائید میں قلم اور زبان سے وہ کام لیا گیا ہے کہ اگر صفحات عالم کو ٹٹولا جائے تو باطل پرستی کی تائید میں یہ سرگرمی اور زمانہ میں ثابت نہ ہوگی اور جبکہ صلیبی فتنہ کے حامیوں

[1] المائدۃ : ۶۸

کی تحریریں اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی ہیں اور توحید حقیقی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عفّت عزت اور حقانیت اور کتاب اللہ کے منجانب اللہ ہونے پر ظلم اور زور کی راہ سے حملے کئے گئے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ اس کاسرالصلیب کو نازل کرے؟ کیا خدا تعالیٰ اپنے وعدہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] کو بھول گیا؟ یقیناً یاد رکھو کہ خدا کے وعدے سچے ہیں۔ اس نے اپنے وعدہ کے موافق دنیا میں ایک نذیر بھیجا ہے۔ دنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ مگر خدا تعالیٰ اس کو ضرور قبول کریگا۔ اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی کو ظاہر کریگا۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق مسیح موعود ہو کر آیا ہوں۔ چاہو تو قبول کرو چاہو تو ردّ کرو۔ مگر تمہارے ردّ کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا ہے۔ وہ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے پہلے سے براہین میں فرما دیا ہے:۔

صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۔

(الحکم جلد ۵ ۲۸-۳۴ پرچہ ۳۱ جولائی - ۱۷ ستمبر ۱۹۰۱ء)

۱۲ جنوری ۱۸۹۸ء:

اپنی جماعت کو کچھ نصیحتیں

بجائے خود مرض طاعون عذاب شدید ہے۔ دوسرا قانون اس پر سخت ہے جو دوسرا عذاب ہے اور مرض بھی بڑھ کر ہے۔ عورت ہو یا بچہ ہو الگ کیا جاتا ہے اور گھر کو خالی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس مرض اور اس کے قانون پر غور کر کے میرے دل میں ایک درد پیدا ہوا اور میں نے تہجد میں اس کے متعلق دعا کی تو الہام ہوا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ اب خیال ہوتا ہے کہ وہ الہام جو ہوا تھا کہ

”کون کہہ سکتا ہے اے بجلی آسمان سے مت گر“

شاید اسی سے متعلق ہو۔

[1] الحجر: ۱۰

نزولِ بلا سے قبل دُعا اور استغفار کرو اور صدقات دو

میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جو لوگ قبل از نزولِ بلا دُعا کرتے ہیں اور استغفار کرتے اور صدقات دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن پر رحم کرتا ہے اور عذابِ الٰہی سے اُن کو بچا لیتا ہے۔ میری ان باتوں کو قصہ کے طور پر نہ سُنو۔ میں نصحًا للہ کہتا ہوں اپنے حالات پر غور کرو۔ اور آپ بھی اور اپنے دوستوں کو بھی دُعا میں لگ جانے کے لئے کہو۔ استغفار عذابِ الٰہی اور مصائب شدیدہ کے لئے سپر کا کام دیتا ہے قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ[1]۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ اس عذابِ الٰہی سے تم محفوظ رہو۔ تو استغفار کثرت سے پڑھو ؂

گورنمنٹ کو اختیار ہوگا کہ مُبتلا اشخاص کو علیحدہ رکھا جائے۔ گویا وہ لوگ جو علیحدہ کئے جائیں گے قبروں ہی میں ہوں گے۔ امیر و غریب، مرد و عورت، بوڑھے جوان کا کوئی لحاظ نہ کیا جاوے گا۔ اس لئے خدانخواستہ اگر کسی ایسی جگہ طاعون پھیلے۔ جہاں تم میں سے کوئی ہو تو میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قوانین کی سب سے پہلے اطاعت کرنے والے تم ہو ؂

اکثر مقامات میں سُنا گیا ہے کہ پولیس والوں سے مقابلہ ہوا۔ میرے نزدیک گورنمنٹ کے قوانین کے خلاف کرنا بغاوت ہے جو خطرناک جُرم ہے۔ ہاں گورنمنٹ کا بیشک یہ فرض ہے کہ وہ ایسے افسر مقرر کرے جو خوش اخلاق، متدیّن اور مُلک کے رسم و رواج اور مذہبی پابندیوں سے آگاہ ہوں۔ غرض تم خود ان قوانین پر عمل کرو اور اپنے دوستوں اور ہمسائیوں کو ان قوانین کے فوائد سے آگاہ کرو۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ دُعاؤں کا وقت یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس وبا نے پنجاب کا رُخ کر لیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ ہر ایک مُتنبّہ اور بیدار ہو کر دُعا کرے اور توبہ کرے۔ قرآن شریف کا منشا یہ ہے۔ کہ جب عذاب سر پر آپڑے پھر توبہ عذاب سے نہیں چھڑا سکتی ؂

[1] الانفال : ۳۴

ہر ایک شخص تہجد میں اُٹھنے کی کوشش کرے

اس لئے اس سے پیشتر کہ عذاب الٰہی آکر توبہ کا دروازہ بند کر دے توبہ کرو۔ جبکہ دُنیا کے قانون سے اس قدر ڈر پیدا ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قانون سے نہ ڈریں۔ جب بلا سر پر آپڑے تو اس کا مزہ چکھنا ہی پڑتا ہے۔ چاہیئے کہ ہر ایک شخص تہجد میں اُٹھنے کی کوشش کرے اور پانچ وقت کی نمازوں میں بھی قنوت ملا دیں۔ ہر ایک خدا کو ناراض کرنے والی باتوں سے توبہ کریں۔ توبہ سے یہ مراد ہے کہ ان تمام بدکاریوں اور خدا کی نارضامندی کے باعثوں کو چھوڑ کر ایک سچی تبدیلی کریں اور آگے قدم رکھیں اور تقویٰ اختیار کریں۔ اس میں بھی خدا کا رحم ہوتا ہے۔ عاداتِ انسانی کو شائستہ کریں۔ غضب نہ ہو۔ تواضع اور انکسار اس کی جگہ لیلے۔ اخلاق کی درستی کے ساتھ اپنے مقدور کے موافق صدقات کا دینا بھی اختیار کرو۔ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا[1] الخ یعنی خدا کی رضا کے لئے مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھانا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خاص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہم دیتے ہیں اور اُس دن سے ہم ڈرتے ہیں جو نہایت ہی ہولناک ہے۔

قصہ مختصر دُعا سے، توبہ سے کام لو۔ اور صدقات دیتے رہو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ تم سے معاملہ کرے۔

اخلاقی حالت کیسی ہو

اخلاقی حالت ایسی درست ہو کہ کسی کو نیک نیتی سے سمجھانا اور غلطی سے آگاہ کرنا ایسے وقت پر ہو کہ اُسے بُرا معلوم نہ ہو۔ کسی کو استخفاف کی نظر سے نہ دیکھا جاوے۔ دل شکنی نہ کی جاوے۔ جماعت میں باہم جھگڑے فساد نہ ہوں۔ دینی غریب بھائیوں کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ مال و دولت یا نسبی بزرگی پر بیجا فخر کر کے دوسروں کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھو۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک مکرم وُہی ہے جو متقی ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[2] دوسروں کے ساتھ بھی پُورے اخلاق سے کام لینا چاہیئے۔ جو بد اخلاقی کا نمونہ ہوتا ہے، وُہ بھی

[1] الدھر: ۹ [2] الحجرات: ۱۴

اچھا نہیں۔ ہماری جماعت کے ساتھ لوگ مقدمہ بازی کا صرف بہانہ ہی ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں کے لئے ایک طاعون ہے۔ ہماری جماعت کے لئے دو طاعون ہیں۔ اگر کوئی جماعت میں سے ایک شخص بُرائی کرے گا تو اس ایک سے ساری جماعت پر حرف آئے گا۔ دانشمندی حلم اور درگذر کے ملکہ کو بڑھاؤ۔ نادان سے نادان کی باتوں کا جواب بھی متانت اور سلامت روی سے دو۔ یاوہ گوئی کا جواب یاوہ گوئی نہ ہو۔ میں جانتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بھی کچھ ایسی ہی حکمت عملی تھی کہ اگر ایسا نہ کرتے تو روز ماریں کھاتے پھرتے۔ رُومیوں کی سلطنت تھی۔ یہود کے فقیہہ اور فریسی اس کے مقرب تھے۔ اس وقت اگر وہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال نہ پھیرتے تو روز ماریں کھایا کرتے اور روز مقدمے ہوتے۔ باوجودیکہ وہ ایسی نرم تعلیم دیتے تھے پھر بھی یہود انہیں دم نہ لینے دیتے تھے۔ اس وقت کی موجودہ حالت انجیل کی تعلیم ہی کو چاہتی ہوگی۔ اس وقت ہماری جماعت کی حالت بھی قریباً ویسی ہی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مارٹن کلارک عیسائی کے مقدمہ میں محمد حسین نے بھی اسی کی گواہی دی۔ اب سمجھ لو کہ قوم سے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ رہی گورنمنٹ اس کو بھی بدظن کیا جاتا ہے۔ اور گورنمنٹ کسی حد تک معذور بھی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدظن ہو۔ کیونکہ عالم الغیب نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو اکثر مرتبہ گورنمنٹ کے حضور خاص طور پر میموریل بھیجنے پڑے اور اپنے حالات سے خود اس کو مطلع کرنا پڑا۔ تا کہ اس کو صحیح اور سچے واقعات کا علم ہو۔ مناسب ہے۔ کہ ان ابتلا کے دنوں میں اپنے نفس کو مار کر تقویٰ اختیار کریں۔ میری غرض ان باتوں سے یہی ہے کہ تم نصیحت اور عبرت پکڑو۔

دنیا فنا کا مقام ہے، آخر مرنا ہے۔ خوشی دین کی باتوں میں ہے۔ اصلی مقصد تو دین ہی ہے۔

لفظ رمضان کے معنی

رمض سورج کی تپش کو کہتے ہیں۔ رمضان میں چونکہ انسان اکل و شرب اور تمام

جسمانی لذتوں پر صبر کرتا ہے۔ دُوسرے اللہ تعالےٰ کے احکام کے لئے ایک حرارت اور جوش پیدا کرتا ہے۔ رُوحانی اور جسمانی حرارت اور تپش مل کر رمضان ہوا۔ اہلِ لُغت جو کہتے ہیں کہ گرمی کے مہینہ میں آیا۔ اِس لئے رمضان کہلایا۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عرب کے لئے یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی۔ رُوحانی رمض سے مراد رُوحانی ذوق و شوق اور حرارتِ دینی ہوتی ہے۔ رَمض اس حرارت کو بھی کہتے ہیں۔ جس سے پتھر وغیرہ گرم ہو جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵-عتا پرچہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۱ء)

۲۹ر جنوری ۱۸۹۸ء۔ انسان کی رُوحانی طاقتوں پر اس کے معبُود کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ دیکھو۔ اگر کوئی ہندو آجاوے تو دُور ہی سے اُس سے غفلت کی بُو آتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا خود ساختہ معبود بھی تو ایسا ہی غافل ہے کہ جبتک ایک انگریز کے کھانے کی گھنٹی کی طرح گھنٹی نہ بجے وُہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رُوحانی زندگی سے جو معرفت اور شفا حاصل ہوتی ہے اس سے یہ لوگ محرُوم رہتے ہیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو بڑے متموّل اور آسُودہ حال ہوتے ہیں۔

رزق ابتلا اور رزق اصطفاء

اصل بات یہ ہے کہ رزق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ابتلا کے طور پر، دوسرے اصطفا کے طور پر۔ رزق ابتلا کے طور پر تو وُہ رزق ہے جس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا بلکہ یہ رزق انسان کو خدا سے دُور ڈالتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی طرف اللہ تعالےٰ نے اشارہ کر کے فرمایا ہے۔ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ[1] تمہارے مال تم کو ہلاک نہ کر دیں۔ اور رزق اصطفا کے طور پر وُہ ہوتا ہے جو خدا کے لئے ہو۔ ایسے لوگوں کا متولّی خدا ہو جاتا ہے۔ اور جو کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے۔ وُہ اس کو خدا ہی کا سمجھتے ہیں۔ اور اپنے عمل سے ثابت کر دکھاتے ہیں۔ صحابہؓ کی حالت دیکھو! جب امتحان کا وقت آیا۔ تو جو کچھ کسی کے پاس تھا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے اوّل کمبل

[1] المنٰفقون ۱۰:

پہن کر آگئے پھر اُس کمبل کی جزا بھی اللہ تعالےٰ نے کیا دی کہ سب سے اوّل خلیفہ وُہی ہوئے۔ غرض یہ ہے کہ اصلی خوبی، خیر اور رُوحانی لذّت سے بہرور ہونے کے لئے وُہی مال کام آسکتا ہے۔ جو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ (الحکم جلد ۳ ۲۲۔ پرچہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء)

۳۰۔ جنوری ۱۸۹۸ء۔

اِنَّمَا الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ

دُنیا اور دُنیا کی خوشیوں کی حقیقت لہو و لعب سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ وُہ عارضی اور چند روزہ ہیں۔ اور اُن خوشیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے دُور جا پڑتا ہے مگر خدا کی معرفت میں جو لذّت ہے وُہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں نے سُنی نہ کسی اَور حِس نے اس کو محسوس کیا ہے۔ وُہ ایک چیر کر نکل جانے والی چیز ہے۔ ہر آن ایک نئی راحت اُس سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے نہیں دیکھی ہوتی۔

خدا تعالےٰ کے ساتھ انسان کا ایک خاص تعلق ہے۔ اہلِ عرفان لوگوں نے بشریّت اور ربوبیّت کے جوڑہ پر بہت لطیف بحثیں کی ہیں۔ اگر بچّے کا منہ پتھر سے لگائیں تو کیا کوئی دانشمند خیال کر سکتا ہے کہ اس پتھر میں سے دُودھ نکل آئے گا۔ اور بچّہ سیر ہو جائیگا ہرگز نہیں۔ اسی طرح پر جب تک انسان خدا تعالےٰ کے آستانہ پر نہیں گرتا۔ اس کی رُوح ہمہ نیستی ہو کر ربوبیّت سے تعلق پیدا نہیں کرتی اور نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ عدم یا مشابہ بالعدم نہو کیونکہ ربوبیّت اسی کو چاہتی ہے۔ اس وقت تک وہ رُوحانی دُودھ سے پرورش نہیں پا سکتا۔

لہو میں کھانے پینے کی تمام لذّتیں شامل ہیں۔ اُن کا انجام دیکھو کہ بجز کثافت کے اَور کیا ہے۔ زینت، سواری، عُمدہ مکانات پر فخر کرنا یا حکومت و خاندان پر فخر کرنا یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ بالآخر اس سے ایک قسم کی حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو رنج دیتی اور طبیعت کو افسُردہ اور بے چین کر دیتی ہے۔

لعب میں عورتوں کی محبت بھی شامل ہے۔ انسان عورت کے پاس جاتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ محبت اور لذت کثافت سے بدل جاتی ہے لیکن اگر یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک حقیقی عشق ہونے کے بعد ہو۔ تو پھر راحت پر راحت اور لذت پر لذت ملتی ہے۔ یہانتک کہ معرفت حقہ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ ایک ابدی اور غیر فانی راحت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں پاکیزگی اور طہارت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خدا میں لذت ہے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُسے ہی پاؤ کہ حقیقی لذت وہی ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ پرچہ ۲۳ر جون ۱۸۹۹ء)

حضرت اقدسؑ کی ایک تقریر

۳۱ر جنوری ۱۸۹۸ء بعد نماز فجر۔

فضائل بھی متعدی ہیں

یاد رکھو کہ فضائل بھی امراض متعدیہ کی طرح متعدی ہونے ضروری ہیں۔ مومن کے لئے حکم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو اس درجہ پر پہنچائے کہ وہ متعدی ہو جائیں۔ کیونکہ کوئی عمدہ سے عمدہ بات قابل پذیرائی اور واجب التعمیل نہیں ہو سکتی جبتک اس کے اندر ایک چمک اور جذبہ نہ ہو۔ اس کی درخشانی دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور جذب ان کو کھینچ لاتا ہے۔ اور پھر اس فعل کی اعلیٰ درجہ کی خوبیاں خود بخود دوسرے کو عمل کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ دیکھو۔ حاتم کا نیکنام ہونا سخاوت کے باعث مشہور ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ خلوص سے تھی۔ ایسا ہی رستم و اسفندیار کی بہادری کے فسانے عام زبان زد ہیں۔ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ خلوص سے تھے۔ میرا ایمان اور مذہب یہ ہے کہ

جب تک انسان سچا مومن نہیں بنتا۔ اس کے نیکی کے کام خواہ کیسے ہی عظیم الشان ہوں لیکن وُہ ریاکاری کے ملمع سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن چونکہ اُن میں نیکی کی اصل موجود ہوتی ہے اور یہ وُہ قابلِ قدر جوہر ہے جو ہر جگہ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے باایں ہمہ ملمع سازی و ریاکاری وہ عزّت سے دیکھے جاتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے ایک نقل بیان کی تھی۔ اور خود میں نے بھی اس قصّہ کو پڑھا ہے کہ سر فلپ سڈنی ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں قلعہ زٹفن ملک ہالینڈ کے محاصرہ میں جب زخمی ہوا۔ تو اس وقت عین نزع کی تلخی اور شدّت پیاس کے وقت جب اس کے لئے ایک پیالہ پانی کا جو وہاں بہت کمیاب تھا مُہیا کیا گیا۔ تو اُس کے پاس ایک اَور زخمی سپاہی تھا جو نہایت پیاسا تھا۔ وہ سر فلپ سڈنی کی طرف حسرت اور طمع کے ساتھ دیکھنے لگا۔ سڈنی نے اس کی یہ خواہش دیکھ کر پانی کا وہ پیالہ خود نہ پیا بلکہ بطور ایثار یہ کہہ کر اس سپاہی کو دیدیا کہ "تیری ضرورت مجھ سے زیادہ ہے"۔ مرنے کے وقت بھی لوگ ریاکاری سے نہیں رُکتے۔ ایسے کام اکثر ریاکاروں سے ہو جاتے ہیں جو اپنے آپ کو اخلاق فاضلہ والے انسان ثابت کرنا یا دکھانا چاہتے ہیں۔

انسان اچھی باتوں کی کیوں پیروی نہیں کرتے

غرض کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ اُس کی ساری باتیں بُری حالت کی اچھی ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اچھّی باتوں کی کیوں پیروی نہیں کرتے۔ میں اس کے جواب میں یہی کہوں گا۔ کہ اصل بات یہ ہے کہ انسان فطرتاً کسی بات کی پیروی نہیں کرتا جب تک کہ اُس میں کمال کی جھلک نہ ہو۔ اور یہی ایک سِرّ ہے جو اللہ تعالےٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کو مبعُوث کرتا رہا ہے اور خاتم النّبیین کے بعد مجدّدین کے سِلسِلہ کو جاری رکھا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے عملی نمونہ کے ساتھ ایک جذب اور اثر کی قوت رکھتے ہیں۔ اور نیکیوں کا کمال اُن کے وجود میں نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ انسان بالطّبع کمال کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں یہ قوت نہ ہوتی۔ تو انبیاء علیہم السّلام کے سِلسِلہ کی بھی ضرورت نہ رہتی لیکن

یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام اور خدا تعالےٰ کے ماموروں کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ اور ان کی تعلیم کی طرف عدم توجہی کیوں کی جاتی ہے۔ اس کا باعث زمانہ کی وہ حالت ہوتی ہے جو اُن پاک وجُودوں کی بعثت کا مُوجب ہوتی ہے۔ زمانہ میں فسق وفجور کا ایک دریا رواں ہوتا ہے اور ہر قسم کی بدکاریاں اور بُرائیاں خدا تعالےٰ سے بُعد اور حرمان اس نیک عُمدہ مادے کو اپنے نیچے دبا لیتا ہے۔ چونکہ بدکاریوں کے کمال کا ظہور ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لئے طبیعت کا یہ مادہ کہ وہ ہر کمال کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ اس طرف رجُوع کر گیا ہوتا ہے اور یہی وہ سِرّ ہوتا ہے کہ ابتداءً انبیاء علیہم السلام اور ماموروں کی مخالفت اور اُن کی تعلیم سے بے پروائی ظاہر کی جاتی ہے۔ آخر ایک وقت آجاتا ہے کہ اس نیکی کے بروز اور کمال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ [1]

غرض انسانی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ ہر کمال کی پیروی کرنا چاہتی ہے دیکھ لو۔ انگریزوں کی نئی ایجادات سُوئی، چاقو وغیرہ تک کی کس قدر عزت کی جاتی ہے اور دیسی اشیاء کے مقابلہ میں ان کو کس قدر پسند کیا جاتا ہے حالانکہ اُن میں بعض اشیا اصلی نہیں بلکہ اکثر ملمّع کی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر ظاہری چمک دمک ایسی ہوتی ہے کہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور اُس کی روشنی ایک کشش کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ یہ جھوٹے زیور جو ملمّع کئے ہوئے بکتے ہیں۔ ان کی تجارت کیسی سُرعت کیساتھ بڑھ رہی ہے۔ اصلی اشیاء کے مقابلہ میں ان کو رکھ کر دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ اصلی نقلی معلوم ہوتا ہے اور نقلی اصلی۔ ان اشیاء کی ظاہری چمک دمک میں ایک روشنی ہے جو ہمارے دیسی صنّاع اس کو دکھا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ باوجودیکہ لوگ صاف جانتے ہیں کہ یہ اشیا ملمع شدہ ہیں لیکن اس دجل کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ہر ایک چیز ان کی دیکھو۔ دیسی کپڑے، دیسی جوتے، جنٹلمین تعلیمیافتہ اُن سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ انگریزی اشیاء میں ایک خاص قسم کی نفاست اور عمدگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ چمڑے کو ایسا چمکاتے ہیں کہ اس

[1] الزخرف : ۳۶

میں نرمی اور چمک پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ کیا ہر ایک ادنیٰ سی چیز کو دیکھو۔ ایک تانگے ہی کو دیکھو کیسا خوبصورت ہوتا ہے۔ غرض ہر ایک دیسی چیز کو بالمقابل نکما کر دیا ہے۔ بلکہ میں نے تو سُنا ہے کہ بعض دیسی رئیس دیسی چیزوں سے یہانتک متنفر ہیں کہ ان کے کپڑے بھی پیرس سے دھل کر آتے ہیں۔ اور پینے کا پانی بھی ولایت سے منگواتے ہیں۔

اس خریداری کا ہنر کیا ہے۔ انہوں نے ظاہری خوبصورتی اور چمک اور خوشنمائی رکھ دی ہے۔ اس لئے لوگ ادھر جھک گئے ہیں جب یہ حالت ہے کہ دیانت دار اور بھی ہیں اور کف رکا گروہ بھی ہے۔ لیکن کفار کی طرف رجوع ان کی نفاست اور چمک کی وجہ سے ہے۔ یہی حال اخلاق اور اعمال کا ہے۔ پس جبتک ان کی چمک دمک یہاں تک نہ پہنچائی جائے نوعِ انسان پر اثر نہیں پڑسکتا۔ جو لوگ خود کمزور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے کمزوروں کو جذب نہیں کر سکتے۔

سُورۂ وَالعَصرِ کی تفسیر

خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ [1]۔ قسم ہے اس زمانہ کی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی۔ آجکل ہمارے زمانہ کے کوتاہ اندیش مخالف یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں مخلوق کی قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں۔ حالانکہ دوسروں کو منع کیا ہے۔ اور کہیں انجیر کی قسم ہے۔ کہیں دن اور رات کی اور کہیں زمین کی اور کہیں نفس کی؟ اس قسم کے اعتراضوں کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تمام قرآن شریف میں یہ ایک عام سنّت اور عادتِ الٰہی ہے۔ کہ وہ بعض نظری امور کے اثبات و احقاق کے لئے کسی ایسے اُمور کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے خواص کا عام طور پر بیّن اور کھُلا کھُلا اور بدیہی ثبوت رکھتے ہیں۔ پس اُن کی قسم کھانا ان کو بطور دلیل اور نظیر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔ ہم اس اعتراض کا واضح جواب دینے سے پیشتر ایک ضروری امر اَور بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو یاد رہے

[1] العصر : ۲ - ۴

کہ ہم بلحاظ گورنمنٹ کے ہندوستان کو دارُالحرب نہیں کہتے اور یہی ہمارا مذہب ہے اگرچہ اس مسئلہ میں علماء مخالفین نے ہم سے سخت اختلاف کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ ہم کو تکلیف دہی کا انہوں نے باقی نہیں رکھا۔ مگر ہم ان عارضی تکالیف اور آنی ضرر رسانیوں کے خوف سے حق کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ حکومت کے لحاظ سے ہندوستان ہرگز ہرگز دارُالحرب نہیں ہے۔

گورنمنٹ انگریزی کی نصفت شعاری

ہمارا مقدمہ ہی دیکھ لو۔ اگر یہی مقدمہ سکھوں کے عہد حکومت میں ہوتا اور دوسری طرف ان کا کوئی گرو یا برہمن ہوتا۔ تو بدُوں کسی قسم کی تحقیق و تفتیش کے ہم کو پھانسی دے دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر انگریزوں کی سلطنت اور عہد حکومت ہی کی یہ خوبی ہے کہ مقابل میں ایک ڈاکٹر اور پھر مشہور پادری ہے لیکن تحقیقات اور عدالت کی کارروائی میں کوئی سختی کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ کیپٹن ڈگلس نے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کی کہ پادری صاحب کی ذاتی وجاہت یا اُن کے اپنے عہدہ اور درجہ کا لحاظ کیا جاوے چنانچہ اُنہوں نے لیمارچنڈ صاحب سے جو پولیس گورداسپور کے اعلیٰ افسر ہیں یہی کہا کہ ہمارا دل تسلّی نہیں پکڑتا۔ پھر عبدالحمید سے دریافت کیا گیا۔ آخرکار انصاف کی رُو سے ہم کو اس نے بَری ٹھیرایا۔ پھر یہ لوگ ہم کو ارکانِ مذہب کی بجاآوری سے نہیں روکتے۔ بلکہ بہت سے برکات اپنے ساتھ لے کر آئے جس کی وجہ سے ہم کو اپنے مذہب کی اشاعت کا خاطر خواہ موقع ملا۔ اور اس قسم کا امن اور آرام نصیب ہوا کہ پہلی حکومتوں میں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ پھر یہ صریح ظلم اور اسلامی تعلیم اور اخلاق سے بعید ہے کہ ہم ان کے شکر گذار نہ ہوں۔ یاد رکھو۔ انسان جو اپنے جیسے انسان کی نیکیوں کا شکر گذار نہیں ہوتا وہ خدا تعالیٰ کا شکر گذار نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ وُہ اسے دیکھتا ہے۔ تو غیب الغیب ہستی کے انعامات کا شکر گزار کیونکر ہوگا جس کو وہ دیکھتا بھی نہیں۔ اس لئے محض حکومت کے لحاظ سے ہم اس کو دارُالحرب نہیں کہتے۔

ہندوستان دارُالحرب ہے بلحاظ قلم کے

ہاں ہمارے نزدیک ہندوستان دارُالحرب ہے بلحاظ قلم کے۔ پادری لوگوں نے اسلام کے خلاف ایک خطرناک جنگ شروع کی ہوئی ہے۔ اس میدان جنگ میں وہ نیزہ ہائے قلم لے کر نکلے ہیں نہ سنان و تفنگ لے کر۔ اس لئے اس میدان میں ہم کو جو ہتھیار لیکر نکلنا چاہیئے۔ وہ قلم اور صرف قلم ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ایک مُسلمان کا فرض ہے کہ وُہ اس جنگ میں شریک ہو جاوے۔ اللہ اور اس کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم پر وہ دل آزار حملے کیئے جاتے ہیں کہ ہمارا تو جگر پھٹ جاتا اور دل کانپ اُٹھتا ہے۔ کیا اُمّہات المومنین یا دربار مصطفائی کے اسرار جیسی گندی کتاب دیکھ کر ہم آرام کر سکتے ہیں۔ جس کا نام ہی اس طرز پر رکھا گیا ہے۔ جیسے ناپاک ناولوں کے نام ہوتے ہیں۔ تعجّب کی بات ہے کہ دربار لنڈن کے اسرار جیسی کتابیں تو گورنمنٹ کے اپنے علم میں بھی اس قابل ہوں کہ ان کی اشاعت بند کی جائے مگر آٹھ کروڑ مسلمانوں کی دلآزاری کرنے والی کتاب کو نہ روکا جائے۔ ہم خود گورنمنٹ سے اس قسم کی درخواست کرنا ہرگز ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس کو بہت ہی نامناسب خیال کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے اپنے میموریل کے ذریعہ سے واضح کر دیا۔ لیکن یہ بات ہم نے محض اس بنا پر کہی ہے کہ بجائے خود گورنمنٹ کا اپنا فرض ہے کہ وہ ایسی تحریروں کا خیال رکھے۔ بہرحال گورنمنٹ نے عام آزادی دے رکھی ہے کہ اگر عیسائی ایک کتاب اسلام پر اعتراض کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں تو مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ اس کا جواب لکھنے اور عیسائی مذہب کی تردید میں کتابیں لکھنے کا اختیار ہے۔

رسول اللہ کے لئے غیرت

میں حلفاً کہتا ہوں کہ جب کوئی ایسی کتاب نظر پڑتی ہے تو دنیا اور مافیہا ایک مکھی کے برابر نظر نہیں آتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ جس کو وقت پر جوش نہیں آتا کیا وُہ مسلمان ٹھیر سکتا ہے۔ کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہا جائے تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو گالیاں دی جائیں تو ان کی رگِ حمیت میں جنبش بھی نہ آوے اور پرواہ بھی نہ کریں۔ یہ کیا ایمان ہے؟ پھر کس مُنہ سے مر کر خدا کے پاس جائیں گے اگر مسلمانوں کا نمونہ دیکھنا چاہو تو صحابۂ کرامؓ کی جماعت کو دیکھو۔ جنہوں نے اپنے جان و مال کے کسی قسم کے نقصان کی پرواہ نہیں کی۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی رضا کو مقدم کر لیا۔ خدا تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جانا ہی ایک فعل تھا جو سارا قرآن شریف ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے اور رضی اللہ عنہم کا تمغہ ان کو مل گیا۔ پس جب تک تم اپنے اندر وُہ امتیاز وُہ جوش حمیت اسلام کے لئے محسوس نہ کر لو۔ ہرگز اپنے آپ کو کامل نہ سمجھو۔

ہماری جماعت یاد رکھے کہ ہم ہندوستان کو بلحاظ حکومت ہرگز ہرگز دارُ الحرب قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس امن اور برکات کی وجہ سے جو اس حکومت میں ہم کو ملی ہیں۔ اور اس آزادی سے جو اپنے مذہب کے ارکان کی بجا آوری اور اس کی اشاعت کے لئے گورنمنٹ نے ہم کو دے رکھی ہے۔ ہمارا دل عطر کے شیشہ کی طرح وفاداری اور شکر گذاری کے جوش سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پادریوں کی وجہ سے ہم اس کو دارُ الحرب قرار دیتے ہیں۔ پادریوں نے چھ کروڑ کے قریب کتابیں اسلام کے خلاف شائع کی ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ مُسلمان نہیں ہیں جو ان حملوں کو دیکھیں اور سُنیں اور اپنے ہی ہمّ و غم میں مبتلا رہیں۔ اس وقت جو کچھ کسی سے ممکن ہو۔ وہ اسلام کی تائید کے لئے کرے اور اس قلمی جنگ میں اپنی وفاداری دکھائے جبکہ خود عادل گورنمنٹ نے ہم کو منع نہیں کیا ہے کہ ہم اپنے مذہب کی تائید اور غیر قوموں کے اعتراضوں کی تردید میں کتابیں شائع کریں۔ بلکہ پریس، ڈاک خانے اور اشاعت کے دوسرے ذریعوں سے مدد دی ہے۔ تو ایسے وقت میں خاموش رہنا سخت گناہ ہے۔ ہاں ضرورت ہے اس امر کی کہ جو بات پیش کی جاوے۔ وہ معقول ہو۔ اس کی غرض دل آزاری نہ ہو۔ جو اسلام کے لئے سینہ بریاں اور چشم گریاں نہیں رکھتا۔ وہ یاد رکھے کہ خدا تعالیٰ ایسے انسان

کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔ اس کو سوچنا چاہیئے کہ جسقدر خیالات اپنی کامیابی کے آتے ہیں اور جتنی تدابیر اپنی دنیوی اغراض کے لئے کرتا ہے۔ اسی سوزش اور جلن اور دردِ دل کے ساتھ کبھی یہ خیال بھی آیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر حملے ہو رہے ہیں۔ میں ان کے اندفاع کی بھی سعی کروں۔ اور اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو کم از کم پُرسوز دل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور دعا کروں۔ اگر اس قسم کی جلن اور دردِ دل میں ہو تو ممکن نہیں کہ سچی محبت کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ اگر ٹوٹی ہانڈی بھی خریدی جائے تو اس پر بھی رنج ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک سوئی کے گم ہو جانے پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسا ایمان اور اسلام ہے کہ اس خوفناک زمانہ میں کہ اسلام پر حملوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ امن اور آرام کے ساتھ خواب راحت میں سو رہے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہفتہ وار اور ماہواری اخبار ول اور رسالوں کے علاوہ ہر روز وہ کس قدر دو ورقہ اشتہار اور چھوٹے چھوٹے رسالے تقسیم کرتے ہیں جن کی تعداد پچاس پچاس ہزار اور بعض وقت لاکھوں تک ہوتی ہے۔ اور کئی کئی مرتبہ اُن کو شائع کرنے میں کروڑ ہا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ پادریوں کے ذہن اور تصور میں ہندو کچھ چیز نہیں ہیں اور نہ دوسرے مذاہب وغیرہ کی ان کو چنداں پرواہ ہے۔ چنانچہ کبھی نہیں سُنا ہوگا۔ کہ جسقدر کتابیں اسلام کی تردید میں یہ لوگ شائع کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں آدھی بھی ہندو مذہب کے خلاف لکھتے ہوں۔ یہ لوگ دوسرے مذاہب سے چنداں غرض نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ ان میں بجائے خود کوئی حقانیت اور صداقت کی رُوح نہیں ہے۔ وہ عیسویت کی طرح خود مُردہ مذاہب ہیں لیکن اسلام جو ایک زندہ مذہب ہے۔ جو حیٌّ قیّوم خدا کی طرف سے ہے اس کے خلاف سر توڑ کوشش کر کے اس کو بھی مردہ ملت بنانا چاہتے ہیں۔

اسلام کے خلاف تین ہزار اعتراض

چنانچہ میں نے ان کے اعتراضوں کو ایک وقت شمار کیا تھا۔ ان کی تعداد تین ہزار

تک پہنچ چکی ہے۔ اور اَب تو اس میں اَور بھی اضافہ ہوا ہوگا ؛

یاد رکھو مُفتری انسان وسوسہ میں ڈالتا ہے۔ چونکہ ان میں صدق، عفت، راستبازی نہیں ہوتی۔ اس لئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ امرتسری افغانوں کا پکا یقین ہے۔ کہ یہ لوگ تارک الصلوٰۃ ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ جب دوسروں کے سامنے وہ اس قسم کے اعتراض کرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ زادہ ہیں کیا جھوٹ بولیں گے؟ اس سے وہ وسوسہ میں پڑتے ہیں اور مان لیتے ہیں کہ ہاں سچ یہی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ غرض ایک تو پادری ہیں جو کھُلے طور پر اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے اور شائع کرتے ہیں۔ دوسرے انگریزی طرز تعلیم اور کتابوں میں بھی پوشیدہ طور پر زہریلا مادہ رکھا ہوا ہے فلسفی اپنے طرز پر اور مؤرخ اپنے رنگ میں واقعات کو بُری صورت میں پیش کر کے اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس وقت دو ہی قسم کے حملے ہوتے ہیں۔ ایک پادریوں کے اور دوسرے فلسفیوں کے۔ پس اس وقت اپنے اسلام کو ٹٹولنا چاہیئے ؛

قرآن شریف کے جس مقام پر نادانوں نے اعتراض کئے ہیں اسی مقام پر اعلےٰ درجہ کی صداقتوں اور معارف کا ایک ذخیرہ موجود ہے

میں پھر اصل کلام کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ قرآن شریف کی قسموں پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ بڑے غور اور فکر کے بعد یہ راز ہم پر کھُلا ہے کہ قرآن شریف کے جس جس مقام پر کوتہ اندیشوں نے اعتراض کئے ہیں۔ اسی مقام پر اعلیٰ درجہ کی صداقتوں اور معارف کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ جس پر اُن کو اس وجہ سے اطلاع نہیں ملی کہ وہ حق کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور قرآن شریف کو محض اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس پر نکتہ چینی اور اعتراض کریں۔ یاد رکھو۔ قرآن شریف کے دو حصّے ہیں بلکہ تین، ایک تو وہ حصہ ہے جس کو ادنےٰ درجہ کے لوگ بھی جو اُمّی ہوتے ہیں سمجھ سکتے ہیں اور دوسرا وُہ حصہ ہے جو اوسط درجہ کے لوگوں پر کھُلتا ہے۔ اگرچہ وُہ پورے طور پر اُمّی نہیں ہوتے لیکن بہت بڑی استعداد علوم کی بھی

نہیں رکھتے اور تیسرا حصہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو اعلےٰ درجہ کے علوم سے بہرہ ور ہیں۔ اور فلاسفر کہلاتے ہیں۔ یہ قرآن ہی کا خاصہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے آدمیوں کو یکساں تعلیم دیتا ہے۔ ایک ہی بات ہے جو اُمّی اور اوسط درجہ کے آدمی اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفر کو تعلیم دی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم ہر طبقہ کے لئے ہے

یہ قرآن شریف ہی کا فخر ہے کہ ہر طبقہ اپنی استعداد اور درجہ کے موافق فیض پاتا ہے۔ الغرض یہ جو قرآن شریف کی قسم پر اعتراض کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قسم ایک ایسی شے ہے جس کو ایک شاہد کے مفقود ہونے کی بجائے دوسرا شاہد قرار دیا جاتا ہے۔ قانوناً شرعاً۔ عرفاً یہ عام مسلّم بات ہے۔ کہ جب گواہ مفقود ہو اور موجود نہ ہو تو صرف قسم پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ قسم گواہی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کی سنّت قرآن کریم میں اس طرح پر جاری ہے۔ کہ نظریات کو ثابت کرنے کے واسطے بدیہیات کو بطور شاہد پیش کرتا ہے تاکہ نظری اُمور ثابت ہوں۔

قرآن مجید میں نظری اُمور کے اثبات کے لئے اُمور بدیہی کو بطور شاہد کے پیش کیا گیا ہے

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں یہ طرز اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے کہ نظری اُمور کے اثبات کے لئے اُمور بدیہی کو بطور شواہد پیش کرتا ہے اور یہ پیش کرنا قسموں کے رنگ میں ہے۔ اس بات کو بھی ہرگز نہ بھُولنا چاہیئے کہ اللہ جلشانہٗ کی قسموں کو انسانی قسموں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جب قسم کھاتا ہے تو اس کا مدّعا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کو ایک ایسا گواہ رؤیت کا قائم مقام ٹھیراوے کہ جو اپنے ذاتی علم سے اُس کے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر سوچ کر دیکھا جاوے تو قسم کا اصل

مفہوم جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا تھا شہادت ہی ہوتا ہے۔ جب انسان معمولی شاہدوں کے پیش کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو پھر قسم کا محتاج ہوتا ہے۔ تا اس سے وُہ فائدہ اٹھاوے جو ایک شاہد رؤیت کی شہادت سے اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن ایسا تجویز کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ بجُز خدا تعالےٰ کے کوئی اَور بھی حاضر ناظر ہے۔ اور تصدیق یا تکذیب یا سزا دہی یا کسی اَور امر پر قادر ہے بصریح شرک و کُفر ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنی تمام کتابوں میں انسان کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ غیر اللہ کی ہرگز قسم نہ کھاوے۔

اب اس بیان سے معلوم ہوگیا۔ کہ اللہ تعالےٰ کا قسم کھانا کوئی اَور رنگ اور شان رکھتا ہے اور غرض اس سے یہی ہے کہ تا صحیفۂ قدرت کے بدیہیات کو شریعت کے اسرار دقیقہ کے حل و انکشاف کے لئے بطور شاہد پیش کرے۔ اور چونکہ اس مدعا کو قسم سے ایک مناسبت تھی اور وُہ یہ کہ جیسا کہ ایک قسم کھانے والا مثلاً خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اِس واقعہ پر گواہ ہے۔ اسی طرح اور ٹھیک اسی رنگ میں اللہ تعالیٰ کے بعض ظاہر در ظاہر افعال نہاں در نہاں اسرار اور افعال پر بطور گواہ ہیں۔ اس لئے اس نے قسم کے رنگ میں اپنے افعال بدیہیہ کو اپنے افعال نظریہ کے ثبوت میں جابجا قرآن شریف میں پیش کیا۔ اور یہ کہنا سراسر نادانی اور جہالت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے غیر اللہ کی قسم کھائی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ درحقیقت اپنے افعال کی قسم کھاتا ہے نہ کسی غیر کی۔ اور اس کے افعال اس کے غیر نہیں ہیں۔ مثلاً اس کا آسمان یا ستارہ کی قسم کھانا اس قصد سے نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کی قسم ہے بلکہ اس کی منشا یہ ہے کہ جو کچھ اس کے ہاتھوں کی صنعت اور حکمت آسمان اور ستاروں میں موجود ہے اس کی شہادت بعض اپنے افعال مخفیہ کے سمجھانے کے لئے پیش کرے۔

قرآن میں قسموں کی فلاسفی

غرض خدا تعالےٰ کی قسمیں اپنے اندر لامحدُود اسرار معرفت کے رکھتی ہیں جن کو اہلِ

بصیرت ہی دیکھ سکتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ قسم کے لباس میں اپنے قانون قدرت کے بدیہیات کی شہادت اپنی شریعت کے بعض دقائق حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب (قانونِ قدرت) اس کی قولی کتاب (قرآن شریف) پر شاہد ہو جاوے۔ اور اُس کے قول اور فعل میں باہم مطابقت ہو کر طالبِ صادق کے لئے مزید معرفت اور سکینت اور یقین کا مُوجب ہو اور یہ طریق قرآن شریف میں عام ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ برہموؤں اور الہام کے منکروں پر یُوں اتمام حجت کرتا ہے:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ۔ قسم ہے بادلوں کی جن سے مینہ برستا ہے۔ رجع[1] بارش کو بھی کہتے ہیں۔ بارش کا بھی ایک مستقل نظام ہے۔ جیسے نظام شمسی ہے رات اور دن کا، اور کسوف خسوف کا بجائے خود ایک ایک نظام ہے۔ مرض کا بھی ایک نظام ہوتا ہے۔ طبیب اس نظام کے موافق کہہ سکتا ہے کہ فلاں دن بُحران ہوگا۔ غرض یہ نظام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت اپنے اندر ایک ترتیب اور کامل نظام رکھتا ہے اور کوئی فعل اس کا ایسا نہیں ہے جو نظام اور ترتیب سے باہر ہو۔

اللہ تعالیٰ جیسے یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے ڈریں۔ ویسے ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگوں میں علُوم کی روشنی پیدا ہووے اور اس سے وُہ معرفت کی منزلوں کو طے کر جاویں کیونکہ علوم حقہ سے واقفیت جہاں ایک طرف سچّی خشیت پیدا کرتی ہے۔ وہاں دوسری طرف ان علوم سے خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بعض بدقسمت ایسے بھی ہیں۔ جو علُوم میں منہمک ہو کر قضاء و قدر سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے وجُود پر ہی شکوک پیدا کر بیٹھتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو قضاء و قدر کے قائل ہو کر علوم ہی سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ مگر قرآن شریف نے دونوں تعلیمیں دی ہیں۔ اور کامل طور پر دی ہیں۔ قرآن شریف علوم حقہ سے اس لئے واقف کرنا چاہتا ہے اور اس لئے ادھر انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ اس سے خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی معرفت میں جُوں جُوں ترقی ہوتی ہے۔ اسی قدر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس سے

[1] الطارق : ۱۲

محبّت پیدا ہوتی جاتی ہے اور انسان کو قضاء وقدر کے نیچے رہنے کی اس لئے تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کی ذات پر توکّل اور بھروسہ کی صفت پیدا ہو اور وہ راضی برضا رہنے کی حقیقت سے آشنا ہو کر ایک سچی سکینت اور اطمینان جو نجات کا اصل مقصد اور منشاء ہے حاصل کرے ؛

ابھی جو مثال میں نے قرآن شریف سے قسم کے متعلق دی ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ[1] یعنی قسم ہے آسمان کی جس میں اللہ تعالیٰ نے رجع کو رکھا ہے۔ سماء کا لفظ فضا اور جوّ اور بارش اور بلندی کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ رجع بار بار وقت پر آنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ بارش برسات میں بار بار آتی ہے۔ اس لئے اس کا نام بھی رجع ہے۔ اسی طرح پر آسمانی بارش بھی اپنے وقتوں پر آتی ہے۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ[2] اور قسم ہے زمین کی کہ وُہ اُن وقتوں میں پھوٹ نکلتی ہے اور سبزہ نکالتی ہے ؛

بارش کی جڑھ زمین ہے۔ زمین کا پانی جو بُخارات بن کر اُوپر اڑ جاتا ہے وہ کرۂ زمہریر میں پہنچ کر بارش بن کر واپس آتا ہے اور اس صُورت میں چونکہ وُہ آسمان سے آتا ہے۔ اس لئے آسمانی کہلاتا ہے۔ پھر بارش کی ضرورت کے لئے ایک اَور وقت خاص ہے جب مزارعین کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بیائی کے بعد پڑے تو کچھ بھی نہ رہے اور پھر بعض اوقات نشوونما کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ غرض بارش اور مینہ کی ضرورت اور اُس کے مفاد اور اس کے آسمان سے آنے کا نظارہ بالکل بدیہی ہے اور ایک ادنیٰ درجہ کی عقل رکھنے والا گنوار دہقان بھی جانتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر آسمانی بارش نہ ہو تو زمینی پانی بھی خشک ہونے لگتے ہیں چنانچہ امساکِ باراں کے دنوں میں بہت سے کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں اور اکثروں میں پانی بہت ہی کم رہ جاتا ہے لیکن جب آسمان سے بارش آتی ہے تو زمینی پانیوں میں بھی ایک جوش اور تموّج پیدا ہونے لگتا ہے۔ میرا مطلب اس مقام پر اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان قسموں کو ایک اَور امر کے

[1] الطارق: ۱۲ [2] الطارق: ۱۳

لئے بطور شاہد قرار دیا ہے کیونکہ ان نظاروں سے تو ایک معمولی زمیندار بھی واقف ہے اور وُہ امر جوان کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ[1]۔ بیشک یہ خدا کا کلام ہے اور قولِ فصل ہے اور وہ عین وقت پر ضرورت حقّہ کے ساتھ اور حق و حکمت کے ساتھ آیا ہے۔ بیہودہ طور پر نہیں آیا+

نزولِ قرآن کے وقت فسادِ عظیم

اب دیکھ لو کہ قرآن شریف جس وقت نازل ہوا ہے۔ کیا اس وقت نظام روحانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا کا کلام نازل ہو اور کوئی مرد آسمانی آوے جو اس گمشدہ متاع کو واپس دلائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ بعثت کی تاریخ پڑھو تو معلوم ہو جاویگا کہ دنیا کی کیا حالت تھی۔ خدا تعالیٰ کی پرستش دنیا سے اُٹھ گئی تھی اور توحید کا نقشِ پا مٹ چُکا تھا۔ باطل پرستی اور معبُودانِ باطلہ کی پرستش نے اللہ جلشانہ کی جگہ لے رکھی تھی دُنیا پر جہالت اور ظُلمت کا ایک خوفناک پردہ چھایا ہوا تھا۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی ملک، کوئی قطعہ، کوئی سرزمین ایسی نہ رہ گئی تھی۔ جہاں خدائے واحد ہاں حیّ و قیّوم خدا کی پرستش ہوتی ہو۔ عیسائیوں کی مُردہ پرست قوم تثلیث کے چکّر میں پھنسی ہوئی تھی اور ویدوں میں توحید کا بیجا دعویٰ کرنے والے ہندوستان کے رہنے والے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پُجاری تھے۔ غرض خود خدا تعالیٰ نے جو نقشہ اُس وقت کی حالت کا اِن الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2] یہ بالکل سچّا ہے۔ اور اس سے بہتر انسانی زبان اور قلم اس حالت کو بیان نہیں کر سکتی۔ اب دیکھو کہ جیسے خدا تعالےٰ کا قانُون عام ہے کہ عین امساکِ بارش کے وقت آخر اُس کا فضل ہوتا ہے اور بارانِ رحمت برس کر شادابی بخشتا ہے۔ اسی طرح پر ایسے وقت میں ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام آسمان سے نازل ہوتا۔ گویا اس جسمانی بارش کے نظام کو دکھا کر رُوحانی بارش کے نظام کی طرف رہبری کی ہے۔ اب اس سے کون انکار کریگا کہ بارش ہمارے مقاصد کے موافق ہوئی۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ نظام رکھا ہے اسی

[1] الطارق: ۱۴، ۱۵ [2] الروم: ۴۲

طرح دوسری بارشوں کے لئے وقت رکھے ہیں۔ اب دیکھ لو کہ کیا یہ بارشِ رُوحانی کا وقت نہ تھا۔ کس قدر جھگڑے تم لوگوں میں بپا تھے۔ اعمال گندے اور ایمان بھی گندے تھے اور دُنیا ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والی تھی۔ پھر وُہ کیونکر اپنے فضل کا مینہ نہ برساتا جس نے جسمِ فانی کی حفاظت کے لئے ایک خاص نظام رکھا ہے۔ پھر رُوحانی نظام کو کیونکر چھوڑتا۔ اس لئے بارش کے نظام کو بطور شاہد پیش کر کے قسم کے رنگ میں استعمال کیا۔ کیونکہ امرِ نبوّت ایک رُوحانی اور نظری امر تھا اور کفارِ عرب اس نظام کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے وہ پہلا نظام پیش کر کے اُن کو سمجھا دیا۔

یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کی تفسیر

غرض یہ ایک سِرّ ہے جس کو جاہلوں نے سمجھا نہیں اور اپنی نادانی اور عداوتِ حق کی بنا پر اعتراض کر دیا ہے۔ اصل مفہوم کو جو اللہ تعالیٰ نے اس میں مقصود رکھا تھا چھوڑ دیا۔ اسی طرح پر ایک نادان کہتا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا[1] (کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ گویا معاذ اللہ خدا بھوکا ہے۔ احمق نہیں سمجھتا۔ کہ اس سے بھوکا ہونا کہاں سے نکلتا ہے۔ یہاں قرض کا مفہوم اصل تو یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کے واپس کرنے کا وعدہ ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ افلاس اپنی طرف سے لگا لیتا ہے۔ یہاں قرض سے مراد یہ ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو اعمالِ صالحہ دے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی جزا اُسے کئی گُنا کر کے دیتا ہے۔ یہ خدا کی شان کے لائق ہے جو سلسلہ عبُودیّت کا ربُوبیّت کے ساتھ ہے۔ اس پر غور کرنے سے اس کا یہ مفہُوم صاف سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بدُوں کسی نیکی، دُعا اور التجا اور بدُوں تفرقہ کافر و مومن کے ہر ایک کی پرورش فرما رہا ہے اور اپنی ربوبیّت اور رحمانیّت کے فیض سے سب کو فیض پہنچا رہا ہے۔ پھر وُہ کسی کی نیکیوں کو کب ضائع کریگا۔ اُس کی شان تو یہ ہے۔ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ[2]۔ جو ذرّہ بھی نیکی کرے اس کا بھی اجر دیتا ہے اور جو ذرّہ بدی کرے گا۔ اس کی پاداش بھی ملے گی۔ یہ ہے قرض کا اصل

[1] البقرۃ : ۲۴۶ [2] الزلزال : ۸

مفہوم جو اس آیت سے پایا جاتا ہے۔ چونکہ اصل مفہوم قرض کا اس سے پایا جاتا تھا۔ اس لئے یہی کہہ دیا۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا[1] اور اس کی تفسیر اس آیت میں موجود ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ[2] جاہل عیسائی جنہوں نے ایک عاجز اور ناتواں انسان کو خدا بنا لیا ہے اور اپنی بدکاریوں اور گناہوں کی گٹھڑی اُس کے سر پر رکھ دی ہے۔ اور اُسے ملعون تسلیم کیا ہے۔ باوجودیکہ اُن کے پاس لعنت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی پاک شریعت کو کفّارہ کی بنا پر رد کر چکے ہیں۔ اعمالِ صالحہ میں جو ایک لذّت اور سرُور ہوتا ہے وُہ انہیں حاصل نہیں رہا اور خدا تعالیٰ کے سارے راستبازوں کو بٹمار اور ڈاکو قرار دینے کی وجہ سے ان پر ایک لعنت پڑی ہے۔ اس لئے یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے راستبازوں کا انکار اور تکذیب ایک ایسی شَے ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور اُس کی رُوحانی طاقتوں اور قوتوں کے لئے زہرِ قاتل کا کام کرتی ہے۔ جو صادق کی نسبت سُوءِ ظن کرتا ہے اور اس کی بے ادبی کرتا ہے وہ حقایق اور معارف سے بے نصیب کر دیا جاتا ہے۔ یہ لعنت عیسائیوں پر پڑی ہے کہ انہوں نے سارے راستبازوں کو خطاکار ٹھیرایا ۔

غرض اس آیت میں یہ لطیفہ ہے کہ بارشوں کا جسمانی طور پر ایک نظام ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ اب بارش کے دن قریب ہیں۔ مثلاً یہ جانتے ہیں کہ پوہ اور ماگھ کے دنوں میں بارش ہوتی ہے اور ساون اور بھادوں کے دنوں میں ہوتی ہے۔ پھر ایک یہ راز ہے کہ بارش بیہودہ کبھی نہیں ہوتی۔ درحقیقت وُہی اوقات بارش کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر روحانی بارشوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ یہ ایک نظری بحث ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے موٹی موٹی باتوں کو بطور شواہد کے پیش کیا ہے اور قسم کا لفظ شاہد کا قائم مقام بیان فرمایا۔ اس لفظ کو اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح پر قرض کے لفظ کو جسے میں ابھی بیان کر چکا ہُوں ۔

◆ ◆ ◆

[1] البقرۃ : ۲۴۶ [2] الزلزال : ۸

ولایت نبوّت کے لئے بطور میخ کے ہوتی ہے

اب ایک بات اَور قابلِ غور ہے کہ ایک بارش تخم ریزی کے لئے ہوتی ہے۔ اور پھر ایک بارش اس تخم کے نشوونما اور سرسبزی کے لئے ہوتی ہے۔ اسی طرح پر نبوّت کی بارش تخم ریزی کے لئے ہوتی ہے اور محدّثین اور مجدّدین کی بارش جو اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ[1] کے ضمن میں داخل ہیں۔ اس تخم کے بارور کرنے اور نشوونما دینے کے لئے۔ میں نے بارہا اس امر کا ذِکر کیا ہے کہ نبوّت الُوہیّت کے لئے بطور میخ کے ہوتی ہے۔ جو شخص نبوّت کا اِنکار کرتا ہے، رفتہ رفتہ وہ الُوہیّت کے انکار تک پہنچ جاتا ہے اور نبوّت کیلئے ولایت بطور میخ کے ہوتی ہے۔ ولی کے انکار سے رفتہ رفتہ سلب ایمان ہو جاتا ہے ؎

اس وقت دیکھو کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کو تیرہ سَو برس سے زائد عرصہ گذر گیا۔ اگر خدا تعالیٰ اس وقت تک بالکل خاموش رہتا اور اپنی تجلّی نہ فرماتا تو اسلام ایک قِصّہ اور کہانی سے بڑھ کر کوئی وُقعت نہ رکھتا۔ اور اس کو دوسرے مذاہب پر کوئی خصوصیّت اور فضیلت نہ ہوتی۔ جیسے ہنُدو اپنے بزرگوں سے منسُوب خوارق کو پرُانوں اور شاستروں میں لکھا ہوا بیان کرتے ہیں اور دکھا کچھ نہیں سکتے۔ اسی طرح پر اسلام کے اعجازی نشانوں کا ذِکر مُسلمان انہی کتابوں ہی میں بتاتے اور دکھا کچھ نہ سکتے، تو دوسرے مذاہب پر اس کو کیا فضیلت رہتی اور انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اگر اسے دوسرے پر کوئی فضیلت نظر نہ آئے تو اس سے بے رغبتی اور بے دلی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح پر گویا اسلام سے ایک قسم کا ضُعفِ ایمان پیدا ہوتا ہے کیونکہ بدُوں فضیلت کے ایمان قوی رہ سکتا ہی نہیں۔ اس لئے نبوت کی زراعت کے واسطے ولایت ایک باڑ لگا دی گئی ہے۔ پس غور کر کے دیکھو کہ قسم پر اعتراض کرنے والوں کا جواب کیسا صاف اور لطیف ہے ؎

مفارقت میں کشش

اس مضمون کو دیکھ کر انسان کس قدر انشراح کے ساتھ قبول کر سکتا ہے کہ قرآن کریم

[1] الحجر: ۱۰

کس قدر عالی مضامین کو کیسے انداز اور طرز سے بیان کرتا ہے۔ پھر قرآن شریف میں ایک مقام پر رات کی قسم کھائی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت کی قسم ہے جب وحی کا سلسلہ بند تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک مقام ہے جو ان لوگوں کے لئے جو سلسلۂ وحی سے افاضہ حاصل کرتے ہیں آتا ہے۔ وحی کے سلسلہ سے شوق اور محبّت بڑھتی ہے لیکن مفارقت میں بھی ایک کشش ہوتی ہے جو محبّت کے مدارجِ عالیہ پر پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کو بھی ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس سے قلق اور کرب میں ترقی ہوتی ہے اور رُوح میں ایک بیقراری اور اضطراب پیدا ہوتا ہے جس سے وُہ دُعاؤں کی رُوح اس میں نفخ کی جاتی ہے کہ وہ آستانۂ اُلوہیت پر یا رب یا رب کہہ کر اور بڑے جوش اور شوق اور جذبہ کے ساتھ دوڑتی ہے۔ جیسا کہ ایک بچّہ جو تھوڑی دیر کے لئے ماں کی چھاتیوں سے الگ رکھا گیا ہو۔ بے اختیار ہو ہو کر ماں کی طرف دوڑتا اور چلّاتا ہے۔ اسی طرح پر بلکہ اس سے بھی بیحد اضطراب کے ساتھ رُوح اللہ کی طرف دوڑتی ہے اور اس دَوڑ دھوپ اور قلق و کرب میں وہ لذّت اور سرور ہوتا ہے جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو۔ رُوح میں جس قدر اضطراب اور بے قراری خدا تعالےٰ کے لئے ہوگی۔ اسی قدر دُعاؤں کی توفیق ملیگی اور اُن میں قبولیّت کا نفخ ہوگا۔ غرض یہ ایک زمانہ ماموروں اور مُرسلوں اور اُن لوگوں پر جن کے ساتھ مکالماتِ الٰہیہ کا ایک تعلق ہوتا ہے آتا ہے اور اس سے غرض اللہ تعالیٰ کی یہ ہوتی ہے کہ تا ان کو محبّت کی چاشنی اور قبولیّتِ دُعا کے ذَوق سے حصّہ دے اور اُن کو اعلیٰ مدارج پر پہنچا دے تو یہاں جو ضحیٰ اور لیل کی قسم کھائی۔ اس میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مدارج عالیہ اور مراتبِ محبّت کا اظہار ہے اور آگے پیغمبر خدا کا ابراء کیا کہ دیکھو دن اور رات جو بنائے ہیں۔ ان میں کس قدر وقفہ ایک دوسرے میں ڈال دیا ہے۔ ضحیٰ کا وقت بھی دیکھو اور تاریکی کا وقت بھی خیال کرو۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ[1]۔ خدا تعالیٰ نے تجھے رخصت نہیں کر دیا۔ اس نے تجھ سے کینہ نہیں کیا بلکہ ہمارا یہ ایک قانون ہے۔ جیسے رات اور دن کو بنایا ہے اسی

---

[1] الضحیٰ : ۴

طرح انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ایک قانون ہے کہ بعض وقت وحی کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن میں دُعاؤں کے لئے زیادہ جوش پیدا ہو۔ اور ضحیٰ اور لیل کو اس لئے بطور شاہد بیان فرمایا۔ تا آپؐ کی اُمید وسیع ہو اور تسلّی اور اطمینان پیدا ہو۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کے بیان کرنے سے اصل مدعا یہ رکھا ہے کہ تا بدیہات کے ذریعہ نظریات کو سمجھا دے۔ اب سوچ کر دیکھو کہ یہ کیسا پُرحکمت مسئلہ تھا۔ مگر ان بدبختوں نے اس پر بھی اعتراض کیا

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عَیب نماید ہُنرش در نظر

قوتِ متفکّرہ سے کام لینا چاہیئے

اِن قسموں میں ایسا فلسفہ بھرا ہوا ہے کہ حکمت کے اَبواب کھلتے ہیں۔ غرض یہ حرب ہمارا کام ہے جس کی آج ضرورت ہے۔ اس سے علوم کے دروازے بھی کھلتے ہیں اور مخالف بھی حُجّت اور بیّنہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور یہ خدا کا فضل ہے کہ پنجاب کے لوگ جن معارف اور حقایق سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ بلاد شام اور دیگر ممالک اسلامیہ میں ان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم پر تو یہ مصیبت آچکی ہے۔ ہر طرف سے حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم کو قوت متفکّرہ سے کام لینا پڑتا ہے اور دُعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے حضور ان مشکلات کو پیش کرنا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہماری دستگیری فرماتا ہے اور اپنی پاک کتاب کے حقایق اور معارف سے اطلاع دیتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ جس قوت کو چالیس دن استعمال نہ کیا جائے وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک ماموں صاحب تھے وہ پاگل ہو گئے۔ ان کی فصد لی گئی اور ان کو تاکید کی گئی کہ ہاتھ نہ ہلائیں۔ انہوں نے چند مہینے تک ہاتھ نہ ہلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ لکڑی کی طرح ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ جس عضو سے کام نہ لیا جائے وُہ بیکار ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں جوگی اور ایسا ہی راہب وغیرہ جو عورتوں کے قابل نہیں رہتے۔ اس کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا تو بد معاشیوں کی کثرت کی وجہ سے یا انقطاعِ کُلّی کے بعد۔ اور

اس امر کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ جن اعضاء کو بیکار چھوڑا گیا۔ وہ آخر بالکل نکمے ہو گئے۔

ہمارا فرض

اِس وقت ہم پر قلم کی تلواریں چلائی جاتی ہیں۔ اور اعتراضوں کے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی قوتوں کو بیکار نہ کریں اور خدا کے پاک دین اور اس کے برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے لئے اپنی قلموں کے نیزوں کو تیز کریں خصوصاً ایسی حالت میں کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے بڑھ کر ہم کو یہ موقع دیا کہ اس نے سلطنت انگریزی میں ہم کو پیدا کیا۔ مُحسن کے احسانات کی شکر گزاری کے اصُول سے ناواقف جاہل ہمارے اس قسم کے بیانات اور تحریروں کو خوشامد کہتے ہیں۔ مگر ہمارا خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم دُنیا میں کسی انسان کی خوشامد کر سکتے ہی نہیں۔

احسان کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہے

یہ قوت ہی ہم میں نہیں ہے۔ ہاں احسان کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہے۔ اور مُحسن کُشی اور غدّاری کا ناپاک مادہ اُس نے اپنے فضل سے ہم میں نہیں رکھا۔ ہم گورنمنٹ انگلشیہ کے احسانات کی قدر کرتے ہیں اور اس کو خدا کا فضل سمجھتے ہیں کہ اس نے ایک عادل گورنمنٹ کو سِکھّوں کے پُر جفا زمانہ سے نجات دلانے کے لئے ہم پر حکومت کرنے کو کئی ہزار کوس سے بھیج دیا۔ اگر اس سلطنت کا وجُود نہ ہوتا۔ تو میں سچ کہتا ہوں کہ ہم اس قسم کے اعتراضوں کی بابت ذرا بھی سوچ نہ سکتے۔ چہ جائیکہ ہم اُن کا جواب دے سکتے۔

اب ہم اُن اعتراضوں کا جواب بڑی آزادی سے دے سکتے ہیں۔ پھر اگر ہم اللہ تعالےٰ کے اس فضل کی قدر نہ کریں تو یقیناً سمجھو کہ بڑے ناقدر شناس اور ناشکر گذار ہونگے ہم کو غور اور فکر کا موقع ملا۔ دُعاؤں کا موقعہ ملا۔ اور اس طرح پر خدا تعالیٰ نے اپنے فضل کے ابواب ہم پر کھولے۔ اگرچہ مبداء فیض وُہی ہے لیکن انسان اپنے میں ایک شَئے قابل بناتا ہے۔

اس پر بلحاظ اس کی استعداد اور ظرف کے فیض ملتا ہے یہ خوشی کی بات ہے کہ اس تقریب کی وجہ سے ہندوستان اور پنجاب کے رہنے والے جوہر قابل بن رہے ہیں اور ان کی علمی طاقتیں بھی ترقی کر رہی ہیں +

جس قسم کے ہتھیار میدان میں لائے گئے ویسے ہی ہتھیار لے کر نکلنا چاہیئے

مختصر یہ کہ یہ مقام دارالحرب ہے پادریوں کے مقابلہ میں۔ اس لیے ہمکو چاہیئے کہ ہرگز بیکار نہ بیٹھیں۔ مگر یاد رکھو کہ ہماری حرب اُن کے ہمرنگ ہو۔ جس قسم کے ہتھیار لے کر میدان میں وُہ آئے ہیں۔ اُسی طرز کے ہتھیار ہم کو لے کر نکلنا چاہیئے۔ اور وُہ ہتھیار ہے **قلم**۔

الہام سُلطان القلم۔ ذوالفقار علی

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس عاجز کا نام **سلطان القلم** اور میرے قلم کو **ذوالفقار علی** فرمایا +

اس میں یہی سِر ہے کہ یہ زمانہ جنگ و جدل کا نہیں ہے۔ بلکہ **قلم** کا زمانہ ہے۔ پھر جب یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ حقایق اور معارف کے دروازوں کے کھلنے کے لئے ضرورت ہے **تقویٰ** کی۔ اس لئے **تقویٰ** اختیار کرو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ[1]۔ اور میں گن نہیں سکتا کہ یہ الہام مجھے کتنی مرتبہ ہوا ہے۔ بہت ہی کثرت سے ہوا ہے۔

فتح چاہتے ہو تو مُتقی بنو

اگر ہم نری باتیں ہی باتیں کرتے ہیں تو یاد رکھو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ فتح کے لئے ضرورت ہے تقویٰ کی۔ فتح چاہتے ہو۔ تو متقی بنو +

میں ہندوؤں اور عیسائیوں میں دیکھتا ہوں کہ عورتیں بھی بہت بڑی جائیدادیں اور

[1] النحل : ۱۲۹

روپیہ اس کام کے لئے وصیت کر جاتے ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں میں اس قسم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

اشاعت کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہے

ہمارے لئے جو بڑی سے بڑی مشکل ہے وُہ اشاعت کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہے۔ یہ تو تم یاد رکھو کہ آخر خدا تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اُس نے اِس سِلسِلہ کو قائم کیا ہے۔ وُہ خود ہی اس کا حامی و ناصر ہے۔ لیکن وُہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں کو ثواب کا مستحق بنادے۔ اس لئے نبیوں کو مالی امداد کی ضرورت ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدد مانگی اُسی طرز پر جو منہاج نبوت کی طرز ہے۔ ہم بھی اپنے دوستوں کو سِلسِلہ کی ضروریات سے اطّلاع دیا کرتے ہیں۔ مگر مَیں پھر یہی کہوں گا کہ اگر ہم کچھ روپیہ بھی اشاعت کے لئے جمع کرلیں۔ تو یہ تو ظاہر بات ہے کہ اس قدر نہیں کرسکتے۔ جس قدر پادریوں کے پاس ہے اور اگر اتنا بھی کرلیں تو بھی میرا ایمان یہی ہے کہ فتح اسی کو ملتی ہے جس سے خدا خوش ہو۔

ہمارے لئے اپنے اخلاق اور اعمال میں ترقی کرنا ضروری ہے

اس لئے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور اعمال میں ترقی کریں اور تقویٰ اختیار کریں تاکہ خدا تعالیٰ کی نُصرت اور محبّت کا فیض ہمیں ملے۔ پھر خدا کی مدد کو لے کر ہمارا فرض ہے اور ہر ایک ہم میں سے جو کچھ کرسکتا ہے اس کو لازم ہے کہ وُہ ان حملوں کے جواب دینے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ ہاں جواب دیتے وقت نیّت یہی ہو کہ خدا تعالےٰ کا جَلال ظاہر ہو۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۰-۲۲ پرچہ ۱۹۰۱ء)

جنوری ۱۸۹۸ء۔ فرمایا:- لوگ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ یہ تو کہہ جاتے ہیں کہ دین کو دُنیا پر ترجیح دوں گا۔ لیکن یہاں سے جا کر اس بات کو بھول جاتے ہیں وُہ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اگر وُہ یہاں نہ آویں گے۔ دُنیا نے ان کو پکڑ رکھا ہے۔ اگر دین کو دنیا پر ترجیح ہوتی۔ تو وہ دُنیا سے فرصت پاکر یہاں آتے۔ (بدر۔ جلد ۱۱ نمبر ۴-۵ صہ ۳ پرچہ ۱۶ ر نومبر ۱۹۱۱ء)

یکم فروری ۱۸۹۸ء۔ "آج تیسرا روز ہے۔ الہام ہوا کہ یَوْمَ تَاْتِیْکَ الْغَاشِیَۃُ۔ یَوْمَ تَنْجُوْا کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ۔ یعنی ایک خوفناک غشی ڈالنے والا۔ انسان کو چاروں طرف سے گھیرنے والا وقت آنے والا ہے۔ اس وقت ہر ایک شخص اپنے اعمال کے سبب سے نجات پائے گا۔ اس وقت ہم ہر ایک شخص کو اس کے اعمال کے موافق جزا دیں گے۔"

حضرت اقدسؑ نے اِن الہامات کے بعد جماعت کو بڑی تاکید کی کہ تیاری کرو۔ نمازوں میں عاجزی کرو۔ تہجّد کی عادت ڈالو۔ تہجد میں رو رو کر دُعائیں مانگو کہ خدا تعالےٰ گڑگڑانے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کو ضائع نہیں کرتا۔

ہمارے مُبارک امام علیہ السلام بھی بار بار یہی وصیّت فرماتے ہیں کہ جماعت متقی بن جاوے اور نمازوں میں خشوع وخضوع کی عادت کریں۔ اور ایک روز بڑے درد سے فرمایا کہ اصلاح وتقویٰ پیدا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم میری راہ میں روک بن جاؤ۔

(منقول از خط مولوی عبد الکریم صاحبؓ۔ محررہ ۴ر فروری ۱۸۹۸ء۔ مندرجہ الحکم جلد ۲ ع ۲ صفحہ ۱۰ پرچہ ۶ر مارچ ۱۸۹۸ء)

غفلت، شکوک وشبہات اور نفسانی ظلمتوں کا علاج

بابو محمد افضل صاحب نے ہندوستان سے افریقہ کی طرف روانگی کے موقعہ پر حضرت مسیح موعودؑ سے عرض کی کہ بعض غفلت کے مقامات سے وُہ شکوک وشبہات ونفسانی ظلمتوں کا ایک دریا ہمراہ لائے تھے۔ اور اب پھر اُنہی مقامات کو جانا ہے۔ اس لئے دُعا کی جائے۔ حضرت اقدسؑ نے ایسی مشکلات سے نکلنے کے لئے مندرجہ ذیل چار امر بطور علاج بتائے:-

(۱) قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہنا۔ (۲) موت کو یاد رکھنا۔ (۳) سفر کے حالات قلمبند کرتے رہنا۔ (۴) اگر ممکن ہو تو ہر روز ایک کارڈ لکھتے رہنا۔

(الحکم جلد ۲ ع ۸ و ۹ صہ ۱۲ پرچہ ۱۳ و ۲۰۔ اپریل ۱۸۹۸ء)

دعائیہ کلمات فرمودہ حضرت مسیح موعودؑ

پاک کلماتِ دعائیہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک ہونٹوں سے نکلے ہوئے ہیں:۔

" اے رب العالمین! تیرے احسانوں کا میں شکر نہیں کر سکتا۔ تو نہایت ہی رحیم و کریم ہے اور تیرے بے غایت مجھ پر احسان ہیں۔ میرے گناہ بخش تا میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔ میرے دل میں اپنی خالص محبت ڈال تا مجھے زندگی حاصل ہو اور میری پردہ پوشی فرما۔ اور مجھ سے ایسے عمل کرا جن سے تو راضی ہو جائے۔ میں تیری وجہ کریم کے ساتھ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر وارد ہو۔ رحم فرما۔ اور دنیا اور آخرت کی بلاؤں سے مجھے بچا کہ ہر ایک فضل و کرم تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ آمین۔ ثم آمین"

(الحکم جلد ۲ ۱ صفحہ ۹۔ پرچہ ۲۰ فروری ۱۸۹۸ء)

حضرت اقدسؑ کی پاک باتیں

۵ فروری ۱۸۹۸ء۔ (۱) دُعا کے بعد جلدی جواب ملے۔ تو عمُوماً اچھا نہیں ہوتا۔ توقّف کامیابی کا موجب ہوتا ہے۔

" " " (۲) خدا تعالیٰ کا بظاہر تلوّن بھی رحمت ہے۔

۲۲۔ فروری ۱۸۹۸ء۔ (۳) دُنیا کی دولت، سلطنت اور شوکت رشک کا مقام نہیں ہے۔ مگر رشک کا مقام دُعا ہے۔

۲۳۔ فروری ۱۸۹۸ء۔ (۴) یہ مُلک بہت ہی قابل رحم ہے۔ اسلام صرف رسمی طور پر رہ گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ہے جو اپنا نذیر اس مُلک

میں بھیجا۔ اگر کوئی حاملہ عورت مرجاتی ہے تو ہندوؤں کی طرح اس کی قبر کے گرد کیلیں ٹھونکتے پھرتے ہیں۔ ملاں صاحب اس کام کے لئے سوا روپیہ لیتے ہیں۔ ان کا یہ حال ہے۔ کہ کوئی کچھ کرالے مگر اجرت دیدے۔ یہاں تک کہ مکرر نکاح پڑھا دیتا ہیں ٭

۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء۔ (۵) مرید و مرشد کے تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ ماں باپ، اولاد کو اتنا عزیز نہیں سمجھتے جتنا مرشد مرید کو جانتا ہے۔ ماں باپ جسمانی تربیت اور تعلیم کے لئے کوششیں کرتے ہیں مگر مرشد مرید کی روحانی پیدائش کا موجب ہوتا ہے اور اس کی اندرونی تعلیم اور تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے بشرطیکہ راستباز ہو اگر ریاکار اور دھوکہ باز ہو تو وہ دشمن سے بھی بدتر ہوتا ہے ٭

(الحکم جلد ۳ عنـ۲ ـ پرچہ ۹ر جون ۱۸۹۹ء)

فروری ۱۸۹۸ء:۔

کثرت ازدواج

کثرت ازدواج کے متعلق صاف الفاظ قرآن کریم میں دو دو، تین تین، چار چار کرکے ہی آئے ہیں۔ مگر اسی آیت میں اعتدال کی بھی ہدایت ہے۔ اگر اعتدال نہ ہو سکے اور محبت ایک طرف زیادہ ہو جائے یا آمدنی کم ہو اور یا قوائے رجولیت ہی کمزور ہوں تو پھر ایک سے تجاوز کرنا نہیں چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے کہ انسان اپنے تئیں ابتلا میں نہ ڈالے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ[1] ٭

حلال پر بھی ایسا زور نہ مارو کہ نفس پرست ہی بن جاؤ

غرض اگر حلال کو حلال سمجھ کر بیویوں ہی کا بندہ ہو جاوے۔ تو بھی غلطی کرتا ہے ہر ایک

[1] البقرۃ: ۱۹۱

شخص اللہ تعالیٰ کی منشاء کو نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کا یہ منشاء نہیں کہ بالکل زن مُرید ہو کر نفس پرست ہی ہو جاؤ۔ اور وُہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ رہبانیت اختیار کرو بلکہ اعتدال سے کام لو اور اپنے تئیں بے جا کارروائیوں میں نہ ڈالو ❖

انبیاءؑ کے ساتھ خاص مراعات قابل اعتراض نہیں

انبیاء علیہم السّلام کے لئے کوئی نہ کوئی تخصیص اگر اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے۔ تو یہ کوتاہ اندیش لوگوں کی ابلہ فریبی اور غلطی ہے کہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ دیکھو توریت میں کاہنوں کے فرقہ کے ساتھ خاص مراعات ملحوظ رکھی گئی ہیں اور ہندوؤں کے برہمنوں کے لئے خاص رعائتیں ہیں۔ پس یہ نادانی ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی کسی تخصیص پر اعتراض کیا جاوے۔ ان کا نبی ہونا ہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جو اور لوگوں میں موجود نہیں ❖

خدا کا تلوّن بھی رحمت ہے۔ دیکھو یُونس علیہ السلام کی قوم کے معاملہ میں قطعی الہام دے کر جب لوگوں نے چیخنا چلّانا شروع کیا تو عذاب ٹلا دیا۔ اور رحمت کے ساتھ ان پر نگاہ کی۔ پس خدا کے تلوّن میں بھی ایک خاص لُطف ہے۔ مگر اس کو وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں۔ جو اس کے سامنے روتے اور عجز و نیاز ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے بارہا تعجّب آتا ہے۔ کہ لوگ اپنے جیسے انسان کی خوشامد تو کرتے ہیں۔ مگر افسوس خدا کی خوشامد نہیں کرتے ❖

قبولیّت دُعا میں توقّف کامیابی کا مُوجب ہے

یہ یاد رکھو کہ دُعا کے لئے اگر جلدی جواب مل جاوے تو عموماً اچھا نہیں ہوتا۔ پس دُعا کرتے نا امید نہ ہو۔ دُعا میں جس قدر دیر ہو اور اس کا بظاہر کوئی جواب نہ ملے تو خوش ہو کر سجدۂ شکر بجا لاؤ کیونکہ اس میں بہتری اور بھلائی ہے۔ توقّف کامیابی کا موجب ہوتا ہے ❖

رونا اور صدقات فردِ قرار دادِ جُرم کو رَدّ کر دیتے ہیں

دُعا بہت بڑی سپر کامیابی کے لئے ہے۔ یُونسؑ کی قوم گریہ و زاری اور دُعا کے

سبب آنے والے عذاب سے بچ گئی۔ میری سمجھ میں مخاضبت مغاضبت کو کہتے ہیں۔ اور حُوت مچھلی کو کہتے ہیں اور نُون تیزی کو بھی کہتے ہیں اور مچھلی کو بھی۔ پس حضرت یونسؑ کی وُہ حالت ایک مغاضبت کی تھی۔ اصل یُوں ہے کہ عذاب کے ٹل جانے سے ان کو شکوہ اور شکایت کا خیال گزرا کہ پیشگوئی اور دُعا یوں ہی رائیگاں گئی اور یہ بھی خیال گزرا۔ کہ میری بات پُوری کیوں نہ ہوئی۔ پس یہی مغاضبت کی حالت تھی۔ اس سے ایک سبق ملتا ہے کہ تقدیر کو اللہ بدل دیتا ہے اور رونا دھونا اور صدقات فردِ قرار دادِ جُرم کو بھی ردّی کر دیتے ہیں۔ اصُول خیرات کا اسی سے نکلا ہے۔ یہ طریق اللہ کو راضی کرتے ہیں۔ علم تعبیر الرؤیا میں مال کلیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے خیرات کرنا جان دینا ہوتا ہے۔ انسان خیرات کرتے وقت کس قدر صِدق وثبات دکھاتا ہے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ صرف قیل وقال سے کچھ نہیں بنتا۔ جبتک کہ عملی رنگ میں لا کر کسی بات کو نہ دکھایا جاوے۔ صدقہ اس کو اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ صادقوں پر نشان کر دیتا ہے۔ حضرت یونسؑ کے حالات میں درِ منثور میں لکھا ہے۔ کہ آپ نے کہا۔ کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ جب تیرے سامنے کوئی آوے گا۔ تجھے رحم آجائے گا۔ ع

این مُشتِ خاک را گر نہ بخشم چہ کُنم

مُنشی رستم علی کورٹ انسپکٹر دہلی کے خواب کی تعبیر میں فرمایا۔ کہ نماز عید شہر میں پڑھنا بہت بڑی کامیابی ہے ؎

سورۂ تبّت پر ایک نکتہ

ابُولہب قرآن کریم میں عام ہے نہ خاص۔ مُراد وہ شخص ہے جس میں التہاب و اشتعال کا مادّہ ہو۔ اسی طرح حمالۃ الحطب۔ ہیزم کش عورت سے مراد ہے۔ جو سُخن چین ہو۔ آگ لگانے والی چغلخور عورت آدمیوں میں شرارت کو بڑھاتی ہے۔ سعدی کہتا ہے۔ ع

سُخن چین بدبخت ہیزم کش است

سُورۂ تبت پر اعتراض سُنکر فرمایا:- **رشک کا مقام دُعا ہے**

دُنیا کی دولت اور سلطنت رشک کا مقام نہیں۔ مگر رشک کا مقام دُعا ہے میں نے اپنے احباب حاضرین۔ اور غیر حاضرین کے لئے جن کے نام یاد آئے یا شکل یاد آئی۔ آج بہت دُعا کی اور اتنی دُعا کی کہ اگر خشک لکڑی پر کی جاتی تو سر سبز ہو جاتی ہمارے احباب کے لئے یہ بڑی نشانی ہے۔

رمضان کا مہینہ الحمدللہ گزر گیا۔ عافیت اور تندرستی سے یہ دن حاصل ہوئے پھر اگلا سال خدا جانے کس کو آئے گا۔ کس کو معلوم ہے کہ اگلے سال کون ہو گا۔ پھر کس قدر افسوس کا مقام ہو گا۔ اگر اپنی جماعت کے ان لوگوں کو فراموش کر دیا جاوے جو انتقال کر گئے ہیں۔ یہ ایسے وقت میں فرمایا کہ جب فہرست میں زندوں کے نام ثبت ہو رہے تھے۔

ظاہر پرستی گمراہی کا موجب ہے

ظاہر پرستی سے یہود گمراہ ہو گئے۔ ظاہر پرستی سے یہودیوں پر یہ آفت آئی۔ کہ وہ مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے رہے اور نہ صرف یہی بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی انکار کرتے رہے۔ اُن کو یہ خیال تھا کہ مسیح آئیگا تو ایک بادشاہ ہو کر آئیگا اور بڑی شان و شوکت سے تختِ داؤد پر جلوہ افروز ہو گا اور اس کے آنے سے پیشتر ایلیا آسمان سے اُترے گا۔ مگر جب مسیح آیا۔ تو اس نے ایلیا تو یوحنا کو بتایا اور آپ بجائے بادشاہ ہونے کے ایسی عاجزی دکھائی کہ سر رکھنے کو بھی جگہ نہ ملی۔ اب ظاہر پرست یہودی کیونکر مان لیتے۔ پس اُنہوں نے بڑے زور سے انکار کیا اور اب تک کر رہے ہیں۔ یہی مصیبت ہمارے زمانہ کے مولویوں اور ملّاؤں کو پیش آئی۔ وہ منتظر ہیں کہ مسیح اور مہدی آکر لڑائیاں کریگا مگر خدا تعالیٰ نے یہ امر ہی ملحوظ نہ رکھا تھا۔ اور بخاری نے یضع الحرب کہہ کر اس کا قضیہ ہی چکا دیا تھا۔ یہ امن اور سلامتی کے خواستگار کو ماننا نہیں چاہتے۔ (الحکم جلد ۲ پرچہ ۱۲ مارچ ۱۸۹۸ء)

فروری ۱۸۹۸ئہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ باوجود مصائب پر مصائب آنے کے اور ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دینے کے لوگ ابھی تک سنگدلی اور عُجب و نخوت سے کام لے رہے ہیں۔ نادان کب تک اس بیفکری میں بسر کریں گے۔ تا وقتیکہ لوگ ضِد نہیں چھوڑتے اپنی بُری کرتوتوں سے باز نہیں آتے اور خدا تعالیٰ سے مصالحت نہیں کرتے۔ یہ بلائیں اور مصیبتیں دُور نہیں ہونے کی۔ میں نے دیکھا ہے اور خوب غور کیا ہے کہ قحط کے دنوں میں لوگوں نے ذرا بھی قحط کی مصیبت کو محسوس نہیں کیا۔ شراب خانے اسی طرح آباد تھے۔ اور بدکاریوں اور بدمعاشیوں کے بازار برابر گرم تھے۔ ابتدا میں جب کبھی کوئی برائے نام فتوے مکہ مدینہ کے نام سے آجایا کرتا تھا۔ تو لوگ ڈر جایا کرتے تھے اور مسجدیں آباد ہو جاتی تھیں۔ مگر اس وقت شوخی اور بیباکی حد سے بڑھ چلی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی فضل کرے ؛

مبارک ہیں وُہ جو آخر بین ہیں

عقلمند وُہ ہے جو عذاب آنے سے پیشتر اس کی فکر کرتا ہے اور دُور اندیش وُہ ہے جو مصیبت سے پہلے اُس سے بچنے کی فِکر کرے ؛

انسان کو یہی لازم ہے کہ آخرت پر نظر رکھ کر بُرے کاموں سے توبہ کرے۔ کیونکہ حقیقی خوشی اور سچّی راحت اسی میں ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ کوئی بدکاری اور گناہ کا کام ایک لحظہ کے لئے بھی سچّی خوشی نہیں دے سکتا۔ بدکار، بدمعاش کو تو ہر دم اظہار راز کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ پھر وُہ اپنی بَدعملیوں میں راحت کا سامان کہاں دیکھیگا۔ آخرت پر نظر رکھنے والے ہمیشہ مُبارک ہیں۔ ع

مَرد آخر بیں مُبارک بندہ ایست

دیکھو اُن قوموں کا حال جن پر وقتاً فوقتاً عذاب آئے۔ ہر ایک کو یہی لازم ہے کہ اگر دِل سخت بھی ہو تو اسے ملامت کر کے خشوع خضوع کا سبق دے۔ رونا اگر نہیں آتا تو رونی صورت بنا دے پھر خود بخود آنسو بھی نکل آئیں گے ؛

جماعت احمدیہ کیلئے سب سے ضروری امر

ہماری جماعت کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وُہ اپنے اندر پاک تبدیلی کریں کیونکہ اُن کو تو تازہ معرفت ملتی ہے۔ اور اگر معرفت کا دعوٰی کر کے کوئی اس پر نہ چلے۔ تو یہ نِری لاف گزاف ہی ہے پس ہماری جماعت کو دوسروں کی سُستی غافل نہ کر دے۔ اور اس کو کاہلی کی جُرأت نہ دلا دے۔ وہ اُن کی محبت سرد دیکھ کر خود بھی دل سخت نہ کرلے۔

انسان بہت آرزوئیں اور تمنّائیں رکھتا ہے۔ مگر غیب کی قضاء و قدر کی کس کو خبر ہے۔ زندگی آرزوؤں کے موافق نہیں چلتی۔ تمنّاؤں کا سِلسلہ اَور ہے۔ قضاو قدر کا سِلسِلہ اَور ہے۔ اور وُہی سچّا سِلسِلہ ہے۔ خدا کے پاس انسان کے سوانح سچّے ہیں۔ اسے کیا معلوم ہے اس میں کیا لکھا ہے۔ اس لئے دِل کو جگا جگا کر غور کرنا چاہیئے۔

مُنتہائے توحید

توحید کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت میں اپنے نفس کے اغراض کو بھی درمیان سے اُٹھا دے اور اپنے وجود کو اس کی عظمت میں محو کر دے۔

(الحکم جلد ۲۔ ۳ - پرچہ ۱۳ مارچ ۱۸۹۸ء)

یکم مئی ۱۸۹۸ء ۔ جناب مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی کے وُہ میموریل پڑھ چکنے کے بعد جو حضرت مسیح موعودؑ نے انجمن حمایت اسلام کے میموریل درباره "امّہات المومنین" کی اصلاح کی غرض سے لکھا تھا حضرت اقدسؑ نے بآواز بلند فرمایا:-

مخالفِ اسلام کتاب کا دندان شکن جواب نہایت نرمی اور ملاطفت سے دیا جائے

"چونکہ یہ میموریل اسلام اور اہلِ اسلام کی حمایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچّی عزت اور قرآن کریم کی عظمت قائم کرنے اور اسلام کی پاکیزہ اور اصفٰی شکل دکھانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کو آپ صاحبان کے سامنے پڑھے جانے سے صِرف

یہ غرض ہے کہ تا آپ لوگوں سے بطور مشورہ دریافت کیا جائے کہ آیا مصلحتِ وقت یہ ہے کہ کتاب کا جواب لکھا جائے یا میموریل بھیج کر گورنمنٹ سے استدعا کی جائے۔ کہ وہ ایسے مصنّفین کو سرزنش کرے اور اشاعت بند کر دے۔ پس آپ لوگوں میں سے جو کوئی اس پر نکتہ چینی کرنا چاہے تو وہ نہایت آزادی اور شوق سے کر سکتا ہے۔"

(مجمع میں سے) ایک شخص بولا کہ اگر کتاب کی اشاعت بند نہ ہوئی تو ہمیشہ تک طبع ہوتی رہیگی۔

حضرت مسیح موعودؑ :-

"اگر ہم واقعی طور پر کتاب کی اشاعت بند نہ کریں جو اس کے ردّ کرنے کی صورت میں ہو سکتی ہے تو گورنمنٹ سے ایک بار نہیں ہزار دفعہ اس قسم کی مدد لے کر اس کی اشاعت بند کی جائے وہ رُک نہیں سکتی۔ اگر اس تھوڑے عرصہ کے لئے وہ برائے نام بند بھی ہو جائے تو پھر بھی بہت سی کمزور طبیعت کے انسانوں اور بعض آنے والی نسلوں کے لئے یہ تجویز زہر قاتل ہو گی۔ کیونکہ جب اُن کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں کتاب کا جواب جب مسلمانوں سے نہ ہو سکا تو اس کے لئے گورنمنٹ سے بند کرانے کی کوشش کی۔ اس سے ایک قسم کی بدظنّی ہمارے مذہب کی نسبت پیدا ہو گی۔ پس میرا یہ اصُول رہا ہے کہ ایسی کتاب کا جواب دیا جاوے اور گورنمنٹ کی ایک سچّی امداد یعنی آزادی سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اور ایسا شافی جواب دیا جائے۔ کہ خود اُن کو اس کی اشاعت کرتے ہوئے ندامت محسوس ہو۔ دیکھو جیسے ہمارے مقدمہ ڈاکٹر کلارک میں اُن کو جب معلوم ہو گیا کہ مقدمہ میں جان نہیں رہی اور مصنوعی جادُو کا پُتلا ٹوٹ گیا۔ تو انہوں نے آتھم کی بیوی اور داماد جیسے گواہ بھی پیش نہ کئے۔ پس میری رائے یہی ہے اور میرے دل کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کا دندان شکن جواب نہایت نرمی اور ملاطفت سے دیا جائے۔ پھر خدا چاہیگا تو ان کو خود ہی جُرأت نہ ہو گی۔"

(رسالہ الانذار)

۲ مئی ۱۸۹۸ء ۔ بروز عید مقام قادیان زیر درخت بڑ۔ جانب شرقیہ۔ بعد نماز عید

بتقریب جلسۂ طاعون حضرت مسیح موعودؑ نے ذیل کی تقریر فرمائی:۔

دوؔ زمانے

آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ اللہ جلشانہٗ نے قرآن شریف میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بھی فرمایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ انسان، حیوان، چرند، پرند، زمین آسمان، اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے۔ کسی چیز کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف خدا ہی تھا۔ یہ اسلام کا عقیدہ ہے۔ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ ۔ یعنی خدا کے ساتھ اور کوئی چیز نہ تھی۔ ہم کو اس نے قرآن اور حدیث کے ذریعہ خبر دی ہے کہ ایک زمانہ اور بھی آنے والا ہے جبکہ خدا کے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ وہ زمانہ بڑا خوفناک زمانہ ہے۔ کیونکہ اس پر ایمان لانا ہر مومن اور مسلمان کا کام ہے۔ جو شخص اس پر ایمان نہیں لاتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے اور بے ایمان ہے جس طرح سے بہشت، دوزخ، انبیاءؑ اور کتابوں وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ ویسا ہی اُس ساعت پر ایمان لانا لازم ہے۔ جبکہ نفخِ صُور ہو کر سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ یہ سنت اللہ اور عادت اللہ ہے

آخرت کے وجود پر تین دلائل

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے سمجھانے کے لئے تین طریق اختیار فرمائے ہیں:۔

ایک یہ کہ انسان کو عقل دی ہے کہ اگر وُہ اس سے ذرا بھی کام لے اور غور کرے۔ تو یہ امر نہایت صفائی سے ذہن میں آسکتا ہے کہ انسان کی مختصر سی زندگی دوؔ عدموں کے درمیان واقع ہے۔ کبھی بھی ہمیشہ کے لئے باقی نہیں رہ سکتی۔ قیاس سے مجہولات کا پتہ لگ سکتا ہے اور انسان معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم غور کریں کہ ہمارے باپ دادے کہاں ہیں اور اسی ایک بات کو سوچیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا۔ کہ ہم سب کو بھی اسی راستہ پر چلنا ہوگا جس پر وہ گئے ہیں۔ نادان ہے وُہ انسان جس کے سامنے ہزار ہا نمونے ہوں۔ اور پھر بھی وُہ اُن سے سبق حاصل نہ کرے اور عقل نہ سیکھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے اور یہ ایک عام

ہوئی بات ہے کہ ہر گاؤں اور شہر میں زندہ لوگوں سے قبریں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہیں اور بعض پُرانے لوگوں کی قبریں مخفی اور بعض ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر ایسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب کسی شہر میں کنواں کھودا جاتا ہے تو اُس کی مٹی میں سے ہڈیاں نکلتی ہیں۔ گویا عام طور پر زمین کے نیچے ہر جگہ قبریں ہی قبریں موجود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ظاہرا طور پر نمودار نہ ہوں۔ جس سے انسان کے نابُود شدہ طبقہ کا پتہ لگتا ہے۔

دوسری دلیل اس زمانہ کے وجُود پر یہ ہے کہ جس طرح پر کھیت میں سبزہ نکلتا ہے جو بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ مگر پھر ایک زمانہ اس پر آتا ہے کہ وُہ رفتہ رفتہ زرد ہو کر خشک ہونے لگتا ہے اور پھر اُس پر ایک دوسری حالت آتی ہے کہ وہ گرنے لگتا ہے تو اُس وقت جب اس طرح نقصان ہونے لگتا ہے تو بونے والا کسان اسے خود ہی کاٹ ڈالتا ہے تا ایسا نہ ہو کہ وہ اس طرح پر اُڑ اُڑ کر ضائع جائے۔ ایسا ہی دُنیا خدا تعالیٰ کا کھیت ہے۔ جس طرح زمیندار مصلحت اور انجام بینی سے کبھی اپنے کھیت کو کچا ہی کاٹ لیتا ہے اور کبھی ذرا پختہ ہونے پر کاٹتا ہے۔ اسی طرح سے ہم انسان بھی پرورش پا کر خداوندی مشیّت اور ارادے کے موافق ٹھیک اپنے اپنے وقت پر کاٹے جاتے ہیں۔ زمیندار کے فعل سے سبق اور عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ کیونکہ انسان کی زندگی کا بھی ٹھیک یہی طرز ہے جس طرح سے بعض دانے اُگنے بھی نہیں پاتے بلکہ زمین کے اندر ہی اندر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض بچے شکم مادر ہی میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض دانے پیدا ہونے کے چند روز بعد ضائع ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی قانون اور عمل کے موافق انسان بھی بچہ، جوان اور بُوڑھا ہوتا ہے اور خدا تعالےٰ کی مرضی کی درانتی اُسے وقتاً فوقتاً مصلحتِ الٰہی سے کاٹتی رہتی ہے۔ کبھی بچے مرتے ہیں جن کو کہتے ہیں کہ اٹھرا سے مر گئے۔ صحیح البدن، توانا اور تندرست جوان بھی مرتے ہیں۔ پھر عمر رسیدہ ہو کر پیر ناتوان بھی آخر مر جاتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ قطع و بُرید کا دنیا میں ایسا جاری ہے۔ جو ہر آن انسان کو سبق دیتا رہتا ہے کہ

دُنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں۔ پس یہ بھی ایک دلیل اس زمانہ کی آمد پر ہے ⁂

علاوہ ازیں اس زمانہ کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اَور دلیل بھی پیش کی ہے اور وُہ انبیاءؑ کے قہری مُعجزات ہیں جن کے باعث ایک ہی وقت میں دُنیا کے تختے اُلٹ دیئے گئے اور خلقت کا نام و نشان تک مِٹا دیا گیا۔ انسان اللہ تعالیٰ کے قہر کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ جب چاہے اسے نابُود کر دے۔ اسی امر کو اللہ تعالیٰ نے دلیل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ بعض امراض اس ہیبت اور شدّت سے پھیلتی ہیں کہ جن لوگوں نے اُن کا دَورہ دیکھا ہوگا۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قیامت کا نمونہ ہوتا ہے۔

طاعُون

منجملہ اُن ہَیبت ناک امراض کے ایک طاعُون بھی ہے جو اس وقت ہمارے مُلک میں پڑی ہوئی ہے اور جس نے کراچی اور بمبئی میں بہت کچھ صفائی کر دی ہے اور اب پہاڑ پر سے (پالم پور) و نیز کلکتہ سے طاعُون پھیلنے کی متوحّش خبریں موصُول ہوئی ہیں۔ غرض یہ ایک بڑا بھاری خطرہ ہے جو اس وقت سامنے ہے۔ اس لئے میری اس تقریر کرنے سے غرض صِرف یہ ہے کہ چُونکہ اِنسان کو بڑے بڑے ابتلا پیش آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ الخ (پارہ ۲)[1] یعنی ہم تمہیں آزماتے رہیں گے کبھی ڈر سے اور کبھی مالوں میں نقصان کرنے سے اور کبھی ثمرات کو تلف کرنے سے۔

اتلاف ثمرات سے مراد

اتلافِ ثمرات سے مراد تفاسیر میں اَولاد بھی لکھی ہے اور اسی میں کوششوں کا ضائع ہونا بھی شامل ہے۔ مثلاً حصولِ علم کی کوشش۔ تجارت میں کامیابی کی کوشش۔ زمینداری کی کوشش۔ غرض ان کوششوں کا ضائع ہونا ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ انسان کو ہر وقت خیال ہوتا ہے کہ کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر خدا تعالےٰ کے علم میں اس کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ ناکام رہے۔ یا کھیتی پیدا نہیں ہوتی یا تجارت میں کامیاب

[1] البقرۃ: ۱۵۶

نہیں ہوتا +

اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے امتحان رکھے ہیں

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے امتحان رکھے ہیں۔ اوّل خوف۔ دوّم نقصان مال۔ سوّم نقصان جان اور چہارم تلف ثمرات۔ مگر یہ ایک دہشتناک مقام اور خوف کی جگہ ہے۔ کہ اس طاعُون کی بیماری میں یہ ہر چہار امتحان مجموعی طور پر اکٹھے ہو گئے ہیں جن لوگوں کو واقعاتِ حاضرہ کی خبر ہے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور انسان کیا کچھ بُھگت رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وارداتِ طاعون سے درحقیقت یہ ہر چہار امتحان یکے بعد دیگرے پیش آجاتے ہیں۔ یہی نہیں کہ آدمی مر جاتا ہے۔ بلکہ گورنمنٹ انگلشیہ نے ایک خاص اور اشد ضرورت کی وجہ سے اور پھر مصلحت کی بناء پر جیسا کہ ایک مادرِ مہربان کو بعض دفعہ اپنے بچوں کی غور و پرداخت اور نگہداشت میں پیش آجاتی ہے۔ یہ قانون پاس کیا ہے کہ جس گھر میں طاعُون کی واردات ہو۔ اس گھر سے تمام رہنے والے باہر نکال دیئے جائیں اور عند الضرورت ہمسائے اور محلہ دار بھی۔ اور پھر اشد ضرورت کی صورت میں گاؤں کا گاؤں ہی خالی کر دیا جائے۔ بیمار الگ رکھے جائیں اور تندرست الگ۔ اور وُہ مقام جہاں ایسے لوگ رکھے جائیں کُھلی ہوا میں ایسی جگہ پر ہو۔ جس کے نشیب میں پانی نہ ہو اور تازہ ہوا کی خوب آمد و رفت ہو سکے۔ اس کے متّصل ہی قبرستان بھی ہو۔ تاکہ مرنے والے کو جلدی دفن کیا جا سکے۔ تا ایسا نہ ہو کہ ان کے تعفن سے ہوا زیادہ زہریلی ہو جائے۔ یہ ایک ایسا شدید ابتلا ہے کہ جس کی وجہ سے بمبئی، پُونا اور بعض دیگر مقامات میں لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے +

غرض گورنمنٹ نے اِن تدابیر کے اختیار کرنے میں جو نیکی سوچی ہے اور درحقیقت اس میں نیکی ہی ہے۔ مگر اُسے بَدی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ جس شخص سے نیکی کی جائے وہ اُس نیکی کو بَدی سمجھتا ہے۔ پھر اس پر مزید حیرت اور

تعجب یہ ہے کہ گورنمنٹ نے یہ تدابیر انسداد مرض کچھ اپنے گھر سے وضع نہیں کیں بلکہ یُونانی اطبّاء کا اس امر پر اتّفاق ہے کہ جس گھر میں طاعُون ہو جائے وُہ نہ صرف اس گھر بلکہ شہر اور مُلک تک کا صفایا کر دیتی ہے۔ اطبّاء نے اس کی بہت سی نظیریں بھی دی ہیں کہ طاعون جیسی خوفناک مرض نے بس نہیں کیا جبتک کہ آبادی کو جنگل نہیں بنا دیا۔ اور اسے اُجاڑ کر کے نہیں دکھا دیا۔ جس کی اکثر لوگوں کو خبر نہیں ہے۔

طاعُون سے لوگوں نے عبرت نہیں پکڑی

مجھے افسوس ہے کہ باوجودیکہ یہ خطرناک مرض بہت بُری طرح پھیل رہی ہے۔ اور مُلک کے ایک بڑے بھاری حصّہ کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ تاہم میں نہیں دیکھتا کہ لوگوں کو ایک کھا جانے والا غم پیدا ہوا ہو۔ جس کی وجہ سے وُہ توبہ اور استغفار میں مصروف ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ وُہ خدا تعالیٰ کے حضور گریہ و زاری کرتے ہوں۔ یا نمازوں کی پابندی کا التزام کرتے ہوں بلکہ جہانتک دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ ظلم اور بداخلاقی کے طریقے استعمال میں آرہے ہیں۔ مرض طاعُون کا قاعدہ ہے کہ وُہ پرواز کر کے پرندے کی طرح دوسرے مقام پر جا پہنچتی ہے۔ اس کی رفتار میں ایسا نظام نہیں ہے۔ کہ وہ منزل بہ منزل جائے بلکہ دو چار سو کوس کا فاصلہ طے کر کے یک لخت دوسرے مقام پر جا پہنچتی ہے۔ موجودہ حالات میں بمبئی اور جالندھر کے واقعات پر ہی غور کرو۔ کہ ہر دو مقامات کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے۔ اب بتاؤ کہ انسان اس کے جالندھر پہنچنے کی بابت کیا نظام رفتار قائم کر سکتا ہے۔ الغرض اس کی رفتار کی نسبت کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج عافیت سے گزر رہی ہے۔ نہ معلوم کل کیا ہو۔ یہ نہایت خطرناک مرض ہے۔ اور اس کے دَورے بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ساٹھ ساٹھ سال تک اس کا دَورہ رہتا ہے جو ایک مسلمہ امر ہے۔ ہیضہ کی طرح نہیں کہ ساون، بھادوں کے مہینے میں آگیا۔ اور بیس پچیس دن دَورہ کر کے رُخصت ہو گیا۔ طاعُون کو حکیموں نے

نیزے سے مارنے والی لکھا ہے۔ طاعون مُبالغہ کا صیغہ ہے۔ جس کا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ اور اُس کے باعث کثرت اموات بہت ہوتی ہیں۔ توراۃ میں بھی اس کا ذکر ہے حضرت موسیٰؑ کے وقت یہ مرض یہودیوں میں پڑی تھی۔ توراۃ میں جہاں خدا نے پھوڑوں کی مار سے ڈرایا ہے۔ اس سے طاعون ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہودیوں کو نافرمانی کی وجہ سے طاعون سے ہلاک کرنے کا ذکر ہے۔

طاعون انسان کی نافرمانی اور بدکاری کی وجہ سے آتی ہے

توراۃ اور قرآن کریم کے اُن مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے۔ کہ یہ مرض انسان کی نافرمانی اور بدکاری سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ سنت اللہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اقوام معصیت کے وقت اسی بیماری سے ہلاک ہوئیں۔ یہ خدا تعالےٰ کا ایک قہری نشان ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ یہ تیسرا نشان قیامت کا ہے۔ اس سے قیامتِ صُغریٰ پیدا ہوتی ہے۔ شاید وُہ لوگ جن کو خبر نہیں۔ اس کو ایک افسانہ سمجھیں کہ جب یہ مرض یورپ اور بلاد شام اور عراق عجم میں پھیلی تھی وہاں اس کا ڈیرہ جم گیا تھا۔ ابھی اِس مُلک میں نو وارد ہے۔ اِس لئے یہاں کے لوگوں کو اس کے اخلاق اور عادات کی کچھ خبر نہیں۔ ایک طرف تو یہ لوگ خدا تعالیٰ سے بیخوف اور بیخبر ہیں۔ اور توبہ اور استغفار نہیں کرتے۔ اور دوسری طرف گورنمنٹ کی تجاویز پر بھی عملدرآمد نہیں کرنا چاہتے۔ اور ان تجاویز کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مخالفت کا شور مچاتے ہیں

مُداہنہ کے طور پر کسی کی تعریف کرنا ہمارا کام نہیں

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ مُداہنہ کے طور پر کسی کی تعریف کرنا ہمارا کام نہیں۔ یہ اصُول کہ جس گاؤں میں طاعون کی بیماری ہو وہاں کے لوگ الگ کئے جائیں۔ اور اس کی آمد و رفت کے راستے بند کئے جائیں اور مریضوں کو ایک کھُلے میدان میں رکھا جائے اور بسا اوقات سارے گاؤں کو الگ کر دیا جائے۔ گویا اس سرزمین سے سب

کو نکال دیا جائے۔ نہایت مُفید اور ضروری ہے۔ ہماری کتابوں سے بھی اور توراتؔ سے بھی یہ پتہ لگتا ہے۔ کہ اس مرض کے مواد زمین سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مرض چُوہوں کے ذریعہ سے پھیلتی ہے۔ یہ بھی منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہے۔ دراصل جو زمین بدکاریوں اور جفاکاریوں سے لعنتی ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ سمیت (زہر) پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے بڑے خوفناک طریقوں پر وہ مُبتلا عذاب ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی ہمیں یہ تو بتائے کہ گورنمنٹ نے کیا بُرائی کی جو یہ کہا کہ وَبا زدہ مکان کو چھوڑ دو۔ جو کام ہماری بھلائی کے لئے ہو۔ اس میں بُرائی کا خیال پیدا کرنا دانشمند انسان کا کام نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اگر گورنمنٹ یہ حکم دے دے کہ طاعون کی مرض میں کوئی شخص گھر سے نہ نکلے تو لوگ اس حکم کو اُس سے بھی زیادہ ناگوار سمجھیں گے کیونکہ جب گاؤں میں طاعُون پھیلے گی اور لوگ مرنے لگیں گے تو کوئی شخص بھی برداشت نہ کریگا۔ کہ اُس گھر میں رہے۔ دیکھو جس گھر یا مکان سے کسی وقت سانپ نکلے تو اس گھر یا مکان میں داخل ہونے سے لوگ دہشت کھاتے ہیں خواہ وہ سانپ مار بھی دیا جائے۔ تاہم تاریکی کے وقت اس مکان میں کوئی شخص داخل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی ایک طبعی عادت ہے۔ پھر حیرت ہے کہ ایک انسان اندیشہ کی جگہ سے واقف ہو۔ اور پھر امن و چین کے ساتھ اُس میں رہے۔ کیا ہو سکتا ہے کہ جس گھر سے مُردہ پر مُردہ نکلنا شروع ہو جائے۔ تو اہلِ خانہ اس میں امن سے بیٹھے رہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وُہ خود ہی اس گھر کو فی الفور چھوڑ دیں گے اور اُسے منحوس سمجھ کر اس سے کنارہ کر جائیں گے۔ اگر یہ لوگ اسی حالت میں چھوڑ دیئے جاتے اور گورنمنٹ کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی تو پھر بھی یہ لوگ خود بخود وُہی کرتے جو آج گورنمنٹ کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو طاعون کی مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ اس کو نزلہ و زکام کی طرح ایک عام مرض سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے طاعون کا نام رجز رکھا ہے

اللہ تعالیٰ نے اس کا نام رجز رکھا ہے۔ رجز عذاب کو بھی کہتے ہیں لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اونٹ کی بُن ران میں یہ مرض ہوتا ہے اور اس میں ایک کیڑا پڑ جاتا ہے جسے نغف کہتے ہیں۔ اس سے ایک لطیف نکتہ سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ اونٹ کی فطرت میں ایک قسم کی سرکشی پائی جاتی ہے۔ جس کو یہ مرض ہوتی ہے تو اس سے یہ پایا گیا کہ جب انسانوں میں بھی سرکشی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اُس وقت اُن پر یہ عذاب الیم نازل ہوتا ہے۔ رجز کے معنی لغت میں دوام کے بھی آئے ہیں اور یہ مرض بھی دیر پا ہوتا ہے اور گھر سے سب کو رخصت کر کے نکلتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بلا گھروں کی صفائی کر دینے والی بچوں کو یتیم بناتی اور بےشمار بیکس عورتوں کو بیوہ بنا دیتی ہے۔

مرض طاعون پلیدی اور ناپاکی سے پیدا ہوتا ہے

پھر رجز کے معنی میں غور کرنے سے اس کا باعث بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ یہ مرض پلیدی اور ناپاکی سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اچھی طرح صفائی نہیں ہوتی۔ اور مکان کی دیواریں بدنما اور قبروں کا نمونہ ہوتی ہیں۔ نہ روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ نہ تازہ ہوا آسکتی ہے۔ وہاں عفونت کا زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں جو آیا ہے۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[1] (پارہ ۲۹) کہ ہر ایک قسم کی پلیدی سے پرہیز کر۔ ہجر دور چلے جانے کو کہتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ روحانی پاکیزگی چاہنے والوں کے لئے ظاہری پاکیزگی اور صفائی بھی ضروری ہے کیونکہ ایک قوت کا اثر دوسری پر اور ایک پہلو کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے۔

جو شخص باطنی طہارت پر قائم ہونا چاہتا ہے۔ وہ ظاہری پاکیزگی کا بھی لحاظ رکھے

انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ جو شخص باطنی طہارت پر قائم ہونا چاہتا ہے۔

[1] المدثر: ۶

وُہ ظاہری پاکیزگی کا بھی لحاظ رکھے۔پھر ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ[1] (پارہ ۲) یعنی جو لوگ باطنی اور ظاہری پاکیزگی کے طالب ہیں۔میں اُن کو دوست رکھتا ہوں۔ظاہری پاکیزگی باطنی طہارت کی مُمد اور مُعاون ہے اگر انسان اسے ترک کردے اور پاخانہ پھر کر بھی طہارت نہ کرے تو باطنی پاکیزگی پاس بھی نہیں پھٹکتی۔پس یاد رکھو کہ ظاہری پاکیزگی اندرُونی طہارت کو مُستلزم ہے۔اس لئے ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ کم از کم جُمعہ کے دِن ضرور غسل کرے۔ہر نماز میں وضو کرے۔جماعت کھڑی ہو تو خوشبو لگائے۔عیدین اور جُمعہ میں جو خوشبو لگانے کا حکم ہے وُہ اسی بنا پر قائم ہے۔اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے اجتماع کے وقت عفُونت کا اندیشہ ہوتا ہے۔اس لئے غُسل کرنے اور صاف کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے سے سمیّت (زہر) اور عفُونت سے روک ہوگی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی میں یہ قانُون مقرر کیا ہے۔ویسا ہی قانُون مَرنے کے بعد بھی رکھا ہے۔

کافُور کے خواص

اسی لئے مسلمان کو مَرتے وقت کافُور کا استعمال کرنا سُنّت ہے یہ اس لئے کہ کافُور ایک ایسی چیز ہے جو وبائی کیڑوں کو مارتی اور سمیّت کو دور کرتی ہے۔اور انسان کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور بہت سی عفُونتی بیماریوں کو روکتی ہے۔اسی لئے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ مومنوں کو کافوری شربت پلایا جائے گا۔آج کل کی تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ کافُور جیسا کہ ہیضہ کے لئے مُفید ہے ویسا ہی طاعُون میں بہت فائدہ بخش ہے۔میں اپنی جماعت کو بتلاتا ہوں کہ یہ بہت مُفید چیز ہے اور میرا اعتقاد ہے کیونکہ قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ یہ جلن کو روکتا ہے اور دل کو سکینت اور تفریح دیتا ہے اور ہمیں رغبت دلائی ہے کہ ہم کافور کا استعمال کیا کریں۔آجکل ایک بات اور ثابت ہوئی ہے کہ کافور کے ساتھ جدوار استعمال کیا جائے تو ازحد مُفید ہے۔جدوار کو سرکہ

[1] البقرۃ : ۲۲۳

میں ملا کر گولیاں بنا لینی چاہئیں اور ڈیڑھ رتّی کی گولیاں بنا کر تازہ لسّی کے ساتھ استعمال کی جائیں۔ اگر عورتوں اور بچوں کو یہ گولیاں روزمرّہ استعمال کرائی جائیں تو بہت مُفید ہیں۔ ہم بھی ایک دوائی طاعُون کے لئے تیار کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ نے چاہا۔ تو بہت مفید ہوگی۔ دراصل یہ کمبخت مرض ایسا ہے کہ کسی علاج پر بھروسہ کرنا غلطی ہے۔ جبتک اللہ تعالیٰ کا ہی فضل نہ ہو۔ مگر عام اسباب تندرستی اور قانون صحت میں سے حفظِ ماتقدم بھی ایک عُمدہ چیز ہے اور فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ پس مناسب ہے کہ سمیّت اور عفُونت والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے اور بعض تیز غذاؤں سے جو دورانِ خُون کو تیز کرتی ہیں۔ جیسا کہ بہت گوشت اور بہت میٹھا یا حد سے زیادہ دُھوپ میں پھرنا یا سخت اور شدید محنت کرنا۔ ان سے پرہیز کرنا مناسب ہے۔

رعایتِ اسباب ہماری اسلامی شریعت میں منع نہیں ہے

رعایت اسباب ہماری اسلامی شریعت میں منع نہیں ہے۔ کسی شخص نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم دوا کریں۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔ کہ ہاں دوا کرو۔ کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو۔ ہاں یہ بالکل سچی بات ہے۔ کہ کوئی بَید یا ڈاکٹر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس کی فلاں دَوا ضرور فائدہ کریگی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر کوئی شخص کیوں مرتا طبیبوں اور ڈاکٹروں کو چاہیئے کہ متقی بن جاویں۔ دوا بھی کریں اور دُعا بھی۔ تنہائی میں بہت بہت دُعائیں مانگیں۔ جن لوگوں نے گھمنڈ کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کو ہی ذلیل کیا۔ لکھا ہے کہ جالینوس کو اسہال کے بند کرنے کا بڑا دعویٰ تھا۔ خدا کی شان کہ وُہ خود اسی مرض کا شکار ہوا۔ اسی طرح بعض طبیب مدقوق ہو کر اور بعض مسلُول ہو کر اس دنیا سے چل دیئے۔

خدا تعالےٰ کی طرف توجّہ کرنیوالا سعادتمند ہے

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے دعویٰ کی حقیقت کھول

دی اور ان کی بیجا شیخی کا بھانڈا پھوڑ کر دکھا دیا۔ جس قسم کا دعویٰ کیا اسی دعوے میں پست اور ذلیل ہوئے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کو کسی قسم کا دعویٰ سزاوار نہیں۔ ہمارے والد صاحب مرحوم بھی مشہور طبیب تھے۔ جن کا پچاس برس کا تجربہ تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حکمی نسخہ کوئی نہیں اور اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ تصرف اللہ کا خانہ خالی رہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے والا سعادت مند ہے۔ انسان مصیبت میں بد دماغ نہ ہو اور غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرے۔ یکدفعہ ہی خفیف عوارض شدید ہونے لگ جاتے ہیں کبھی قلب کا علاج کرتے کرتے دماغ پر آفت آجاتی ہے۔ کبھی سردی کے پہلو پر علاج کرتے کرتے گرمی کا زور چڑھ جاتا ہے۔ کون ان بیماریوں پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنا چاہیئے۔ انسان ان حشرات الارض اور سمیات کو کب گن سکتا ہے۔ صرف بیماریوں کو بھی نہیں گن سکتا۔ لکھا ہے کہ صرف آنکھ ہی کی تین ہزار بیماریاں ہیں۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے طور پر غلبہ کرتی ہیں کہ ڈاکٹر نسخہ نہیں لکھ چکتا جو بیمار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ ہی کی پناہ میں آنا چاہیئے

پس اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ میں آنا چاہیئے۔ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالےٰ سے سخت غفلت اور استغنار ہے۔ قبریں کھودی جارہی ہیں۔ فرشتے ہلاکت کے مواد تیار کر رہے ہیں اور لوگ کاٹے جارہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی نادان لوگ دھیان نہیں کرتے۔ یہ وبار قادیان سے ۳۵ کوس کے فاصلے پر ہے گو شدت حرارت کی وجہ سے کم ہوتی جاتی ہے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ شدت حرارت کے ایام میں کم ہو گئی تو آئندہ سال نہ آئے گی مجھے چند مرتبہ بذریعہ الہام اور رؤیا معلوم ہوا ہے کہ یہ وبار اس ملک میں زور سے پھیلے گی۔ جیسے میں پیشتر ازیں شائع کر چکا ہوں کہ سیاہ رنگ کے پودے لگائے جارہے ہیں۔ لگانے والوں سے پوچھا تو انہوں نے طاعون کے درخت بتلائے۔

یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

وعید کی پیشگوئیاں توبہ اور استغفار سے ٹل سکتی ہیں

ایسا ہی میں یہ بھی بتلا چکا ہوں کہ وعید کی پیشگوئیاں توبہ اور استغفار سے ٹل سکتی ہیں۔ یہانتک کہ دوزخ کا وعید بھی ٹل سکتا ہے۔ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس کی طرف توجہ کریں تو اللہ تعالےٰ اِس ملک اور خِطّہ کو چاہے گا تو محفوظ رکھ لے گا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ مگر فرماتا ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ[1] (پارہ ۱۹) ان لوگوں کو کہدے کہ اگر تم میری بندگی نہ کرو۔ تو پرواہ کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ گلی گلی میں حکیم ہیں۔ ہر جگہ ڈاکٹر موجود ہیں۔ شفاخانے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا علاج کرکے تندرست ہوجائیں گے۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ بمبئی اور کراچی میں کئی بڑے بڑے ڈاکٹر خود اس مرض میں مُبتلا ہو کر چل بسے ہیں اور جو لوگ مریضوں کی خدمت پر مامُور ہو کر گئے تھے وہ خود ہی اس مرض کا شکار ہو گئے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنے تصرفات کا مُشاہدہ کراتا ہے۔ کیونکہ محض ڈاکٹروں یا اُن کے علاج پر بھروسہ کرنا دانشمندی نہیں۔ خدا تعالےٰ چاہتا ہے۔ کہ دوسرے عالَم پر بھی ایمان پیدا ہو۔ اب لوگ زور لگا کر دکھاویں کہ کس طرح وُہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت کو بدل سکتے ہیں۔ جس طرح انسان ایک بالشت بھر زمین کے لئے مرتا ہے۔ سازشیں کرتا اور مقدمات کی تکالیف اور زیر باریاں برداشت کرتا ہے وہ سوچے۔ کہ کیا وُہ اللہ تعالےٰ کے کسی حکم کی تعمیل نہ کرنے پر بھی ویسا ہی قلق اور کرب اپنے اندر پاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

طاعُون تمہاری اپنی شامتِ اعمال سے آئی

نادان انسان جب شدید امراض میں مُبتلا ہو جاتا ہے تو اس وقت خدا تعالےٰ کو پکارتا ہے۔ جس پر اُسے یُونہی آزمائشی طور پر مُہلت مِل جاتی ہے۔ لیکن بعد اس کے پھر وُہ ایسی چالیں چلتا ہے کہ گویا اُس نے مَرنا ہی نہیں۔ معمولی امراض میں مُبتلا ہو کر مَرجانے

[1] الفرقان: ۷۸

پر اب لوگوں کے دلوں پر بہت تھوڑا اثر ہوتا ہے جو صرف دو چار یوم برائے نام قائم رہتا ہے۔ بعد اس کے پھر وُہی ہنسی ٹھٹھول اور مزخرفات شروع ہو جاتے ہیں۔ قبرستان میں جاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے مُردے گاڑتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچتے۔ کہ آخر ایک دن مَر کر ہم نے بھی خدا کے حضور جانا ہے۔ اس لئے اب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ معمولی اموات کچھ اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ امرتسر، لاہور میں روزانہ اموات کی تعداد ساٹھ ستر ہوتی ہوگی۔ اور کلکتہ و بمبئی میں اس سے بھی زیادہ لوگ مَرتے ہوں گے۔ گو نفس الامر میں یہ ایک خوفناک نظارہ ہے۔ مگر کون اس پر غور کرتا ہے۔ کوتاہ اندیش انسان کہہ اُٹھتا ہے کہ اس قدر اموات آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہیں۔ اس لئے ان کی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ چونکہ دوسروں کی موت سے خود کچھ بھی نفع نہیں اُٹھا سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دوسرا نسخہ اختیار کیا ہے اور طاعُون کے ذریعہ سے لوگوں کو متنبّہ کرنا چاہا ہے۔ اس لئے میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ یہ خیال کرکے کہ اب جو کچھ ہونا ہے وُہ تو ہونا ہی ہے ایسا نہ ہو کہ تم خدا تعالےٰ کو بھی ناراض کرو اور گورنمنٹ کو خطا کار ٹھہراؤ۔ گورنمنٹ کو بدنام کرنے سے کیا حاصل۔ طاعُون تمہاری اپنی شامت اعمال سے آئی۔ اس لئے گورنمنٹ پر بھی تمہاری بدولت آفت آئی۔ گورنمنٹ کو اگر تمہارے ساتھ سچّی ہمدردی نہیں۔ تو تم خود ہی بتلاؤ کہ وُہ کیوں اس قدر روپیہ اس مرض کے تدارک پر خرچ کرتی ہے۔ شفاخانے اور ڈاکٹر کیوں مقرر کئے جاتے ہیں۔ پولیس کے ہزاروں آدمی کیوں انتظام کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ کیا گورنمنٹ کو کچھ شوق ہے کہ اس قدر اخراجات کثیر برداشت کرے؟ نہیں۔ بلکہ مُلک کی یہ حالت دیکھ کر وُہ اندر ہی اندر مادرِ مہربان کی طرح بےچین ہو رہی ہے۔

گورنمنٹ بھی رعایا ہی سے ہے۔

گورنمنٹ بھی رعایا ہی سے ہے۔ لوگوں کو شاید خبر نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت میں لوگ طاعُون سے مارے جائیں گے۔ مُنجموں کی باتیں گو قابلِ ذکر نہیں۔ مگر ہند اور

یُورپ کے مُنجم کہتے ہیں کہ نومبر ۱۸۹۹ء میں ستارے جمع ہوں گے اور خوفناک وقت آئیگا۔ ہمیں تو اس کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ مگر ہم کو تو یہ غم ہے کہ ہمارے الہامات میں بھی آئندہ دو جاڑوں کا سخت اندیشہ ہے۔ بشرطیکہ لوگ راہِ راست اختیار نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجُوع نہ کریں۔ بدکاریاں، زناکاریاں، چوریاں اور ہر ایک قسم کے مکر و فریب اور بد اعمال چھوڑ کر نیکی اختیار کریں۔ اور بد اعمالیوں سے کُلّی اجتناب کریں۔ ورنہ سخت خطرہ اور اندیشہ ہے اور ایک نہایت سہمناک اور ترسناک نظارہ ہمارے سامنے ہے۔ اب بتلاؤ کہ ہم گورنمنٹ کو کیوں قصوروار ٹھہرائیں۔

تم جاہلوں کی روش اختیار نہ کرو

پس میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہماری جماعت کے لئے یہ مُناسب نہیں ہے کہ وہ جاہلوں کی روش اختیار کرے اور احمقوں اور کوتاہ اندیشوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جس قدر ہدایات جاری کی ہیں۔ وہ صحت کے لئے بہت مُفید ہیں۔ ہماری تواریخ کی کتابوں مثل طبری وغیرہ میں جو ہزار سال سے پہلے کی تصنیف ہے لکھا ہے۔ کہ حضرت عُمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب لشکرِ اسلام ملک شام میں تھا تو وہاں وبا پڑی جس پر لشکرِ اسلام کو پہاڑ پر بھیجنا پڑا۔ تو گویا یہ اِس گورنمنٹ کا ہی مخترعہ نسخہ نہیں۔ بلکہ گذشتہ اہلِ اسلام کے طرزِ عمل سے بھی یُونہی ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح انہوں نے نشیب کو چھوڑ کر پہاڑ کی بلندی کو اختیار کیا۔ اسی طرح اب بھی مرطوب اور نشیبی مکانات کو چھوڑ کر کھُلے میدانوں میں مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ بوعلی سینا نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ جن گھروں میں وبا کا مرض ہو اُن کی صفائی کی جائے کیونکہ جبتک سبب موجود ہے۔ نتیجہ زائل نہیں ہو سکتا۔ طبیب کیا کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ماشہ دو ماشہ دوائی دے گا۔ مگر اس عفُونت کو جو سانس کے ذریعہ سے انسان کے جسم میں چلی جاتی ہے اُسے دوائی کیا کرے گی۔ اور ایسے گھر میں رہ کر طاعون کا کیا علاج ہو سکتا

ہے۔ لوگوں نے طاعُون سے فوت شدہ لوگ نہیں دیکھے۔ جس جگہ طاعون کا مریض مَر جاتا ہے وہ جگہ ایسی عفُونت آمیز ہوجاتی ہے۔ کہ ناک نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے گورنمنٹ کی تدابیر حفظِ صحت کی نسبت بدظنی کرنا ایک ناپاک خیال ہے۔ گورنمنٹ نے اس مرض کے دفعیہ کے لئے جو کچھ سوچا ہے، وہ بالکُل صحیح ہے۔ اس لئے ہماری جماعت کے لئے لازم ہے وُہ اِس بارہ میں گورنمنٹ کی مدد کریں۔ اور اپنے دوستوں و ہمسائیوں اور دوسرے لوگوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مُسلمان سمجھائیں اور غلط فہمیوں کو دُور کریں۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گورنمنٹ نے رعایا کو مارنے کی یہ تجویز کی ہے۔ بھلا کوئی اِن نادانوں سے پوچھے تو سہی کہ کیا گورنمنٹ یہ لکھوکھہا روپیہ صرف لوگوں کو مارنے پر صرف کر رہی ہے۔ اور اُسے اس قدر تکالیف برداشت کرنے کا شوق ہے؟ نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ طاعُون بہت مُہلک مرض ہے۔

طاعُون کیا ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ طاعون کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک شدید تپ ہوتا ہے جس کے ساتھ غشی، متلی، دَردِ سر اور نسیان ہوتا ہے۔ لرزہ بہت ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے چینی اور سراسیمگی ہوتی ہے۔ پھر چند روز کے بعد بُن ران یا گردن یا پس گوش ایک پھُنسی نکل آتی ہے۔ جو کبھی تو چھوٹی سی ہوتی ہے اور کبھی بڑی۔ یہانتک کہ سرسام ہوجاتا ہے اور غالباً یہ سب علامات چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر ظاہر ہوجاتی ہیں عموماً ایسے مریضوں کا گورنمنٹ کو پتہ بمشکل لگتا ہے۔ کیونکہ بیس بائیس گھنٹہ تک تو لوگ اسے معمولی بُخار سمجھ کر لاپرواہ رہتے ہیں۔ مگر بعد ازاں آثارِ طاعُون دیکھ کر اُسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض جب مرض کا پُورا پُورا اثر ہو چکتا ہے تو کہیں جا کر گورنمنٹ کے عمّال کو پتہ لگتا ہے۔ اب اس ایک دو گھنٹہ کے علاج سے کیا بَن سکتا ہے وہ ہسپتال میں مَریگا نہیں تو اَور کیا ہوگا۔ پس یہ لوگوں کی اپنی نادانی اور حماقت ہے کہ اپنے قصُور کو

گورنمنٹ کے سر پر تھوپا جاتا ہے۔ اگر اس میں گورنمنٹ کا کچھ قصور یا غلطی ہے۔ تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ اُسے ظاہر کرو۔ ورنہ اپنی غلطی کے لئے گورنمنٹ کو متہم کرنا ناواجب ہے۔ گورنمنٹ کی نیک نیتی اور خیر طلبی تو اِس معاملہ میں یہاں تک ہے کہ اس نے خود معززین سے مشورے لئے پھر کارروائی کی۔ مگر چونکہ ہمارا ملک واقعی نیم وحشی اور جاہل ہے۔ اس لئے اُن کے ہاتھ میں سوائے غصہ اور بدظنّی کے اَور کچھ نہیں۔ اپنی غلط کاریوں کا الزام گورنمنٹ پر دیتے ہیں۔ اور ذرہ نہیں سوچتے۔ کاش کہ یہ صدہا انجمنیں جو ہمارے ملک میں پھیل رہی ہیں۔ اس کام کی طرف توجہ کریں اور جُہلاء کے دلوں سے یہ بدظنّیاں نکالنے کی کوشش کریں تو بنی نوع کی کس قدر بھلائی ہو۔ تم لوگ غفلت کے لحافوں میں پڑے سو رہے ہو اور جن بے آراموں اور تکالیف میں تمہارے ہم جنس مبتلا ہیں تمہیں ان کی خبر تک نہیں۔ گورنمنٹ جس قدر روپیہ ان مصائب سے نجات دلانے کے لئے اپنی پیاری رعایا کی خاطر صَرف کر رہی ہے اگر چندہ کر کے وُہ صَرف کرنا پڑتا اور یہ حکم ہوتا کہ گاؤں گاؤں کے لوگ چندہ دیں تو کوئی شخص بھی ایک پَیسہ دینے پر راضی نہ ہوتا۔ میں نے بھی ایک دوائی تیار کرنی چاہی ہے۔ جس کی تیاری میں مَیں مصروف ہوں۔ اللہ تعالیٰ شیخ رحمت اللہ صاحب کو جزائے خیر دے۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے دوصَد روپیہ (۲۰۰) اس کارِ خیر میں دیا ہے۔ میں نے اس مرض کے اسباب کو خوب زیرِ نظر رکھ لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مرض کے کئی حصّے ہوتے ہیں۔ اس لئے طبیب کو مناسب اور لازم ہے۔ کہ وُہ ہر حصّہ اور سبب کی رعایت کو ملحوظ رکھے۔ ردّی غذائیں اور سمّی ہوائیں اس مرض کو بہت زیادہ پھیلاتی اور خطرناک بنا دیتی ہیں۔ زمین کے نشیبی حصّہ سے ایسی سمّی ہوائیں تنفّس کے ذریعہ یا غذا کے ذریعہ سے انسان کے خون میں سمیّت اور عفُونت پیدا کر دیتی ہیں۔ آج کل کی تحقیقات میں طاعُون کی جڑ کیڑے یا اجرامِ صغیرہ ثابت ہوئے ہیں۔ میں بھی اس تحقیقات کو پسند کرتا ہوں کیونکہ اس سے

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اسلام کی صداقت ثابت ہوتی ہے ؂

حدیث میں طاعُون کا نام نغف رکھا گیا ہے

حدیث شریف میں جہاں طاعُون کا ذِکر آیا ہے وہاں نغف اس کا نام رکھا گیا ہے۔ اور نغف اُس کیڑے کو کہتے ہیں جو بکری اور اونٹ کی ناک سے نکلتا ہے اور اُسے طاعُون قرار دیا گیا ہے۔ آج کل کی تحقیقات پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ مگر جس شخص نے مقدس اِسلام کے بانی علیہ السّلام کے پاک کلام کو پڑھا ہے۔ اُسے کس قدر لُطف اور مزا آتا ہے جب وہ تیرہ سَو برس پیشتر آپ کے پاک ہونٹوں سے نکلی ہوئی باتوں کو پُورا ہوتے دیکھتا ہے۔ قرآن شریف نے بھی طاعون کو کیڑا ہی بتلایا ہے ؂

قرآن کریم اور آنحضرتؐ کے معقُولی مُعجزات

اب اَے نئی تحقیقات پر اِترانے والو! خدا کے لئے ذرا انصاف کو کام میں لاؤ۔ اور بتلاؤ۔ کہ کیا وُہ مذہب انسانی افترا ہو سکتا ہے۔ جس میں ایسے حقائق پہلے سے موجود ہوں اور جو تیرہ سَو سال کی محنتوں، تحقیقاتوں اور جان کنیوں کا نتیجہ ہوں۔ یہ قرآن کریم اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے معقولی مُعجزات ہیں۔ اَور دیکھو۔ قلب دِل کو کہتے ہیں۔ اور قلب گردش دینے والے کو بھی کہتے ہیں۔ دِل پر مدار دورانِ خون کا ہے۔ آجکل کی تحقیقات نے تو ایک عرصہ دراز کی محنت اور دماغ سوزی کے بعد دورانِ خون کا مسئلہ دریافت کیا۔ لیکن اِسلام نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر ہی سے دِل کا نام قلب رکھ کر اس صداقت کو مرکُوز اور محفوظ کر دیا ؂

طاعُون کے اسباب

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ دوسرا سبب پلیدی۔ تیسرا سبب سمیّت۔ چوتھا سبب تپ۔ پانچواں پھوڑے۔ اب اس اَمر میں ایک اختلاف ہے۔ کہ آیا اصل سبب پھوڑے ہیں یا تپ۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اصل تپ ہے

اور یُونانی پھوڑے کو اصل سبب ٹھہراتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یُونانیوں کی رائے صحیح ہے کیونکہ توریت میں بھی پھوڑوں ہی کا ذکر ہے۔ ہاں تپ لازمی ہے۔ بعض اوقات تپ قایم مقام ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ بلکہ بیمار تپ ہونے سے پہلے ہی رُخصت ہو جاتا ہے۔ غرض اس مرض کا اصل تپ نہیں بلکہ پھوڑا ہے۔ پھوڑا اگر چیرا جائے اور اس سے مواد نکال دیا جائے تو تپ بھی کم ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ مریض تندرست ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ مرض سخت مُہلک اور خوفناک ہے۔ اسی لئے اس کے روکنے کی تدابیر بھی سخت ہونی لازمی ہیں۔ جن کے اجراء پر گورنمنٹ باوجودیکہ وہ سچی ہمدردی اور پُوری غمخواری کے ساتھ رعیّت کی بھلائی میں مصرُوف ہے۔ بدنام ہو گئی ہے۔ جہانتک نیک نیّتی اور بنی نوعِ انسان کی اس غمخواری کے خیال سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈال رکھی ہے میں نے ان تمام تجاویز پر جو گورنمنٹ نے مریضانِ طاعُون کے متعلق شائع کی ہیں غور کیا ہے۔ میں بلاخوف لومۃ لائم کہتا ہوں کہ وُہ تجاویز بہت مُناسب اور موزُوں ہیں۔ وُہ یہ کہ اُس گھر کو یا بعض اوقات عندالضرورت محلّہ کو خالی کر دیا جائے۔ اور مریض کو الگ رکھا جائے۔ یہ بالکل درست اور عَین مُناسب ہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک بچہ طاعون سے بیمار ہو اور اُسے بمُوجب قواعد ماں باپ سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ ضرور مَر جائیگا ایسے معترضین کو معلوم ہو کہ ایسی صُورت میں ماں باپ اُس کے ہمراہ رہ سکیں گے۔ مگر وہ بھی طاعون کے مریض ہی شمار ہو کر ان تمام پابندیوں کے ماتحت ہوں گے۔ جو مبتلا شخص کے لئے ہیں۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ موجُودہ حالت میں گورنمنٹ کی نیّت بالکل نیک ہے۔ اس کی یہ منشاء ہرگز نہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جائے۔

اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کی تفسیر

اور میری تو سمجھ میں یہ ہرگز نہیں آتا کہ لوگوں کو خواہ مخواہ ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے گورنمنٹ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ گورنمنٹ پر بدظنّی ہے۔ قرآن شریف میں حکم

ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (پ۵) یہاں اُولی الاَمر کی اطاعت کا صاف طور پر حکم موجود ہے اور اگر کوئی شخص کہے کہ مِنْکُمْ میں گورنمنٹ داخل نہیں تو یہ اُس کی صریح غلطی ہے۔ گورنمنٹ جو حکم شریعت کے مطابق دیتی ہے۔ وہ اُسے مِنْکُمْ میں داخل کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص ہماری مخالفت نہیں کرتا۔ وہ ہم میں داخل ہے۔ اشارۃ النّص کے طور پر قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اور اس کے حکم مان لینے چاہئیں۔ عام طور پر تو مسلمانوں کے لئے یہ لازم تھا کہ انسداد طاعون کے متعلق شکر گذاری کے میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجتے۔ مگر یہاں بجائے شکرگذاری کے ناشکر گذاری ہو رہی ہے۔ اور کوئی معقول وجہ ناراضگی کی بجز اس کے معلوم نہیں ہوتی کہ عورتوں کی نبضیں مَرد ڈاکٹر دیکھتے ہیں۔ سو اِس بارہ میں یہ معلوم ہو۔ کہ اوّل تو اس نقص کے معلوم ہو جانے پر گورنمنٹ نے اس شکایت کو رفع کر دیا ہے اور دائیاں مقرر کر دی ہیں جو مستورات کا ملاحظہ کرتی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا نہ بھی ہوتا۔ تو بھی اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔

بیماری میں پَردہ کے متعلق حکم

ایسی صورت اور حالت میں کہ قہرِ خدا نازل ہو رہا ہو اور ہزاروں لوگ مَر رہے ہوں۔ پَردہ کا اتنا تشدّد جائز نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ کی بیوی مَرگئی تو کوئی اُس کا اُٹھانے والا بھی نہ رہا۔ اب اس حالت میں پَردہ کیا کر سکتا تھا۔ مَثل مشہور ہے۔ مَرتا کیا نہ کرتا۔ مَردوں نے ہی جنازہ اُٹھایا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر بچہ رحم میں ہو تو کبھی مرد اُس کو نکال سکتا ہے۔ دینِ اسلام میں تنگی و حرج نہیں۔ جو شخص خواہ مخواہ تنگی و حرج کرتا ہے وُہ اپنی نئی شریعت بناتا ہے۔ گورنمنٹ نے بھی پَردہ میں کوئی تنگی نہیں کی۔ اور اب قواعد بھی بہت آسان بنا دیئے ہیں۔ جو جو تجاویز و اصلاحات لوگ پیش کرتے ہیں گورنمنٹ انہیں توجہ سے سُنتی، اور ان پر مُناسب اور مصلحتِ وقت

لہ النساء : ۶۰

کے موافق عمل کرتی ہے۔ کوئی شخص مجھے یہ۔ تو بتائے کہ پردہ میں نبض دکھانا کہاں منع کیا ہے ؟

انسان کو نیک بختی اور تقویٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے

اصل بات جو قابلِ غور ہے وُہ یہ ہے کہ انسان کو نیک بختی اور تقویٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اور سعادت کی راہیں اختیار کرنی چاہئیں۔ تب ہی کچھ بنتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ[1] (پ ۱۳) خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک کہ خود وُہ اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے۔ خواہ مخواہ کے ظنّ فاسد کرنے اور بات کو انتہا تک پہنچانا بالکل بیہودہ امر ہے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے۔ کہ لوگوں کو چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں، نمازیں پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اتلافِ حقوق اور بدکاریوں سے باز آئیں۔ یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ بعض وقت جب صرف ایک شخص ہی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو وُہ سارے گھر اور سارے شہر کی ہلاکت کا مُوجب ہو جاتی ہے۔ پس بدیوں کو چھوڑ دو کہ وُہ ہلاکت کا مُوجب ہیں۔ ضلع جالندھر اور ہوشیارپور کے اس وقت کئی گاؤں طاعُون میں مبتلا ہیں۔ پھر بیماری کے انسداد سے کیوں غفلت کی جائے۔ گورنمنٹ پر جاہلانہ طور سے بدگمانی نہ کرو۔ اور اگر تمہارا ہمسایہ بدگمانی کرتا ہے تو اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کرو۔ اور اُسے سمجھاؤ۔ انسان کہانتک غفلت کرتا جائے گا۔ اس دن سے ڈرنا چاہیئے جب ایک دفعہ ہی وبا آپڑے اور سب کو تباہ کر ڈالے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ مصیبت کے وارد ہونے سے پہلے جو دُعا کی جائے وُہ قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ خوف و خطر میں مُبتلا ہونے کے وقت تو ہر شخص دُعا اور رجُوعِ الی اللہ کر سکتا ہے۔ سعادتمندی یہی ہے کہ امن کے وقت دُعا کی جائے۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ ان لوگوں کی حالت سے عبرت حاصل کرے جو اس خطرہ میں مبتلا ہیں یہاں سے تو بہت قریب گاؤں میں یہ بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں کے حالات دریافت کر کے

[1] الرعد : ۱۲

ہر شخص قبل از وقت عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ اس وقت تک ضلع جالندھر میں یہ مرض بہت ترقی پر ہے۔ گو ضلع ہوشیار پور میں کچھ کمی ہے۔

نمازوں کو باقاعدہ التزام سے پڑھو

تاہم میں یقین نہیں کرتا۔ کہ وُہ بالکل ناپَید ہو جائیگی۔ ابھی جاڑا آنے والا ہے۔ اس لئے پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ۔ نمازوں کو باقاعدہ التزام سے پڑھو۔ بعض لوگ صرف ایک ہی وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ وُہ یاد رکھیں کہ نمازیں مُعاف نہیں ہوتیں۔ یہانتک کہ پیغمبروں تک کو معاف نہیں ہوئیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک نئی جماعت آئی۔ اُنہوں نے نماز کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ جس مذہب میں عمل نہیں وُہ مذہب کچھ نہیں۔ اس لئے اس بات کو خوب یاد رکھو اور اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق اپنے عمل کر لو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نشانوں میں سے ایک یہ بھی نشان ہے۔ کہ آسمان اور زمین اس کے اَمر سے قائم رَہ سکتے ہیں۔ بعض دفعہ وُہ لوگ جن کی طبائع طبیعّیات کی طرف مائل ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ نیچرّی مذہب قابلِ اتباع ہے۔ کیونکہ اگر حفظِ صحت کے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے تو تقویٰ اور طہارت سے کیا فائدہ ہوگا؟ سو واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانوں میں سے یہ بھی ایک نشان ہے کہ بعض وقت ادویات بے کار رہ جاتی ہیں اور حفظِ صحت کے اسباب بھی کسی کام نہیں آسکتے۔ نہ دَوا کام آسکتی ہے نہ طبیب حاذق۔ لیکن اگر اللہ تعالےٰ کا اَمر ہو۔ تو اُلٹا سیدھا ہو جایا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا واقعہ

دیکھو حضرت ابراہیمؑ کا ابتلا کہ بچّے اور اُس کی ماں کو کنعان سے بہت دُور لیجانے کا حکم ملا۔ اور وُہ ایسی جگہ تھی جہاں نہ دَانہ تھا نہ پانی۔ وہاں پہنچکر حضرت ابراہیم نے خدا کے حضور عرض کی کہ اَے اللہ میں اپنی ذریّت کو ایسی جگہ چھوڑتا ہوں جہاں دانہ پانی نہیں

ہے حضرت سارہؓ کا ارادہ یہ تھا کہ کسی طرح سے اسماعیلؑ مرجائے۔ اس لئے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اسے کسی بے آب وگیاہ جگہ میں چھوڑ آ۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ سارہؓ کہتی ہے وُہی کرنا ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ کو سارہؓ کا پاس تھا۔ حضرت سارہؓ نے اس واقعہ سے پہلے بھی ایک دفعہ حضرت ہاجرہؓ کو گھر سے نکالا تھا۔ اس وقت بھی خدا تعالیٰ کا فرشتہ اس سے ہم کلام ہوا تھا۔ کیونکہ نبیوں کے سوا غیر انبیاء سے بھی اللہ تعالیٰ بذریعہ فرشتہ کلام کیا کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہؓ سے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ ہوا۔ غرض حضرت ابراہیمؑ نے ویسا ہی کیا۔ اور کچھ تھوڑا سا پانی اور تھوڑی سی کھجوریں ہمراہ لے کر حضرت ہاجرہؓ اور اُس کے بچے کو لیجا کر وہاں چھوڑ آئے جہاں اب مکّہ آباد ہے۔ چند روز کے بعد نہ دانہ رہا اور نہ پانی۔ حضرت اسماعیلؑ شدّتِ پیاس سے بیچین ہونے لگے۔ تو اس وقت حضرت ہاجرہؓ نے نہ چاہا کہ اپنے بچے کی ایسی بے بسی کی مَوت اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس لئے ہاجرہؓ چند مرتبہ اُس پہاڑ پر ادھر ادھر دوڑیں کہ شاید کوئی قافلہ ہو۔ پہاڑ پر چڑھ کر گریہ و زاری کرنے لگیں۔ یہ ایسا وقت تھا کہ ان کے پاس صرف ایک ہی بچّہ تھا۔ خاوند سے الگ تھیں۔ دوسرا بچہ پیدا ہونے کی امید نہیں تھی۔ گویا بیوہ کی مانند آپ کا حال تھا۔ آپ کی گریہ وزاری پر فرشتہ نے آواز دی۔ ہاجرہ! ہاجرہ! جب آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ بچّہ کے پاس جب آئی تو دیکھا کہ اس کے پاس پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مُردہ سے ان کو زندہ کر دیا۔ حضرت نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس چشمہ کا پانی نہ روکتا۔ تو وہ تمام ملک میں پھیل جاتا۔ اس قِصّہ کے بیان کرنے سے یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی جگہوں پر جہاں آب و دانہ کچھ نہ ہو۔ اس طرح اپنی قدرت کے کرشمے دکھایا کرتا ہے چنانچہ پانی کے اس پہلے کرشمہ نے حضرت اسماعیلؑ کو زندہ کیا۔ مگر وہ پانی جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پھیلایا گیا۔ اُس کی

شان میں فرمایا۔ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا[1] (پ ۲۷) گویا اس پانی سے دُنیا زندہ ہوئی۔ مدعا یہ ہے کہ جہاں ظاہری اسباب موجود نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بچاؤ کی ایک راہ نکالدی۔ اور اللہ تعالیٰ جو یہ فرماتا ہے کہ اس کے اَمر سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ تو غور کرو کہ وُہ جنگل جہاں اس قدر گرمی پڑتی تھی اور جہاں انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا بابرکت بنادیا کہ کروڑہا مخلوق وہاں جاتی ہے اور ہر مُلک اور ہر قوم کے لوگ وہاں موجود ہوتے ہیں۔ وُہ مَیدان جہاں حج کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ وُہی جگہ ہے جہاں نہ دانہ تھا نہ پانی ◆

اپنی زِندگی میں ایسی تبدیلی پَیدا کرلو کہ معلوم ہو گویا نئی زِندگی ہے

اصل بات یہی ہے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ویرانہ کو آبادی اور آبادی کو ویرانہ بنادیتا ہے۔ شہر بابل کے ساتھ کیا کیا؟ جس جگہ انسان کا منصوبہ تھا۔ کہ آبادی ہو۔ وہاں مشیتِ ایزدی سے ویرانہ بن گیا اور اُلّوؤں کا مسکن ہوگیا۔ اور جس جگہ انسان چاہتا تھا کہ ویرانہ ہو۔ وُہ دنیا بھر کے لوگوں کا مرجع ہوگیا۔ پس خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوا اور تدبیر پر بھروسہ کرنا حماقت ہے۔ اپنی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کرلو کہ معلوم ہو کہ گویا نئی زندگی ہے۔ استغفار کی کثرت کرو۔ جن لوگوں کو کثرتِ اشغالِ دُنیا کے باعث کم فرصتی ہے۔ ان کو سب سے زیادہ ڈرنا چاہیئے۔ ملازمت پیشہ لوگوں سے اکثر فرائضِ خداوندی فوت ہوجاتے ہیں۔ اس لئے مجبوری کی حالت میں ظُہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کا جمع کرکے پڑھ لینا جائز ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر حکّام سے نماز پڑھنے کی اجازت طلب کرلی جائے تو وُہ اجازت دے دیا کرتے ہیں۔ نیز اعلیٰ حکّام کی طرف سے ماتحت افسروں کو اس بارہ میں خاص ہدایات ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ ترکِ نماز کیلئے ایسے بیجا عُذر بجز اپنے نفس کی کمزوری کے اَور کوئی نہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و زیادتی نہ کرو۔ اپنے فرائض منصبی نہایت دیانتداری سے بجالاؤ۔ گورنمنٹ پر ایک سیکنڈ کے لئے بھی بدظنّی نہ کرو۔ کیا

[1] الحدید : ۱۸

تمہیں سکھوں کے عہدِ حکومت کے واقعات معلوم نہیں جس وقت مسجدوں میں اذان دینی موقوف ہوگئی تھی۔ گائے کو ذرا سی تکلیف دینے پر سخت ایذائیں اور بیحد ظلم ہوتے تھے۔ پس ایسی مصیبت سے تم کو خلاصی دینے کے لئے اللہ تعالیٰ بہت فاصلہ سے اس سلطنت کو لایا جس سے ہم نے بہت فائدہ حاصل کیا۔ اور امن و امان سے اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے لگے اس لئے ہمیں کس قدر شکریہ اس گورنمنٹ کا کرنا چاہیئے۔ خوب یاد رکھو کہ جو شخص انسان کا شکر نہیں کرتا، وہ خدا کا بھی شکر نہیں کرتا۔ یہ قاعدہ ہے کہ اگر انسان اپنے کسی عضو سے کام نہ لے تو وہ ایک عرصہ کے بعد بیکار ہو جایا کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اگر آنکھ کو چالیس دن بند رکھا جائے تو وہ بالکل اندھی ہو جائے۔ اس لئے میں تم کو بتاکید نصیحت کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے احسان ہم پر بہت ہیں۔ حقائق اور معارف کی کثیر التعداد کتب کہاں کہاں سے ہمیں میسّر آتی ہیں۔ اُن کی سلطنت کی آزادی سے ہم نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے ہمارے مذہب پر حملے ہوئے۔ اور دیگر مشکلات کا سامنا ہوا تو ہم نے کس طرح آزادی سے اُن کا دفعیہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حسب وعدہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1] (پ۲۱) ہم پر کس کس قسم کے معارف کھولے جنہیں ہم نے دور و نزدیک شائع کیا۔ گورنمنٹ کی آزادی بھی ایک باعث اُن کے کُھلنے کا ہے۔ بالآخر میں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے سچا رشتہ قائم کرو۔ اور گورنمنٹ کی نسبت بدظنی مت کرو بلکہ اس کی ہدایات کی تعمیل کرو اور اُسے مدد دو۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۵۲-۵۳)

۱۶ مئی ۱۸۹۸ء۔ دن بہت ہی نازک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے غضب سے سب کو ڈرنا چاہیئے۔

جماعت کو نصائح

اللہ تعالیٰ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر صالح بندوں کی۔ آپس میں اخوت اور محبت کو پیدا کرو۔ اور درندگی اور اختلاف کو چھوڑ دو۔ ہر ایک قسم کے ہزل اور تمسخر سے مطلقاً

[1] عنکبوت : ۷۰

کنارہ کش ہو جاؤ۔ کیونکہ تمسخر انسان کے دل کو صداقت سے دُور کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ عزّت سے پیش آؤ۔ ہر ایک اپنے آرام پر اپنے بھائی کے آرام کو ترجیح دیوے۔ اللہ تعالیٰ سے ایک سچی صُلح پیدا کر لو۔ اور اُس کی اطاعت میں واپس آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا غضب زمین پر نازل ہو رہا ہے۔ اور اس سے بچنے والے وہی ہیں جو کامل طور پر اپنے سارے گناہوں سے توبہ کر کے اُس کے حضور میں آتے ہیں۔

تم یاد رکھو۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان میں تم اپنے تئیں لگاؤ گے۔ اور اُس کے دین کی حمایت میں ساعی ہو جاؤ گے۔ تو خدا تمام رکاوٹوں کو دُور کر دے گا۔ اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کسان عُمدہ پودوں کی خاطر کھیت میں سے ناکارہ چیزوں کو اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اور اپنے کھیت کو خوشنما درختوں اور بار آور پودوں سے آراستہ کرتا۔ اور اُن کی حفاظت کرتا اور ہر ایک ضرر اور نقصان سے اُن کو بچاتا ہے۔ مگر وُہ درخت اور پودے جو پھل نہ لاویں اور گلنے اور خشک ہونے لگ جاویں۔ اُن کی مالک پرواہ نہیں کرتا۔ کہ کوئی مویشی آکر اُن کو کھا جاوے۔ یا کوئی لکڑہارا اُن کو کاٹ کر تنور میں ڈال دیوے۔ سو ایسا ہی تم بھی یاد رکھو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حضور میں صادق ٹھیرو گے۔ تو کسی کی مخالفت تمہیں تکلیف نہ دے گی۔ پر اگر تم اپنی حالتوں کو درست نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے فرمانبرداری کا ایک سچا عہد نہ باندھو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کو کسی کی پرواہ نہیں۔ ہزاروں بھیڑیں اور بکریاں روز ذبح ہوتی ہیں۔ پر اُن پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اور اگر ایک آدمی مارا جاوے تو کتنی باز پُرس ہوتی ہے۔ سو اگر تم اپنے آپ کو درندوں کی مانند بیکار اور لاپرواہ بناؤ گے تو تمہارا بھی ایسا ہی حال ہو گا۔ چاہیئے۔ کہ تم خُدا کے عزیزوں میں شامل ہو جاؤ۔ تاکہ کسی وبا کو یا آفت کو تم پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت نہ ہو سکے۔ کیونکہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر زمین پر ہو نہیں سکتی۔ ہر ایک آپس کے جھگڑے اور جوش اور عداوت کو درمیان میں سے اُٹھا دو۔ کہ اب وُہ وقت ہے کہ تم ادنیٰ باتوں سے اعراض

کر کے اہم اور عظیم الشان کاموں میں مصروف ہو جاؤ۔ لوگ تمہاری مخالفت کریں گے۔ اور انجمن کے ممبر تم پر ناراض ہوں گے۔ پر تم ان کو نرمی سے سمجھاؤ اور جوش کو ہرگز کام میں نہ لاؤ۔ یہ میری وصیت ہے۔ اور اس بات کو وصیت کے طور پر یاد رکھو۔ کہ ہرگز تندی اور سختی سے کام نہ لینا بلکہ نرمی اور آہستگی اور خُلق سے ہر ایک کو سمجھاؤ۔ اور انجمن کے ممبروں کے ذہن نشین کراؤ کہ ایسا میموریل[1] فی الحقیقت دین کو ایک نقصان دینے والا امر ہے۔ اور اسی واسطے ہم نے اس کی مخالفت کی کہ دین کو صدمہ پہنچتا ہے۔"

(الحکم جلد ۲ ۱۲-۱۳۔ صـ۱۰ پرچہ ۲۰-۲۷ مئی ۱۸۹۸ء)

۲۵ جولائی ۱۸۹۸ء

مولوی محمد حسین بٹالوی کی گالیوں کا احسن جواب

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اپنا رسالہ اشاعۃ السنہ نمبر پنجم لغایت دوازدہم جلد ہژدہم بابت ۱۸۹۵ء بدست محمد ولد چوغطہ قوم اعوان ساکن ہمتوں گکھڑ ضلع سیالکوٹ بھیجا جس میں حضرت مسیح موعودؑ پر بہت ناواجب حملے کئے گئے تھے۔ آپ نے ۲۵ جولائی ۱۸۹۸ء کی سہ پہر کو اصل مرسلہ رسالہ کی پیشانی پر مندرجہ ذیل عبارت لکھ کر قاصد کو دے دیا۔

"رَبِّ اِنْ کَانَ ھٰذَا الرَّجُلُ صَادِقًا فِیْ قَوْلِہٖ فَاَکْرِمْہُ وَاِنْ کَانَ کَاذِبًا فَخُذْہُ۔ اٰمِیْن"

(الحکم جلد ۲ ۔ نمبر ۲۰-۲۱ ۔ پرچہ ۲۰-۲۷ جولائی ۱۸۹۸ء)

---

[1] احمد شاہ شایق نام عیسائی نے ایک دلخراش کتاب بنام امہات المومنین چھپوا کر ایک ہزار جلد ۱۸۹۸ء میں ہندوستان کے نامور مسلمانوں کو بلا طلب مفت بھیجی تھی۔ اس کے خلاف انجمن حمایت اسلام لاہور نے ایک میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجا تھا جو کہ بیسود ثابت ہوا۔ اس میں اس میموریل کی طرف اشارہ ہے۔

یکم اگست ۱۸۹۸ء ۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت اقدسؑ نے فرمایا :۔

خواب میں ہاتھ سے دانت کا گرانا مُنذر ہوتا ہے

"میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک ڈاڑھ کا حصّہ جو بوسیدہ ہوگئی ہے۔ اس کو میں نے منہ سے نکالا اور وُہ بہت صاف تھا۔ اور اُسے ہاتھ میں رکھا" پھر فرمایا کہ

"خواب میں دانت اگر ہاتھ سے گرایا جاوے تو وُہ مُنذِر ہوتا ہے ورنہ مبشر"

زاں بعد محمد صادق نے اپنے دو۲ خواب سُنائے جن میں سے ایک میں نُور کے کپڑوں کا ملنا اور دوسرے میں حضرت اقدسؑ کے دیئے ہوئے مضمون کا خوشخط نقل کرنا تھا۔ جس کی تعبیر حضرت اقدسؑ نے کامیابیٔ مقاصد فرمائی ۔

بعض تائیداتِ الٰہیہ بیّن ہوتی ہیں اور بعض مخفی

اس کے بعد حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ "تائیداتِ الٰہیہ ایک تو بیّن اور ظاہر طور پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور عام لوگ اُن کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر بعض مخفی تائیدات ایسی ہوتی ہیں۔ جن کے لئے میری سمجھ میں کوئی قاعدہ نہیں آتا کہ عوام النّاس کو کیونکر دکھا سکوں مثلاً یہی عربی تصنیف ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ عربی ادب میں مجھے کہانتک دسترس ہے۔ لیکن جب میں تصنیف کا سِلسلہ شروع کرتا ہوں تو یکے بعد دیگرے اپنے اپنے محل اور مَوقع پر موزُوں طور پر آنے والے الفاظ القا ہوتے جاتے ہیں۔ اب کوئی بتلائے کہ ہم کیونکر اس تائید الٰہی کو دکھلا سکیں کہ خدا کیونکر سینہ پر الفاظ نازل کرتا ہے۔ اور دیکھو اس ایّام الصّلح میں اکثر مضامین ایسے آئے ہیں۔ جن کا میری پہلی تصنیفات میں نام تک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس سے پہلے وُہ کبھی ذہن میں نہ گذرے تھے۔ لیکن اب وہ ایسے طور پر آکر قلب پر نازل ہوئے کہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جبتک خود تائید الٰہی شاملِ حال ہو کر اس کو اس قابل نہ بنا دیوے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔ جو وُہ ایسے بندوں پر کرتا ہے۔ جن سے کوئی کام لینا ہوتا ہے ۔

یہ بھی ایک سچی بات ہے کہ تصنیفات کے لئے جبتک صحت اور فراغت نہ ہو۔ یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل اُن لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ جن سے وُہ کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ پھر ان کو یہ سب سامان جو تصنیف کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یکجا جمع کر دیتا ہے "

جناب مولانا مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ کے دشمنوں کی طبیعت ۳۱ جولائی ۱۸۹۸ء سے بعارضہ دردِ شکم علیل تھی۔ تو حضرت اقدسؑ نے آدمی بھیج کر خبر منگوائی۔ اور افاقہ کی خبر سُنکر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا۔ اور فرمایا کہ

" مولوی صاحب کا سِن اب انحطاط کا ہے۔ اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے گویا پُھونک پُھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ زندگی اور مَوت تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لیکن انسان کو یہ بھی مُناسب نہیں کہ وُہ اسباب کی رعایت نہ رکھے"

پھر فرمایا۔ کہ :-

" دراصل انحطاط کا زمانہ ۴۰ سال کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ افراط اور تفریط اس سِن میں اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے بعض آدمی دیکھے ہیں کہ گِنا نپا آٹا دیتے اور پانی بھی اندازہ اور وزن کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ اور بعض یہانتک بڑھ جاتے ہیں۔ کہ ان کو کسی قسم کا اندازہ ہی نہیں رہتا۔ یہ دونو باتیں ٹھیک نہیں "

" جیسا میں نے کہا۔ زمانہ شباب تیس ۳۰ سال تک ہے اور یہ بھی اس صورت میں کہ قوی مضبوط اور تندرست ہوں۔ ورنہ بعض تو اوائل ہی میں تشبہ بالشیوخ رکھتے ہیں "

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۲-۲۳ صفحہ ۱۹ پرچہ ۶-۱۳ اگست ۱۸۹۸ء)

۲۴ اگست ۱۸۹۸ء کی شام۔ حضورؑ نے پوچھا کہ

" یہ موجودہ فلسفہ اکثر طبیعتوں میں بیدینی کیوں پیدا کر دیتا ہے "

اس پر ماسٹر غلام محمد صاحب سیالکوٹی نے کہا کہ " دراصل جو طبیعتیں پہلے ہی سے بیدینی

کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ وہی اس سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ ورنہ اکثر بڑے بڑے فلاسفر مزاج پادری اپنے مذہب میں پکّے ہوتے ہیں"

حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ :-

"ان باتوں پر غور کرنے کے بعد افسوس کے ساتھ ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو یہ پادری لوگ کالجوں اور سکولوں میں فلسفہ اور منطق پڑھاتے ہیں۔ اور دوسری طرف مسیح کو ابن اللہ اور اللہ مانتے ہیں۔ اور تثلیث وغیرہ عقائد کے قائل ہیں۔ جو سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیونکر اس کو فلاسفہ سے مطابق کرتے ہیں۔

عیسائی اصول فلسفہ استقراء کے مطابق نہیں

انگریزی منطق کی بنا تو منطق استقرائی ہی پر ہے۔ پھر یہ کونسا استقرا ہے کہ یسوع ابن اللہ ہے۔ کونسی شکل پیدا کرتے ہوں گے۔ یہی ہوگا کہ مثلاً اس قسم کے خواص جن لوگوں کے اندر ہوں وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہوتے ہیں۔ اور مسیح میں یہ خواص تھے۔ پس وہ بھی خدا یا خدا کا بیٹا تھا اس سے تو کثرت لازم آتی ہے۔ جو مُحال مطلق ہے۔ میں تو جب اس پر غور کرتا ہوں حیرت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ نہیں معلوم یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے؟

اسلامی اصُول فلسفہ استقراء کے مطابق ہیں

اسلام کے پاک اصُول ایسے نہیں ہیں کہ فلسفہ یا استقراء کی محک پر بھی کامل العیار ثابت نہ ہوں۔ بلکہ میں نے بارہا غور کی ہے کہ قرآن کریم کی نسبت جو آیا ہے فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ[1] (س ۲۷) یہ کتاب مکنون زمین اور آسمان کی چھپی ہوئی کتاب ہے۔ جس کے پڑھنے پر ہر شخص قادر نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن کریم اسی کتاب کا آئینہ ہے۔ اور قرآن کریم نے وہی خدا دکھایا ہے۔ جس پر آسمان و زمین شہادت دیتے ہیں۔ مگر یہ انیس سَو برس کا تراشا ہوا جعلی مُردہ خدا کس سند اور شہادت پر خدا بنایا گیا ہے۔ پس یہ اسلام ہی کی خوبی اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی فخر ہے کہ وہ ایسا دین لے کر آئے کہ جو ہمیشہ سے

[1] الواقعۃ : ۷۹

ہے اور جس کی تعلیم زمین اور آسمان کے اوراق میں بھی واضح طور پر موجود ہے"۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴-۲۵ صفحہ ۹ ۔ پرچہ ۲۰۔ ۲۷ اگست ۱۸۹۸ء)

موجودہ فارسی

۲۵ ر اگست کی صُبح کو فارسی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی نے کہا کہ " ایرانیوں نے آجکل اپنی توجہ تصنیفات کی طرف بہت مبذول کی ہے اور اس کثرت سے عربی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کہ بجز روابط کے فارسی زبان کو کم دخل دیتے ہیں ۔ اور باب مفاعلہ، انفعال ۔ استفعال وغیرہ کو اس قدر کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ عقل حیران ہوتی ہے"۔

اس پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ " فہمیدن وغیرہ قدیم زمانے میں استعمال کرتے تھے ۔ آجکل بہت کم استعمال رہ گیا"

پھر مولانا عبدالکریم صاحب نے عرض کیا کہ " جناب ! آج کل تو مفاہمہ، تفہیم وغیرہ ہی بولتے ہیں"

اس کے بعد اسی سلسلہ میں حضرتؑ نے فرمایا کہ :۔

عربی زبان کی وسعت

" عربی زبان بہت وسیع ہے ۔ اور ہر ایک قسم کی اصطلاحیں اس میں موجود ہیں۔ اور تصنیفات اس قدر کثرت سے ہو رہی ہیں ۔ کہ جن کا علم بجز خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا ۔ صرف حدیث ہی کو دیکھو کہ کوئی کامل طور پر دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ کہ اس نے علمِ حدیث کی کُل کتابوں کو دیکھا ہو"

پھر مولانا مولوی عبدالکریم صاحب نے علی سبیل الذکر فرمایا کہ " حال ہی میں مولوی نورالدین صاحب کے پاس مصر سے کتب خانہ خدیویہ کی ایک فہرست سات جلدوں میں آئی ہے ۔ وہ فہرست ایسے طور پر مرتب کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر بھی ایک مزا آتا ہے ۔ ایسے ڈھنگ پر کتابوں کے نمبر دیئے ہیں ۔ کہ ایک بالکل اجنبی بھی اگر لائبریری میں چلا جاوے تو وہ بلاتکلیف عین کتاب پر ہاتھ ڈالیگا

بشرطیکہ اُس نے فہرست کو ایکبار دیکھا ہو۔" اِس پر حضرت اقدسؑ نے پوچھا۔ کہ "وُہ کتابیں باہر جا سکتی ہیں؟" مولوی صاحب نے فرمایا۔ " ہاں۔ وُہ لائبریریاں ایسی نہیں۔ کتابیں نقل ہو سکتی ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔"

اِس پر جناب امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ کہ :۔

تائیدِ اسلام

" خدا تعالیٰ نے اسلام کی کس قدر تائید کی ہے۔ اگر کوئی نادان اِسلام کی اس تائیدِ الٰہی کا انکار کرتا ہے تو اُسے ماننا پڑیگا کہ کبھی بھی دُنیا میں خدا نے کسی کی تائید نہیں کی زبان کا اس قدر وسیع ہونا۔ اور پھر اس میں اس قدر کثرت سے تصنیفات کا ہونا بھی اِسلام ہی کی تائید ہے۔ کیونکہ قرآن شریف ہی کی تائید ہوئی ہے۔ کوئی اہلِ لغت جب کسی لفظ کے معنے لکھتا ہے تو اگر وُہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے تو ساتھ ہی اُس نے وُہ آیت بھی ضرور لکھ دی ہے۔"

یہاں مولانا عبد الکریم صاحب نے فرمایا۔ کہ " لسان العرب نے تو یہ طریق لازمی طور پر رکھا ہے"

پھر حضرتؑ نے اپنے سلسلۂ تقریر میں فرمایا۔ کہ :۔

"سنسکرت وغیرہ زبانیں تو قریباً مُردہ ہو گئی ہیں۔ نہ اُن میں تصنیفات ہیں نہ کچھ اور۔ ایسا ہی عیسائیوں کا حال ہے کہ اُن کی انجیل کو اصلی زبان کی طرف توجّہ ہی نہیں رہی"

پھر اسی سلسلہ میں حضورؑ نے فرمایا۔ کہ :۔

رسالت کی اصل غرض، آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے صحابہ کا مقابلہ

" مجھے حیرت ہوتی ہے کہ پھر اسلام سے کیوں پرخاش رکھی جاتی ہے۔ اسلام کا خُدا کوئی مصنوعی خدا نہیں۔ بلکہ وُہی قادر خدا ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور پھر رسالت کی طرف دیکھو۔ کہ اصل غرض رسالت کی کیا ہوتی ہے؟

اوّل یہ کہ رسُول ضرورت کے وقت آئے اور پھر اس ضرورت کو بوجہ احسن پُورا کرے۔ سو یہ فخر بھی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کو حاصل ہے۔ عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آئے۔ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی لوگ تھے۔ کھانے پینے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا نہ حقوق اللہ سے آگاہ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اُن کا نقشہ کھینچ کر بتلایا۔ کہ یَاْکُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ[1] پھر رسول اللہ صلی اللہ وسلّم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا۔ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا[2] (س ۱۹) کی حالت ہوگئی۔ یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گذار دیتے تھے۔ اللہ اللہ۔ کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سبب سے ایک بےنظیر انقلاب اور عظیم الشّان تبدیلی واقع ہوگئی۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزانِ اعتدال پر قائم کر دیا۔ اور مُردار خوار اور مُردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ دونوں ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا[2] (س ۱۹) اور علمی کا یہ حال کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیع زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ؂

دوسری طرف جب عیسائیوں کو دیکھتا ہوں۔ تو مجھے حیران ہی ہونا پڑتا ہے۔ کہ حواریوں نے عیسائی ہو کر کیا ترقی کی۔ یہوداہ اسکریوطی جو یسوع کا خزانچی تھا۔ کبھی کبھی تغلب بھی کر لیا کرتا تھا۔ اور تیس روپے لے کر اُستاد کو پکڑوانا تو اُس کا ظاہر ہی ہے۔ یسوع کی تھیلی میں دو ہزار روپے رہا کرتے تھے۔ ایک طرف تو اُن کا یہ حال ہے بالمقابل رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ حال کہ بوقتِ وفات پوچھا۔ کہ کیا گھر میں کچھ ہے۔ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایک دینار ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ اسے تقسیم کر دو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ کا رسُول خدا تعالیٰ کی طرف سفر کرے۔ اور گھر

[1] محمد : ۱۳ [2] الفرقان : ۶۵

میں ایک دینار چھوڑ جاوے "

مجھے تو حیران ہی ہونا پڑتا ہے کہ عیسائی لوگ فلسفہ فلسفہ پکارتے ہیں۔ اُن کی الٰہیات کی فلسفی خدا جانے کہاں گئی۔ کفّارہ ہی کو دیکھو۔ ایک تصوری جانور کی طرح ہے۔ کفّارہ نے کیا بنایا۔ علمی دلائل کو چھوڑ دیا جاوے۔ تو بھی دیکھو کہ حواریوں کی نہ تو علمی اصلاح ہوئی اور نہ عملی۔ علمی اصلاح کے لئے تو انجیل نے خود فیصلہ کر دیا کہ وہ موٹی عقل والے تھے۔ اور کم فہم اور لالچی تھے۔ اور عملی اصلاح کا خاکہ بھی انجیل ہی نے کھینچ کر دکھلا دیا کہ کوئی لعنتیں بھیجتا ہے اور کوئی تیس روپے پر پکڑواتا ہے اور کیا کچھ۔ گناہ کے آثار، تاریکی اور ظلمت تو اس دنیا ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے فرمایا۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[1]۔ الآیہ (پ۱۵)۔ اب یسوع کے شاگردوں کو دیکھو کہ کیا اُن کی حالت میں تبدیلی ہوئی۔ گناہ کے دُور ہونے سے تو ایک قسم کی بصیرت اور روشنی پیدا ہوتی ہے مگر اُن میں کہاں۔ پھر کفّارہ نے کیا بنایا۔" (الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴ و ۲۵، پرچہ ۲۰۔ ۲۷ اگست ۱۸۹۸ء)

۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ ۲۶ ستمبر کی صبح کو بعد نماز فجر حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ

جسقدر انسان کے تعلقات وسیع ہوتے ہیں اسی قدر اس کی خوابوں کا تعلق وسیع ہوتا ہے

" اب میری حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اگر کوئی خواب بھی آتا ہے تو میں اُسے اپنی ذات یا نفس سے مخصوص نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسلام اور اپنی جماعت ہی کے متعلق سمجھتا ہوں۔ اور میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اپنے نفس کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا چنانچہ رات میں نے دیکھا کہ ایک بڑا پیالہ شربت کا پیا۔ اس کی حلاوت اس قدر ہے۔ کہ میری طبیعت برداشت نہیں کرتی۔ بایں ہمہ میں اُس کو پیئے جاتا ہوں۔ اور میرے دل میں یہ خیال بھی گذرتا ہے کہ مجھے پیشاب کثرت سے آتا ہے۔ اتنا میٹھا اور کثیر شربت میں کیوں پی رہا ہوں۔ مگر اس پر بھی میں اس پیالے کو پی گیا۔ شربت سے مُراد کامیابی ہوتی ہے۔ اور

[1] بنی اسرائیل : ۷۳

یہ اسلام اور ہماری جماعت کی کامیابی کی بشارت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس قدر تعلقات انسان کے وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر سلسلہ اُس کے خواب کا بلحاظ تعلقات وسیع ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کلکتہ کا کوئی ایسا شخص ہو جس کو ہم جانتے بھی نہیں تو اس کے متعلق کوئی خواب بھی نہ آئے گی۔ چنانچہ کئی سال پہلے جب مجھے صرف چند آدمی جانتے تھے۔ اس وقت جو خواب آتی تھی وہ اُن تک ہی محدود ہوتی تھی۔ اور اب کئی ہزار سے تعلق رکھتی ہے۔"

اَدویات کے متعلق سلسلہ گفتگو کا چل پڑا۔ اور وہ اس تقریب پر کہ مولوی عبدالکریم صاحبؓ کو کوئی دوا حضرت اقدسؑ نے شب گذشتہ کو دی تھی۔ اس کے اثر کے متعلق حضرتؑ نے دریافت فرمایا۔ اسی ضمن میں ایسٹرن سیرپ اور کچلہ وغیرہ پر مختلف ذکر ہوتا رہا۔ اور ان کے خواص میں سے اعصاب کی تقویت کا تذکرہ ہوا۔ جس پر حضرت اقدسؑ کو مولانا مولوی عبدالکریم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ عَصَب کے لفظ میں فلاسفی بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ عَصَب کے معنی ہیں باندھنا۔ اور پٹھے بھی انسان کے اعضاء کو رسیوں کی طرح باندھے رکھتے ہیں۔ اور بالمقابل نَرْو کے لفظ میں بجز لفظ کے کچھ بھی نہیں اس پر حضرتؑ نے فرمایا:۔

رسُول اللہؐ کا مُعجزہ

"یہ بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مُعجزہ ہے کہ الفاظ کے اندر علمی باتیں بھری ہوئی ہیں۔ اور عربی زبان اسی لئے خاتم الالسنہ ہے۔ چونکہ قرآن جیسا عظیم الشّان معجزہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیا۔ اِس لئے اس کی عظمت علمی پہلو سے بہت بڑی ہے۔"

پھر اسی کے ضمن میں مِنَن الرحمٰن کی اشاعت کے متعلق تذکرہ ہوتا رہا۔ حضرت نے فرمایا۔ کہ "بعض اسباب اور سامان کے بہم پہنچ جانے پر جو اس کے لئے ضروری ہیں۔ شائع ہوگی۔"

پھر اسی ذکر میں آپؑ نے فرمایا۔ "میں نے بارہا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے نشان مجھے دیئے ہیں اور جن کو میں نے بڑے دعوے کے ساتھ متعدد مرتبہ لکھا اور شائع کیا ہے"

اپنی صداقت پر چار قسم کے نشانات

اوّل۔ عربی دانی کا نشان ہے۔ اور یہ اُس وقت سے مجھے ملا ہے۔ جب سے کہ محمد حسین (بٹالوی صاحب) نے یہ لکھا کہ یہ عاجز عربی کا ایک صیغہ بھی نہیں جانتا۔ حالانکہ ہم نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا کہ عربی کا صیغہ آتا ہے۔ جو لوگ عربی اِملا اور اِنشار میں پڑے ہیں۔ وُہ اس کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور اُس کی خوبیوں کا لحاظ رکھ سکتے ہیں۔ مولوی صاحب (مولوی عبدالکریم صاحب سے مُراد تھی) شروع سے دیکھتے رہے ہیں کہ کِس طرح پر اللہ تعالیٰ نے اعجازی طور پر مدد دی ہے۔ بڑی مشکل آ کر یہ پڑتی ہے۔ جب ٹھیٹھ زبان کا لفظ مُناسب موقع پر نہیں مِلتا۔ اس وقت خدا تعالیٰ وُہ الفاظ القار کرتا ہے۔ نئی اور بناوٹی زبان بنا لینا آسان ہے۔ مگر ٹھیٹھ زبان مشکل ہے۔ پھر ہم نے ان تصانیف کو بیش قرار انعامات کے ساتھ شائع کیا ہے اور کہا ہے کہ تم جس سے چاہو۔ مدد لے لو۔ اور خواہ اہلِ زبان بھی ملا لو۔ مجھے خدا تعالیٰ نے اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ وُہ ہرگز قادر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ نشان قرآن کریم کے خوارق میں سے ظِلّی طور پر مجھے دیا گیا ہے۔

دوم۔ دُعاؤں کا قبول ہونا۔ میں نے عربی تصانیف کے دَوران میں تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ کہ کس قدر کثرت سے میری دُعائیں قبول ہوئی ہیں۔ ایک ایک لفظ پر دُعا کی ہے۔ اور میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو مُستثنیٰ کرتا ہوں (کیونکہ اُن کی طفیل اور اقتدار سے تو یہ سب کچھ ملا ہی ہے) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میری دُعائیں اس قدر قبول ہوئی ہیں کہ کسی کی نہیں ہوئی ہوں گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دس ہزار یا دو لاکھ یا کتنی۔ اور بعض نشانات قبولیّت کے تو ایسے ہیں کہ ایک عالَم اُن کو جانتا ہے۔

تیسرا نشان پیشگوئیوں کا ہے یعنی اِظہار علی الغَیب۔ یُوں تو نجومی اور رمّال لوگ بھی اٹکل بازیوں سے بعض باتیں ایسی کہہ دیتے ہیں۔ کہ اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ٹھیک ہوتا ہے اور ایسا ہی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے۔ کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کاہن لوگ

تھے جو غیب کی خبریں بتلاتے تھے چنانچہ سطیح بھی ایک کاہن تھا۔ مگر ان اٹکل باز رمالوں اور کاہنوں کی غیب دانی اور مامور من اللہ اور ملہم کے اظہارِ غیب میں یہ فرق ہوتا ہے۔ کہ ملہم کا اظہارِ غیب اپنے اندر الٰہی طاقت اور خدائی ہیبت رکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم نے صاف طور پر فرمایا ہے۔ لَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1] یہاں اظہار کا لفظ ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک شوکت اور قوت ہوتی ہے۔

چوتھا نشان قرآن کریم کے دقائق اور معارف کا ہے۔ کیونکہ معارفِ قرآن اس شخص کے سوا اور کسی پر نہیں کھل سکتے۔ جس کی تطہیر ہو چکی ہو۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[2] میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میرے مخالف بھی ایک سورۃ کی تفسیر کریں اور میں بھی تفسیر کرتا ہوں۔ پھر مقابلہ کر لیا جاوے۔ مگر کسی نے جرأت نہیں کی۔ محمد حسین وغیرہ نے تو یہ کہہ دیا کہ ان کو عربی کا صیغہ نہیں آتا۔ اور جب کتابیں پیش کی گئیں تو بودے اور رکیک عذر کر کے ٹال دیا کہ یہ عربی تو اردی کچالو ہے۔ مگر یہ نہ ہو سکا کہ ایک صفحہ ہی بنا کر پیش کر دیتا۔ اور دکھا دیتا کہ عربی یہ ہے۔

غرض یہ چار نشان ہیں جو خاص طور پر میری صداقت کے لئے مجھے ملے ہیں۔"

(الحکم جلد ۲۔ نمبر ۲۸، ۲۹۔ پرچہ ۲۰-۲۷ ستمبر ۱۸۹۸ء)

۳۔ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔ ۳ اکتوبر کی صبح کو بعد نماز فجر فرمایا۔ کہ

ہر ایک امر کی عظمت اور عدم عظمت اُس کے حصول کے لوازمات اور مشکلات پر ہوتی ہے

"رات کو بعد تہجد لیٹ گیا تو تھوڑی سی غنودگی کے بعد دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سرمہ چشم آریہ کے چار ورق ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ آریہ لوگ اب خود اس کتاب کو چھپوا رہے ہیں"۔ تعبیر میں فرمایا۔ کہ "شاید اس سے یہ مراد ہو کہ آریہ لوگوں کو جو بعض حجاب اور وساوس ہماری پیشگوئیوں مثل پیشگوئی متعلقہ لیکھرام وغیرہ کے متعلق ہیں۔ وہ دور ہو جاویں۔ اور ان

[1] الجن: ۲۷، ۲۸ [2] الواقعۃ: ۸۰

پر اصل حقیقت کا انکشاف ہو جاوے۔ مقدمہ کلارک میں رام بھجدت وکیل آریہ تھا جب امرت سر کے سٹیشن پر مجھ سے ملا تو اُس نے صاف کہا کہ میں بلا فیس اس مقدمہ میں اس لئے گیا تھا کہ شاید قتل لیکھرام کا کوئی سُراغ ملے۔ کیونکہ اُس کے قتل کا یقین ہم کو آپ پر تھا۔ ایسا ہی اَور اقوام کو ایسا خیال ہو سکتا ہے۔ پس اِس خواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ اُن پر اصل حقیقت کھول کر حجتِ مُلزمہ قایم کر دے۔" پھر فرمایا۔ کہ "پٹی والے جو اشتہار دکھائے گئے تھے۔ اُس میں بھی یہی تھا۔ کہ وُہ لوگ خود چھپوا رہے ہیں"۔

اس پر مولانا مولوی نورالدین صاحبؓ نے فرمایا کہ جب وُہ امر پُورا ہوگا۔ جس قدر عظمت اور قدر ہم کو ہوگی اور لوگوں کو کہاں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کیسے مُشکلات درپیش ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ کہ

"بیشک صِرف اسی میں نہیں بلکہ ہر دُعا اور پیشگوئی کی عظمت اور قبولیت میں یہی حال ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی لق و دق میدان میں جہاں ہزارہا کوس تک پانی نہیں ملتا۔ کوئی شخص دُعا کرے اور خدا تعالیٰ اپنے فضل سے اُسے پانی کا پیالہ عطا کرے۔ تو اس اَمر کو مجمل طور پر اُن مُشکلات اور لوازمات کو نظرانداز کر کے بیان کیا جاوے۔ تو لوگ جو کُل حالات پر آگاہ نہیں بجائے عظمت کے ہنسی کرینگے۔ مگر جب مُشکلات سے واقف ہوں تو پھر ایک خاص عظمت اور ہیبت سے اُس کو دیکھیں گے۔ ایسا ہی اگر کوئی ناخواندہ اور اُمّی آدمی انگریزی کی کتاب پڑھ جاوے۔ تو اس کی اُمّیت سے واقف لوگ اُسے عظمت کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر ایک ایم۔ اے اور بی۔ اے اگر اُس کتاب کو پڑھ جاوے تو چنداں کیا، بالکل وقعت نہ دیں گے۔ معمولی امر خیال کریں گے۔

غرض ہر ایک اُمر کی عظمت اور عدمِ عظمت اس کے حصُول کے لوازمات اور مشکلات پر ہوتی ہے۔" پھر فرمایا۔ کہ

"لوگ اس امر کو بھی جھُوٹ جانیں گے۔ جو ہم نے لکھ دیا ہے کہ میری تیس ہزار دُعائیں کم از کم قبول ہوئی ہیں۔ مگر میرا خدا خوب جانتا ہے کہ یہ سچ ہے۔ اور اس میں ذرا بھی جھُوٹ

نہیں۔ کیونکہ ہر ایک کام کے لئے خواہ دینی ہو یا دُنیوی۔ دُعا کی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے موزوں اور طیّب بنا دیا ہے۔

عربی تصنیفات میں ایک ایک لفظ دُعا ہی کا اثر ہے

عربی تصنیفات میں ایک ایک لفظ دُعا ہی کا اثر ہے ورنہ انسانی طاقت کا کام نہیں۔ کہ تحدی کرے۔ اگر دُعا کا اثر نہیں تو پھر کیوں کوئی مولوی یا اہلِ زبان دَم نہیں مار سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اہلِ زبان کے رنگ اور محاورہ پر ہماری کُتب تصنیف ہوئی ہیں۔ ورنہ اہلِ زبان بھی سارے اس پر قادر نہیں ہوتے کہ کُل مسلّم محاورات زبان پر اطلاع رکھتے ہوں۔ پس یہ خدا ہی کا فضل ہے۔"

۲؍جنوری ۱۸۹۹ء۔ ۸ بجے دن کے حضرت اقدس امام ہمام ایک کثیر التعداد احباب کے ہمراہ سَیر کو تشریف لے گئے۔ اثنائے راہ میں فرمایا:۔

مخالفوں کی بدزبانی اور جھوٹی مخبریاں

"یہ تکالیف اور ایذائیں جو مخالف کبھی بدزبانیوں کے رنگ میں اور جھُوٹ اور افتراء سے بھرے ہوئے اشتہاروں کے ذریعے اور کبھی گورنمنٹ اور حکومت کو خلافِ واقعہ اور محض جھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے بدظن کرکے ہم کو پہنچاتے ہیں۔ اگر ہماری اپنی ہی ذات تک محدود اور مخصوص ہوتیں تو خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم کو ذرا بھی خیال نہ ہوتا۔ کیونکہ ہم تو قربانی کے بکرے کی طرح اللہ تعالےٰ کی راہ میں ہر وقت تیار ہیں۔ مگر اس کا اثر ہماری قوم پر پہنچتا ہے اور بعض لوگ ابھی ایسے کمزور بھی ہیں جو ابتلا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کُل حالات کو چھاپ کر گورنمنٹ کے پاس بھیجدیں۔ کیونکہ اگر ہم خاموش رہیں۔ تو ادھر مخالف ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ پھر اس کا اثر اچھّا نہیں پڑتا۔ چونکہ ہمارے دل صاف ہیں اور ہم بدباطن لوگوں کی طرح نفاق اور مداہنت سے کام نہیں لیتے۔ اس لئے ہم کو کامل امید ہے کہ یہ رسالہ کشف الغطاء گورنمنٹ عالیہ کو ہمارے حالات اور ہمارے تعلقات سے

اطلاع دے گا۔ اور ہمارے ہر دوست کے پاس بطور سارٹیفکیٹ کے رہے گا؟

۵ جنوری ۱۸۹۹ء۔ بعد نماز صبح مولوی قطب الدین صاحب ساکن بدوملہی نے سوال کیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کتفین مبارک کے درمیان جو مُہرِ نبوت بتلائی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ رسولی کی طرح تھی۔ اُس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

مُہرِ نبوت کی اصل حقیقت

فرمایا:۔ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہرِ نبوت کے متعلق جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بالکل غلط بات ہے۔ مگر میں یہ بات اپنے سچے جوش اور اخلاص سے کہتا ہوں کہ میرا ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نشان نبوت کو رسولی وغیرہ الفاظ سے نسبت دینا ایک مومن اور سچے مسلمان کا کام نہیں۔ یہ گستاخی اور شوخی ہے جو کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم کو ایسے معاملات میں زیادہ تفتیش اور چھان بین کی ضرورت نہیں کہ وہ مُہرِ نبوت کیا تھی؟ اور کیسی تھی؟ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے بیشمار نشانات بیّن اور واضح طور پر رکھے تھے۔ اُن میں سے ایک مُہرِ نبوت بھی تھی؛

دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجُود باجُود سے انبیاء علیہم السلام کو ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ہلال کو بدر سے ہوتی ہے۔ ہلال کا وجود ایک تاریکی میں ہوتا ہے۔ لیکن جب وُہ اپنے کمال کو پہنچکر بدر بن جاتا ہے تو وہ بدر اپنی پہلی حالت ہلال کا مُثبت اور مُصدق ہو جاتا ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو پہلے نبی اور ان کی نبوتوں کے پہلو مخفی رہتے؛

موجُودہ اناجیل اور توحید

اب سوچو اور بتلاؤ کہ کیا موجُودہ اناجیل سے انسان طریق توحید کا پتہ لگا سکتا ہے کیسی حیران کردینے والی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا نبی اُس کی توحید کو قائم کرنے آیا کرتا ہے یا اپنی

خدائی منوانے؟ پس اب موجودہ انجیل نے یہی نہیں کہ طریق توحید کو گم کیا بلکہ ساتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور نبوت کو اُڑا دیا۔ اور چہ جائیکہ وُہ خدا یا ابنِ خدا بنتے۔ اُن کو نبی کے درجہ سے بھی گرا کر معاذ اللہ بہت بُرے درجہ کا آدمی بنا دیا۔ مگر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی پاک ذات نے آکر اُن کی تعلیم کو زندہ کیا۔ اور خود مسیح کی اپنی ذات اور وجود کے لئے مسیحائی کی کہ اس کو مُردوں سے نکال کر اس زندگی میں داخل کیا۔ جو اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ بندوں اور رسُولوں کو دی جاتی ہے۔

کونسی تعلیم کامل ہوسکتی ہے؟

تعلیم وُہی کامل ہوسکتی ہے جو انسانی قویٰ کی پُوری مربّی اور متکفّل ہو۔ نہ یہ کہ ایک ہی پہلُو پر واقع ہوئی ہو۔ انجیل کی تعلیم کو دیکھو کہ وُہ کیا کہتی ہے۔ اور اُس کے بالمقابل قویٰ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ انسانی قویٰ اور فطرت خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب ہے۔ پس اس کی قولی کتاب جو کتاب اللہ کہلاتی ہے یا اُسے تعلیم الٰہی کہو۔ اس کی ساخت اور بناوٹ کے مخالف اور متضاد کیونکر ہوگی؟ اسی طرح پر اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نہ آتے۔ تو انبیاء سابقین کے اخلاق، ہدایات، معجزات اور قوت قدسیہ پر اعتراض ہوتے مگر حضورؐ نے آکر اُن سب کو پاک ٹھیرایا۔ اس لئے آپ کی نبوّت کے نشانات سُورج سے زیادہ روشن ہیں۔ اور بے انتہا اور بے شمار ہیں۔ پس آپ کی نبوّت یا نشاناتِ نبوّت پر اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ دن چڑھا ہوا ہو۔ اور کوئی احمق نابینا کہدے کہ ابھی تورات ہی ہے میں پھر کہتا ہوں کہ دوسرے مذاہب تاریکی ہی میں رہتے اگر اب تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نہ آتے۔ ایمان تباہ ہو جاتا اور زمین لعنت اور عذاب الٰہی سے تباہ ہو جاتی۔ اسلام شمع کی طرح منوّر ہے جس نے دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالا ہے۔ توریت کو پڑھو تو بہشت اور دوزخ کا پتہ ہی ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انجیل کو دیکھو تو توحید کا نشان نہیں ملتا۔ اب بتلاؤ کہ اس میں تو شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے تھیں اور ہیں۔

لیکن اُن میں کونسی روشنی رل سکتی ہے۔ سچّی روشنی اور حقیقی نُور جو نجات کے لئے مطلوب ہے وُہ اِسلام ہی میں ہے۔ توحید ہی کو دیکھو کہ جہاں سے قرآن کو کھولو وہ ایک شمشیرِ برہنہ نظر آتا ہے کہ شرک کی جڑھ کاٹ رہا ہے۔ ایسا ہی نبوّت کے تمام پہلو ایسے صاف اور روشن نظر آتے ہیں۔ کہ اُن سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

ختمِ نبوّت

ختمِ نبوّت کو یُوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں پر دلائل اور معرفت طبعی طور پر ختم ہو جاتے ہیں وُہ وہی حد ہے جس کو ختمِ نبوّت کے نام سے موسُوم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مُلحدوں کی طرح نکتہ چینی کرنا بے ایمانوں کا کام ہے۔ ہر بات میں بیّنات ہوتے ہیں اور اُن کا سمجھنا معرفت کاملہ اور نُورِ بصر پر موقوف ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری سے ایمان اور عرفان کی تکمیل ہوئی۔ دوسری قوموں کو روشنی پہنچی۔ کسی اور قوم کو مبیّن اور روشن شریعت نہیں ملی۔ اگر ملتی تو کیا وُہ عرب پر اپنا کچھ بھی اثر نہ ڈال سکتی۔ عرب سے وہ آفتاب نکلا کہ اس نے ہر قوم کو روشن کیا اور ہر بستی پر اپنا نُور ڈالا۔ یہ قرآن کریم ہی کو فخر حاصل ہے کہ وہ توحید اور نبوّت کے مسئلہ میں کُل دنیا کے مذاہب پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ یہ فخر کا مقام ہے کہ ایسی کتاب مسلمانوں کو ملی ہے، جو لوگ حملہ کرتے ہیں اور تعلیم و ہدایت اسلام پر معترض ہوتے ہیں۔ وہ بالکل کور باطنی اور بے ایمانی سے بولتے ہیں۔

تعدّدِ ازدواج

مثلاً تعدّدِ ازدواج پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت عورتوں کی اجازت دی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا کوئی ایسا دلیر اور مردِ میدان معترض ہے جو ہم کو یہ دکھلا سکے۔ کہ قرآن کہتا ہے کہ ضرور ضرور ایک سے زیادہ عورتیں کرو۔ ہاں یہ ایک سچّی بات ہے اور بالکل طبعی امر ہے کہ اکثر اوقات انسان کو ضرورت پیش آجاتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں کرے مثلاً عورت اندھی ہو گئی یا کسی اور خطرناک مرض میں مُبتلا ہو کر اس قابل ہو گئی کہ خانہ داری

کے اُمور سر انجام نہیں دے سکتی۔ اور مرد از راہِ ہمدردی یہ بھی نہیں چاہتا کہ اُسے علیحدہ کرے۔ یا رحم کی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو کر مرد کی طبعی ضرورتوں کو پُورا نہیں کر سکتی تو ایسی صورت میں اگر نکاح ثانی کی اجازت نہ ہو تو بتلاؤ کیا اس سے بدکاری اور بداخلاقی کو ترقی نہ ہوگی؟ پھر اگر کوئی مذہب و شریعت کثرت ازدواج کو روکتی ہے تو یقیناً وُہ بدکاری اور بداخلاقی کی مؤید ہے۔ لیکن اسلام جو دُنیا سے بداخلاقی اور بدکاری کو دُور کرنا چاہتا ہے۔ اجازت دیتا ہے کہ ایسی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ ایسا ہی اولاد کے نہ ہونے پر جبکہ لاولد کے پس مرگ خاندان میں بہت سے ہنگامے اور کُشت و خون ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایک ضروری امر ہے کہ وُہ ایک سے زیادہ بیویاں کرکے اولاد پیدا کرے۔ بلکہ ایسی صورت میں نیک اور شریف بیبیاں خود اجازت دے دیتی ہیں۔ پس جسقدر غور کروگے یہ مسئلہ صاف اور روشن نظر آئیگا۔ عیسائی کو تو حق ہی نہیں پہنچتا کہ اس مسئلہ پر نکتہ چینی کرے۔ کیونکہ اُن کے مسلمہ نبی اور مُلہم بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بزرگوں نے سات سات سَو اور تین تین سَو بیبیاں کیں اور اگر وُہ کہیں کہ وُہ فاسق فاجر تھے تو پھر ان کو اس بات کا جواب دینا مشکل ہوگا کہ اُن کے الہام خدا کے الہام کیونکر ہو سکتے ہیں؟ عیسائیوں میں بعض فرقے ایسے بھی ہیں جو نبیوں کی شان میں ایسی گستاخیاں جائز نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں انجیل میں صراحت سے اس مسئلہ کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔ لنڈن کی عورتوں کا زور ایک باعث ہو گیا کہ دوسری عورت نہ کریں۔ پھر اس کے نتائج خود دیکھ لو۔ کہ لنڈن اور پیرس میں عفّت اور تقویٰ کی کیسی قدر ہے۔

اسلامی جہاد

ایسا ہی دوسرے مسائل غُلامی اور جہاد پر بھی ان کے اعتراض درست نہیں۔ کیونکہ توریت میں ایک لمبا سلسلہ ایسی جنگوں کا چلتا ہے۔ حالانکہ اسلام کی لڑائیاں ڈیفنسو (دفاعی) تھیں۔ اور وُہ صرف دس سال ہی کے اندر ختم ہو گئیں۔ میں دعوے سے کہتا

ہوں کہ یہ مسائل اُن کی کتابوں میں سے نکال سکتا ہوں۔ اور ایسے ہی میرا دعویٰ ہے کہ تمام صداقتیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اگر کوئی مدّعی ایسی صداقت پیش کرے کہ وُہ قرآن میں نہیں۔ میں اُسے نکال کر دکھانے کو تیار ہوں۔ اسلامی شریعت نے وہ مسائل لئے ہیں جو طبعی اور فطرتی طور پر انسان کے لئے مطلوب ہیں۔ اور جو ہر پہلو سے اُس کے قویٰ کی تربیت کرتے ہیں۔ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں! اِسلام کے جو اعتراض غیر مذاہب پر ہیں وُہ ان کا جواب نہیں دے سکتے۔

اِستہزاء سے کُفر کا اندیشہ ہے

پس مَیں پھر کہتا ہوں کہ میری باتوں کو استخفاف اور استہزاء کی نظر سے نہ دیکھیں استہزاء سے کُفر کا اندیشہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا ادب اور خوف ہونا چاہیئے۔ ہر ایک عارف ان باتوں کے ہزارہا جواب دے سکتا ہے۔ کیا چہروں میں ایسی علامات نہیں ہوتیں جن کو دیکھ کر ہم ایک سعید اور شقی، بدمعاش اور خوش اطوار میں تمیز کر سکتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت لکھا ہے کہ ایک شخص نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ یہ جھُوٹوں کا منہ نہیں۔ اب وُہ کونسا نشان تھا جو جھوٹوں میں ہوتا ہے۔ اور آپ میں نہ تھا۔ ایک امتیاز تو تھا۔ جس کو بصیرت والا انسان دیکھ سکتا ہے۔ ایسا ابلہ اور احمق کون ہے جو نیک اور بد کو چہرہ سے دیکھ کر تمیز نہیں کر سکتا۔ مومن کا چہرہ اور ہر عضو اس کو ایک امتیاز بخشتا ہے اور اس کے باخدا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مُہر نبوّت میں ایک خصوصیت ہو تو بتلاؤ اس سے کیا استبعاد لازم آتا ہے۔ سب کچھ ممکن ہے۔

بحث اصُول پر ہونی چاہیئے

بالآخر یہ یاد رکھو کہ یہ ایک فرعی بات ہے۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ ان باتوں میں پڑیں اصول پر بحث ہونی چاہیئے۔ اصول کے اثبات پر فرع خود ہی ثابت ہو جاتی ہے۔ ایمان لانا

ضروری ہے۔ اس کی کیفیت اور کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں۔ دشمن اگر گفتگو کرے تو ہم اُس کو روک سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اور اُس کی صفات پر، ملائکہ اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام وغیرہ اُمور ایمانی پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان سب باتوں کا ماننا اصول ہے۔ اور باقی امور اُن پر متفرع ہیں۔ اور یہ سب صفائی کے ساتھ ثابت شدہ صداقتیں ہیں۔ تعلیم اسلام ایسی صاف ہے کہ ہر قوت کو اعتدال اور عین محل پر رکھتی اور تربیت کرتی ہے اور یہ عظیم الشان معجزہ ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ دوسری تعلیمیں ایسی نہیں۔ کسی کا ناک نہیں تو کسی کے کان نہیں ہیں۔ غرض وہ ناقص اور ادھوری ہیں۔ مکمل خلقت تعلیم اسلام ہی کی ہے۔ توحید، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت اور اخلاق فاضلہ، تکمیل نفس وغیرہ ضروری امور جن کا انسان محتاج ہے۔ وہ ایسے کامل اور روشن طور پر بیان ہوئے ہیں کہ ان میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ باقی امور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر کھاتے تھے؟ کتنے بڑے نوالے لیتے تھے۔ ان جھگڑوں میں پڑنے کی مومن کو کیا ضرورت ہے؟ مدارِ نجات ان باتوں پر نہیں ہے۔ ایسی باتیں جو اثر کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ نبوت حقہ کے خلاف نہیں بلکہ مشابہ ہیں تو ایمان لائیں ورنہ تاویل کریں۔ کچھ ضرورت نہیں کہ اس پر چُنیاں اور چُنیں کر کے لمبی اور فضول بحثوں میں پڑیں

خاتم النبیین کے معنی

ختم نبوت کے متعلق میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ خاتم النبیین کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے اُمور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ موٹے اور ظاہر معنے ہیں۔ دوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا۔ اور نبوت ختم ہو گئی۔ اس لئے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ [1] کا مصداق اسلام ہو گیا۔ غرض یہ نشانات نبوت ہیں۔ اُن کی کیفیت اور کُنہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصول

[1] المآئدہ : ۴

صاف اور روشن ہیں اور وُہ ثابت شدہ صداقتیں کہلاتی ہیں۔ ان باتوں میں پڑنا مومن کو ضروری نہیں۔ ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی مخالف اعتراض کرے تو ہم اُس کو روک سکتے ہیں۔ اگر وُہ بند نہ ہو تو ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اپنے جُزوی مسائل کا ثبوت دے۔ الغرض **مُہرِ نبوّت** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے نشانِ نبوّت میں سے ایک نشان ہے جس پر ایمان لانا ہر مسلمان مؤمن کو ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۹ پرچہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء)

۵ جنوری ۱۸۹۹ء - (سوال مولوی قطب الدین صاحب) "رُوح کا تعلق جو قبور سے بتلایا گیا ہے۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟"

رُوح کا تعلّق قبور سے

فرمایا "اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ارواح کے تعلق قبور کے متعلق احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں آیا ہے وُہ بالکل سچ اور درست ہے۔ ہاں یہ دُوسرا امر ہے کہ اس تعلق کی کیفیت اور کُنہ کیا ہے؟ جس کے معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ہمارا فرض ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ اس قسم کا تعلق قبور کے ساتھ ارواح کا ہوتا ہے اور اس میں کوئی مُحالِ عقلی لازم نہیں آتا۔

اور اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ درحقیقت یہ امر اسی قسم کا ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اُمور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کو ذرا وسیع کر کے ہم یوں کہتے ہیں کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقے رکھے ہیں۔ بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتا ہے اور بعض ایسی ہیں۔ کہ حِسّ مشترک سے ان کا سراغ چلتا ہے۔ اور کتنی ہی سچائیاں ہیں کہ وہ مرکزِ قوٰی یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صداقت کے معلوم کرنے کے لئے مختلف طریق اور

ذریعے رکھے ہیں۔ مثلاً مصری کی ایک ڈلی کو اگر کان پر رکھیں تو وُہ اس کا مزہ معلوم نہ کر سکیں گے اور نہ اُس کے رنگ کو بتلا سکیں گے۔ ایسا ہی اگر آنکھ کے سامنے کریں گے تو وُہ اس کے ذائقہ کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے گی۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لئے مختلف قویٰ اور طاقتیں ہیں۔ اب آنکھ کے متعلق اگر کسی چیز کا ذائقہ معلوم کرنا ہو اور وُہ آنکھ کے سامنے پیش ہو۔ تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اس چیز میں کوئی ذائقہ ہی نہیں۔ یا آواز نکلتی ہو اور کان بند کر کے زبان سے وُہ کام لینا چاہیں تو کب ممکن ہے۔ آج کل کے فلسفی مزاج لوگوں کو یہ بڑا دھوکا لگا ہوا ہے۔ کہ وُہ اپنے عدم علم کی وجہ سے کسی صداقت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں دیکھا جاتا ہے کہ سب کام ایک شخص نہیں کرتا بلکہ جُداگانہ خدمتیں مقرر ہیں۔ سقہ پانی لاتا ہے۔ دھوبی کپڑے صاف کرتا ہے۔ باورچی کھانا پکاتا ہے۔ غرضیکہ تقسیم محنت کا سلسلہ ہم انسان کے خود ساختہ نظام میں بھی پاتے ہیں۔ پس اس اصل کو یاد رکھو کہ مختلف قوتوں کے مختلف کام ہیں۔ انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے۔ اور طرح طرح کی خدمتیں اس کی تکمیل کے لئے ہر ایک قوت کے سپرد ہیں۔ نادان فلسفی ہر بات کا فیصلہ اپنی عقل خام سے چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط محض ہے۔ تاریخی اُمور تو تاریخ ہی سے ثابت ہوں گے۔ اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدُوں تجربۂ صحیحہ کے کیونکر لگ سکے گا۔ امور قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اسی طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں۔ انسان دھوکہ میں مُبتلا ہو کر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب ہی محروم ہو جاتا ہے جبکہ وُہ ایک ہی چیز کو مختلف اُمور کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔ میں اس اصول کی صداقت پر زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ ذرا سے فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور روزمرہ ہم ان باتوں کی سچائی دیکھتے ہیں۔ پس جب رُوح جسم سے مفارقت کرتی ہے یا تعلق پکڑتی ہے۔ تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مُبتلا نہ ہوتے۔ اسی

طرح قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے۔ یہ ایک صداقت تو ہے۔ مگر اس کا پتہ دینا اِس آنکھ کا کام نہیں۔ یہ کشفی آنکھ کا کام ہے کہ وُہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پتلا اتنا ہی بتلائے کہ رُوح کا وجُود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا۔ تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اس سفید چیز کا ذائقہ بتلائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی۔ چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو روح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں۔ اور رُوح فی الخارج ان کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاسیر رُوح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی چشمۂ نبوّت سے ملی ہیں۔ اور نِرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے۔ تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پر چشمۂ نبوّت سے کچھ لے کر کہا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ رُوح کے متعلق علوم چشمۂ نبوّت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ اَرْوَاح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اُسی چشم سے دیکھنا چاہئے اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے۔ کہ اس تودۂ خاک سے رُوح کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشف قبور ہو سکتا ہے۔ وُہ اُن تعلقات کو دیکھ سکتا ہے ٭

ہم ایک بات مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک نمک کی ڈلی اور ایک مصری کی ڈلی رکھی ہو۔ اب عقل محض اُن پر کیا فتویٰ دے سکے گی۔ ہاں اگر اُن کو چکھیں گے تو جُدا گانہ مزوں سے معلوم ہو جاوے گا۔ کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری ہے۔ لیکن اگر حسِ لسان ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا فیصلہ کوئی کیا کرے گا؟ پس ہمارا کام صرف دلائل سے سمجھا

دیتا ہے۔ آفتاب کے چڑھنے میں جیسے ایک اندھے کے انکار سے فرق نہیں آسکتا اور ایک مسلوب القوۃ کے طریق استدلال سے فائدہ نہ اٹھانے سے اس کا ابطال نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پر اگر کوئی شخص کشفی آنکھ نہیں رکھتا۔ تو وہ اُس تعلق ارواح کو کیونکر دیکھ سکتا ہے؟ پس اُس کے انکار سے محض اِس لئے کہ وُہ دیکھ نہیں سکتا۔ اس کا انکار جائز نہیں ہے۔ ایسی باتوں کا پتہ نری عقل اور قیاس سے کچھ نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لئے انسان کو مختلف قویٰ دیئے ہیں۔ اگر ایک ہی سب کام دیتا تو پھر اس قدر قویٰ کے عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی؛ بعض کا تعلق آنکھ سے ہے اور بعض کا کان سے بعض زبان سے متعلق ہیں اور بعض ناک سے، مختلف قسم کی حِسّیں اِنسان رکھتا ہے۔ قبور کے ساتھ تعلق ارواح کے دیکھنے کے لئے کشفی قوت اور حِس کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو وُہ غلط کہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد کروڑہا اولیاء و صُلحاء کا سلسلہ دُنیا میں گذرا ہے۔ اور مجاہدات کرنے والے بیشمار لوگ ہو گذرے ہیں۔ اور وہ سب اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔ گو اس کی اصلیت اور تعلقات کی وجہ عقلی طور پر ہم معلوم کر سکیں یا نہ، مگر نفسِ تعلق سے انکار نہیں ہو سکتا۔ غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کئے دیتے ہیں۔ کان اگر نہ دیکھ سکیں تو ان کا کیا قصور؟ وہ اَور قوت کا کام ہے۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں۔ کہ رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے۔ رُوح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے۔ یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے۔ بجز اس فرقہ کے جو نفیِ بقائے رُوح کرتا ہے۔ اور یہ امر کہ کس جگہ تعلق ہے کشفی قوت خود ہی بتلادے گی۔ جیالوجسٹ (عالمِ علم طبقات الارض) بتلادیتے ہیں کہ یہاں فلاں دھات ہے اور وہاں فلاں کان ہے۔ دیکھو ان میں یہ ایک قوت ہوتی ہے جو فی الفور بتلادیتی ہے۔ پس یہ بات

ایک سچی بات ہے کہ ارواح کا تعلق قبور سے ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اہلِ کشف توجہ سے میت کے ساتھ کلام بھی کر سکتے ہیں۔ اور اوہام اور اعتراضوں کا سلسلہ تو ایسا لمبا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ (الحکم جلد ۳۔ نمبر ۳۔ صفحہ ۲-۳۔ پرچہ ۲۳ر جنوری ۱۸۹۹ء)

دُعا سے کیا ملتا ہے؟

"اگر دُعا نہ ہوتی تو کوئی انسان خدا شناسی کے بارے میں حق الیقین تک نہ پہنچ سکتا۔ دُعا سے الہام ملتا ہے۔ دُعا سے ہم خدا تعالیٰ سے کلام کرتے ہیں جب انسان اخلاص اور توحید اور محبت اور صدق اور صفا کے قدم سے دُعا کرتا کرتا فنا کی حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ تب وُہ زندہ خدا اس پر ظاہر ہوتا ہے، جو لوگوں سے پوشیدہ ہے"

نصیحت

"خدا سے صلح کر و۔ سچی پرہیزگاری سے کام لو۔ آسمان اپنے غیر معمولی حوادث سے ڈرا رہا ہے۔ زمین بیماریوں سے انذار کر رہی ہے۔ مُبارک وُہ جو سمجھے!"

(الحکم جلد ۳ نمبر ۳ صفحہ ۲ پرچہ ۲۳ر جنوری ۱۸۹۹ء)

۲۷ر جنوری ۱۸۹۹ء۔ ایڈیٹر صاحب اخبار الحکم لکھتے ہیں۔ جب دھاریوال کے پاس ایک گاؤں ہے جہاں حضرت اقدسؑ نے بغرض پیروی مقدمہ ضمانت برائے حفظ امن منجانب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، دھاریوال تشریف لے جاتے ہوئے قیام فرمایا تھا۔ مرتب) سے روانہ ہو کر کھنڈہ (جہاں حضرت اقدسؑ تشریف فرماتے تھے۔ مرتب) آپہنچے۔ تو حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ:۔

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے

"اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ چونکہ سُنا گیا ہے کہ محمد حسین بھی وہیں اُترنے والا تھا۔ اس لئے اچھا ہوا کہ ہم وہاں نہیں ٹھہرے۔ ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا اچھا ہے"

(نوٹ از مرتب۔ تبدیلِ فرودگاہ کا باعث یہ ہوا کہ حضرت اقدس بسواری پالکی روانہ ہوئے تھے اور حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ اور چند اور دوست بٹالہ کے راستہ سے گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ اور یہ امر مقرر شدہ تھا کہ مقامِ نزول لیّل ہی ہوگا۔ مگر حضرت اقدسؑ کو راستہ میں رانی ایشر کور (سکنہ دھرم سردار جیمل سنگھ کی بیوہ ہو) کا خاص آدمی پیغام لے کر ملا۔ کہ آپ میرے ہاں قیام فرماویں چنانچہ حضرت اقدسؑ نے اس کا پیغام منظور فرما لیا اور وہیں قیام فرما ہوئے۔ مگر گاڑی والے دوستوں کو اطلاع نہ ہوئی۔ اس لئے وہ لیّل ہی پہنچے۔ بعد میں حضرت اقدس کے بُلوانے پر سب وہیں اکٹھے ہو گئے)

رانی ایشر کور کی نذر اور دعوت

تھوڑی دیر کے بعد رانی ایشر کور نے اپنے اہلکاروں کے ہاتھ ایک تھال مصری کا اور ایک باداموں کا بطور نذر پیش کیا اور کہلا بھیجا۔ بڑی مہربانی فرمائی میرے واسطے آپ کا تشریف لانا ایسا ہے جیسے سردار جیمل سنگھ آنجہانی کا آنا۔ حضرت اقدسؑ نے نہایت سادگی اور اُس لہجہ میں جو ان لوگوں میں خداداد ہوتا ہے، فرمایا کہ "اچھا آپ نے چونکہ دعوت کی ہے ہم یہ نذر بھی لے لیتے ہیں۔"

ایک سائل

کھانا کھا چکنے کے بعد ایک سفید ریش شخص کی بابت عرض کیا گیا کہ وُہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ حضرت اقدسؑ نے نہایت فراخدلی سے فرمایا "ہاں" چنانچہ وُہ شخص پیش ہوا اور اس نے اپنی درخواست منظوم پیش کی۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ "اِستقلال سے اگر طبیب کا علاج کیا جاوے وُہ بہت مہربان ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ فائدہ بھی دیتا ہے"

کیا سفر میں روزہ رکھیں؟

اس کے بعد آپ سے دریافت کیا گیا کہ سفر کیلئے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "قرآن کریم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ[1] یعنی مریض اور مسافر روزہ نہ رکھے۔ اس میں امر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ

[1] البقرۃ : ۱۸۵

نے نہیں فرمایا کہ جس کا اختیار ہو رکھ لے جس کا اختیار ہو نہ رکھے۔ میرے خیال میں مسافر کو روزہ نہیں رکھنا چاہیئے اور چونکہ عام طور پر اکثر لوگ رکھ لیتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی تعامل سمجھ کر رکھ لے۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ مگر عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ[1] کا پھر بھی لحاظ رکھنا چاہیئے"

اس پر مولانا نورالدین صاحبؓ نے فرمایا کہ "یوں بھی تو انسان کو مہینے میں کچھ روزے رکھنے چاہئیں۔" (ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ایک موقعہ پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا تھا کہ "سفر میں تکالیف اُٹھا کر جو انسان روزہ رکھتا ہے تو گویا اپنے زورِ بازو سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتا ہے۔ اس کو اطاعتِ امر سے خوش نہیں کرنا چاہتا۔ یہ غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ اَمر اور نہی میں سچا ایمان ہے۔"

۲۷ جنوری ۱۸۹۹ء۔ بعد نماز صبح روانگی کا حکم ہوا۔ جب کارخانہ کے قریب سے گذرے تو اس کے متعلق ذکر میں فرمایا۔

کارخانہ دھاریوال کا ذکر

"اس کو کسی وقت دیکھنا چاہیئے۔ دیکھی ہوئی چیز کچھ کام ہی دیتی ہے"

ایک شخص نے کہا کہ حضرت میں نے ایک بار دیکھا۔ تو مجھے خدا تعالیٰ کی قدرت پر عجب جوش آیا۔ اور جب تک میں نے چار رکعت نماز نہ پڑھ لی صبر نہ آیا۔ حضرتؑ نے فرمایا :-

"اصل بات یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ وہ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے، دیکھو کیڑے تک کو کس قدر طاقتیں دی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تو ساری طاقتیں اور قوتیں ہیں۔"

حضورؑ کے لئے خیمہ چونکہ نہر پہ لگایا گیا تھا۔ نہر کو دیکھ کر اور اس کے اِرد گِرد درختوں کے نظارہ کو دیکھ کر فرمایا۔ "بہت اچھی جگہ ہے۔"

(الحکم جلد ۳۔ نمبر ۴۔ پرچہ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء)

۲۶ فروری ۱۸۹۹ء۔ حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹیؓ کے لیکچر موسوم حضرت

[1] البقرۃ : ۱۸۵

اقدس مرزا غلام احمد قادیانیؑ نے کیا اصلاح اور تجدید کی) کو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام نے پڑھا اور ۲۶ر فروری ۱۸۹۹ء کو مسجد مُبارک میں احباب سے فرمایا۔ کہ:۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہمارے سب دوست اسے ضرور پڑھیں۔ اس لئے کہ اس میں بہت سے نکاتِ لطیفہ ہیں اور یہ نمُونہ ہے ایک شخص کی قوت تقریر کا۔ اور اسی منوال پر مخصوصاً ہماری جماعت کو مُقرّر بننے کی کوشش کرنی چاہیئے"۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ صٹ)

۱۰ر مارچ ۱۸۹۹ء۔ صبح سیر کو جاتے ہوئے حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔

ہمّت بلند

"ہمّت نہیں ہارنی چاہیئے۔ ہمّت اخلاق فاضلہ میں سے ہے۔ اور مومن بڑا بلند ہمّت ہوتا ہے۔ اور اُسے ہر وقت خدا تعالیٰ کے دین کی نُصرت اور تائید کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور کبھی بُزدلی ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ بُزدلی منافق کا نشان ہے مومن دلیر اور شجاع ہوتا ہے۔ مگر شجاعت سے یہ مُراد نہیں ہے کہ اس میں موقع شناسی نہ ہو۔ موقع شناسی کے بغیر جو فعل کیا جاتا ہے۔ وُہ تہوّر ہوتا ہے۔ مومن میں شتابکاری نہیں ہوتی۔ بلکہ وُہ نہایت ہوشیاری اور تحمّل کے ساتھ نصرت دین کے لئے تیار رہتا ہے اور بُزدل نہیں ہوتا۔ انسان سے کبھی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے اور کبھی خوش کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کسی سائل کو دھکا دیا تو وُہ سختی کا موجب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا فعل ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے توفیق نہ ملے گی۔ کہ وُہ اسے کچھ دے سکے۔ لیکن اگر اُس سے نرمی اور اخلاق سے پیش آئے گا تو خواہ اسے پیالہ پانی کا ہی دیدے تو وُہ بھی ازالہ قبض کا مُوجب ہو جائے گا۔

قبض و بسط

انسان پر قبض اور بسط کی حالت آتی رہتی ہے۔ بسط کی حالت میں ذوق اور شوق بڑھ جاتا ہے اور قلب میں ایک اِنشراح پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف توجّہ بڑھ

جاتی ہے۔ نمازوں میں لذّت اور سرُور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بعض وقت ایسی حالت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ وُہ ذوق اور شوق جاتا رہتا ہے اور دل میں ایک تنگی کی سی حالت ہوجاتی ہے۔ جب ایسی حالت ہوجائے تو اُس کا علاج یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ استغفار کرے اور پھر درُود شریف بہت پڑھے۔ نماز بھی بار بار پڑھے۔ قبض کے دُور ہونے کا یہی علاج ہے ۔

حقیقی علم

عِلم سے مُراد منطق یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وُہ ہے جو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس سے خشیّت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا[1] اگر علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت میں ترقی نہیں ہوتی۔ تو یاد رکھو کہ وہ علم ترقی معرفت کا ذریعہ نہیں ہے ۔ (الحکم جلد ، ع ۲۱)

۲۰ر اپریل ۱۸۹۹ء۔ بوقت عصر

خدا پر بھروسہ

" اسلام کا خاصّہ ہے کہ خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔ مسلمان وُہی ہے جو صدقات اور دُعا کا قائل ہو۔ عیسائیوں کو اس بات پر یقین نہیں۔ کیوں؟ انہوں نے جسمانی خدا بنایا ہے ۔

انسان کی بڑی خوشی جو زوال پذیر نہیں ہوتی، اور خطرات کے وقت اُسے سنبھال لیتی ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ ہے۔ اور یہ صرف اسلام ہی کی تعلیم ہے کہ خدا پر بھروسہ کرو۔" (الحکم جلد ۳ ۱۵۔ صفحہ ۶)

۲۱ر اپریل ۱۸۹۹ء۔ یوم عید اضحیٰ۔

والدہ کی تعظیم

" پہلی حالت انسان کی نیک بختی کی ہے کہ والدہ کی عزت کرے۔ اویس قرنی کے

[1] فاطر: ۲۹

لئے بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن کی طرف کو مُنہ کر کے کہا کرتے تھے۔ کہ مجھے یمن کی طرف سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وُہ اپنی والدہ کی فرمانبرداری میں بہت مصرُوف رہتا ہے اور اسی وجہ سے میرے پاس بھی نہیں آسکتا بظاہر یہ بات ایسی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں۔ مگر وُہ ان کی زیارت نہیں کر سکتے۔ صرف اپنی والدہ کی خدمتگذاری اور فرمانبرداری میں پوری مصروفیت کی وجہ سے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہی آدمیوں کو السلام علیکم کی خصوصیت سے وصیّت فرمائی یا اویس کو یا مسیح کو۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ جو دوسرے لوگوں کو ایک خصوصیّت کے ساتھ نہیں ملی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اُن سے ملنے کو گئے۔ تو اویس نے فرمایا کہ والدہ کی خدمت میں مصروف رہتا ہوں اور میرے اونٹوں کو فرشتے چرایا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ لوگ ہیں جنہوں نے والدہ کی خدمت میں اس قدر سعی کی اور پھر یہ قبولیت اور عزت پائی۔ ایک وُہ ہیں جو پیسہ پیسہ کے لئے مقدمات کرتے ہیں اور والدہ کا نام ایسی بُری طرح لیتے ہیں کہ رذیل قومیں چوہڑے چمار بھی کم لیتے ہوں گے۔ ہماری تعلیم کیا ہے؟ صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ہدایت کا بتلا دینا ہے۔ اگر کوئی — میرے ساتھ تعلق ظاہر کر کے اس کو ماننا نہیں چاہتا تو وُہ ہماری جماعت میں کیوں داخل ہوتا ہے؟ ایسے نمونے سے دوسروں کو ٹھوکر لگتی ہے۔ اور وُہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے لوگ ہیں جو ماں باپ تک کی بھی عزت نہیں کرتے۔

مادر پدر آزاد کبھی خیر و برکت کا مُنہ نہ دیکھے گا۔

میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مادر پدر آزاد کبھی خیر و برکت کا مُنہ نہ دیکھیں گے۔ پس نیک نیّتی کے ساتھ اور پُوری اطاعت اور وفاداری کے رنگ میں خدا رسول کے فرمودہ پر عمل کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ بہتری اسی میں ہے۔ ورنہ اختیار ہے۔ ہمارا کام صرف نصیحت کرنا ہے

عربی سیکھو، انگریزی پڑھو!

میں یہ بھی اپنی جماعت کو نصیحت کرنی چاہتا ہوں کہ وُہ عربی سیکھیں کیونکہ عربی کی تعلیم کے بدُون قرآن کریم کا مزا نہیں آتا۔ پس ترجمہ پڑھنے کے لئے ضروری اور مناسب ہے کہ تھوڑا تھوڑا عربی زبان کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ آج کل تو آسان آسان طریق عربی پڑھنے کے نکل آئے ہیں۔ قرآن شریف کا پڑھنا جبکہ ہر مسلمان کا فرض ہے تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش نہ کی جاوے اور ساری عمر انگریزی اور دوسری زبانوں کے حاصل کرنے میں کھو دی جاوے۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھو کہ چونکہ استحکام گورنمنٹ نے ایک قومی گورنمنٹ کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے قومی گورنمنٹ کی زبان بھی ایک قومیت کا رنگ رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ اپنے مطالب و اغراض کو حکام پر پُورے طور سے ذہن نشین کرنے کے لئے انگریزی پڑھو۔ تاکہ تم گورنمنٹ کو فائدہ اور مدد پہنچا سکو۔"

پھر زبانوں کے تذکرے پر فرمایا۔ "فونوگراف کیا ہے؟ گویا مطبع ناطق ہے۔"

تقریر

کوئی تکلیف نہیں پہنچتی جبتک آسمان پر فتویٰ نہ ہو۔ اگرچہ تکالیف تو پیغمبروں کو بھی پہنچتی ہیں۔ مگر وہ ازراہِ محبّت ہوتی ہیں۔ اور اُن میں ایک قسم کی تعلیم مخفی ہوتی ہے۔ جو ان مشکلات میں انبیاء علیہم السلام کا پاک گروہ اپنے طرزِ عمل اور چال چلن سے دیتا ہے۔

دُکھ پہنچنا اپنے اعمال کا نتیجہ ہے

اور بعض لوگوں پر دُکھ کی مار ہوتی ہے اور وُہ ان کی اپنی ہی کرتُوتوں کا نتیجہ ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ[1]۔ پس آدمی کو لازم ہے کہ توبہ و استغفار میں لگا رہے اور دیکھتا رہے کہ ایسا نہ ہو، بداعمالیاں حد سے گذر جاویں اور خدا تعالےٰ کے غضب کو کھینچ لاویں۔ جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کے ساتھ نگاہ کرتا ہے تو عام طور پر

[1] الزلزال: ۹

دلوں میں اُس کی محبت کا القا کر دیتا ہے۔ لیکن جس وقت انسان کا شر حد سے گذر جاتا ہے۔ اُس وقت آسمان پر اُس کی مخالفت کا ارادہ ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے موافق لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ مگر جُونہی وُہ توبہ و استغفار کے ساتھ خدا کے آستانہ پر گِر کر پناہ لیتا ہے۔ تو اندر ہی اندر ایک رحم پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ اس کی محبت کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ غرض توبہ و استغفار ایسا مجرب نسخہ ہے کہ خطا نہیں جاتا ٭

(الحکم جلد ۳ ۱۸ صفحہ ۳۔ پرچہ ۱۲ مئی ۱۸۹۹ء)

۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء۔ قبل مغرب:

اعتراض کہ آکر کیا بنایا؟

یہ کتابؔ جو لکھی گئی ہے جب شائع ہوگی تو اُن لوگوں کو بھی پتہ لگ جاوے گا جو بار بار اعتراض کرتے ہیں کہ آکر کیا بنایا؟ میں حیران ہو جاتا ہوں جب اس قسم کے اعتراض سُنتا ہوں۔ کیا پھُونک مار کر کچھ بنا دیا جاتا؟ مگر یہ لوگ دیکھیں گے اور خدا تعالیٰ نمایاں طور پر دکھا دے گا کہ کیا بنایا ہے۔ کاش یہ لوگ موجودہ حالت وقت پر غور کرتے۔ صدی میں سے سوؔلہ سال گذر گئے ظُلمت اِنتہا تک پہنچ گئی اور کوئی نہ آیا جو اصلاح کرتا۔ یہ لوگ ذرا بھی انصاف نہیں کرتے۔ مجھ پر اعتراض کرتے کرتے خدا پر اعتراض جا کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے تو آکر کچھ بنایا نہیں اور خدا نے بنانیوالا بھیجا نہیں۔ بلکہ باوجود اس کے کہ اور ضرورتیں اگر چھوڑ بھی دی جاویں تو ان ناعاقبت اندیش معترضوں کے موافق ایک گمراہ کرنیوالا بھی آگیا اور پھر بھی وُہ اصل مہدی نہ آیا۔ اور نہ خدا نے اُسے بھیجا۔ چودھویں صدی کو مبارک سمجھتے تھے پر کیا خاک مبارک نکلی جبکہ ایک دجّال آگیا!!! صدیق حسن اور عبد الحیٔ جو دعویٰ کرنیوالے تھے وُہ صدی کے سر پر ہی

ؔ "مسیح ہندوستان میں" (مرتّب)

فوت ہوگئے ورنہ شاید وُہی اُن لوگوں کا سہارا ہوتے۔ لیکن خدا نے اپنے فضل سے دکھا دیا کہ یہ کام اُن کا نہ تھا بلکہ کسی اَور کا ٭

اسلام صرف رسمی طور پر رہ گیا ہے

مجدد جو آیا کرتا ہے وُہ ضرورت وقت کے لحاظ سے آیا کرتا ہے نہ استنجے اور وضو کے مسائل بتلانے۔ خدا جو مدبّر اور حکیم خدا ہے کیا وہ نہیں دیکھتا کہ دنیا پر طبعیات اور فلسفہ کی زہریلی ہوا چلی ہے۔ جس نے ہزارہا انسانوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ صلیب پرست عیسائیوں نے کس کس رنگ میں لکھوکھا رُوحوں کو خدا سے دُور پھینک دیا ہے۔ تو پھر کیا اس وقت ایسے مجدد کی ضرورت نہ تھی جو کسرِ صلیب کرے اور دلائل و بیّنات سے دکھاوے کہ صلیبی مذہب میں حقانیت کا نُور نہیں۔ اور ایک لکڑی پر ایمان لا کر انسان نجات کا وارث نہیں ٹھیر سکتا۔ آئے دن پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ اشتہار چھاپ چھاپ کر یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں۔ اور ٹڈی دَل کی طرح عورتیں۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام پر حملہ کریں۔ اس وقت اسلام پر وُہ حملہ ہوا ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ ادھر خدا کا یہ وعدہ کہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] اور ادھر ان ناعاقبت اندیش معترضین کی یہ دانائی کہ اسلام میں حفاظتِ دین کے لئے معرفت کا نُور لے کر کوئی نہیں آیا۔ بلکہ دجّال آیا ہے۔ افسوس! صد افسوس!! آہ! صد آہ!!

یہی تو وقت تھا کہ خدا اپنی نصرت اور تائید کا روشن ہاتھ دکھاتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس نے دِکھایا اور وہ اپنی چمکار دکھائے گا۔ اور مخالفوں کو شرمندہ کر کے بتلا دیگا۔ کہ آنے والے نے آ کر کیا بنایا۔" (الحکم۔ جلد ۳ نمبر ۱۸ صفحہ ۲۔ پرچہ ۱۹ ر مئی ۱۸۹۹ء)

۱۲؍ اپریل ۱۸۹۹ء

خدا بیند و بپوشد و ہمسایہ نہ بیند و خروشد

"خدا تعالیٰ کی ستّاری ایسی ہے کہ وُہ انسان کے گناہ اور خطاؤں کو دیکھتا ہے

[1] الحجر: ۱۰

لیکن اپنی اس صفت کے باعث اس کی غلط کاریوں کو اُس وقت تک جب تک کہ وُہ اعتدال کی حد سے نہ گذر جاوے ڈھانپتا ہے۔ لیکن انسان کسی دوسرے کی غلطی دیکھتا بھی نہیں اور شور مچاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کم حوصلہ ہے اور خدا تعالےٰ کی ذات حلیم و کریم ہے۔ ظالم انسان اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی کبھی خدا تعالیٰ کے حلم پر پُوری اطلاع نہ رکھنے کے باعث بیباک ہو جاتا ہے اس وقت ذوانتقام کی صفت کام کرتی ہے اور پھر اُسے پکڑ لیتی ہے۔ ہنُدو لوگ کہا کرتے ہیں کہ پرمیشر اور اَنت میں وَیر ہے۔ یعنی خدا حَد سے بڑھی ہوئی بات کو عزیز نہیں رکھتا۔ باایں ہمہ بھی وُہ ایسا رحیم کریم ہے کہ ایسی حالت میں بھی اگر انسان نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ آستانہ الٰہی پر جا گرے تو وُہ رحم کے ساتھ اُس پر نظر کرتا ہے۔ غرض یہ ہے۔ کہ جیسے اللہ تعالےٰ ہماری خطاؤں پر معاً نظر نہیں کرتا اور اپنی ستاری کے طفیل رُسوا نہیں کرتا تو ہم کو بھی چاہیئے کہ ہر ایسی بات پر جو کسی دوسرے کی رُسوائی یا ذلت پر مبنی ہو۔ فی الفور مُنہ نہ کھولیں۔

غفلت کا علاج توبہ ہے

بعض لوگوں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اُن کو ایسے اسباب پیش آجاتے ہیں مثلاً ملازمت یا کوئی اَور وجہ کہ ان کی عُمر کا ایک بڑا حصہ ظُلمانی حالت میں گذرتا ہے۔ نہ پابندی نماز کی طرف توجّہ کرتے ہیں۔ نہ قال اللہ اور قال الرسول سُننے کا موقع ملتا ہے۔ کتاب اللہ پر غور کرنے کا اُن کو خیال تک بھی نہیں آتا۔ ایسی صورت میں جب ایک زمانہ ظُلمت کا گذر جاوے تو یہ خیالات راسخ ہو کر طبیعت ثانیہ کا رنگ پکڑ جاتے ہیں۔ پس اس وقت اگر انسان توبہ اور استغفار کی طرف توجّہ نہ کرے تو سمجھو کہ بڑا ہی بَد قسمت ہے۔ غفلت اور سُستی کا بہترین علاج استغفار ہے۔ سابقہ غفلتوں اور سُستیوں کی وجہ سے کوئی ابتلا بھی آجاوے تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ

کر سجدے اور دُعائیں کرے اور خدا تعالےٰ کے حضور ایک سچی اور پاک تبدیلی کا وعدہ کرے ؎

۲۲ر اپریل ۱۸۹۹ء۔

اپنے دعوے کی صداقت پر ایک دلیل

ہمارے دعویٰ الہام و مکالمہ الٰہیہ کی اشاعت کو یوں تو بہت سال گذرے لیکن اگر براہین کی اشاعت سے بھی لیا جائے تو بیسؔ سال ہو چکے۔ ہمارے مخالف جو ہم کو جھوٹا اور اپنے دعوے میں مُفتری قرار دیتے ہیں۔ اُن سے کوئی سوال کرے کہ خدا تعالیٰ تو کسی ایسے مفتری کو جو اُس پر الہام اور مکالمہ کا اِفترا کرے مہلت نہیں دیتا۔ یہانتک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی فرمایا۔ کہ اگر تُو بعض باتیں اپنی طرف سے کہتا تو ہم شاہ رگ سے پکڑ لیتے۔ پھر کسی اَور کی کیا خصُوصیّت ہو سکتی ہے۔ اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ پر الہام کا افترا کرنے والا کبھی بھی مُہلت نہیں پا سکتا۔ اب ہم پُوچھتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا سِلسِلہ خدا تعالےٰ کا قائم کردہ نہیں ہے۔ تو کسی قوم کی تاریخ سے ہم کو پتہ دو کہ خدائے تعالیٰ پر کسی نے افتراء کیا ہو۔ اور پھر اسے مہلت دی گئی ہو۔ ہمارے لئے تو یہ معیار صاف ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ ۲۳ سال تک کا ایک دراز زمانہ ہے۔ اُس صادِق اور کامل نبی کے زمانہ سے قریباً مِلتا ہوا زمانہ اللہ تعالےٰ نے اب تک ہم کو دیا۔ کیونکہ براہین کی اشاعت پر بیسؔ سال ہوئے جو ناعاقبت اندیش معترضوں کے نزدیک افتراء کا پہلا زمانہ ہے۔ اب تک تو ہم ایک مُسلّمہ صادق بلکہ جُملہ صادقوں کے سرتاج صادقؐ کے زمانہ سے ملتا ہوا زمانہ پیش کرتے ہیں اور یہ ظالم کہے جاتے ہیں کہ جُھوٹ ہے۔ افسوس ہماری تکذیب کے خیال میں یہ لوگ یہاں تک اندھے ہو گئے ہیں کہ اُن کو یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اس اِنکار کی زَد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر کیسی پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر بیسؔ بائیسؔ

سال تک بھی خدا کسی مُفتری کو مدد دے سکتا ہے تو پھر مجھے تو تعجب ہی آتا ہے نہیں بلکہ دل کانپ اُٹھتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت پر یہ کیا دلیل پیش کرینگے؟ ایک مُسلمان رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سچّے مُتبع کے مُنہ سے جب وہ اتنا دراز عرصہ تک مدّعی کو مُہلت پاتے ہوئے دیکھ لے کبھی یہ نہیں نکل سکتا کہ جھُوٹا اور کاذب بھی اِس قدر عرصہ دراز کی مہلت پالیتا ہے۔ اگر اَور کوئی بھی نشان اور دلیل ایسے مدّعی کی صداقت کی نہ ملے۔ تب بھی ایک سچّے مسلمان کو حُسنِ ظن اور ایمانداری کے رُو سے لازم آتا ہے کہ انکار نہ کرے کیونکہ اس کا زمانہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ سے مشابہ ہو گیا ہے۔

اگر کوئی عیسائی کہے کہ مفتری کو مہلت مِل سکتی ہے تو وُہ اِس امر کا ثبوت دے مگر مسلمان تو ایسا کہہ ہی نہیں سکتا۔ پس اب ہمارے مخالف بتلائیں کیا ایک کاذب[1] دجّال، مُفتری علی اللہ طرزِ استدلال نبوّت میں شریک ہو سکتا ہے؟ ماننا پڑیگا کہ ہرگز نہیں۔ پھر وُہ ہمارے دعوے کو سوچیں۔ اور اس زمانہ پر غور کریں جو استدلالِ نبوّت کا زمانہ ہے۔ غرض ہر پہلُو میں بہت سی باتیں ہیں جو سوچنے والے کو مِل سکتی ہیں۔ اور ایک دُور اندیش اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے"۔

(الحکم جلد ۳ ۲۱ء۔ پرچہ ۱۶ر جون ۱۸۹۹ء)

۲۲ر جون ۱۸۹۹ء ۔ (حضرت اقدسؑ نے) کُل باتوں باتوں میں فرمایا۔ کہ:۔

"یقیناً یاد رکھو کہ خدا اپنے بندے کو کبھی ضائع نہیں کریگا۔ اور ہرگز نہیں اُٹھائے گا جبتک اُس کے ہاتھ سے وُہ باتیں پُوری نہ ہو جائیں۔ جن کے لئے وُہ آیا ہے۔ اسے کسی کی خصومت اور کسی کی بد دُعا کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی"۔

اس کی تحریک یُوں ہوئی کہ کسی نے کہا کہ اب مخالف مُلہم صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس

---

[1] منشی الٰہی بخش اکونٹنٹ مصنف عصائے موسٰی۔ (مرتب)

سلسلہ کی تباہی اب قریب ہے۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذباً[1]

پھر بڑے دردِ دل سے فرمایا۔ کہ

تمام صُحف مقدّسہ کا خُلاصہ تقویٰ ہے

"کل (یعنی ۲۲ر جون ۱۸۹۹ء) بہت دفعہ خدا کی طرف سے الہام ہوا۔ کہ تم لوگ متقی بن جاؤ اور تقویٰ کی باریک راہوں پر چلو تو خدا تمہارے ساتھ ہو گا۔"

فرمایا "اس سے میرے دل میں بڑا درد پیدا ہوتا ہے کہ میں کیا کروں کہ ہماری جماعت سچا تقویٰ و طہارت اختیار کر لے" پھر فرمایا کہ "میں اتنی دُعا کرتا ہوں کہ دُعا کرتے کرتے ضُعف کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات غشی، اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔"

فرمایا۔ "جب تک کوئی جماعت خدا تعالےٰ کی نگاہ میں متقی نہ بن جائے۔ خدا تعالےٰ کی نصرت اس کے شامل حال نہیں ہو سکتی۔" فرمایا۔ "تقویٰ خلاصہ ہے تمام صُحفِ مقدّسہ اور توریت و انجیل کی تعلیمات کا۔ قرآن کریم نے ایک ہی لفظ میں خدا تعالیٰ کی عظیم الشان مرضی اور پوری رضا کا اظہار کر دیا ہے۔" فرمایا۔ "میں اس فکر میں بھی ہوں کہ اپنی جماعت میں سے سچے متقیوں، دین کو دُنیا پر مقدّم کرنے والوں اور منقطعین الی اللہ کو الگ کروں اور بعض دینی کام انہیں سپرد کروں۔ اور پھر میں دُنیا کے ہم و غم میں مبتلا رہنے والوں اور رات دن مُردار دنیا ہی کی طلب میں جان کھپانیوالوں کی کچھ بھی پرواہ نہ کرونگا۔"

رات کس درد سے حضرت امامؑ فرماتے ہیں۔ "آہ! اب تو خدا کے سوا کوئی بھی ہمارا نہیں۔ اپنے پرائے سب ہی اس پر تُلے ہوئے ہیں کہ ہمیں ذلیل کر دیں۔ رات دن ہماری نسبت مصائب اور گردشوں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اب اگر خدا تعالےٰ ہماری مدد نہ کرے تو ہمارا ٹھکانا کہاں؟"

(خط مولوی عبد الکریم صاحب مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۲؍ صفحہ ۲)

۲۵ر جون ۱۸۹۹ء صاحبزادہ مبارک احمد صاحب کے عقیقہ کے لئے ۲۵ر جون اتوار کا

[1] الکہف: ۶

دن مقرر تھا۔ حضرت اقدسؑ نے اس کام کا اہتمام منشی نبی بخش صاحب کے سپرد کیا تھا۔ مگر اس دن صبح صادق سے پہلے بارش شروع ہو گئی۔ صبح کی نماز معمول سے سویرے پڑھی گئی اور دوست تاریکی اور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے سو گئے۔ جب دِن چڑھے حضرت اقدس بیدار ہوئے تو دریافت کیا کہ عقیقہ کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ گاؤں کے لوگوں کو دعوت کی گئی تھی اور باہر سے بھی کچھ احباب تشریف لائے تھے۔ حضرتؑ کو فکر ہوئی کہ مہمانوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ ادھر مہتمم منشی صاحب بڑے مضطرب اور نادم تھے کہ حضور پاک میں کیا عذر کروں۔ منشی صاحب حاضر ہوئے اور معذرت کی۔ خیر کریم انسان اور رحیم ہادی کی ذات میں درشتی اور سخت نکتہ چینی تو تھی ہی نہیں۔ فرمایا "اچھا فعل ما قدر"۔ تاہم مہتمم صاحب بار بار معذرت کے لئے حضرت اقدسؑ کی خدمت میں دوڑے جاتے۔ اُن کے اس حال کو دیکھ کر حضرت اقدسؑ کو اپنی ایک رؤیا یاد آ گئی جو چودہ سال ہوئے دیکھی تھی جس کا مضمون یہ ہے۔ کہ :-

"ایک چوتھا بیٹا ہوگا اور اُس کا عقیقہ سوموار کو ہوگا"

خدا تعالیٰ کی بات کے پُورا ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اس عجیب تصرّف سے حضرت اقدسؑ کو بڑی خوشی ہوئی۔ دوسرے دن سوموار کو جب سب خدّام صحن اندرون خانہ میں بیٹھے تھے۔ اور صاحبزادہ مبارک احمد صاحب کا سر مونڈا جا رہا تھا۔ حضرت اقدسؑ نے بڑے جوش اور خوشی سے یہ رؤیا سُنائی۔ (از خط حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحبؓ سیالکوٹی مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۳ صفحہ ۷ پرچہ ۳۰ جون ۱۸۹۹ء)

۳۰ جون ۱۸۹۹ء۔ رات کو امراض وبائیہ کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا :-

"یہ ایام برسات کے معمولاً خطرناک ہوا کرتے ہیں۔ ہند کے طبیب کہتے ہیں کہ ان تین مہینوں میں جو بچ رہے وہ گویا نئے سر سے پیدا ہوتا ہے" پھر فرمایا "یہ جاڑا بھی خوفناک ہی نظر آتا ہے"۔ فرمایا۔ "اطبّاء بڑے بڑے پرہیزوں اور حفظ ما تقدّم کے لئے احتیاطیں

بتلاتے ہیں۔ اگرچہ سلسلہ اسباب کا اور اُن کی رعایت درست ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ محدودُ العلم ضعیف انسان کہانتک بچار بچار کر غذا اور پانی کا استعمال کیا کرے۔ میرے نزدیک تو استغفار سے بڑھ کر کوئی تعویذ و حرز اور کوئی احتیاط و دوا نہیں میں تو اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ سے صُلح و موافقت پیدا کرو اور دُعاؤں میں مصروف رہو" فرمایا:۔ "میں تو بڑی آرزو رکھتا ہوں اور دُعائیں کرتا ہوں کہ میرے دوستوں کی عمریں لمبی ہوں تاکہ اس حدیث کی خبر پُوری ہو جائے جس میں لکھا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں چالیس برس موت دُنیا سے اُٹھ جائے گی" فرمایا:۔ "اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام جانداروں سے اس عرصہ میں موت کا پیالہ ٹل جائے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جو نافع الناس اور کام کے آدمی ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ ان کی زندگی میں برکت بخشیگا"۔ (از خط مولوی عبدالکریم صاحبؓ یکم جولائی ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ صفحہ ۵)

۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء سے قبل۔ "مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب قادیان میں حضرت کے مکان کی تلاشی کے لئے آئے تھے۔ اور قبل از وقت اس کا کوئی پتہ اور خبر نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔

حضرت مسیح موعودؑ کے تعلق باللہ کا ایک واقعہ

اس کی صبح کو کہیں سے ہمارے میر صاحب نے سُن لیا کہ آج وارنٹ ہتھکڑی سمیت آوے گا۔ میر صاحب جو اس باختہ سراز پا نشناختہ حضرت کو اس کی خبر کرنے اندر دوڑے گئے اور غلبۂ رقت کیوجہ سے بصد مشکل اس ناگوار خبر کے مُنہ سے بُرقع اُتارا۔ حضرت اس وقت نور القرآن لکھ رہے تھے۔ اور بڑا ہی لطیف اور نازک مضمون درپیش تھا۔ سر اُٹھا کر اور مُسکرا کر فرمایا۔ کہ

"میر صاحب! لوگ دُنیا کی خوشیوں میں چاندی سونے کے کنگن پہنا ہی کرتے ہیں ہم سمجھ لیں گے کہ ہم نے اللہ تعالےٰ کی راہ میں لوہے کے کنگن پہن لئے"۔ پھر ذرا تامّل کے بعد فرمایا۔ "مگر ایسا نہ ہوگا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی

اپنی گورنمنٹ کے مصالح ہوتے ہیں وُہ اپنے خلفائے مامورین کی ایسی رُسوائی پسند نہیں کرتا۔" (از خط حضرت مولانا عبد الکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۴ صـ۲)

ہفتہ مختتمہ ۱۰ ر جولائی ۱۸۹۹ء

دینی اور اعلائے کلمۃ اللہ کی باتوں پر حضرت مسیح موعودؑ کی خوشی کا واقعہ

اِس ہفتہ میں سب سے عجیب اور دلچسپ بات جو واقع ہوئی اور جس نے ہمارے ایمانوں کو بڑی قوت بخشی وُہ ایک چھٹی کا حضرت کے نام آنا تھا۔ اس میں پختہ ثبوت اور تفصیل سے لکھا تھا کہ جلال آباد (علاقہ کابل) کے علاقہ میں یوز آسف نبی کا چبوترہ موجود ہے اور وہاں مشہور ہے کہ دو ہزار برس ہوئے کہ یہ نبی شام سے یہاں آیا تھا اور سرکار کابل کی طرف سے کچھ جاگیر بھی اس چبوترہ کے نام ہے۔ زیادہ تفصیل کا محل نہیں۔ اس خط سے حضرت اقدس اس قدر خوش ہوئے کہ فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ گواہ اور علیم ہے کہ اگر مجھے کوئی کروڑوں روپے لا دیتا تو میں کبھی اتنا خوش نہ ہوتا جیسا اس خط نے مجھے خوشی بخشی ہے۔"

برادران! دینی بات پر یہ خوشی کیا منجانب اللہ ہونے کا نشان نہیں؟ کون ہے آج جو اعلائے کلمۃ اللہ کی باتوں پر ایسی خوشی کرے؟ . . . . . . ہمارے ایمان کی تجدید و تقویت کے لئے ایک نشان یہ ظاہر ہوا کہ ظہر کے وقت اچانک یہ خط آتا ہے اور صبح حضرت اقدسؑ کو یہ رؤیا ہوتی ہے کہ حضرت ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند گویا حضرت اقدسؑ کے گھر میں رونق افروز ہوئی ہیں۔ حضرت اقدسؑ رؤیا میں عاجز راقم عبد الکریم کو جو اس وقت حضور اقدسؑ کے پاس بیٹھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت ملکہ معظمہ کمال شفقت سے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرما ہوئی ہیں اور دو روز قیام فرمایا ہے۔ ان کا کوئی شکریہ بھی ادا کرنا چاہیئے۔

اس رؤیا کی تعبیر یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ کوئی نصرت الٰہی شامل ہوا چاہتی ہے۔ اِس

لئے کہ حضرت ملکہ معظمہ کا اسم مبارک وکٹوریہ ہے جس کے معنی ہیں ۔مظفرہ منصورہ ۔ اور نیز چونکہ اس وقت حضرت ملکہ معظمہ کُل رُوئے زمین کے سلاطین میں سب سے زیادہ کامیاب اور خوش نصیب ہیں۔ اس لئے آپ کا مہربانی کے لباس میں آپ کے مکان میں تشریف لانا بڑی برکت و کامیابی کا نشان ہے ۔خدا کا علم و قدرت دیکھئے ۔ظُہر کے وقت اس رؤیا کی صحیح تعبیر پوری ہو گئی ۔ اللہ اللہ! اس سے زیادہ نصرت کیا ہے کہ ایسے سامان بن رہے ہیں کہ جن سے دُنیا کے کُل نصاریٰ پر خدا کی روشن حجت پوری ہوتی ہے۔

مسیح کا کام

حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ "میں حیران ہوتا ہوں کہ ان کا فرضی مسیح اور کام کیا کرتا یا کریگا؟ اس کی اوقات زندگی کی یہی تقسیم بتاتے ہیں کہ دن کا ایک حصّہ تو لکڑی یا لوہے یا پیتل یا سونے چاندی کی صلیبوں کے توڑنے میں بسر کریگا اور ایک حصّہ سُوروں کے قتل کرنے میں صرف کریگا۔ بس یہی کہ کچھ اَور بھی؟" فرمایا۔ "یہ لوگ نہیں سوچتے کہ وُہ بات کیا ہے جس سے اتنے کروڑ نصاریٰ پر حجت حق پوری ہو کیونکہ اگر نری تلوار ہو تو وہ تو احقاق حق کے لئے کبھی آلہ بن نہیں سکتی ۔کیا ایمان کبھی درشتی سے دلوں میں اُتر سکتا ہے اور حجت اللہ اکراہ سے کسی کے دل کو فریفتہ کر سکتی ہے ؟ وہ تو اَور بھی الزام کا مُوجب ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں بجز لٹھم لٹھا ہونے کے دلیل کوئی نہیں"۔ فرمایا۔ "آگے تھوڑا مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا۔ اور مسلمان یوں اُسے سچا کر دینا چاہتے ہیں اور معمولی کرامات و مُعجزات سے بھی یورپ و دیگر نصاریٰ پر اثر نہیں پڑسکتا۔ اس لئے کہ اُن کی کتاب میں لکھا ہے کہ بہت سے جھُوٹے نبی آئیں گے جو نشان دکھائیں گے ۔ پھر اب کیا ہے بجز اس کے کہ کوئی ایسی حجت ظاہر ہو جس کے آگے گردنیں خم ہو جائیں اور وہ وُہی راہ ہے جو خدا میرے ہاتھ سے پُوری کریگا۔"

اُسی ہفتہ لاہوری مُلہَم صاحب کا خط آیا۔ جس میں اس نے حضرت مسیح موعودؑ اور آپؑ کے

سلسلہ کے خلاف ایک دو پیشگوئیاں کی تھیں۔ اس کے متعلق آپؑ نے فرمایا:-

مقابلہ کی تین ہی راہیں ہیں

"اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی کے لئے کس قدر میرے دل میں تڑپ اور جوش ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ کس طرح ان لوگوں کو سمجھاؤں یہ لوگ کسی طرح بھی مقابلہ میں نہیں آتے۔ تین ہی راہیں ہیں یا گذشتہ زمانہ کے نشانوں سے میرے اپنے نشانوں کا مقابلہ کرلیں یا آئندہ نشانوں میں مقابلہ کرلیں یا اور نہیں تو یہی دُعا کریں کہ جس کا وجود نافع الناس ہے وہ بموجب وعدۂ الٰہی (وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ[1]) دراز زندگی پائے۔ پھر عیاں ہوجائے گا کہ خدا کی نگاہ میں کون مقبول و منظور ہے۔" فرمایا:-

کسی الہام کے خدا کی طرف سے ہونے اور دخل شیطان سے پاک ہونے کا معیار

"افسوس یہ لوگ چھوٹے چھوٹے معمولی الہامی ٹکڑوں اور خوابوں پر اتراتے بیٹھے ہیں اور سمجھ نہیں سکتے کہ کسی الہام کے خدا کی طرف سے ہونے اور دخلِ شیطان سے پاک ہونے کا معیار کیا ہے؟ معیار یہی ہے کہ اُس (خدائی الہام) کے ساتھ نصرتِ الٰہی ہو اور اقتداری علمِ غیب اور قاہر پیشگوئی اس کے ساتھ ہو۔ ورنہ وُہ فضول باتیں ہیں جو نافع الناس نہیں ہوسکتیں" فرمایا:- "اگر کوئی شخص کسی جلسہ کے وقت دُور بیٹھا ہوا کسی عظیم الشان بادشاہ کی باتیں معمولاً سُن لے اور لوگوں کے سامنے آکر کہے کہ میں نے فلاں بادشاہ کی باتیں سُنی ہیں تو اس کے اس کہنے سے اُسے اور دوسرے لوگوں کو کیا حاصل؟ تقرب سُلطانی کے بعد کی باتوں کے نشان اَور ہی ہوا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک عالم پکار اُٹھتا ہے کہ فلاں شخص درحقیقت بادشاہ کا مہبط کلام و سلام ہے۔" فرمایا۔ "اگر میرے الہامات بھی ویسے ہی معمولی اور فضول ٹکڑے ہوتے۔

[1] الرعد: ۱۸

اور ہر ایک میں علم غیب اور اقتداری پیشگوئیاں نہ ہوتیں تو میں انہیں محض ہیچ سمجھتا۔
فرمایا:۔ " بھلا کوئی شخص لیکھرام والی پیشگوئی کے برابر کوئی ایک ہی الہام بتادے۔"
فرمایا:۔ " میرے الہاموں سے قوم کا فائدہ اور اسلام کا فائدہ ہوتا ہے اور یہی معیار بڑا بھاری معیار ہے جو میرے الہامات کے منجانب اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔" فرمایا
" میرے ساتھ خدا تعالےٰ کے معاملات اور تصرفات اور اُس کے نشان میری تائید میں عجیب ہیں کچھ تو میری ذات کے متعلق ہیں۔ کچھ میری اولاد کے متعلق ہیں اور کچھ میرے اہلِ بیت کے متعلق ہیں اور کچھ میرے دوستوں کے متعلق ہیں اور کچھ میرے مخالفوں کے متعلق ہیں اور کچھ عامۃ الناس کے متعلق ہیں "

لاہوری ملہم کے دوستوں میں سے ایک حافظ صاحب کا پیغام پہنچا کہ وہ گذشتہ نشانوں کا حوالہ سننا نہیں چاہتے۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

" افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی بات بھی ناقدردانی کے قابل نہیں ہوتی۔ کیا ایک قوم کو ان سے پہلے بھی اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں کہا اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ[1]۔ کیا یہ گذشتہ نشان کا حوالہ نہیں؟" فرمایا
" اب ایسا وقت ہے کہ ہمارے دوستوں کو چاہیئے کہ بہت دفعہ ملاقات کیا کریں۔ تاکہ نئے نئے نشانوں کے دیکھنے سے جو روز بروز نازل ہوتے ہیں۔ اُن کے ایمان و تقویٰ میں ترقی ہو۔" (از خط مولوی عبدالکریم صاحبؓ ۱۱ جولائی ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۴ صـ ۲-۳)

گورنمنٹ اور ہم

جولائی ۱۸۹۹ء۔ ایک معزز افسر جو کسی تقریب پر اگلے دن قادیان میں تشریف لائے۔ تو حضرت اقدس امامنا مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان نے بھی ان کی دعوت کی جبکہ سب مہمان

[1] العنکبوت : ۵۲

کھانے کے واسطے جمع ہوئے تو دسترخوان کے بچھائے جانے سے پہلے حضرت اقدسؑ نے اس مہمان کو اور دوسرے احباب کو مخاطب کرکے فرمایا[1]:۔

حضرت مسیح موعودؑ کا کام

"جب کبھی آپ اس جگہ قادیان میں تشریف لاویں، بے تکلف ہمارے گھر میں تشریف لایا کریں۔ ہمارے ہاں مطلقاً تکلف نہیں ہے۔ ہمارا سب کاروبار دینی ہے۔ اور دُنیا اور اُس کے تعلقات اور تکلفات سے ہم بالکل جُدا ہیں۔ گویا ہم دنیاداری کے لحاظ سے مثل مُردہ کے ہیں۔ ہم محض دین کے ہیں اور ہمارا سب کارخانہ دینی ہے۔ جیسا کہ اسلام میں ہمیشہ بزرگوں اور اماموں کا ہوتا آیا ہے اور ہمارا کوئی نیا طریق نہیں بلکہ لوگوں کے اُس اعتقادی طریق کو جو کہ ہر طرح سے اُن کے لئے خطرناک ہے دُور کرنا اور اُن کے دلوں سے نکالنا ہمارا اصل منشاء اور مقصود ہے مثلاً بعض نادان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ غیر قوموں کے لوگوں کی چیزیں چُرا لینا جائز ہے اور کافروں کا مال ہمارے لئے حلال ہے اور پھر اپنی نفسانی خواہشوں کی خاطر اس کے مطابق حدیثیں بھی گھڑ رکھی ہیں۔ پھر وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ جو دوبارہ دنیا میں آنے والے ہیں تو ان کا کام لاٹھی مارنا اور خونریزیاں کرنا ہے۔ حالانکہ جبر سے کوئی دین دین نہیں ہو سکتا۔ غرض اسی قسم کے خوفناک عقیدے اور غلط خیالات اِن لوگوں کے دلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن کو دُور کرنے کے واسطے اور پُرامن عقائد اُن کی جگہ قائم کرنے کے واسطے ہمارا سلسلہ ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ مُصلِح

---

[1] جناب مفتی محمد صادق صاحب لکھتے ہیں:۔ "یہ گفتگو ایسی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل تھی۔ کہ میں نے اکثر فقروں کو اپنی عادت کے موافق اسی وقت اپنی نوٹ بُک میں جمع کیا اور بعد میں مجھے خیال آیا کہ بذریعہ اخبار الحکم مَیں دوسرے احباب کو بھی اس پُرلطف تقریر کے مضمون سے حظ اُٹھانے کا موقع دُوں . . . . لہٰذا ان فقرات کی مدد سے اور اپنی یادداشت کے ذریعہ مَیں نے مفصّلہ ذیل عبارت ترتیب دی ہے۔"

کی اور اولیاء اللہ کی اور نیک باتیں سکھانے والوں کی دُنیا دار مخالفت کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے اور مخالفوں نے غلط خبریں محض افترا اور جھوٹ کے ساتھ ہمارے برخلاف مشہور کیں یہانتک کہ ہم کو ضرر پہنچانے کے واسطے گورنمنٹ تک غلط رپورٹیں کیں کہ یہ مُفسد آدمی ہیں اور بغاوت کے ارادے رکھتے ہیں اور ضرور تھا۔ کہ یہ لوگ ایسا کرتے۔ کیونکہ نادانوں نے اپنے خیر خواہوں یعنی انبیاء اور ان کے وارثین کیساتھ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے انسان میں ایک زیرکی رکھی ہے اور گورنمنٹ کے کارکُن ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے ایک اعتراض کا جواب

چنانچہ کپتان ڈگلس صاحب کی دانائی کی طرف خیال کرنا چاہیئے کہ جب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے میری نسبت کہا کہ یہ بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اشتہار اس کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے بڑی زیرکی سے پہچانا کہ یہ سب ان لوگوں کا افترا ہے اور ان کا مخالف کی کسی بات پر توجہ نہ کی۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ ازالہ اوہام وغیرہ دوسری کتب میں ہمارا لقب سُلطان لکھا ہوا ہے۔ مگر یہ آسمانی سلطنت کی طرف اشارہ ہے اور دُنیوی بادشاہوں سے ہمارا کچھ سروکار نہیں ایسا ہی ہمارا نام حکم عادل بھی ہے۔ جس کا ترجمہ اگر انگریزی میں کیا جائے تو گورنر جنرل ہوتا ہے اور شروع سے یہ سب باتیں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں میں موجود ہیں کہ آنے والے مسیح کے یہ نام ہیں۔ یہ سب ہمارے خطاب کتابوں میں موجود ہیں اور ساتھ ہی ان کی تشریح بھی موجود ہے کہ یہ آسمانی سلطنتوں کی اصطلاحیں ہیں اور زمینی بادشاہوں سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم شر کو چاہنے والے ہوتے تو ہم جہاد وغیرہ سے لوگوں کو کیوں روکتے اور درندگی سے ہم مخلوقات کو کیوں منع کرتے غرض کپتان ڈگلس صاحب عقل سے ان سب باتوں کو پا گیا۔ اور پورے پورے انصاف سے کام لیا۔ اور دونوں فریق میں سے ذرہ بھی

دوسری طرف نہیں جُھکا۔ اور ایسا نمونہ انصاف پروری اور دادرسی کا دکھلایا۔ کہ ہم بدل خواہشمند ہیں کہ ہماری گورنمنٹ کے تمام معزز حکّام ہمیشہ اسی اعلےٰ درجہ کے نمونہ انصاف کو دکھلاتے رہیں جو نوشیروانی انصاف کو بھی اپنے کامل انصاف کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کا ٹھیراتا ہے۔ اور یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس گورنمنٹ کے پُرامن زمانہ کو بُرا خیال کرے اور اس کے برخلاف منصُوبہ بازی کی طرف اپنا ذہن لے جاوے حالانکہ یہ ہمارے دیکھنے کی باتیں ہیں کہ سکھوں کے زمانہ میں مسلمانوں کو کس قدر تکلیف ہوتی تھی۔ صرف ایک گائے کے اتفاقاً ذبح کئے جانے پر سکھوں نے چھ سات ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ اور نیکی کی راہ اس طرح پر مسدُود تھی کہ ایک شخص مسمّی کے ّشاہ اس آرزو میں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں مانگتا تھا کہ ایک دفعہ صحیح بخاری کی زیارت ہو جائے اور دُعا کرتا کرتا رو پڑتا تھا اور زمانہ کے حالات کی وجہ سے ناامید ہو جاتا تھا۔ آج گورنمنٹ کے قدم کی برکت سے وُہی صحیح بخاری چار پانچ روپے میں مل جاتی ہے۔ اور اُس زمانہ میں لوگ اِس قدر دُور جا پڑے تھے۔ کہ ایک مسلمان نے جس کا نام خدابخش تھا اپنا نام خدا سنگھ رکھ لیا تھا۔ بلکہ اس گورنمنٹ کے ہم پر اس قدر احسان ہیں کہ اگر ہم یہاں سے نکل جائیں تو نہ ہمارا مکّہ میں گذارہ ہو سکتا ہے اور نہ قسطنطنیہ میں۔ تو پھر کس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے برخلاف کوئی خیال اپنے دل میں رکھیں۔ اگر ہماری قوم کو خیال ہے کہ ہم گورنمنٹ کے برخلاف ہیں یا ہمارا مذہب غلط ہے تو اُن کو چاہیئے کہ وُہ ایک مجلس قائم کریں۔ اس میں ہماری باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنیں تا کہ اُن کی تسلی ہو اور اُن کی غلط فہمیاں دُور ہوں۔ جھُوٹے کے مُنہ سے بَدبُو آتی ہے اور فراست والا اُس کو پہچان جاتا ہے۔ صادق کے کام سادگی اور یکرنگی سے ہوتے ہیں۔ اور زمانہ کے حالات اس کے مؤیّد ہوتے ہیں ✦

آجکل دیکھنا چاہیئے کہ لوگ کس طرح عقائد حقّہ سے پھر گئے ہیں۔ ۲۰ کروڑ کتاب

اسلام کے خلاف شائع ہوئی اور کئی لاکھ آدمی عیسائی ہو گئے ہیں۔ ہر ایک بات کے لئے ایک حد ہوتی ہے۔ اور خشک سالی کے بعد جنگل کے حیوان بھی بارش کی امید میں آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاتے ہیں۔ آج ۱۳۰۰ برس کی دھوپ اور امساک باراں کے بعد آسمان سے بارش اُتری ہے۔ اب اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ برسات کا جب وقت آگیا ہے، تو کون ہے جو اُس کو بند کرے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ لوگوں کے دل حق سے بہت ہی دُور جا پڑے ہیں۔ ایسا کہ خود خدا پر بھی شک ہو گیا ہے۔ حالانکہ تمام اعمال کی طرف حرکت صرف ایمان سے ہوتی ہے۔ مثلاً سَم الفار کو اگر کوئی شخص طباشیر سمجھ لے تو بلا خوف و خطر کئی ماشوں تک کھا جاوے گا۔ اگر یقین رکھتا ہو کہ یہ زہرِ قاتل ہے تو ہرگز اس کو مُنہ کے قریب بھی نہ لائے گا۔

حقیقی نیکی کے واسطے خدا کے وجُود پر ایمان لانا ضروری ہے

حقیقی نیکی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان ہو کیونکہ مجازی حکّام کو یہ معلوم نہیں کہ کوئی گھر کے اندر کیا کرتا ہے اور پسِ پردہ کسی کا کیا فعل ہے۔ اور اگرچہ کوئی زبان سے نیکی کا اقرار کرے۔ مگر اپنے دِل کے اندر وُہ جو کچھ رکھتا ہے اس کے لئے اُس کو ہمارے مؤاخذہ کا خوف نہیں اور دُنیا کی حکومتوں میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا خوف انسان کو رات میں اور دن میں، اندھیرے میں اور اُجالے میں، خلوت میں اور جلوت میں، ویرانے میں اور آبادی میں، گھر میں اور بازار میں ہر حالت میں یکساں ہو۔ پس درستی اخلاق کے واسطے ایسی ہستی پر ایمان کا ہونا ضروری ہے جو ہر حال اور ہر وقت میں اس کے نگران اور اس کے اعمال اور افعال اور اس کے سینہ کے بھیدوں کی شاہد ہے

نیک وُہی ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو

کیونکہ دراصل نیک وہی ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو اور جس کا دل اور باہر ایک ہے وہ زمین پر فرشتہ کی طرح چلتا ہے۔ دہریّہ ایسی گورنمنٹ کے نیچے نہیں کہ وُہ

حُسن اخلاق کو پا سکے۔ تمام نتائجُ ایمان سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ سانپ کے سُوراخ کو پہچان کر کوئی انگلی اُس میں نہیں ڈالتا جب ہم جانتے ہیں کہ ایک مقدار اسٹرکنیا کی قاتل ہے تو ہمارا اس کے قاتل ہونے پر ایمان ہے اور اس ایمان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس کو مُنہ نہیں لگائیں گے اور مرنے سے بچ جائیں گے۔ اور تقدیر یعنی دُنیا کے اندر تمام اشیاء کا ایک اندازہ اور قانُون کے ساتھ چلنا اور ٹھیرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا کوئی مُقدِّر یعنی اندازہ باندھنے والا ضرور ہے۔ گھڑی کو اگر کسی نے بالارادہ نہیں بنایا۔ تو وُہ کیوں اس قدر ایک باقاعدہ نظام کے ساتھ اپنی حرکت کو قائم رکھ کر ہمارے واسطے فائدہ مند ہوتی ہے۔ ایسا ہی آسمان کی گھڑی کہ اُس کی ترتیب اور باقاعدہ اور باضابطہ انتظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وُہ بالارادہ خاص مقصد اور مطلب اور فائدہ کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اس طرح انسان مصنُوع سے صانع کو اور تقدیر سے مُقدِّر کو پہچان سکتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کی ہستی کا ثبوت

لیکن اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کے ثبوت کا ایک اَور ذریعہ قائم کیا ہوا ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ وُہ قبل از وقت اپنے برگزیدوں کو کسی تقدیر سے اطلاع دیدیتا ہے اور اُن کو بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت اور فلاں دن میں مَیں نے فلاں امر کو مقدر کر دیا ہے چنانچہ وُہ شخص جس کو خدا نے اس کام کے واسطے چُنا ہوا ہوتا ہے پہلے سے لوگوں کو اطلاع دے دیتا ہے کہ ایسا ہوگا اور پھر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اُس نے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت کے واسطے یہ ایسی دلیل ہے کہ ہر ایک دہریّہ اس موقع پر شرمندہ اور لاجواب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہم کو ہزاروں ایسے نشانات عطا کئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر لذیذ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ ہماری جماعت کے اس قدر لوگ اس جگہ موجود ہیں۔ کون ہے جس نے کم از کم دو چار نشان نہیں دیکھے۔ اور اگر آپ چاہیں تو کئی سَو آدمی کو باہر سے بُلوائیں اور اُن سے پُوچھیں۔ اس قدر احباب اور اخیار اور متقی

اور صالح لوگ جو کہ ہر طرح سے عقل اور فراست رکھتے ہیں اور دُنیوی طور پر اپنے معقول روزگاروں پر قائم ہیں۔ کیا ان کو تسلی نہیں ہوئی۔ کیا اُنہوں نے ایسی باتیں نہیں دیکھیں جن پر انسان کبھی قادر نہیں ہے۔ اگر اُن سے سوال کیا جائے تو ہر ایک اپنے آپ کو اوّل درجہ کا گواہ قرار دیگا۔ کیا ممکن ہے کہ ایسے ہر طبقہ کے انسان جن میں عاقل اور فاضل اور طبیب اور ڈاکٹر اور سوداگر اور مشائخ سجادہ نشین اور وکیل اور معزز عہدہ دار ہیں۔ بغیر پُوری تسلی پانے کے یہ اقرار کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس قدر آسمانی نشان بچشمِ خود دیکھے اور جبکہ وُہ لوگ واقعی طور پر ایسا اقرار کرتے ہیں جس کی تصدیق کے لئے ہر وقت شخصِ مکذّب کو اختیار ہے تو پھر سوچنا چاہیئے کہ ان مجموعۂ اقرارات کا طالب حق کے لئے اگر وہ فی الحقیقت طالبِ حق ہے کیا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ کم سے کم ایک ناواقف اتنا تو ضرور سوچ سکتا ہے کہ اگر اس گروہ میں جو لوگ ہر طرح سے تعلیمیافتہ اور دانا اور آسودہ روزگار اور بفضل الٰہی مالی حالتوں میں دوسروں کے محتاج نہیں ہیں۔ اگر انہوں نے پورے طور پر میرے دعوے پر یقین حاصل نہیں کیا اور پُوری تسلی نہیں پائی تو کیوں وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اور عزیزوں سے علیحدہ ہو کر غربت اور مسافری میں اس جگہ میرے پاس بسر کرتے ہیں۔ اور اپنی اپنی مقدرت کے موافق مالی امداد میں میرے سلسلہ کے لئے فِدا اور دلدادہ ہیں۔

ہر ایک بات کا وقت ہے۔ بہار کا بھی وقت ہے اور برسات کا بھی وقت ہے اور کوئی نہیں جو خدا کے ارادے ٹال دے۔ (الحکم جلد ۳ ۲۶ صفحہ ۷ پرچہ ۲۴ جولائی ۱۸۹۹ء)

یکم اگست ۱۸۹۹ء[1]

[1] یکم اگست ۱۸۹۹ء کو بعد مغرب ایک مشہور ہندو صاحب حضرت اقدس ؑ کی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور حضورؑ سے باتیں کرتے رہے۔ یہ اس گفتگو کا خلاصہ یا مفہوم ہے جس کو حافظہ کی مدد سے ہم نے اپنے الفاظ میں قلمبند کیا ہے (ایڈیٹر الحکم)

حضرت اقدسؑ کا ایک ہندو سادھو سے مکالمہ دربارہ طریق حصول معرفت الٰہی

حضرت اقدسؑ۔ آپ کے ہاں جوگ کا طریق سناتن دھرم کے اصول پر ہے یا آریہ سماج کے اصول پر۔

سادھو۔ سناتن دھرم کے موافق۔

حضرت اقدسؑ۔ آریہ سماج ایک ایسا فرقہ ہے جس میں صرف کہنا ہے کرنا نہیں۔

سادھو۔ بیشک یہ لوگ گرو کی ضرورت نہیں سمجھتے اور یہانتک کہ دیانند کو بھی گرو کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ وُہ ایک راہ بتا گیا ہے۔ اس پر چلنا چاہیئے۔

حضرت اقدسؑ۔ آپ کے جوگ کے لیئے بڑی بڑی مشقتیں ہیں۔

سادھو۔ جی ہاں۔

حضرت اقدسؑ۔ اس مشقت کے بعد کیا کوئی ایسی قوت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس پریم کا پتہ لگ جاوے جو اس ریاضت کرنے والے کو خدا کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ محبّت کا پتہ اور وجُود اس وقت تک نہیں ملتا۔ جبتک کہ دونوں طرف سے کامل محبّت کا اظہار نہ ہو۔ ادھر سے محبّت کے جوش میں ہر قسم کے دُکھ اور تکالیف کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو اور ادھر سے یعنی پرمیشر کی طرف سے ایسا پرکاش (روشنی یا نُور) اس کو ملے۔ کہ وہ عام طور پر لوگوں میں متمیز ہو جاوے۔

سادھو۔ ہاں کچھ بَل اور طاقت آہی جاتا ہے۔

حضرت اقدسؑ۔ بھلا کوئی ایسی طاقت اور بَل کی بات آپ سنائیں جو آپ کی سُنی ہوئی نہ ہو بلکہ دیکھی ہوئی ہو۔ یعنی آپ کے گرو میں یا اُن کے گرو میں۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ سُنی ہوئی بات کچھ ایسی موثر نہیں ہوتی خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ قصّے کہانی کے ذیل میں سمجھی جاتی ہے۔ جیسے مثلاً کوئی کہے کہ ایک دیش ہے وہاں آدمی اُڑا کرتے ہیں۔ اب ہم کو اُس

کے ماننے میں ضرور تامّل ہوگا۔ کیونکہ ہم نے نہ تو ایسے آدمی اُڑتے دیکھے ہیں اور نہ خود اُڑے ہیں۔ پس قوتِ ایمان اور یقین کے بڑھانے کے لئے سُنی سُنائی باتیں فائدہ نہیں پہنچاتی ہیں۔ بلکہ تازہ بتازہ جو سامنے دیکھی جاویں اور اُس سے بھی بڑھ کر وہ جو خود انسان کی اپنی حالت پر وارد ہوں۔ پس میرے اس سوال سے یہ غرض ہے کہ آپ کوئی ایسی بات بتلائیں۔ جو اس ریاضت کرنے والوں میں آپ نے دیکھی ہو یا سُنی ہو +

سادھو۔ ہاں ہمارے جو گرُو تھے ان میں بعض بعض باتیں ایسی تھیں جو دوسرے کے مَن کی بات بُوجھ لیتے تھے۔ اور پھر جو مُنہ سے کہہ دیتے تھے ہو جاتا تھا۔ اور جو اُن کے گرُو تھے اُن میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں مگر اُن کو دیکھا نہیں تاہم دیکھنے کے برابر ہے۔ کیونکہ اُن کو مَرے کوئی اسّی برس کے قریب ہوئے۔ اور اُن کے دیکھنے والے ابھی موجُود ہیں +

حضرت اقدسؑ۔ آپ نے بھی کوئی ریاضتیں کی تھیں ؟

سادھو۔ جی ہاں۔ میں نے بھی کی ہیں +

حضرت اقدسؑ۔ کیا کیا ؟

سادھو۔ پہلے چِلّہ کشی کیا کرتے تھے۔ یہانتک کہ آٹھ مہینے کا ایک ہی چِلّہ تھا +

حضرت اقدسؑ۔ اس میں کیا کھاتے تھے ؟

سادھو۔ پہلے چاولوں کا آٹا کھایا کرتے تھے۔ پھر صرف پانی جو پکا کر رکھا ہوا تھا یعنی ایک گاگر کا نصف جب رہ جاوے تو وُہ رکھ لیا کرتے تھے اور اس میں سے سیر کچّا صبح کو پی لیا کرتے تھے اور اسی وقت پیشاب کر لیا کرتے تھے اور پھر کچھ نہیں +

حضرت اقدسؑ۔ کیا اس میں لونا وغیرہ تو نہ ہوتا تھا ؟

سادھو۔ نہیں +

حضرت اقدسؑ۔ پھر کیا اس ریاضت کی حالت میں آپ کو کچھ عجیب و غریب نظّارے

نظر آئے؟

سادھو۔ ہاں کبھی روشنی نظر آتی تھی جو اندر ہو جاتی تھی اور دُور دُور سے آتے جاتے آدمی نظر آجاتے تھے۔

اس کے بعد چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر اس مُہرِ سکوت کو سادھو صاحب نے اپنے اس ایک سوال سے توڑا۔ (ایڈیٹر)

سادھو۔ کیا آپ پرمیشر کو اکار مانتے ہیں یا نراکار؟

(حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ نے اس موقع پر بطور تشریح عرض کیا کہ مُورتی کے قابل یا ایسا خدا کہ مُورتی کی ضرورت نہ ہو)

اسلام کا خدا

حضرت اقدسؑ۔ ہم جس خدا کو مانتے ہیں۔ اس کی عبادت اور پرستش کے لئے نہ تو ان مشقتوں اور ریاضتوں کی ضرورت ہے اور نہ کسی مُورتی کی حاجت ہے۔ اور ہمارے مذہب میں خدائے تعالیٰ کو حاصل کرنے اور اس کی قُدرت نمائیوں کے نظّارے دیکھنے کے لئے ایسی تکالیف کے برداشت کرنے کی کچھ بھی حاجت نہیں۔ بلکہ وُہ اپنے سچے پریمی بھگتوں کو آسان طریق سے جو ہم نے خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے بہت جلد مِلتا ہے۔ انسان اگر اس کی طرف ایک قدم اُٹھاتا ہے تو وُہ دو قدم اُٹھاتا ہے۔ انسان اگر تیز چلتا ہے۔ تو وُہ دوڑ کر اس کے ہردے میں پرکاش کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ کا غیب میں رہنا انسان کے فائدے کیلئے ہی ہے

میرے نزدیک مُورتی بنانے والوں نے خدا تعالیٰ کی اس حکمت اور راز کو نہیں سمجھا۔ جو اس نے اپنے آپ کو بظاہر ایک حالت غیب میں رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کا غیب میں ہی ہونا انسان کے لئے تمام تلاش اور جُستجو اور کُل تحقیقاتوں کی راہوں کو کھولتا ہے۔ جس قدر علُوم اور معارف انسان پر کھُلے ہیں وُہ گو موجُود تھے اور ہیں۔ لیکن ایک وقت میں وُہ غیب

میں تھے۔ انسان کی سعی اور کوشش کی قوت نے اپنی چمکار دکھائی اور گوہر مقصود کو پا لیا۔ جس طرح پر ایک عاشق صادق ہوتا ہے۔ اس کے محبوب اور معشوق کی غیر حاضری اور آنکھوں سے بظاہر دُور ہونا اس کی محبت میں کچھ فرق نہیں ڈالتا بلکہ وہ ظاہری ہجر اپنے اندر ایک قسم کی سوزش پیدا کر کے اس پریم بھاؤ کو اَور بھی ترقی دیتا ہے۔ اسی طرح پر مُورتی لے کر خدا کو تلاش کرنے والا کب سچّی اور حقیقی محبّت کا دعویدار بن سکتا ہے جبکہ مُورتی کے بدُوں اس کی توجہ کامل طور پر اس پاک اور کامل حُسن ہستی کی طرف نہیں پڑ سکتی۔ انسان اپنی محبّت کا خود امتحان کرے۔ اگر اس کو اس سوختہ دِل عاشق کی طرح چلتے پھرتے، بیٹھتے اُٹھتے غرض ہر حالت میں بیداری کی ہو یا خواب کی، اپنے محبُوب کا ہی چہرہ نظر آتا ہے اور کامل توجہ اُسی طرف ہے تو سمجھ لے کہ واقعی مجھے خدا تعالےٰ سے ایک عِشق ہے اور ضرور ضرور خدا تعالیٰ کا پرکاش اور پریم میرے اندر موجود ہے۔ لیکن اگر درمیانی اُمور اور خارجی بندھن اور رکاوٹیں اس کی توجہ کو پھرا سکتی ہیں۔ اور ایک لحظہ کے لئے بھی وُہ خیال اس کے دل سے نِکل سکتا ہے تو مَیں سچ کہتا ہوں کہ وُہ خدا تعالیٰ کا عاشق نہیں اور اس سے محبّت نہیں کرتا اور اسی لئے وُہ روشنی اور نُور جو سچّے عاشقوں کو ملتا ہے اُسے نہیں مِلتا۔ یہی وُہ جگہ ہے جہاں آکر اکثر لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور خدا کا انکار کر بیٹھے ہیں۔ نادانوں نے اپنی محبّت کا امتحان نہیں کیا اور اُس کا وزن کئے بدُوں ہی خدا پر بدظن ہو گئے ہیں پس میرے خیال میں خدا تعالےٰ کا غیب میں رہنا انسان کی سعادت اور رُشد کو ترقی دینے کی خاطر ہے اور اس کی رُوحانی قوتوں کو صاف کر کے جلا دینے کے لئے تاکہ وُہ نُور اس میں پرکاش ہو۔ ہم جو بار بار اشتہار دیتے ہیں۔ اور لوگوں کو تجربہ کے لئے بُلاتے ہیں۔ بعض لوگ ہم کو دوکاندار کہتے ہیں۔ کوئی کچھ بولتا ہے کوئی کچھ۔ غرض ان بھانت بھانت کی بولیوں کو سُن کر جو ہر مُلک میں جو اس دُنیا پر آباد ہے۔ یورپ، امریکہ وغیرہ میں اشتہار دیتے ہیں اُس کی غرض کیا ہے؟

ہماری غرض

ہماری غرض بجز اس کے اَور کچھ نہیں۔ کہ لوگوں کو اُس خدا کی طرف رہنمائی کریں جسے ہم نے خود دیکھا ہے۔ سُنی سُنائی بات اور قِصّہ کے رنگ میں ہم خدا کو دکھانا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم اپنی ذات اور اپنے وجود کو پیش کر کے دُنیا کو خدا تعالیٰ کا وجود منوانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی بات ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف جس قدر کوئی قدم اُٹھاتا ہے خدا تعالیٰ اس سے زیادہ سُرعت اور تیزی کے ساتھ اُس کی طرف آتا ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک معزّز آدمی کا منظور نظر عزیز اور واجب التّعظیم سمجھا جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کا قُرب حاصِل کرنے والا اپنے اندر ان نشانات میں سے کچھ بھی حِصّہ نہ لے گا جو خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور بے انتہا طاقتوں کا نمونہ ہوں ۞

مُقرّبان بارگاہِ الٰہی پر مخالفانہ حملے ہونے کی وجہ

یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی غیرت کبھی تقاضا نہیں کرتی کہ اُس کو ایسی حالت میں چھوڑے کہ وُہ ذلیل ہو کر پیسا جاوے۔ نہیں بلکہ وُہ خود وحدہٗ لا شریک ہے وہ اپنے اُس بندہ کو بھی ایک فرد اور وحدہٗ لاشریک بنا دیتا ہے۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی انسان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہر طرف سے اُس پر حملے ہوتے ہیں۔ اور ہر حملہ کرنے والا اُس کی طاقت کے اندازہ سے بیخبر ہو کر جانتا ہے کہ میں اُسے تباہ کر ڈالوں گا۔ لیکن آخر اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا بچ نکلنا اِنسانی طاقت سے باہر کِسی قوت کا کام ہے۔ کیونکہ اگر اُسے پہلے سے یہ علم ہوتا تو وُہ حملہ بھی نہ کرتا۔ پس وُہ لوگ جو خدا تعالےٰ کے حضور ایک تقرّب حاصِل کرتے ہیں۔ اور دُنیا میں اُس کے وجُود اور ہستی پر ایک نشان ہوتے ہیں۔ بظاہر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ہر ایک مخالف اپنے خیال میں یہ سمجھتا ہے کہ میرے مقابلہ میں یہ بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر قسم کی تدبیر اور کوشش کے نتائج اسے یہیں تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن جب وُہ اس زد میں سے ایک عزّت اور احترام

کے ساتھ اور سلامتی سے نکلتا ہے تو ایک دم کے لئے تو اسے حیران ہونا پڑتا ہے کہ اگر انسانی طاقت کا ہی کام تھا تو اس کا بچنا محال تھا۔ لیکن اب اس کا صحیح سلامت رہنا انسان کا نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی پر جو مخالفانہ حملے ہوتے ہیں وہ کیوں ہوتے ہیں؟ معرفت اور گیان کے کوچہ سے بےخبر لوگ ایسی مخالفتوں کو ایک ذلت سمجھتے ہیں۔ مگر اُن کو کیا خبر ہوتی ہے کہ اس ذلت میں اُن کے لئے ایک عزت اور امتیاز نکلتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور ہستی پر ایک نشان ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ وجود آیات اللہ کہلاتے ہیں ۔

غرض ہم جو اشتہار دے دے کر لوگوں کو بلاتے ہیں تو ہماری یہی آرزو ہے کہ اُن کو اُس خدا کا پتہ دیں جسے ہم نے پایا اور دیکھا ہے اور وہ اقرب راہ بتلائیں۔ جس سے انسان جلد باخدا ہو جاتا ہے۔ پس ہمارے خیال میں قصہ کہانی سے کوئی معرفت اور گیان ترقی نہیں پا سکتا جبتک کہ خود عملی حالت سے انسان نہ دیکھے اور یہ بدوں اس راہ کے جو ہماری راہ ہے میسر نہیں۔ اور اس راہ کے لئے ایسی صعوبتوں اور مشقتوں کی ضرورت نہیں یہاں دِل بکار ہے۔ خدا تعالیٰ کی نگاہ دِل پر پڑتی ہے اور جس دل میں محبت اور عشق ہو اس کو مورتی سے کیا غرض؟ مورتی پوجا سے انسان کبھی صحیح اور یقینی نتائج پر پہنچ نہیں سکتا۔

خدا تعالیٰ اخلاص و محبت کو دیکھتا ہے

خدا تعالیٰ کی نگاہ انسان مخلص کے دل کے ایک نقطہ پر ہوتی ہے جسے وہ دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کی خاطر وہ خوش دلی سے ہر صعوبت و مکروہ کو برداشت کرلیگا۔ یہ ضرور نہیں کہ کوئی بڑی بڑی مشقتیں کرے اور دائم حاضر باش رہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ خاکروب ہمارے مکان میں آکر بڑی تکلیف اُٹھاتا ہے اور جو کام وہ کرتا ہے ہمارا ایک بڑا معزز مخلص دوست وہ کام نہیں کر سکتا۔ تو کیا ہم اپنے وفادار احباب کو بیقدر سمجھیں اور خاکروب کو معزز و مکرم خیال کریں۔ بعض ہمارے ایسے بھی احباب ہیں جو مدتوں کے

بعد تشریف لاتے ہیں اور انہیں ہر وقت ہمارے پاس بیٹھنا میسّر نہیں آتا مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ اُن کے دلوں کی بناوٹ ایسی ہے اور وُہ اخلاص و مودّت سے ایسے خمیر کئے گئے ہیں کہ ایک وقت ہمارے بڑے بڑے کام آسکتے ہیں۔ نظام قُدرت میں بھی ہم ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ جتنا شرف بڑھ جاتا ہے۔ محنت اور کام ہلکا ہو جاتا ہے۔ ایک مذکوری کو دیکھ لو۔ انبار پَروانوں کا اُسے دیا جاتا ہے اور ایک ہفتہ کے اندر حکم ہے کہ تعمیل کر کے حاضر ہو۔ برسات ہو، دھوپ ہو، جاڑا ہو، دیہات کے راستے خراب ہوں۔ کوئی عذر سُنا نہیں جاتا اور تنخواہ پُوچھو تو پانچ روپے۔ اور حکام بالا دست کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔

رہبانیت معرفتِ تامّہ کا ذریعہ نہیں ہے

اس قانون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قانون بھی اپنے برگزیدوں سے ایسا ہی ہے۔ خطرناک ریاضتیں کرنا اور اعضاء اور قویٰ کو مجاہدات میں بیکار کر دینا محض نکمّی بات اور لاحاصل ہے۔ اسی لئے ہمارے ہادی کامل علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا۔ لا رھبانیّۃ فی الاسلام۔ یعنی جب انسان کو صفت اسلام (گردن نہادن بر حکم خدا و موافقت تامہ بمقادیر الٰہیہ) میسّر آجائے تو پھر رہبانیّت یعنی ایسے مجاہدوں اور ریاضتوں کی کوئی ضرورت نہیں ۔

اس کے بعد سادھو صاحب تشریف لے گئے اور کھانا رکھا گیا۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا۔ کہ :۔
یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیّت کو نہیں رکھا۔ اس لئے کہ وہ معرفت تامّہ کا ذریعہ نہیں ہے ۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۵-۳)

۱۰ اگست ۱۸۹۹ء سے قبل :۔

میں نے بارہا اپنے محبوب مُرشد سید الاولیاء عیسیٰ موعُود علیہ السّلام کی زبان مبارک سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے ہیں :۔

ہم میں اس خسیس دُنیا کو خوش کرنے کیلئے اپنے خدا کی دھتکار کی طاقت نہیں

"ہم اس پر قادر ہیں کہ ایسی تقریریں کریں اور ایسی تحریریں شائع کریں کہ لوگوں کی مُصطلح صُلح کُل کے ڈھانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوں اور سب قومیں علی اختلاف المشارب خوش ہو جاویں اور حُکام اور رعایا میں سے کسی کو بھی کبھی اُن پر نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ مگر اس خسیس دنیا کو خوش کر کے اپنے خدا کی دھتکار کی طاقت ہم کہاں رکھ سکتے ہیں۔"

(از خط مولانا عبدالکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۲)

ہفتہ مختتمہ ۱۷ اگست ۱۸۹۹ء۔ بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں دُعا کے لئے لکھا کرتے تھے جس کے جواب میں اُن کو تحریر کیا جاتا تھا۔ کہ دُعا کی گئی۔ مگر بعد ازاں وہ دوبارہ لکھ دیا کرتے کہ "کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اور یہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو آپ نے دُعا نہیں کی۔ یا اگر کی ہے تو توجہ سے نہیں کی۔" حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ نے اس بارہ میں ایک دن عرض کی۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

دُعا کیا ہے؟

"سخت ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ دُعا کے مضمون پر پھر قلم اٹھایا جائے۔ کیونکہ پہلے مضامین اس بارہ میں کافی ثابت نہیں ہوئے۔ دُعا، نہایت نازک امر ہے اور اس کے لئے شرط ہے کہ مستدعی اور داعی میں ایسا مستحکم رابطہ ہو جائے کہ ایک کا دَرد دوسرے کا دَرد ہو جائے اور ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہو جائے۔ جس طرح شیر خوار بچّہ کا رونا ماں کو بے اختیار کر دیتا اور اس کی چھاتیوں میں دُودھ اتار دیتا ہے ویسے ہی مستدعی کی حالت زار اور استغاثہ پر داعی سراسر رِقّت اور عقدِ ہمّت بن جائے۔"

دُعا کیلئے توجہ اور رِقّت بھی خدا تعالیٰ کیطرف سے ہوتی ہے

فرمایا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ سب امُور خدا تعالیٰ کی موہبت ہیں۔ اکتساب کو ان میں

دخل نہیں۔ توجّہ اور رقّت بھی خدا تعالیٰ کے ہاں سے نازل ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی کے لئے کامیابی کی راہ نکال دے۔ تو وُہ داعی کے دل میں توجّہ اور رقّت ڈال دیتا ہے۔ مگر سلسلہ اسباب میں ضروری ہوتا ہے کہ داعی کو کوئی محرک شدید جنبش اور حرکت دینے والا ہو۔ اس کی تدبیر بجز اس کے اَور کوئی نہیں کہ مُستدعی اپنی حالت ایسی بنائے کہ اضطراراً داعی کو اُس کی طرف توجہ ہو جائے۔" فرمایا کہ:-

"جو حالت میری توجہ کو جذب کرتی ہے اور جسے دیکھ کر میں دُعا کے لئے اپنے اندر تحریک پاتا ہوں۔ وُہ ایک ہی بات ہے کہ میں کسی شخص کی نسبت معلوم کر لوں۔ کہ یہ خدمتِ دین کے سزاوار ہے اور اُس کا وجُود خدا تعالےٰ کے لئے، خدا کے رسولؐ کے لئے خدا کی کتاب کے لئے اور خدا کے بندوں کے لئے نافع ہے۔ ایسے شخص کو جو دَرد و الَم پہنچے وہ درحقیقت مجھے پہنچتا ہے۔" فرمایا:-

اپنے دلوں میں خدمتِ دین کی نیّت کرو

"ہمارے دوستوں کو چاہیئے کہ وُہ اپنے دلوں میں خدمتِ دین کی نیت باندھ لیں جس طرز اور جس رنگ کی خدمت جس سے بَن پڑے کرے۔" پھر فرمایا:-

"میں سچ سچ کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے نزدیک اُس شخص کی قدر و منزلت ہے جو دین کا خادم اور نافع النّاس ہے۔ ورنہ وُہ کچھ پَرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کتّوں اور بھیڑیوں کی موت مَر جائیں۔"

خدا تعالیٰ اور بندہ کے رابطہ کا حال

ایک دن حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے فرمایا۔ کہ

"دُو دوستوں میں دوستی اسی صورت میں نبھ سکتی ہے کہ کبھی وُہ اِس کی مان لے اور کبھی یہ اُس کی۔ اگر ایک شخص سدا اپنی ہی منوانے کے درپے ہو جائے۔ تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ یہی حال خدا تعالےٰ اور بندہ کے رابطہ کا ہونا چاہیئے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اس

کی سُن لے اور اس پر فضل کے دروازے کھول دے اور کبھی بندہ اُس کی قضاو قدر پر راضی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق خدا تعالیٰ کا ہی ہے کہ وُہ بندوں کا اِمتحان لے اور یہ امتحان اُس کی طرف سے انسان کے فوائد کے لئے ہوتے ہیں۔ اُس کا قانُون قدرت ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ کہ امتحان کے بعد جو اچھے نکلیں انہیں اپنے فضلوں کا وارث بناتا ہے۔"

ہمہ تن دُنیاوی اُمُور میں کھویا جانا خسارت آخرت کا موجب ہوتا ہے۔

ایک نوجوان شخص نے حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر دُنیاوی مصائب کی کہانی شروع کی اور اپنے طرح طرح کے ہمّ و غم بیان کئے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے بہت سمجھایا۔ اور فرمایا۔ کہ "ہمہ تن دُنیاوی امُور میں کھویا جانا خسارتِ آخرت کا موجب ہوتا ہے اور اس قدر جزع و فزع مومن کو نہیں چاہیئے۔" مگر وہ زور زور سے رونے لگا جس پر آپ نے سخت ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر کہا۔ کہ "بس کرو۔ میں ایسے رونے کو جہنّم کا موجب جانتا ہوں۔ میرے نزدیک جو آنسو دنیا کے ہمّ و غم میں گرائے جاتے ہیں۔ وہ آگ ہیں جو بہانے والے کو ہی جلا دیتے ہیں۔ میرا دل سخت ہو جاتا ہے ایسے شخص کے حال کو دیکھ کر جو جیفۂ دنیا کی تڑپ میں کُڑھتا ہے۔"

حضرت اقدسؑ کے قلب کی عجیب کیفیت

ایک دن مجلس مسیح موعودؑ میں توکّل کی بات چل پڑی جس پر آپؑ نے فرمایا:۔

"میں اپنے قلب کی عجیب کیفیت پاتا ہُوں۔ جیسے سخت حبس ہوتا اور گرمی کمال شدّت کو پہنچ جاتی ہے تو لوگ وثوق سے امّید کرتے ہیں کہ اب بارش ہو گی۔ ایسا ہی جب میں اپنی صندوقچی کو خالی دیکھتا ہوں تو مجھے خدا کے فضل پر یقین واثق ہوتا ہے کہ اب یہ بھرے گی اور ایسا ہی ہوتا ہے۔" اور خدا تعالےٰ کی قسم کھا کر فرمایا کہ:۔

"جب میرا کیسہ خالی ہوتا ہے تو جو ذوق و سرُور اللہ تعالیٰ پر توکّل کا اُس وقت مجھے حاصل ہوتا ہے میں اُس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ اور وُہ حالت بہت ہی زیادہ راحت بخش اور

طمانیت انگیز ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کیسہ بھرا ہوا ہو۔" اور فرمایا۔

"اُن دنوں میں جبکہ دُنیوی مقدمات کی وجہ سے والد صاحب اور بھائی صاحب طرح طرح کے ہموم و غموم میں مبتلا رہتے تھے وہ بسا اوقات میری حالت دیکھ کر رشک کھاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ بڑا ہی خوش نصیب آدمی ہے اس کے نزدیک کوئی غم نہیں آتا۔"

حضرت مسیح موعودؑ کے دل میں رسول کریمؐ اور شیخینؓ کی محبت اور عزت

ایک دفعہ ایک دوست نے جو محبت مسیح موعودؑ میں فنا شُدہ تھے۔ آپ کی خدمت میں عرض کی کہ کیوں نہ ہم آپؑ کو مدارج میں شیخینؓ سے افضل سمجھا کریں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب قریب مانیں؟ اللہ اللہ! اس بات کو سُنکر حضرت اقدسؑ کا رنگ اُڑ گیا اور آپ کے سراپا پر عجیب اضطراب و بیتابی مستولی ہو گئی۔ میں خدائے غیور و قدوس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس گھڑی نے میرا ایمان حضور اقدسؑ کی نسبت اَور بھی زیادہ کر دیا۔ آپؑ نے برابر چھ گھنٹے کامل تقریر فرمائی۔ بولتے وقت میں نے گھڑی دیکھ لی تھی اور جب آپؑ نے تقریر ختم کی تب بھی دیکھی۔ پورے چھ ہُوئے۔ ایک منٹ کا فرق بھی نہ تھا۔ اتنی مدت تک ایک مضمون کو بیان کرنا اور مسلسل بیان کرنا ایک خرق عادت تھا۔ اس سارے مضمون میں آپؑ نے رسول کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کے محامد و فضائل اور اپنی غلامی اور کفش برداری کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے، اور جناب شیخین علیہم السلام کے فضائل بیان فرمائے اور فرمایا۔

"میرے لئے یہ کافی فخر ہے کہ میں ان لوگوں کا مدّاح اور خاکِ پا ہُوں۔ جو جزئی فضیلت خدا تعالیٰ نے انہیں بخشی ہے۔ وہ قیامت تک کوئی اَور شخص نہیں پا سکتا کب دوبارہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں پیدا ہوں اور پھر کسی کو اَیسی خدمت کا موقع ملے جو جناب شیخین علیہما السلام کو مِلا۔" (از خط جناب مولوی عبدالکریم صاحب مورخہ ۱۱ر اگست ۱۸۹۹ء مندرجہ الحکم جلد ۳ ۲۹)

۱۷ر اگست ۱۸۹۹ء۔ چند روز ہوئے۔ بریلی سے ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں لکھا۔ کہ کیا آپ وُہی مسیح موعود ہیں جس کی نسبت رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے احادیث میں خبر دی

ہے؟ خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر آپ اس کا جواب لکھیں۔ مَیں نے معمولاً رسالہ تریاق القلوب سے دو ایک ایسے فقرے جو اس کا کافی جواب ہو سکتے تھے لکھ دئے۔ وُہ شخص اس پر قانع نہ ہوا۔ اور پھر مجھے مخاطب کرکے لکھا۔ کہ " میں چاہتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحبؑ خود اپنے قلم سے قسمیہ لکھیں۔ کہ آیا وُہ وُہی مسیح موعُود ہیں جس کا ذِکر احادیث اور قرآن شریف میں ہے؟" میں نے شام کی نماز کے بعد دوات قلم اور کاغذ حضرتؑ کے آگے رکھدیا اور عرض کیا۔ کہ ایک شخص ایسا لکھتا ہے۔ حضرتؑ نے فوراً کاغذ ہاتھ میں لیا اور یہ چند سطریں لکھدیں:۔

" میں نے پہلے بھی اس اقرار مفصّل ذیل کو اپنی کتابوں میں قسم کے ساتھ لوگوں پر ظاہر کیا ہے اور اب بھی اس پرچہ میں اُس خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر لکھتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ مَیں وُہی مسیح موعُود ہُوں جس کی خبر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن احادیث صحیحہ میں دی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں درج ہیں وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا۔ الراقم مرزا غلام احمدؐ عفا اللہ عنہ وایّد۔ ۱۷؍اگست ۱۸۹۹ء "

اس ذکر سے میری دو غرضیں ہیں۔ ایکؔ یہ کہ اپنی جماعت کا ایمان بڑھے اور انہیں وُہی ذوق اور سرور حاصل ہو جو یہاں کے خوش قسمت حاضرین کو اُس گھڑی حاصل ہوا اور انہوں نے سچے دل سے اعتراف کیا کہ اُن کو نیا ایمان ملا ہے۔ اور دوسرےؔ یہ کہ منکرین اور بدظن اس علیٰ بصیرۃ قسم پڑھتے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ متعمد، کذاب، اور مفتری مختلق کی یہ شان اور اُسے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ذُوالجلال خدا کی ایسی اور اس طرح اور ایسے مجمع میں قسم کھائے۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!" (از خط مولانا عبدالکریم صاحبؓ مندرجہ الحکم جلد ۳ ۳۲ صفحہ ۱۰)

اسلام اور عیسائیت

۱۲؍اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لالہ کیشو داس صاحب تحصیلدار بٹالہ اتّفاق حسنہ سے قادیان میں وارد ہوئے۔ اور حضرت اقدسؑ کی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور عرض کیا کہ مجھے فقرا سے ملنے کا کمال شوق ہے۔

اور اسی شوق کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا:۔

حالتِ زمانہ اور غرض بعثت حضرت مسیح موعودؑ

بیشک اگر آپ کے دل میں اہلِ دِل لوگوں کے ساتھ محبّت نہ ہوتی تو آپ ہمارے پاس کیوں آتے اور ایک دُنیا دار کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وُہ ایک دُنیا سے الگ گوشہ نشین کے پاس جاوے۔ مُناسبت ایک ضروری شئے ہے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ جبکہ انسان ایک فنا ہونے والی ہستی ہے اور موت کا کچھ بھی پتہ نہیں کہ کب آجاوے اور عُمر ایک ناپائیدار شئے ہے پھر کس قدر ضروری ہے کہ اپنی اصلاح اور فلاح کی فِکر میں لگ جاوے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ دُنیا اپنی دھن میں ایسی لگی ہے کہ اس کو آخرت کا کچھ فِکر اور خیال ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے ایسے لاپروا ہو رہے ہیں گویا وُہ کوئی ہستی ہی نہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ دُنیا کی ایمانی حالت اس حد تک کمزور ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مامُور کر کے بھیجا ہے تاکہ مَیں زِندہ ایمان زِندہ خدا پر پَیدا کرنے کی راہ بتلاؤں۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کا عام قانون ہے بہت لوگوں نے جو سعادت اور رُشد سے حِصّہ نہ رکھتے تھے۔ خدا ترسی اور انصاف سے بے بہرہ تھے۔ مجھے جھُوٹا اور مُفتری کہا اور ہر پہلو سے مجھے دُکھ دینے اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کی۔ کُفر کے فتوے دیکر مسلمانوں کو بدظن کرنا چاہا۔ اور خلافِ واقعہ امُور کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر کے اُس کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ جھوٹے مقدّمات بنائے۔ گالیاں دیں۔ قتل کرنے کے منصُوبے کئے۔ غرض کونسا امر تھا جو اُنہوں نے نہیں کیا۔ مگر میرا خدا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اُس نے مجھے اُن کی ہر شرارت سے پہلے اُن کے فتنہ اور اُس کے انجام کی خبر دی اور آخر وُہی ہوا جو اُس نے ایک عرصہ پہلے مجھے بتلایا تھا اور کچھ وُہ لوگ بھی ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے سعادت، خدا ترسی اور نُورِ ایمان سے حِصّہ دیا ہے۔ جنہوں نے مجھے پہچانا اور اُس نُور کے لینے کے واسطے میرے گِرد جمع ہو گئے جو مجھے خدا تعالےٰ نے اپنی بصیرت اور معرفت بخشی ہے۔ اُن لوگوں میں بڑے بڑے عالِم ہیں۔ گریجویٹ ہیں، وکیل اور ڈاکٹر ہیں

معزز عہدہ داران گورنمنٹ ہیں۔ تاجر اور زمیندار ہیں اور عام لوگ بھی ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ نااہل مخالف اتنا بھی تو نہیں کرتے کہ ایک حق بات جو ہم پیش کرتے ہیں۔ اُس کو آرام سے سُن ہی لیں۔ اُن میں ایسے اخلاق فاضلہ کہاں؟ ورنہ حق پرستی کا تقاضا تو یہ ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش * گر نوشت است پند بر دیوار

مذہب حق اور اسلامی توحید

اس زمانہ میں مذہب کے نام سے بڑی نفرت ظاہر کی جاتی ہے اور مذہب حقہ کی طرف آنا تو گویا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ مذہب حق وُہ ہے۔ جس پر باطنی شریعت بھی شہادت دے اُٹھے۔ مثلاً ہم اسلام کے اصُول توحید کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی حقانی تعلیم ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں توحید کی تعلیم ہے اور نظارۂ قدرت بھی اس پر شہادت دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو متفرق پیدا کر کے وحدت ہی کی طرف کھینچا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت ہی منظور تھی۔ پانی کا ایک قطرہ اگر چھوڑیں۔ تو وہ گول ہوگا۔ چاند، سورج سب اجرام فلکی گول ہیں اور کرویت وحدت کو چاہتی ہے۔

تثلیث کا ردّ

ہم اس وقت بے انتہا خداؤں کا ذکر چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ تو ہے ہی ایک بیہودہ اور بے معنی اعتقاد اور بے شمار خدا ماننے سے امان اُٹھ جاتا ہے۔ مگر ہم تثلیث کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم نے جیسا کہ قدرت کے نظائر سے ثابت کیا ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔ اس طرح پر اگر خدا معاذ اللہ تین ہوتے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو چاہیئے تھا کہ پانی، آگ کے شعلے اور زمین آسمان کے اجرام سب کے سب سہ گوشہ ہوتے تاکہ تثلیث پر گواہی ہوتی۔ اور نہ انسانی نُورِ قلب کبھی تثلیث پر گواہی دیتا ہے۔ پادریوں سے پُوچھا ہے کہ جہاں انجیل نہیں گئی وہاں تثلیث کا سوال ہوگا یا توحید کا۔ تو انہوں نے صاف اقرار کیا ہے کہ توحید کا۔

بلکہ ڈاکٹر فنڈر نے اپنی تصنیف میں یہ اقرار درج کر دیا ہے۔ اب ایسی کھلی شہادت کے ہوتے پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ تثلیث کا عقیدہ کیوں پیش کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ سہ گوشہ خدا بھی عجیب ہیں۔ ہر ایک کے کام الگ الگ ہیں۔ گویا ہر ایک بجائے خود ناقص اور ناتمام ہے اور ایک دوسرے کا مُتمّم ہے۔

عیسائیوں کے خدا کی حالت

اور مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے۔ اس کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔ ساری عمر پکڑ دھکڑ میں گوری اور ابنِ آدم کو سر دھرنے کو جگہ ہی نہ ملی۔ اخلاق کا کوئی کامل نمونہ ہی موجود نہیں تعلیم ایسی ادھوری اور غیر مکتفی کہ اس پر عمل کر کے انسان بہت نیچے جا گرتا ہے۔

وہ کسی دوسرے کو اقتدار اور عزت کیا دے سکتا ہے۔ جو اپنی بے بسی کا خود شاکی ہے، اوروں کی کیا سُن سکتا ہے۔ جس کی اپنی ساری رات کی گریہ وزاری اکارت گئی اور چلّا چلّا کر ایلی ایلی لِمَا سبقتانی بھی کہا مگر شنوائی ہی نہ ہوئی اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ آخر یہودیوں نے پکڑ کر صلیب پر لٹکا دیا۔ اور اپنے اعتقاد کے موافق ملعون قرار دیا۔ خود عیسائیوں نے لعنتی مانا۔ مگر یہ کہدیا کہ ہمارے لئے لعنتی ہوا۔ حالانکہ لعنت ایسی چیز ہے کہ انسان اس سے سیاہ باطن ہو جاتا ہے۔ اور وہ خدا سے دُور اور خدا اُس سے دُور ہو جاتا ہے۔ گویا خدا سے اس کو کچھ تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے ملعون شیطان کا نام بھی ہے۔ اب اس لعنت کو مان کر اور مسیح کو ملعون قرار دے کر عیسائیوں کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے:۔

لعنت نال گلے نہیں رہندا

خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کیا تا کہ اسلامی نور لوگوں کو دکھاؤں

گلے پڑا ڈھول ہے جو یہ لوگ بجا رہے ہیں۔ غرض ان لوگوں کے عقائد کا کہاں تک ذکر کیا جاوے۔ حقیقت وہی ہے جو اسلام لے کر آیا۔ اور خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کیا کہ میں

اس نُور کو جو اسلام میں ملتا ہے۔ اُن کو جو حقیقت کے جویاں ہوں دکھاؤں۔ سچ یہی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے اور میرا تو یہ مذہب ہے کہ اگر انجیل اور قرآن کریم اور تمام صُحفِ انبیاء بھی دُنیا میں نہ ہوتے تو بھی خدا تعالیٰ کی توحید ثابت تھی کیونکہ اس کے نقوش فطرتِ انسانی میں موجود ہیں۔ خدا کے لئے بیٹا تجویز کرنا گویا خدا تعالیٰ کی موت کا یقین کرنا ہے۔ کیونکہ بیٹا تو اس لئے ہوتا ہے کہ وُہ یادگار رہو۔ اب اگر مسیح خدا کا بیٹا ہے تو پھر سوال ہوگا کہ کیا خدا کو مرنا ہے؟ مختصر یہ ہے کہ عیسائیوں نے اپنے عقائد میں نہ خدا کی عظمت کا لحاظ رکھا اور نہ قوائے انسانی کی قدر کی ہے۔ اور ایسی باتوں کو مان رکھا ہے۔ کہ جن کے ساتھ آسمانی روشنی کی تائید نہیں ہے۔ ایک بھی عیسائی ایسا نظر نہ آیا جو خوارق دکھا سکے اور اپنے ایمان کو اُن نشانات سے ثابت کر سکے جو مومنوں کے ہوتے ہیں۔ یہ فضیلت اور فخر اسلام ہی کو ہے کہ ہر زمانہ میں تائیدی نشان اُس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور اِس زمانہ کو بھی خدا نے محروم نہیں رکھا۔ مجھے اِسی غرض کے لئے بھیجا ہے کہ اُن تائیدی نشانوں سے جو اسلام کا خاصہ ہے۔ اس زمانہ میں اِسلام کی صداقت دُنیا پر ظاہر کروں۔ مُبارک وُہ جو ایک سلیم دل لے کر میرے پاس حق لینے کے لئے آتا ہے۔ اور پھر مُبارک وُہ جو حق دیکھے۔ تو اس کو قبول کرتا ہے۔"

(الحکم جلد ۴ صفحہ ۲۸ مؤرخہ ۹ اگست ۱۹۰۰ء)

جلسۃ الوداع[۱] کی تقریب پر حضرت اقدسؑ کی تقریر

غرض بعثت استیصالِ عیسائیت

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر سے زندہ اُتر آنے اور اِس حادثہ سے بچ

[۱] جلسۃ الوداع کیا چیز ہے؟ جن دنوں حضرت مسیح موعودؑ کتاب "مسیح ہندوستان میں" تالیف کر رہے تھے۔ انہیں ایام میں معلوم ہوا تھا کہ نصیبین (ملک عراق عرب) میں حضرت مسیح ناصریؑ کے

جانے کا قرآن شریف میں صحیح اور یقینی علم دیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ پچھلے ہزار برس میں جہاں اسلام پر اور بہت سی آفتیں آئیں۔ وہاں یہ مسئلہ بھی تاریکی میں پڑ گیا۔ اور مسلمانوں میں بدقسمتی سے یہ خیال راسخ ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ اور وہ قیامت کے قریب آسمان سے اُتریں گے۔ مگر اس چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور کر کے بھیجا۔ تاکہ مَیں اندرونی طور پر جو غلطیاں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُن کو دُور کروں اور اسلام کی حقیقت دُنیا پر ظاہر کروں۔ اور بیرونی طور پر جو اعتراضات اسلام پر کئے جاتے ہیں۔ اُن کا جواب دُوں۔ اور دوسرے مذاہب باطلہ کی حقیقت کھول کر دکھاؤں خصوصیت کے ساتھ وُہ مذہب جو صلیبی مذہب ہے یعنی عیسائی مذہب، اس کے غلط اعتقادات کا استیصال کروں جو انسان کے لئے خطرناک طور پر مُضر ہیں۔ اور انسان کی رُوحانی قوتوں کے نشوونما اور ترقیات کے لئے ایک روک ہیں۔

مسیحؑ کے آسمان پر جانے کا مسئلہ

منجملہ اُن کے ایک یہی مسئلہ ہے جو مسیح کے آسمان پر جانے کے متعلق ہے۔ اور جس میں بدقسمتی سے بعض مُسلمان بھی اُن کے شریک ہو گئے ہیں۔ اسی ایک مسئلہ پر عیسائیت کا دارومدار ہے۔ کیونکہ عیسائیت کی نجات کا مدار اسی صلیب پر ہے۔ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۱) بعض آثار موجود ہیں جن سے اُن کے اس سفر کا پتہ ملتا ہے اور تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کشمیر میں آ کر رہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے قرینِ مصلحت سمجھا تھا۔ کہ ایک کمیشن (وفد) بھیجا جائے جو ان آثار و حالات کی خود تفتیش اور تحقیقات کرے اور پھر اُسی راستہ سے جو حضرت مسیحؑ نے کشمیر آنے کے لئے تجویز کیا تھا۔ واپس ہوتے ہوئے قادیان پہنچ جائے۔ اس وفد کو رخصت اور وداع کرنے کے لئے ایک جلسہ تجویز ہوا تھا۔ جس کا نام جلسۃ الوداع رکھا گیا تھا۔ اگرچہ بعض پیش آمدہ امور ضروریہ کی وجہ سے اس کمیشن کا بھیجا جانا ملتوی ہو گیا۔ مگر یہ جلسہ ۱۲-۱۳-۱۴ نومبر ۱۸۹۹ء کو خوب دُھوم دھام سے ہُوا۔ اس میں آپؑ نے یہ تقریر فرمائی۔

اُن کا عقیدہ ہے کہ مسیح ہمارے لئے مصلوب ہوا۔ اور پھر وُہ زندہ ہو کر آسمان پر چلا گیا۔ جو گویا اس کی خدائی کی دلیل ہے۔

جن مُسلمانوں نے اپنی غلطی سے اُن لوگوں کا ساتھ دیا ہے۔ وہ یہ تو نہیں مانتے۔ کہ مسیح صلیب پر مر گیا۔ مگر وُہ اتنا ضرور مانتے ہیں کہ وُہ (زندہ بجسد عنصری) آسمان پر اُٹھایا گیا ہے۔ لیکن جو حقیقت اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحؑ ابن مریمؑ اپنے ہمعصر یہودیوں کے ہاتھوں سخت ستایا گیا۔ جس طرح پر راستباز لوگ اپنے زمانہ میں نادان مخالفوں کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں۔ اور آخر ان یہودیوں نے اپنی منصوبہ بازی اور شرارتوں سے یہ کوشش کی کہ کسی طرح پر آپ کا خاتمہ کر دیں اور آپ کو مصلوب کرا دیں۔ بظاہر وُہ اپنی ان تجاویز میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ حضرت مسیحؑ ابن مریمؑ کو صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم دیدیا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو اپنے راستبازوں اور ماموروں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اُن کو اُس لعنت سے جو صلیب کی موت کے ساتھ وابستہ تھی بچا لیا۔ اور ایسے اسباب پیدا کر دیئے۔ کہ وُہ اس صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے بہت سے دلائل ہیں جو خاص انجیل سے ہی مل سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اُن کا بیان کرنا میری غرض نہیں ہے۔ جو شخص ان واقعات پر جو صلیب کے متعلق انجیل میں درج ہیں، غور کریگا۔ تو اُن کے پڑھنے سے اُسے صاف معلوم ہو جائیگا۔ کہ حضرت مسیحؑ ابن مریمؑ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے تھے اور پھر یہ خیال کر کے کہ اس ملک میں اُن کے بہت سے دشمن تھے۔ اور دشمن بھی وُہ جو اُن کے جانی دشمن تھے۔ اور جیسا کہ وُہ پہلے کہہ چکے تھے کہ نبی بیعزت نہیں ہوتا مگر اپنے وطن میں۔ جس سے اُن کی ہجرت کا پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور اپنے فرضِ رسالت کو پُورا کرنے کے لئے وُہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں نکلے اور نصیبین کی طرف سے ہوتے ہوئے افغانستان کے راستہ کشمیر میں آ کر بنی اسرائیل کو جو کشمیر

میں موجود تھے تبلیغ کرتے رہے۔ اور اُن کی اصلاح کی اور آخر کار اُن میں ہی وفات پائی۔ یہ امر ہے جو مجھ پر کھولا گیا ہے۔

جب صلیب پر مسیحؑ کی موت ہی نہیں ہوئی۔ تو الوہیت اور کفارہ باطل ہو گئے

اس ایک مسئلہ سے ہی عیسائیت کا ستون ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ جب صلیب پر مسیحؑ کی موت ہی نہیں ہوئی اور وُہ تین دن کے بعد زندہ ہو کر آسمان پر گئے ہی نہیں۔ تو الوہیت اور کفارہ کی عمارت تو بیخ و بنیاد سے گر پڑی۔ اور مسلمانوں کا غلط خیال (جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوتی تھی کہ حضرت مسیحؑ زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اور پھر دوبارہ نازل ہوں گے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا یا پُرانا نبی نہیں آسکتا جس کی نبوت پر آپؐ کی مُہر نہ ہو) بھی دُور ہو گیا۔ اور قرآن شریف کی اصل اور پاک تعلیم سچی ثابت ہو گئی۔ کیونکہ قرآن شریف میں تو مسیحؑ کا صاف اقرار فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي[1] کا موجود ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

وفات مسیحؑ کے مسئلہ پر زور دینے کی وجہ

یہی وجہ ہے کہ ہم وفات مسیحؑ کے مسئلہ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ کیونکہ اسی موت کے ساتھ عیسائی مذہب کی بھی موت ہے۔ اور اسی غرض سے میں نے کتاب "مسیح ہندوستان میں" لکھنی شروع کی ہے۔ اور اس کتاب کے بعض مطالب کی تکمیل کے لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اپنی جماعت میں سے چند آدمیوں کو بھیجوں۔ جو اُن علاقہ جات میں جا کر اُن آثار کا پتہ لگائیں۔ جن کا وہاں موجود ہونا بتایا جاتا ہے چنانچہ اس غرض کو مدنظر رکھ کر ہم نے یہ جلسہ کیا ہے۔ تاکہ اُن دوستوں کو رخصت کرنے کے لئے پہلے ہم سب مل کر اُن کے لئے دعائیں کریں کہ وُہ خیر و عافیت کے ساتھ اس مبارک سفر کے لئے رخصت ہوں اور کامیاب ہو کر واپس آئیں۔

[1] المائدۃ : ۱۱۸

مومن ہمیشہ ترقیات کی خواہش کرتا ہے

اگرچہ میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ سفر جو تجویز کیا گیا ہے۔ اگر نہ بھی کیا جاتا۔ تو بھی خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس قدر شواہد اور دلائل ہم کو اس امر کے لئے دیدیئے ہیں جن کو مخالف کا قلم اور زبان توڑ نہیں سکتی۔ لیکن مومن ہمیشہ ترقیات کی خواہش کرتا ہے۔ اور وُہ زیادہ سے زیادہ حقائق اور معارف کا بھُوکا پیاسا ہوتا ہے۔ کبھی اُن سے سیر نہیں ہوتا۔ اس لئے ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ جس قدر ثبوت اور دلائل اَور مِل سکیں۔ وہ اچھا ہے۔ اِسی مقصد کے لئے یہ تقریب پیش آئی ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو نصیبین کی طرف بھیجتے ہیں۔ جس کے متعلق ہمیں پتہ ملا ہے کہ وہاں کے حاکم نے حضرت مسیحؑ کو (جبکہ وہ اپنی ناشکر گذار قوم کے ہاتھ سے تکلیفیں اُٹھا رہے تھے۔ لکھا تھا کہ آپ میرے پاس چلے آئیے اور واقعہ صلیب سے بچ جانے کے بعد اس مقام پر پہنچکر انہوں نے بَدقسمت قوم کے ہاتھ سے نجات پائی۔ وہاں کے حاکم نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں گے تو آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرونگا اور میں بیمار ہوں میرے لئے دُعا بھی کریں۔ اگرچہ یہ امر ہمیں ایک انگریزی کتاب سے معلوم ہوا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ روضۃ الصّفا جو ایک اِسلامی تاریخ ہے۔ اس قسم کا مفہوم اس سے بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ یقین ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نصیبین میں ضرور آئے۔ اور اسی راستے سے وہ ہندوستان کو چلے آئے۔ سارا عِلم تو اللہ تعالیٰ کو ہے۔ لیکن ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے کہ اس سفر سے انشاء اللہ حقیقت کھل جائے گی اور اصل معاملہ صاف ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ اس سفر میں ایسی تحریریں پیش ہو جاویں یا ایسے کتبے نکل آویں جو حضرت مسیحؑ کے اس سفر کے متعلق بعض اُمور پر روشنی ڈالنے والے ہوں یا حواریوں میں سے کسی کی قبر کا کوئی پتہ چل جائے۔ یا اَور اس قسم کے بعض امور نکل آویں جو ہمارے اس مقصد میں مؤیّد ثابت ہو سکیں۔ اس لئے میں نے اپنی جماعت میں سے تین

آدمیوں کو اس سفر کے لئے تیار کیا ہے۔

سفر کر کے تبلیغ کرو

اُن کے لئے ایک عربی تصنیف بھی میں کرنی چاہتا ہوں۔ جو بطور تبلیغ کے ہو۔ اور جہاں جہاں وُہ جاویں۔ اُس کو تقسیم کرتے رہیں۔ اس طرح پر اس سفر سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہمارے سلسلہ کی اشاعت بھی ہوتی جائے گی اور میں خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک مخلص اور وفادار جماعت عطا کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جس کام اور مقصد کے لئے میں اُن کو بلاتا ہوں۔ نہایت تیزی اور جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے پہلے اپنی ہمت اور توفیق کے موافق آگے بڑھتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ اُن میں ایک صدق اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ میری طرف سے کسی امر کا ارشاد ہوتا ہے اور وُہ تعمیل کے لئے تیار۔

کبتک کوئی قوم اور جماعت تیار نہیں ہوسکتی

حقیقت میں کوئی قوم اور جماعت تیار نہیں ہو سکتی۔ جبتک کہ اُس میں اپنے امام کی اطاعت اور اتباع کے لئے اس قسم کا جوش اور اخلاص اور وفا کا مادہ نہ ہو۔ حضرت مسیح کو جو مشکلات اور مصائب اُٹھانے پڑے۔ اُن کے عوارض اور اسباب میں سے جماعت کی کمزوری اور بیدلی بھی تھی۔ چنانچہ جب اُن کو گرفتار کیا گیا۔ تو پطرس جیسے اعظم الحواریین نے اپنے آقا اور مُرشد کے سامنے انکار کر دیا اور نہ صرف انکار کیا۔ بلکہ تین مرتبہ لعنت بھی بھیجدی۔ اور اکثر حواری اُن کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے وُہ صدق و وفا کا نمونہ دکھایا جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ انہوں نے آپ کی خاطر ہر قسم کا دُکھ اُٹھانا سہل سمجھا۔ یہانتک کہ عزیز وطن چھوڑ دیا۔ اپنے املاک و اسباب اور احباب سے الگ ہو گئے اور بالآخر آپ کی خاطر جان تک دینے سے تامل اور افسوس نہیں کیا۔ یہی صدق

اور وفا تھی جسنے انکو آخر کار بامراد کیا۔ اسیطرح میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری جماعت کو بھی اس کی قدر اور مرتبہ کیموافق ایک جوش بخشا ہے اور وُہ وفاداری اور صدق کا نمونہ دکھاتے ہیں جس دن سے میں نے نصیبین کی طرف ایک جماعت کے بھیجنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہر ایک شخص کوشش کرتا ہے کہ اس خدمت پر وُہ مامور کیا جائے اور دوسرے کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور آرزو کرتا ہے کہ اس کی جگہ اگر اُس کو بھیجا جائے تو اُس کی بڑی ہی خوش قسمتی ہے۔ بہت سے احباب نے اس سفر پر جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن میں اُن درخواستوں سے پہلے مرزا خدا بخش صاحب کو اس سفر کے واسطے منتخب کر چکا تھا۔ اور مولوی قطب الدین اور میاں جمال دین کو ان کے ساتھ جانے کے واسطے تجویز کر لیا تھا۔ اس واسطے مجھے ان احباب کی درخواستوں کو ردّ کرنا پڑا۔ تاہم میں جانتا ہوں۔ کہ وُہ لوگ جنہوں نے بصد مشکل اور سچے اخلاص کے ساتھ اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی پاک نیتوں کے ثواب کو ضائع نہیں کریگا۔ اور وُہ اپنے اخلاص کے موافق اجر پائیں گے۔

دُور دراز بلاد اور ممالک غیر کا سفر آسان امر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اس وقت سفر آسان ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ کِس کو علم ہو سکتا ہے۔ کہ اِس سفر سے کون زندہ آئیگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویوں اور دُوسرے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر جانا کوئی سہل بات نہیں۔ اپنے کاروبار اور معاملات کو ابتری اور پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر ان لوگوں نے اس سفر کو اختیار کیا ہے اور انشراح صدر سے اختیار کیا ہے جس کے لئے میں یقین رکھتا ہوں کہ بڑا ثواب ہے۔ ایک تو سفر کا ثواب ہے۔ کیونکہ یہ سفر محض خدا تعالیٰ کی عظمت اور توحید کے اظہار کے واسطے ہے۔ دوسرے اس سفر میں جو جو مشقتیں اور تکالیف ان لوگوں کو اٹھانی پڑیں گی۔ اُن کا بھی ثواب ہے۔

اللہ تعالےٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا

اللہ تعالےٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا جبکہ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ[1]

---

[1] الزلزال : ۸

کے موافق وُہ کسی کی ذرّہ بھر نیکی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ تو اتنا بڑا سفر جو اپنے اندر ہجرت کا نمونہ رکھتا ہے۔ اس کا اجر کبھی ضائع ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ صدق اور اخلاص ہو۔ ریا اور دوسرے اغراض شہرت و نمود کے نہ ہوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ برّ و بحر کے شدائد و مصائب کو برداشت کرنا اور ایک موت کا قبول کر لینا بجز صدق کے نہیں ہو سکتا۔ بہت سے بھائی اُن کے لئے دُعائیں کرتے رہیں گے۔ اور میں بھی ان کے واسطے دُعاؤں میں مصروف رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اِس مقصد میں کامیاب کرے اور خیر و عافیت سے واپس لاوے اور سچ تو یہ ہے کہ ملائکہ بھی اُن کے واسطے دُعائیں کریں گے اور وُہ اُن کے ساتھ ہوں گے ۰

اب میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس موقعہ پر ہماری جماعت نے دو قسم کی مروّت اور ہمت دکھائی ہے۔ ایک تو یہ گروہ ہے جنہوں نے سفر اختیار کیا ہے اور اپنے آپ کو سفر کے خطرات میں ڈالا ہے اور ان مصائب اور شدائد کے برداشت کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ جو اِس راہ میں اُنہیں پیش آئیں گی۔ دوسرا وُہ گروہ ہے۔ جنہوں نے میری دینی اغراض و مقاصد میں ہمیشہ دل کھول کر چندے دیئے ہیں۔ میں کچھ ضرورت نہیں سمجھتا کہ تفصیل کروں کیونکہ ہر شخص کم و بیش اپنی استطاعت اور مقدرت کے موافق حصّہ لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس اخلاص اور وفاداری سے ان چندوں میں شریک ہوتے ہیں۔ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ ہماری جماعت نے وہ صدق اور وفا دکھایا ہے جو صحابہؓ ساعت العسر میں دکھلاتے تھے۔ اگرچہ اشتہار میں مَیں نے چند دوستوں کے نام لکھے ہیں۔ جنہوں نے اپنے صدق و ہمّت کا نمونہ دکھایا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ میں دوسروں سے بےخبر ہوں یا اُن کی خدمات کو قابل قدر نہیں سمجھتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کون سرگرمی اور اخلاص کے ساتھ میری راہ میں دوڑتا ہے۔ میں چونکہ بیمار تھا اور ابھی تک طبیعت ناساز ہے۔ اس لئے میں پوری تفصیل نہ دے سکا اور نہ مختصر سے اشتہار

میں اتنی تفصیل ہو سکتی تھی۔ پس جن لوگوں کے نام درج نہیں ہوئے۔ اُن کو افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے صدق اور اخلاص کو خوب جانتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس غرض کے لئے چندہ دیتا ہے یا ہماری دینی ضروریات میں شریک ہوتا ہے کہ اُس کا نام شائع کیا جائے تو یقیناً سمجھو کہ وُہ دُنیا کی شہرت اور نام و نمود کا خواہشمند ہے۔ لیکن جو شخص محض اللہ تعالیٰ کے لئے اِس راہ میں قدم رکھتا ہے اور خدمتِ دین کے لئے کمربستہ ہوتا ہے اُس کو اس بات کی کچھ بھی پَرواہ نہیں ہوتی۔ دُنیا کے نام کچھ حقیقت اور اثر اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں۔ نام وُہی بہتر ہوتے ہیں جو آسمان پر رکھے جاویں۔ کاغذات کا کیا اثر ہے۔ ایک دن ہوتے ہیں اور دُوسرے دن ضائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو کچھ آسمان پر لکھا جاتا ہے وہ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ اس کا اثر ابدالآباد کے لئے ہوتا ہے میرے بہت سے مخلص احباب ایسے ہیں جن کو تم میں سے شاید بہت ہی کم جانتے ہوں۔ لیکن اُنہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ مثلاً میں نظیر کے طور پر کہتا ہوں کہ میرزا یوسف بیگ صاحب میرے بہت ہی مخلص اور صادق دوست ہیں۔ میں نے اُن کا ذکر اس واسطے کیا ہے کہ اس طرح پر بھائیوں میں باہم تعارف بڑھتا ہے۔ اور محبت پَیدا ہوتی ہے۔ میرزا صاحب اس وقت سے میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جبکہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اُن کا دل محبت اور اخلاص سے بھرا ہُوا ہے اور وُہ ہر وقت سِلسِلہ کی خدمت کے لئے اپنے اندر ایک جوش رکھتے ہیں۔ ایسا ہی اَور بہت سے عزیز دوست ہیں اور سب اپنے اپنے ایمان اور معرفت کے موافق اخلاص اور جوش محبت سے لبریز ہیں۔

جبتک ایمان قوی نہ ہو کچھ نہیں ہوتا

اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اعمال کی توفیق رفتہ رفتہ ملتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جبتک ایمان قوی نہ ہو کچھ نہیں ہوتا۔ جس قدر ایمان قوی ہوتا ہے۔ اسی قدر اعمال میں بھی قوت آتی ہے۔ یہانتک کہ اگر یہ قوتِ ایمانی پُورے طور پر نشوونما پا جاوے تو پھر اَیسا

مومن شہید کے مقام پر ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی امر اس کے سدِراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی عزیز جان تک دینے میں بھی تامل اور دریغ نہ کریگا۔

آنحضرتؐ اور قرآن مجید نازل کرنے کی غرض

میں نے کئی دفعہ اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے اور اب بھی اس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو انبیاءؑ کو بھیجتا ہے اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے دُنیا کی ہدایت کے واسطے بھیجا اور قرآن مجید کو نازل فرمایا تو اس کی غرض کیا تھی؟ ہر شخص جو کام کرتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے ایسا خیال کرنا کہ قرآن شریف نازل کرنے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض اور مقصد نہیں ہے، کمال درجہ کی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ کیونکہ اس میں (معاذاللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف ایک فعل عبث کو منسوب کیا جائیگا۔ حالانکہ اس کی ذات پاک ہے (سُبحانہٗ وتعالیٰ شانہٗ)

پس یاد رکھو کہ کتاب مجید کے بھیجنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تا دُنیا پر عظیم الشّان رحمت کا نمونہ دکھاوے۔ جیسے فرمایا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[1] اور ایسا ہی قرآن مجید کے بھیجنے کی غرض بتائی۔ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[2] یہ ایسی عظیم الشّان اغراض ہیں کہ اُن کی نظیر نہیں پائی جاسکتی۔

قرآن مجید میں متفرق کتابوں کے تمام کمالات جمع ہیں

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ جیسے تمام کمالات متفرقہ جو انبیاءؑ میں تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع کر دیئے۔ اسی طرح تمام خوبیاں اور کمالات جو متفرق کتابوں میں تھے وہ قرآن شریف میں جمع کر دیئے۔ اور ایسا ہی جس قدر کمالات تمام اُمتوں میں تھے وہ اس امت میں جمع کر دیئے۔ پس خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ان کمالات کو پالیں۔ اور یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیئے کہ جیسے وہ عظیم الشّان کمالات ہم کو دینا چاہتا ہے

[1] الانبیاء: ۱۰۸ [2] البقرۃ: ۳

اُسی کے موافق اُس نے ہمیں قویٰ بھی عطا کئے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کے موافق قویٰ نہ دیئے جاتے تو پھر ہم اُن کمالات کو کسی صورت اور حالت میں پا ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک گروہ کی دعوت کرے تو ضرور ہے کہ وہ اُس گروہ کی تعداد کے موافق کھانا تیار کرے اور اُسی کے موافق ایک مکان ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دعوت تو ایک ہزار آدمی کی کرے اور اُن کے بٹھانے کے واسطے ایک چھوٹی سی کُٹیا بنا دے۔ نہیں۔ بلکہ وہ اُس تعداد کا پُورا لحاظ رکھیگا۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی کتاب بھی ایک دعوت اور ضیافت ہے۔ جس کے لئے کُل دنیا کو بلایا گیا ہے۔ اس دعوت کے لئے خدا تعالیٰ نے جو مکان تیار کیا ہے وُہ انسانی قویٰ ہیں۔ جو اُن لوگوں کو دیئے گئے ہیں جو اس امت میں ہیں۔ قویٰ کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اب اگر بیل، کُتّے یا کسی اَور جانور کے سامنے قرآن کی تعلیمات کو پیش کریں تو وُہ نہیں سمجھ سکتے۔ اِس لئے کہ اُن میں وُہ قویٰ نہیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیمات کو برداشت کر سکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو وُہ قویٰ دیئے ہیں کہ ہم اُن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

ختم نبوّت کی حقیقت

ہمیں اللہ تعالیٰ نے وہ نبیؐ دیا۔ جو خاتم المومنینؐ، خاتم العارفینؐ اور خاتم النّبیینؐ ہے اور اسی طرح پر وہ کتاب اُس پر نازل کی جو جامع الکتب اور خاتم الکتب ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النّبیین ہیں اور آپؐ پر نبوّت ختم ہو گئی۔ تو یہ نبوت اس طرح پر ختم نہیں ہوئی جیسے کوئی گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ ایسا ختم قابلِ فخر نہیں ہوتا۔ بلکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت ختم ہونے سے یہ مُراد ہے کہ طبعی طور پر آپؐ پر کمالات نبوّت ختم ہو گئے یعنی وہ تمام کمالات متفرقہ جو آدمؑ سے لیکر مسیحؑ ابن مریمؑ تک نبیوں کو دیئے گئے تھے۔ کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی۔ وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے۔ اور اس طرح پر طبعاً آپؐ خاتم النّبیین ٹھہرے۔ اور ایسا ہی وہ جمیع تعلیمات، وصایا اور معارف جو مختلف کتابوں میں چلے آتے ہیں۔ وہ قرآن شریف پر آکر ختم ہو گئے

اور قرآن شریف خاتم الکتب ٹھہرا۔

کیا ہم رسُول کریمؐ کو خاتم النّبیین نہیں مانتے؟

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ کہ ہم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو خاتم النّبیین نہیں مانتے۔ یہ ہم پر افترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت یقین، معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں اس کا لاکھواں حِصّہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے۔ اور اُن کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔ وُہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاء کی ختم نبوّت میں ہے، سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سُنا ہوا ہے۔ مگر اُس کی حقیقت سے بیخبر ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ختم نبوّت کیا ہوتا ہے اور اُس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟ مگر ہم بصیرت تام سے (جس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے ہم پر ختم نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے۔ کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذّت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا بجز ان لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیراب ہوں۔

ختم نبوّت کی مثال

دُنیا کی مثالوں میں سے ہم ختم نبوت کی مثال اس طرح پر دے سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر آکر اُس کا کمال ہوجاتا ہے جبکہ اُسے بدر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر کمالات نبوت ختم ہو گئے۔ جو لوگ یہ مذہب رکھتے ہیں کہ نبوت زبردستی ختم ہوگئی اور آنحضرتؐ کو یونسؑ بن متی پر بھی ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ اُنہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کے فضائل اور کمالات کا کوئی علم ہی اُن کو نہیں ہے باوجود اس کمزوری فہم اور کمیٔ علم کے ہم کو کہتے ہیں کہ ہم ختم نبوت کے منکر ہیں۔ میں ایسے مریضوں کو کیا کہوں اور اُن پر

کیا افسوس کروں۔ اگر اُن کی یہ حالت نہ ہو گئی ہوتی اور وُہ حقیقتِ اسلام سے بکُلّی دُور نہ جا پڑے ہوتے۔ تو پھر میرے آنے کی ضرورت کیا تھی؟ ان لوگوں کی ایمانی حالتیں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ اور وُہ اِسلام کے مفہوم اور مقصد سے محض ناواقف ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وُہ اہلِ حق سے عداوت کرتے جس کا نتیجہ کافر بنا دیتا ہے۔

اگر مُسلمان کہلانے والوں کے اعمال، اعمالِ صالحہ ہیں تو پھر اُن کے پاک نتائج کیوں پیدا نہیں ہوتے

یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں کونسی بات اِسلام کے خلاف ہے۔ ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے کے دنوں میں روزے بھی رکھتے ہیں۔ اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اُن کے تمام اعمال، اعمالِ صالحہ کے رنگ میں نہیں ہیں۔ بلکہ محض ایک پوست کی طرح ہیں جن میں مغز نہیں ہے۔ ورنہ اگر یہ اعمال صالحہ ہیں تو پھر اُن کے پاک نتائج کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ اعمالِ صالحہ تو تب ہو سکتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے فساد اور ملاوٹ سے پاک ہوں۔ لیکن اُن میں یہ باتیں کہاں ہیں؟ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ ایک شخص مومن اور متقی ہو اور اعمالِ صالحہ کرنے والا ہو اور وُہ اہلِ حق کا دشمن ہو۔ حالانکہ یہ لوگ ہم کو بے قید اور دہریہ کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ مَیں نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کیا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے مامور کرکے بھیجا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی کچھ عظمت اُن کے دل میں ہوتی تو وُہ انکار نہ کرتے اور اس سے ڈر جاتے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم خدا تعالیٰ کے نام کی تخفیف کرنے والے ٹھہریں۔ لیکن یہ تب ہوتا جبکہ اُن میں تحقیق اور اصل ایمان اللہ تعالیٰ پر ہوتا۔ اور وُہ یوم الجزاء سے ڈرتے اور لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ[1] پر اُن کا عمل ہوتا۔

اولیاء اللہ کا انکار سلبِ ایمان کا موجب ہو جاتا ہے

اُن کی دماغی قوت اور ایمانی طاقت نے تو یہاں تک اُنہیں پہنچا دیا ہے کہ وہ کہتے

[1] بنی اسرائیل: ۳۷

ہیں کہ نبی کا منکر تو کافر ہوتا ہے مگر ولی کے انکار سے کفر کیونکر لازم آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کے انکار سے کیا حرج؟ یہ لوگ انکار اولیاء اللہ کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس سے کیا بگڑتا ہے؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ اولیاء اللہ کا انکار سلبِ ایمان کا موجب ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں غور کریگا۔ اسے اچھی طرح نظر آ جائے گا بلکہ ایسے طور پر نظر آجائے گا۔ جیسے شیشہ میں کوئی شکل دیکھ لیتا ہے۔

سلب ایمان دو طرح پر ہوتا ہے

یاد رکھنا چاہیئے کہ سلب ایمان دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک تو انبیاء کے انکار سے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ اور یہ مسلّم بات ہے۔ دوسرا اولیاء اللہ اور ماموریں کے انکار سے سلب ایمان ہوتا ہے۔

انبیاء کے انکار سے سلب ایمان تو بالکل واضح امر ہے اور سب جانتے ہیں لیکن پھر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء کے انکار سے سلب ایمان اس لئے ہوتا ہے کہ نبی کہتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں یہ میرا قول ہے۔ یہ میرا نبی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ میری کتاب کو مانو اور میرے احکام پر عمل کرو۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا۔ اور اُن وصایا اور حدود پر جو اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ عمل نہیں کرتا ہے۔ وہ اُن سے منکر ہو کر کافر ہو جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کے انکار سے سلب ایمان کس طرح ہوتا ہے؟

لیکن وہ صورت جس سے اولیاء اللہ کے انکار سے سلب ایمان ہوتا ہے۔ اور ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ عَادَا لِیْ وَلِیًّا فَاذَنْتُهٗ لِلْحَرْبِ۔ یعنی جو شخص میرے ولی کے ساتھ دشمنی کرتا ہے۔ وہ گویا میرے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہو اور محبت

بھی ایسی جیسے کوئی اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ اور ایک دُوسرا شخص بار بار کہے کہ یہ شخص مَرجائے یا اُس کی نسبت اور اسی قسم کی دلآزاری کی باتیں کہے اور اُسے تکلیف دے تو وُہ شخص ایسی باتوں سے کیونکر خوش ہو سکتا ہے اور وُہ باپ جس کے بچے کیلئے کوئی شخص بَد دُعائیں کر رہا ہو یا دیگر رنجیدہ کلمات اُس کے بچے کی نسبت استعمال کر رہا ہو ایسے شخص سے کب محبت کر سکتا ہے؟ اسی طرح پر اَولیاء اللہ بھی اطفال اللہ کا رنگ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے جسمانی بلوغ کا چولا اُتارا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں پرورش پاتے ہیں۔ وہ خود اُن کا متولّی، متکفل اور اُن کے لئے غیرت رکھنے والا ہوتا ہے جب کوئی شخص (خواہ وُہ کیسا ہی نماز، روزہ رکھنے والا ہو) اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اُن کے دکھ دینے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش مارتی ہے اور اُن مخالفت کرنے والوں پر اُس کا غضب بھڑکتا ہے۔ اِس لئے کہ اُنہوں نے اُس کے ایک محبُوب کو دُکھ دینا چاہا ہے۔ اس وقت پھر نہ وُہ نماز کام آتی ہے اور نہ وُہ روزہ۔ کیونکہ نماز اور روزہ کے ذریعہ سے اُسی ذات کو خوش کرنا تھا۔ جس کو ایک دُوسرے فعل سے ناراض کر لیا ہے۔ پھر وُہ رضا کا مقام کیونکر ملے جبتک غضب الٰہی دُور نہ ہو۔ وُہ اَولیاء اللہ کا مخالِف نادان اُن اسباب غضب سے ناواقف ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے نماز روزہ پر اسے ایک ناز اور گھمنڈ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دن بدن بڑھتا جاتا ہے اور وُہ بجائے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے دن بدن اللہ تعالےٰ سے دُور ہٹتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ بالکُل راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص جو بالکل فنا کی حالت میں ہے اور آستانۂ الوہیت پر گرا ہوا ہے اور آغوشِ ربوبیت میں پرورش پا رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت نے اُسے ڈھانپ لیا ہے۔ یہانتک کہ اُس کا بات کرنا خدا تعالیٰ کا بات کرنا ہوتا ہے۔ اور اُس کا دوست خدا کا دوست، اور اُس کا دشمن خدا کا دشمن ہو جاتا ہے۔ پس ایسے مومن کامل کا دشمن رَہ کر کوئی شخص کیونکر مومن کامل ہو سکتا ہے اور ایسے ہی مومن کامل کی دشمنی سے اُس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اور اُسے

مغضوب علیہم میں سے بنا دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے ماموروں اور اَولیاء اللہ کی مخالفت اور اُن کی ایذا رسانی کبھی اچھا پھل نہیں دے سکتی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے۔ کہ میں اُن کو ستا کر اور دُکھ دے کر بھی آرام پا سکتا ہوں وُہ سخت غلطی کرتا ہے اور اُس کا نفس اُسے دھوکا دے رہا ہے۔

سلب ایمان کی دُوسری وجہ

دوسری وجہ سلب ایمان کی یہ ہوتی ہے کہ ولی اللہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوتے ہیں کیونکہ وَلی کے معنے قریب کے ہیں۔ یہ لوگ گویا اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ ایک محجُوب کی طرح ہوتے ہیں جن کے سامنے ایک دیوار حائل ہو۔ اب یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو اُن میں سے ایسا ہے۔ کہ جس کے سامنے کوئی پَردہ ہی نہیں ہے۔ خدا تعالےٰ نے اُسے آنکھیں دے دی ہیں۔ اور اُسے ایسی بصیرت عطا کی ہے کہ اُس کا ہر قول و فعل علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ اعمیٰ کی طرح نہیں جو ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اور ٹکریں مارتا رہتا ہے۔ بلکہ اُس کے دل پر تو خدا تعالےٰ کا نزُول ہوتا ہے۔ اور ہر قدم پر وُہی اس کا رہنما اور متکفل بن جاتا ہے۔ شیطان کی شرارت کی تاریکی اُس کے نزدیک نہیں آسکتی۔ بلکہ ظُلمت جَل کر بالکل بھسم ہو جاتی ہے اور اُسے سب کچھ روشن نظر آتا ہے۔ وہ جو کچھ بیان کرتا ہے وہ حقائق اور معارف ہوتے ہیں۔ وہ احادیث شریفہ کی جو تاویل کرتا ہے وُہ صحیح ہوتی ہے کیونکہ وُہ براہ راست بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے سُن لیتا ہے۔ اور اس طرح وُہ اس کی اپنی روایت ہوتی ہے حالانکہ دوسرے لوگوں کو ۱۳۰۰ برس کے وسائط سے کہنا پڑتا ہے۔ پھر ان ہر دو میں کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ولی اللہ کا سارا ذخیرہ پاک معارف اور نُور ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص اس سے عداوت کرتا ہے۔ وُہ اس کی ہر بات کی تکذیب کرتا ہے۔ گویا کہ وُہ یہ شرط کر لیتا ہے کہ وُہ ولی اللہ کے ہر نکتہ معرفت کا انکار کرے گا۔ پھر وُہ اس کی ہر بات کا انکار

کرتا رہتا ہے۔ اس طرح پر اس کی ایمانی عرفانی دیوار کی اینٹیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جب ایک شخص صراطِ مُستقیم بتلا رہا ہے اور معارف اور حقایق کھول کھول کر بیان کر رہا ہے اور دوسرا شخص اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ اس مقابلہ میں انجام کار نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی کہ (مؤخر الذکر) قرآن شریف کے عقائد کے مجمُوعہ کی تکذیب کرتا ہے۔ کرتا رہے گا۔ اور اسی لئے وُہ خدا تعالیٰ کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اُس کا ایمان سلب ہو جائے گا۔

غرض اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اَولیاء اللہ کے انکار سے سلب ایمان ہو جاتا ہے۔ اس لئے اولیاء اللہ کے انکار سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ یہودیوں پر جو آفت آئی اور وُہ مغضوب ہو گئے۔ اس کی بھاری وجہ یہی تھی کہ وُہ خدا تعالیٰ کے مامُوروں اور مرسلین سے انکار کرتے رہے اور ہمیشہ اُن کی مخالفت اور ایذا رسانی میں حِصّہ لیتے رہے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر نازل ہوا۔

آنحضرتؐ کے خاتم النّبیین ہونے کا ایک اور پہلو

پھر میں اپنے پہلے کلام کی طرف رجُوع کر کے کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النّبیین ہونے کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے محض اپنے فضل سے اس امّت میں بڑی بڑی استعدادیں رکھ دی ہیں۔ یہانتک کہ عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بھی حدیث میں آیا ہے۔ اگرچہ محدّثین کو اس پر جرح ہو مگر ہمارا نورِ قلب اس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے اور ہم بغیر چُون و چرا کے اس کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی بزرگ نے بذریعہ کشف بھی اس حدیث کا اِنکار نہیں کیا۔ بلکہ اگر کچھ کیا ہے تو تصدیق ہی کی ہے۔ اس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ میری امّت کے عُلماءِ ظاہری بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہیں۔ عُلماء کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ بعض لوگ الفاظ پر اَڑ بیٹھتے ہیں۔ اور اُن کے معانی کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ قرآن شریف کی تفسیر میں مقابلہ نہیں کر سکتے۔

عالمِ ربانی کی تعریف

یاد رکھو کہ عالمِ ربانی سے یہ مُراد نہیں ہوا کرتی کہ وہ صرف ونحو یا منطق میں بے مثل ہو بلکہ عالم ربانی سے مُراد وہ شخص ہوتا ہے جو ہمیشہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتا رہے اور اُس کی زبان بیہودہ نہ چلے۔ مگر موجودہ زمانہ اس قسم کا آگیا ہے کہ مُردہ شو تک بھی اپنے آپ کو عُلماء کہتے ہیں۔ اور اس لفظ کو اپنی ذات میں داخل کر لیا ہے۔ اس طرح پر اس لفظ کی بڑی تحقیر ہوئی ہے۔ اور خدا تعالےٰ کے منشاء اور مقصد کے خلاف اس کا مفہوم لے لیا گیا ہے۔ ورنہ قرآن شریف میں تو عُلماء کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ۲۲)[1] یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اللہ تعالےٰ کے وُہ بندے ہیں جو عُلماء ہیں۔ اب یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ جن لوگوں میں یہ صفات خوف وخشیت اور تقوی اللہ کی نہ پائی جائیں وہ ہرگز ہرگز اس خطاب سے پکارے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔

اصل میں عُلماء عالِم کی جمع ہے اور عِلم اس چیز کو کہتے ہیں جو یقینی اور قطعی ہو۔ اور سچا عِلم قرآن شریف سے مِلتا ہے۔ یہ نہ یونانیوں کے فلسفہ سے مِلتا ہے۔ نہ حال کے انگلستانی فلسفہ سے۔ بلکہ یہ سچّا ایمانی فلسفہ قرآن کریم کے طفیل سے مِلتا ہے۔ مومن کا کمال اور معراج یہی ہے کہ وُہ عُلماء کے درجہ پر پہنچے اور اُسے حق الیقین کا وُہ مقام حاصل ہو جو عِلم کا انتہائی درجہ ہے۔ لیکن جو لوگ علومِ حقّہ سے بہرہ ور نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں اُن پر کھُلی ہوئی نہیں ہیں وُہ گو اپنے مُنہ سے اپنے آپ کو عالِم کہیں مگر فی الحقیقت ایسے لوگ علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اور وُہ روشنی اور نُور جو حقیقی علم سے مِلتا ہے۔ اُن میں بالکل پایا نہیں جاتا۔ بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ یہ اپنی آخرت دُخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ

[1] فاطر: ۲۹

هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[1] جو آدمی اس دُنیا میں اندھا ہے وُہ آخرت میں بھی اندھا اُٹھایا جائے گا۔ یعنی جس کو یہاں علم بصیرت اور معرفت نہیں دیگئی۔ اُسے وہاں کیا علم ملیگا۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی آنکھ اِسی دُنیا سے لے جانی پڑتی ہے۔ جو آدمی یہاں ایسی آنکھ پیدا نہیں کرتا۔ اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کو آخرت کے دن دیکھ لیگا۔

لیکن جن لوگوں کو سچّی معرفت اور بصیرت دی جاتی ہے اور وُہ علم جس کا نتیجہ خشیتہ اللہ ہے۔ عطا کیا جاتا ہے۔ وہ وُہی لوگ ہیں جن کو اس حدیث میں انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سچّے علُوم کا سرچشمہ قرآن مجید ہے

اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے سچّے علُوم کا منبع اور سرچشمہ قرآن شریف میں اس امّت کو دیا ہے۔ جو شخص ان حقائق اور معارف کو پالیتا ہے، جو قرآن شریف میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو محض حقیقی تقویٰ اور خشیتہ اللہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسے وُہ علم ملتا ہے جو اس کو انبیاء بنی اسرائیل کا مثیل بنا دیتا ہے۔ ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ایک شخص کو جو ہتھیار دیا گیا ہے اگر وُہ اُس سے کام نہ لے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے نہ کہ اس ہتھیار کا۔ اس وقت دُنیا کی یہی حالت ہو رہی ہے۔ مسلمانوں نے باوجودیکہ قرآن شریف جیسی بے مثل نعمت ان کے پاس تھی جو اُن کو ہر گمراہی سے نجات بخشتی اور ہر تاریکی سے نکالتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور اس کی پاک تعلیموں کی کچھ پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ اسلام سے بالکل دُور جا پڑے ہیں۔ یہانتک کہ اب اگر حقیقی اسلام اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو چونکہ وُہ اس سے بکلّی بے خبر اور غافل ہیں۔ اس لئے حقیقی مومن کو بھی کافر کہہ دیتے ہیں۔

خداداد قویٰ سے کام لو

بہت سے لوگ ہیں جو اوباشانہ اور عیاشانہ حالات زندگی رکھتے ہیں۔ اور وہ دُنیا کا فخر

[1] بنی اسرائیل: ۷۳

دُنیا کی عزّت اور املاک و دولت چاہتے ہیں۔ اس قسم کی آرزوؤں اور تمناؤں اور اُن کے پُورا کرنے کی تدبیروں اور تجویزوں میں ہی اپنی عمر کھو بیٹھتے ہیں۔ اُن کی آرزوؤں کی اِنتہا نہیں ہوتی کہ پیغام موت آجاتا ہے۔ اب اُن کو بھی اللہ تعالیٰ نے قویٰ تو دیئے تھے انہیں قویٰ سے اگر کام لیتے تو حق کو پا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو کسی سے بخل نہیں کیا۔ لیکن ایسے لوگ خود قویٰ سے کام نہیں لیتے۔ یہ اُن کی اپنی بدبختی ہے۔ نیک بخت اور مُبارک ہو وہ شخص جو اُن خداداد قویٰ سے کام لے۔ بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب اُن کو کہا جاتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اُس کے اَوامر کی پیروی کرو اور نواہی سے پرہیز کرو۔ تو وُہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے کیا ولی بننا ہے۔ اس قسم کا کلمہ میرے نزدیک کلمۂ کُفر ہے۔ یہ خدا تعالیٰ پر بدگمانی ہے۔ خدا تعالیٰ کے حضور کیا کمی ہے۔ اُس کے پاس اس سرکار کی طرح کوئی محدُود نوکریاں تو نہیں ہیں جو ختم ہو جائیں۔ بلکہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلقات پیدا کرلے وہ ان فیوض سے بہرہ وَر ہو سکتا ہے جو پہلے راستبازوں کو دیئے گئے تھے ؎ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے محبوب بندوں کا نام وَلی رکھا ہے تو کیا ولی بننا خدا تعالیٰ کے نزدیک مُشکل ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ اس کے نزدیک بہت سہل امر ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان راستی کے ساتھ اس کی راہ میں قدم رکھنے والا ہو۔ اور اُس کے راستے میں صبر و استقلال اور وفاداری کیساتھ چلنے والا ہو۔ کوئی دُکھ اور تکلیف اور مصیبت اس کے قدم کو ڈگمگا نہ سکے۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ سچّا تعلق پیدا کرتا ہے اور اُن باتوں سے الگ ہو جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کی نارضامندی کا مُوجب ہوتی ہیں اور سچّی پاکیزگی اور طہارت اختیار کر لیتا ہے اور گندی باتوں سے پرہیز کرتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اُس کے ساتھ ایک تعلق پیدا کر لیتا ہے اور اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے دُوری اختیار کرے اور گندگی سے نکلنے کی کوشش نہ کرے تو پھر خدا تعالیٰ بھی اُس کی پرواہ نہیں کرتا جیسے کہ فرمایا۔ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ[1]

[1] الصف : ۶

ہماری جماعت کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے

ہماری جماعت کو چاہیئے کہ ہمت نہ ہار بیٹھے۔ یہ بڑی مشکلات نہیں ہیں۔ میں تمہیں یقیناً کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے ہماری مشکلات آسان کر دی ہیں۔ کیونکہ ہمارے سلوک کی راہیں اَور ہیں۔ ہمارے ہاں یہ حالت نہیں ہے کہ کمریں جھک جائیں یا ناخن بڑھالیں۔ یا پانی میں کھڑے رہیں اور چلّہ کشیاں کریں یا اپنے ہاتھ خشک کرلیں اور یہانتک نوبت پہنچے کہ اپنی صورتیں بھی مسخ ہوجائیں۔ ان صُورتوں کے اختیار کرنے سے بعض لوگ بخیال خویش باخدا بننا چاہتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایسی ریاضتوں سے خدا تو کیا ملنا ہے انسانیت بھی جاتی رہتی ہے۔ لیکن ہمارے سلوک کا یہ طریق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اِسلام نے اس کے لئے نہایت آسان راہ رکھ دی ہے۔ اور وُہ کشادہ راہ وُہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ[1]۔ یہ دُعا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھلائی ہے۔ تو ایسے طور پر نہیں کہ دعا تو سکھا دی۔ لیکن سامان کچھ بھی مہیا نہ کیا ہو۔ نہیں بلکہ جہاں دُعا سکھلائی ہے وہاں اس کے لئے سامان بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس سے اگلی سُورۃ میں اُس قبولیت کا اشارہ ہے۔ جہاں فرمایا۔ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[2]۔ یہ گویا ایسی دعوت ہے جس کا سامان پہلے سے تیار کر رکھا ہے۔

اگر انسان اپنے قویٰ سے کام لے تو یقیناً ولی ہوسکتا ہے

غرض یہ قویٰ جو انسان کو دیئے گئے ہیں۔ اگر وُہ اُن سے کام لے تو یقیناً ولی ہوسکتا ہے۔ میں یقیناً کہتا ہوں کہ اس اُمت میں بڑی قوت کے لوگ آتے ہیں۔ جو نُور اور صدق اور وفا سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی شخص اپنے آپکو ان قویٰ سے محروم نہ سمجھے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی فہرست شائع کر دی ہے جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیں اُن برکات سے حصّہ نہیں ملیگا۔ خدا تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اس کی کریمی کا بڑا گہرا سمندر ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اور جس کو تلاش کرنے والا اور طلب کرنے والا کبھی محرُوم نہیں رہا۔

[1] الفاتحہ : ۶ [2] البقرۃ : ۳

اس لئے تم کو چاہیئے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دُعائیں مانگو اور اُس کے فضل کو طلب کرو۔ ہر ایک نماز میں دُعا کے لئے کئی مواقع ہیں۔ رکوع، قیام، قعدہ، سجدہ وغیرہ۔ پھر آٹھ پہروں میں پانچ مرتبہ نماز پڑھی جاتی ہے۔ فجر، ظہر، عصر، شام اور عشاء۔ ان پر ترقی کر کے اشراق اور تہجد کی نمازیں ہیں۔ یہ سب دُعا ہی کے لئے مواقع ہیں۔

نماز کی اصلی غرض اور مغز دُعا ہی ہے

نماز کی اصلی غرض اور مغز دُعا ہی ہے۔ اور دُعا مانگنا اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ مثلاً ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ جب بچہ روتا دھوتا ہے اور اضطراب ظاہر کرتا ہے تو ماں کس قدر بیقرار ہو کر اس کو دُودھ دیتی ہے۔ الوہیت اور عبودیت میں اسی قسم کا ایک تعلق ہے۔ جس کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے دروازہ پر گر پڑتا ہے۔ اور نہایت عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ اس کے حضور اپنے حالات کو پیش کرتا ہے۔ اور اس سے اپنی حاجات کو مانگتا ہے۔ تو الوہیت کا کرم جوش میں آتا ہے۔ اور ایسے شخص پر رحم کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا دُودھ بھی ایک گریہ کو چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے حضور رونے والی آنکھ پیش کرنی چاہیئے۔

یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کے حضور رونے دھونے سے کچھ نہیں ملتا۔ غلط ہے

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اللہ تعالےٰ کے حضور رونے دھونے سے کچھ نہیں ملتا۔ بالکل غلط اور باطل ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے صفات قدرت و تصرف پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر اُن میں حقیقی ایمان ہوتا۔ تو وُہ ایسا کہنے کی جُرأت نہ کرتے۔ جب کبھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے حضور آیا ہے اور اس نے سچّی توبہ کے ساتھ رجوع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس پر اپنا فضل کیا ہے۔ یہ کسی نے بالکل سچ کہا ہے ؎ عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ؂ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

خدا تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ تم اُس کے حضور پاک دل لے کر آجاؤ۔ صرف شرط اتنی ہے۔ کہ

اس کے مناسب حال اپنے آپ کو بناؤ۔ اور وُہ سچّی تبدیلی جو خدا تعالیٰ کے حضور جانے کے قابل بنا دیتی ہے اپنے اندر کر کے دکھاؤ۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ میں عجیب در عجیب قدرتیں ہیں اور اس میں لا انتہا فضل و برکات ہیں۔ مگر ان کے دیکھنے اور پانے کے لئے محبّت کی آنکھ پیدا کرو۔ اگر سچی محبّت ہو۔ تو خدا تعالیٰ بہت دعائیں سُنتا ہے اور تائیدیں کرتا ہے ٭

خدا کی محبّت

لیکن شرط یہی ہے کہ محبّت اور اخلاص خدا تعالیٰ سے ہو۔ خدا کی محبّت ایک ایسی شئے ہے جو انسان کی سفلی زندگی کو جلا کر اسے ایک نیا اور مصفّٰی انسان بنا دیتی ہے۔ اس وقت وہ وُہ کچھ ہے جو پہلے نہیں دیکھتا تھا۔ اور وہ وُہ کچھ سنتا ہے۔ جو پہلے نہیں سنتا تھا۔ غرض خدا تعالیٰ نے جو کچھ مائدہ فضل و کرم کا انسان کے لئے تیار کیا ہے۔ اس کے حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے استعدادیں بھی عطا کی ہیں۔ اگر وُہ استعدادیں تو عطا کرتا لیکن سامان نہ ہوتا تب بھی ایک نقص تھا۔ یا اگر سامان تو ہوتا۔ لیکن استعدادیں نہ ہوتیں، تو کیا فائدہ تھا۔ مگر نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اس نے استعداد بھی دی اور سامان بھی مہیا کیا۔ جس طرح پر ایک طرف روٹی کا سامان پیدا کیا۔ تو دوسری طرف آنکھ، زبان، دانت اور معدہ دے دیا۔ اور جگر اور امعاء کو کام میں لگا دیا۔ اور ان تمام کاموں کا مدار غذا پر رکھ دیا۔ اگر پیٹ کے اندر ہی کچھ نہ جائے گا۔ تو دل میں خون کہاں سے آئے گا۔ کیلوس کہاں سے بنے گا ٭

اسی طرح پر سب سے اوّل اس نے یہ فضل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام جیسا مکمل دین دے کر بھیجا۔ اور آپؐ کو خاتم النّبیینؐ ٹھیرایا۔ اور قرآن شریف جیسی کامل اور خاتم الکتاب عطا فرمائی۔ جس کے بعد قیامت تک نہ کوئی کتاب آئیگی۔ اور نہ کوئی نیا نبی نئی شریعت لے کر آئے گا۔ پھر جو قویٰ سوچ اور فکر کے ہیں۔ ان سے اگر ہم کام نہ

پس اور خدا تعالیٰ کی طرف قدم نہ اُٹھائیں تو کس قدر سستی اور کاہلی اور ناشکری ہے۔ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پہلی ہی سورت میں ہمارے لئے کس قدر مبسوط طریق پر فضل کی راہ بتا دی ہے۔ اس سورت میں جس کا نام خاتم الکتاب اور ام الکتاب بھی ہے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور اس کے حصول کی کیا راہ ہے؟ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ[۱] گویا انسانی فطرت کا اصل تقاضا اور منشاء ہے اور وہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ[۲] پر مقدم کر کے یہ بتایا ہے کہ پہلے ضروری ہے کہ جہانتک انسان کی اپنی طاقت، ہمت اور سمجھ میں ہو۔ خدا تعالیٰ کی رضامندی کی راہوں کے اختیار کرنے میں سعی اور مجاہدہ کرے اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے پُورا کام لے اور اس کے بعد پھر خدا تعالےٰ سے اس کی تکمیل اور نتیجہ خیز ہونے کے لئے دُعا کرے۔

انسانی زندگی کا مقصد اور غرض صراطِ مستقیم پر چلنا اور اُس کی طلب ہے

انسانی زندگی کا مقصد اور غرض صراطِ مستقیم پر چلنا اور اُس کی طلب ہے۔ جس کو اس سُورۃ میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ[۳] یا اللہ۔ ہم کو سیدھی راہ دکھا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہ وہ دُعا ہے جو ہر نماز میں اور ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے۔ اس دُعا کا اس قدر تکرار ہی اس کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہماری جماعت یاد رکھے کہ یہ معمولی سی بات نہیں ہے۔ اور صرف زبان سے طوطے کی طرح ان الفاظ کا رٹ دینا اصل مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ دُعا انسان کو انسان کامل بنانے کا ایک کارگر اور خطا نہ کرنے والا نسخہ ہے۔ جسے ہر وقت نصب العین رکھنا چاہیئے۔ اور تعویذ کی طرح مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ اس آیت میں چار قسم کے کمالات کے حاصل کرنے کی التجا ہے۔ اگر انسان ان چار قسم کے کمالات کو حاصل کر لیگا۔ تو گویا دُعا مانگنے اور خلقِ انسانی کے حق کو ادا کر

[۱] ، [۲] الفاتحہ ۵ [۳] الفاتحہ ۶، ۷

دے گا اور اُن استعدادوں اور قویٰ کے بھی کام میں لانے کا حق ادا ہو جائے گا جو اُس کو دی گئی ہیں۔

قرآن کریم کے بعض حصّے دُوسرے حصّوں کی تفسیر اور شرح ہیں

اس بات کو کبھی بھُولنا نہیں چاہیئے کہ قرآن شریف کے بعض حِصّے دوسرے حصّوں کی تفسیر اور شرح ہیں۔ ایک جگہ ایک امر بطریقِ اجمال بیان کیا جاتا ہے تو دوسری جگہ وُہی امر کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا دُوسرا پہلے کی تفسیر ہے۔ پس اس جگہ جو یہ فرمایا۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[1]۔ تو یہ بطریقِ اجمال ہے۔ لیکن دوسرے مقام پر منعم علیہم کی خود ہی تفسیر کر دی ہے۔ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ[2]۔ منعم علیہم لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ نبی۔ صدیق۔ شہید۔ صالح۔ انبیاءؑ میں یہ چاروں شانیں جمع ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ اعلیٰ کمال ہے۔ ہر ایک انسان کا یہ فرض ہے۔ کہ وُہ اِن کمالات کے حاصل کرنے کے لئے جہانتک مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس طریق پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دکھا دیا ہے۔ کوشش کرے۔

آنحضرتؐ کی راہ کو نہ چھوڑو

میں یہ بھی تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے تراشے ہوئے وظائف اور اَوراد کے ذریعہ سے اِن کمالات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یا خدا تعالیٰ کے ساتھ سچّا تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اختیار نہیں کیا۔ وہ محض فضُول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر منعم علیہم کی راہ کا سچّا تجربہ کار اَور کون ہو سکتا ہے۔ جن پر نبوّت کے بھی سارے کمالات ختم ہو گئے۔ آپؐ نے جو راہ اختیار کی وہ بہت ہی صحیح اور اقرب ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ ایجاد کرنا خواہ وہ بظاہر کتنی ہی خوش کُن معلوم ہوتی ہو۔ میری رائے میں ہلاکت ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔

[1] الفاتحہ: ۷ [2] النسآء: ۷۰

آنحضرتؐ کی سچّی اتباع سے خدا ملتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سچّی اتباع سے خدا ملتا ہے اور آپؐ کی اتباع کو چھوڑ کر خواہ کوئی ساری عمر ٹکریں مارتا رہے۔ گوہر مقصود اُس کے ہاتھ نہیں آسکتا چنانچہ سعدی بھی آنحضرت صلعم کی اتباع کی ضرورت بدیں الفاظ بتاتا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا   ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہ کو ہرگز نہ چھوڑو۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ قسم قسم کے وظیفے لوگوں نے ایجاد کر لئے ہیں۔ اُلٹے سیدھے لٹکتے ہیں اور جوگیوں کی طرح راہبانہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب بیفائدہ ہیں۔ انبیاءؑ کی یہ سنّت نہیں کہ وہ اُلٹے سیدھے لٹکتے رہیں یا نفی اثبات کے ذکر کریں اور ارّہ کے ذکر کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسی لئے اُسوہ حسنہ فرمایا۔ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے نقش قدم پر چلو۔ اور ایک ذرہ بھر بھی اِدھر یا اُدھر ہونے کی کوشش نہ کرو ۔

انسان کا اصل مقصد

غرض مُنعم علیہم لوگوں میں جو کمالات ہیں۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[2] میں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا اصل مقصد ہے اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قائم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے تیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سچّائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے ۔

منعم علیہم گروہ کے کمالات میں سے پہلا نبوّت کا کمال ہے

ان کمالات میں سے جو منعم علیہم گروہ کو دیئے جاتے ہیں۔ پہلا کمال نبوّت کا کمال

[1] الاحزاب: ۲۲   [2] الفاتحۃ: ۷

ہے۔ جو بہت ہی اعلیٰ مقام پر واقع ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وُہ الفاظ نہیں ملتے جن میں اس کمال کی حقیقت بیان کر سکیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر کوئی چیز اعلےٰ ہو۔ اس کے بیان کرنے کے واسطے اُسی قدر الفاظ کمزور ہوتے ہیں۔ اور **نبوت** تو ایسا مقام ہے کہ انسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ نہیں ہے۔ تو پھر یہ الفاظ میں کیونکر بیان ہو سکے۔ مختصر اور ناکافی طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان جب سفلی زندگی کو چھوڑ دیتا ہے اور بالکل سانپ کی کینچلی کی طرح اس زندگی سے الگ ہو جاتا ہے۔ اُس وقت اس کی حالت اَور ہو جاتی ہے۔ وُہ بظاہر اسی زمین پر چلتا پھرتا کھاتا پیتا ہے اور اس پر قانُون قدرت کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے۔ جیسے دوسرے لوگوں پر لیکن باوجود اس کے بھی وُہ اِس دُنیا سے الگ ہوتا ہے اور وُہ ترقی کرتے کرتے اُس مقام پر جا پہنچتا ہے۔ جو نقطۂ نبوّت کہلاتا ہے۔ اور جہاں وُہ خدا تعالیٰ سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہ مکالمہ یُوں شروع ہوتا ہے کہ جب وُہ نفس اور اُس کے تعلقات سے الگ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا تعلق محض اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے اور اُسی سے وُہ مکالمہ کرتا ہے۔ انسان کی حالت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ کبھی نکما اور بیکار نہیں رہتا ہے اور نفس کلام سے بھی کبھی فارغ نہیں ہوتا ہے۔ نفس اور شیطان سے ہی اُس کا مکالمہ شروع رہتا ہے۔ اگر کوئی اَور بات کرنیوالا نہ ہو۔ بعض اَوقات لوگ دیکھتے ہیں۔ کہ ایک انسان بالکل خاموش ہے۔ لیکن درحقیقت وُہ خاموش نہیں ہوتا۔ اس کا سِلسِلہ کلام اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور بعض اوقات وُہ بہت ہی لمبا ہوتا ہے اور شیطانی رنگ میں اُسے خود لمبا کرتا ہے اور بے شرمی سے اُسے لمبا ہونے دیتا ہے۔ یہ سلسلہ کلام کبھی خیالی فِسق کے رنگ میں ہوتا ہے اور کبھی بیہودہ اور جھوٹی تمنّاؤں کے رنگ میں۔ اور اس سے وہ کبھی فارغ نہیں رہتا۔ جبتک کہ اس سفلی زندگی کو نہ چھوڑ دے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس قسم کے خطرات اور خیالات کا سِلسِلہ جیسے انسان لمبا نہیں ہونے دیتا۔ اور ایک

معمولی خیال کی طرح آ کر دل سے محو ہو جاتا ہے وُہ معاف ہیں۔ لیکن جب اس سلسلہ کو لمبا کرتا ہے اور اس پر عزیمت کرتا ہے تو وُہ گناہ ہے۔ اور ان کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

جب انسان اُن خیالات کو جو اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ دُور کر دیتا ہے اور اُن کو لمبا نہیں ہونے دیتا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وُہ معافی کے قابل ہیں لیکن جب اُن کے سلسلہ کی درازی میں ایک لذّت پاتا ہے اور اُن کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تب وہ قابل مؤاخذہ ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن میں عزیمت شامل ہو جاتی ہے۔

کلام نفسی دو قسم کا ہوتا ہے

جیسا کہ پہلے بھی مَیں نے بیان کیا ہے۔ اس بات کو خوب یاد رکھو کہ کلام نفسی دو قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی شیطانی جو خیالی فسق و فجور کے سلسلہ میں چلا جاتا ہے اور آرزوؤں کے ایک لمبے سلسلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان ان دونوں سلسلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اسے شیطانی دخل کا بہت اندیشہ ہوتا ہے۔ اور اس امر کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ وہ اس طرح سے نقصان اُٹھائے اور شیطان اُسے زخمی کر دے مثلاً کبھی کوئی منصوبہ باندھتا ہے کہ فلاں شخص میری فلاں غرض اور مقصد میں بڑا مخل ہے اُسے مار دیا جائے یا فلاں شخص نے مجھے ٹوک کے بلایا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ اور اس کی ناک کاٹ دی جائے۔ غرض اسی قسم کے منصوبوں اور ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرض سخت خطرناک ہے۔ وُہ نہیں سمجھتا کہ ایسی باتوں سے نفس کا کیا نقصان کر رہا ہوں اور اس سے میری اخلاقی اور رُوحانی قوتوں پر کس قسم کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لئے اس قسم کے خیالات سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ جب کبھی کوئی ایسا بیہودہ سلسلہ خیالات شروع ہو تو فوراً اس کے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ استغفار پڑھو لاحول کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی مدد اور توفیق چاہو۔ اور خدا تعالیٰ کی کتاب کے پڑھنے

میں اپنے آپ کو مصروف کر دو۔ اور یہ سمجھ لو کہ اس قسم کے خیالی سلسلہ سے کچھ بھی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ اگر دشمن مر بھی جاوے تو کیا اور زندہ رہے تو کیا۔ نفع و نقصان کا پہنچانا خدا تعالٰے کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ کوئی شخص کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ سعدی نے گلستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ نوشیرواں بادشاہ کے پاس کوئی شخص خوشخبری لے کر گیا کہ تیرا فلاں دشمن مارا گیا ہے اور اس کا ملک اور قلعہ ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ نوشیرواں نے اس کا کیا اچھا جواب دیا ؎

مرا بمرگِ عدو جائے شادمانی نیست ✤ کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

پس انسان کو چاہئیے کہ اس امر پر غور کرے کہ اس قسم کے منصوبوں اور اُدھیڑبن سے کیا فائدہ اور کیا خوشی۔ یہ سلسلہ تو بہت ہی خطرناک ہے اور اس کا علاج ہے توبہ، استغفار لاحول اور خدا تعالیٰ کی کتاب کا مطالعہ۔ بیکاری اور بے شغلی میں اس قسم کا سلسلہ بہت لمبا ہو جایا کرتا ہے۔

دوسری قسم کلام نفس کی امانی ہے۔ یہ سلسلہ بھی چونکہ بیجا خواہشوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور طمع، حسد اور خود غرضی کے امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے جونہی کہ یہ سلسلہ پیدا ہو۔ فوراً اُس کی صف لپیٹ دو۔ میں نے یہ تقسیم کلام نفس کی جو کی ہے یہ دونو قسمیں انجامکار انسان کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ لیکن نبی ان دونو قسم کے سلسلہ کلام سے پاک ہوتا ہے۔

نبوّت کیا ہے؟

نبوّت کیا ہے؟ یہ ایک جوہر خداداد ہے۔ اگر کسب سے ہوتا تو سب لوگ نبی ہو جاتے۔ نبیوں کی فطرت ہی اس قسم کی نہیں ہوتی کہ وُہ اس بیجا سلسلہ کلام میں مبتلا ہوں۔ وہ نفسی کلام کرتے ہی نہیں۔ حالانکہ دوسرے لوگوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وُہ ان سلسلوں میں کچھ ایسے مبتلا ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا خانہ ہی خالی رہ جاتا ہے

برخلاف اِس کے نبی ان دونو سلسلوں سے الگ ہو کر خدا تعالیٰ میں کچھ ایسے گُم ہوتے ہیں اور اُس کے مخاطبہ و مکالمہ میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ اِن سلسلوں کے لئے اُن کے دل و دماغ میں سمائی اور گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کے دل و دماغ میں صرف خدا تعالیٰ کا ہی سلسلہ کلام رہ جاتا ہے۔ چونکہ اُن کے پاس صرف وُہی حصّہ باقی ہوتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ اُن سے کلام کرتا ہے اور وُہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے رہتے ہیں۔ تنہائی اور بیکاری میں بھی جب ایسے خیالات کا سلسلہ ایک انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص نبی کو بھی ویسی ہی حالت میں دیکھے۔ تو شاید غلطی اور ناواقفی سے سمجھ لیگا کہ اب اس کا سلسلہ کلام بھی خدا تعالیٰ سے نہ ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ نبی ہر وقت خدا تعالیٰ ہی سے باتیں کرتا رہتا ہے

نبی کی ہر وقت کی دُعا

اور یہی دُعا کرتا رہتا ہے کہ اَے خدا میں تجھ سے پیار کرتا ہوں اور تیری ہی رضا کا طالب ہوں۔ مجھ پر ایسا فضل کر کہ میں اُس نُقطہ اور مقام تک پہنچ جاؤں جو تیری رضا کا مقام ہے۔ مجھے ایسے اعمال کی توفیق دے جو تیری نظر میں پسندیدہ ہوں۔ دُنیا کی آنکھ کھول کہ وہ تجھے پہچانے اور تیرے آستانہ پر گرے۔ یہ اُس کے خیالات ہوتے ہیں اور یہی اُس کی آرزوئیں۔ اور اُن میں وُہ ایسا محو اور فنا ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی اُس کو شناخت نہیں کر سکتا۔ نبی اس سلسلہ کو ذوق کے ساتھ دراز کرتا ہے اور پھر اس میں اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اُس کا دل پگھل جاتا ہے اور اس کی رُوح بہہ نکلتی ہے۔ وہ پُورے زور اور طاقت کے ساتھ آستانۂ الُوہیت پر گرتی اور اَنْتَ رَبِّیْ۔ اَنْتَ رَبِّیْ کہہ کر پکارتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم جوش میں آتا ہے۔ اور وُہ اس کو مخاطب کرتا اور اپنے کلام سے اُس کو جواب دیتا ہے۔ یہ ایسا لذیذ سلسلہ ہے کہ ہر شخص اُس کو سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ لذّت ایسی ہے کہ الفاظ اُس کو ادا نہیں کر سکتے۔ پس

وہ بار بار مستسقی کی طرح باب ربوبیت کو ہی کھٹکھٹاتا رہتا ہے اور وہاں ہی اپنے لئے راحت و آرام پاتا ہے۔ وہ دُنیا میں ہوتا ہے لیکن دُنیا سے الگ ہوتا ہے۔ وہ دُنیا کی کسی چیز کا آرزومند نہیں ہوتا۔ لیکن دُنیا اس کی خادم ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اُسکے قدموں پر دُنیا کو لا ڈالتا ہے۔

مقام نبوّت کی مختصر کیفیت

یہ ہے مختصر حقیقت نبوّت کے مقام کی۔ یہاں کلام نفسی کے دونوں سلسلے بھسم ہو جاتے ہیں۔ اور تیسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا مبداء اور منتہا خدا تعالےٰ ہی ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ خدا تعالےٰ کے مقام کو جذب کرتا ہے اور اُس میں اِس قسم کے دُخان اور اضغاث، احلام نہیں ہوتے جو نفسی کلام میں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دُنیا سے انقطاع کُلّی کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جیسے ایک نفسانی خواہشوں کا اسیر اپنی محبُوبہ سے تعلق پیدا کر کے ہمہ گوش ہو کر تصور کرتا ہے اور اسے نفسانی لذّات کا معراج پاتا ہے۔ اور قطعاً نہیں چاہتا کہ وُہ کسی دوسرے کو ملے۔ اسی طرح پر نبی خدا تعالےٰ سے اپنے تعلقات کو یہانتک پہنچاتا ہے کہ وُہ اس تنہائی اور خلوت میں کسی دوسرے کا دخل ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے محبُوب سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور اسی میں لذّت اور راحت پاتا ہے۔ وُہ ایک دم کے لئے بھی اس خلوت کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن خدا تعالیٰ اُس کو دنیا کے سامنے لاتا ہے تاکہ وہ دُنیا کی اصلاح کرے اور خدا نما آئینہ ٹھہرے نبی طبعاً ایک لذّت اور کیفیت پاتا ہے۔ اور اسے خدا تعالیٰ ہی میں چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ مَیں اس کیفیت و حقیقت کو بیان نہیں کر سکتا۔ اگرچہ دل اس لذّت سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس ذکر کی درازی اَور بھی لذت بخش ہے۔ مگر وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جن میں اس کو ظاہر کر سکوں

کیا وجہ ہے کہ انبیاء بیویاں اور بچے بھی رکھتے ہیں؟

بعض نادان لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ جبکہ انبیاء ایسے فنافی اللہ ہوتے ہیں۔

اور دُنیا اور اُس کی لذتوں سے دُور بھاگتے ہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وُہ بیویاں اور بچے بھی رکھتے ہیں؟ ایسے معترضین اتنا نہیں سمجھتے کہ ایک شخص تو ان باتوں کا اسیر اور ان فانی لذّتوں میں فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے خلاف انبیاءؑ کا گروہ اِن باتوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اُن کے لئے محض خادم کے طور پر ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں انبیاءؑ ہر قسم کی اصلاح کے لئے آتے ہیں۔ پس اگر وُہ بیوی بچے نہ رکھتے ہوں تو اس پہلو میں تکمیل اصلاح کیونکر ہو۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عیسائی لوگ معاشرت کے متعلق حضرت مسیحؑ کا دنیا کے رُوبرو کیا نمونہ پیش کر سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں جب وُہ اس راہ سے ہی ناواقف ہیں اور مدارج سے بے خبر۔ تو وُہ کیا اصلاح کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کمال ہے کہ ہر پہلو میں آپؐ کا نمونہ کامل ہے۔ دنیا اور اس کی چیزیں انبیاء پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ اور وہ فانی لذّتوں کی کچھ بھی پرواہ نہیں کیا کرتے بلکہ اُن کا دل خدا تعالیٰ کی طرف اُس دریا کی ایک تیز دھار کی طرح جو پہاڑ سے گرتی ہے بہتا ہے اور اس کی رَو میں ہر خس و خاشاک بہ جاتا ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام ان چیزوں کے غلام نہیں ہوتے بلکہ یہ چیزیں اُن کے لئے بطور خادم ہوتی ہیں اور اُن کے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی کمالات کا نمونہ اُن کے اس ذِکر اور ذَوق میں جو خدا تعالیٰ کے تصور اور محویت میں انہیں ملتا ہے کچھ ہرج پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کچھ ایسے محو اور فنا ہوتے ہیں۔ کہ دُنیا سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ جب اس قسم کی ربودگی ہوتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اور مکالمات الٰہیہ ہوتے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب جذب کی قوت کسی چیز میں ہوتی ہے تو وہ دوسرے کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ انبیاءؑ کے جذب میں اس قدر قوت ہوتی ہے کہ دُنیا اور مافیہا کی ساری باتیں اُس میں بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے فضل اور فیض کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اور اس سلسلہ کو باقی تمام

سلسلوں پر تقدّم اور فوق ہو جاتا ہے۔

مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت

لیکن اس کے لئے مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر یہ راہ نہیں کھلتی جیسا کہ فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1] اور اسی کی طرف اشارہ ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں۔ اگرچہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کو اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ پر تقدّم ہے لیکن پھر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت نے سبقت کی ہوئی ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ بھی کسی قوت نے کہلوایا ہے۔اور وہ قوت جو پوشیدہ ہی پوشیدہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کا اقرار کراتی ہے۔کہاں سے آئی۔کیا خدا تعالیٰ نے ہی وہ عطا نہیں فرمائی ہے؟ بےشک وہ خدا تعالیٰ کا ہی عطیّہ ہے جو اس نے محض رحمانیت سے عطا فرمائی ہے۔ اس کی تحریک اور توفیق سے یہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ بھی کہتا ہے۔اس پہلو سے اگر غور کریں۔ تو اُس کو تاخّر ہے اور دوسرے پہلو سے اس کو تقدّم ہے۔یعنی جب یہ قوت اس کو اس بات کی طرف لاتی ہے تو یہ تاخّر ہو گیا اور بصورت اوّل تقدّم۔اسی طرح پر سلسلہ نبوت کی فلاسفی کا خلاصہ یا مفہوم ہے۔

یہ تو ممکن ہے کہ ہزاروں ہزار انسان مُلہم ہونے کا دعویٰ کریں اور اثباتِ نبوت اور کلام الٰہی کی حجّت قائم کرنے کے واسطے یہ ضروری امر ہے۔لیکن امر نبوت میں مقصود بالذات ایک اَور امر ہوتا ہے جو خاص نبیوں سے مخصوص ہوتا ہے۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شئے آتی ہے تو اس کے لوازم اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔یہ نہیں کہ وہ لوازم سے الگ ہو۔مثلاً جب کھانا آئے گا تو اس کے لوازم ساتھ ہی ہونگے۔ ہر قسم کے برتن، پانی یہانتک کہ خلال بھی دیدیں گے۔اسی طرح پر نبوت کے ساتھ لوازماتِ نبوت بھی ساتھ ہوتے ہیں۔اور منجملہ اُن لوازمات کے ایک یہ بھی ہے۔کہ کلام نفسانی کا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔اور یہ امر اصل کیفیت کے لوازم میں

[1] العنکبوت: ۷۰

سے ہے اور اس کے آثار اور علامات کی دلیل وُہ پیشگوئیاں ہوتی ہیں جو خدا تعالےٰ انہیں عطا کرتا ہے۔

نبیوں کا ایک اَور نام آسمان پر ہوتا ہے

یہ بھی یاد رکھو کہ نبیوں کا ایک اَور نام آسمان پر ہوتا ہے جس سے دوسرے لوگ آشنا بھی نہیں ہوتے۔ اور بعض وقت جب وُہ آسمانی نام دُنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ تو لوگوں کو ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ مثلاً میرے ہی معاملہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام مسیح ابن مریم بھی رکھا ہے۔ جس پر بعض نادان اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارا نام تو غلام احمد ہے مگر وُہ اِس راز کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہ اسرار نبوت میں سے ایک بات ہے۔

غرض جب دونو قسم کے جھوٹے مکالے ختم ہو جاتے ہیں۔ تو پھر اُس کا دل بولتا ہے۔ اور ہر وقت بولتا رہتا ہے۔ حرکت کرتا ہے۔ تب بھی اس سے آواز آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہزار لوگ اس کے پاس اَور اَور قسم کی باتوں میں مشغول ہوں۔ مگر یہ اپنے اس سلسلہ میں لذّت پاتا ہے اور اپنے محبوب سے کلام کرنے میں مصروف رہتا ہے یہی وجہ اس کی جمعیّتِ قلب کی ہوتی ہے۔ کوئی شور و شر اس کو پراگندہ نہیں کر سکتا عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک عاشق چاہتا ہے کہ وہ اپنے معشوق اور محبوب کے حُسن جمال پر پُوری طرح اطلاع پالے۔ اور ہر وقت اُس سے کلام کرتا رہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کرتا اور اس قسم کی دُنیاوی خواہشیں ذلیل ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت کرنے والے اور اس کے عشق میں گُمشدہ قوم یعنی انبیاؑ ان جھوٹے اور فانی عاشقوں کے عشق سے کہیں بڑھ کر اپنے اندر جوش رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا خدا وُہ خدا ہے جو جُھکنے والوں کیطرف جُھکتا ہے۔ اور وُہ اُن پر بہت زیادہ توجہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف آنے والا اگر معمولی چال سے چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ پس جس شخص کی توجہ ایسے خدا کی طرف ہو جائے اور وہ اس کی محبّت میں کھویا جائے تو اس محبّت اور عشقِ الٰہی

کی آگ اُس کی امانی اور نفسانی خیالات کو جلا دیتی ہے اور اس کے اندر رُوحِ ناطق بھر جاتی ہے۔ اور وُہ پاک نُطق جو اس کے اندر شروع ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کا نُطق ہوتا ہے۔ جیسے دوسرے رنگ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اس کا جواب دیتا ہے۔ پس یہ ایک کمالِ نبوت ہے۔ جیسے اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری بات ہے کہ جب انسان اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[1] کی دُعا مانگے تو اس کے پیش نظر یہ رہنا چاہیئے کہ وہ اُس کمالِ نبوّت کو حاصل کرے۔

دوسرا کمال صدیقوں کا کمال ہے

پھر دوسرا کمال صدیقوں کا کمال ہے۔ صِدِّیق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جو بالکل راستبازی میں فنا شُدہ ہو۔ اور کمال درجہ کا پابند راستباز اور عاشقِ صادق ہو۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جب ایک شخص اس درجہ پر پہنچتا ہے۔ تو وُہ ہر قسم کی صداقتوں اور راستبازیوں کا مجموعہ اور ان کو کشش کرنے والا ہو جاتا ہے۔ جس طرح پر صدیق کمالاتِ صداقت کا جذب کرنے والا ہوتا ہے۔ بقول شخصے ؎ زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔ جب ایک شے بہت بڑا ذخیرہ پیدا کر لیتی ہے تو اس میں اپنی قسم کی اشیاء کو جذب کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

صدیق کے کمال کے حصُول کا فلسفہ

صدیق کے کمال کے حصُول کا فلسفہ یہ ہے کہ جب وُہ اپنی کمزوری اور ناداری کو دیکھ کر اپنی طاقت اور حیثیت کے موافق اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہتا اور صدق اختیار کرتا اور جھُوٹ کو ترک کر دیتا ہے۔ اور ہر قسم کے رجس اور پلیدی سے جو جھُوٹ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ دُور بھاگتا ہے اور عہد کر لیتا ہے کہ کبھی جھُوٹ نہ بولوں گا۔ جھُوٹی گواہی نہ دوں گا اور نہ جذبہ نفسانی کے رنگ میں کوئی جھُوٹا کلام کروں گا۔ نہ لغو طور پر

[1] الفاتحہ : ۶-۷

نہ کسبِ خیر اور نہ دفع شر کے لئے۔ یعنی کسی رنگ اور حالت میں بھی جھوٹ کو اختیار نہیں کروں گا۔ جب اس حد تک وعدہ کرتا ہے تو گویا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر وُہ ایک خاص عمل کرتا ہے۔ اور اس کا وُہ عمل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہوتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے آگے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے۔ خواہ یہ اُس کے مُنہ سے نکلے یا نہ نکلے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو مبدء الفیوض اور صِدق اور راستی کا سرچشمہ ہے۔ اس کو ضرور مدد دیگا اور صداقت کے اعلیٰ اصول اور حقایق اس پر کھول دیگا۔ مثلاً جیسے کہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو تاجر اچھے اصُولوں پر چلتا ہے اور راستبازی اور دیانتداری کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اگر وُہ ایک پیسہ سے بھی تجارت کرے تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک پیسہ کے بدلے لاکھوں روپے دے دیتا ہے۔

اسی طرح جب عام طور پر ایک انسان راستی اور راستبازی سے محبت کرتا ہے اور صِدق کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو وُہی راستی اس عظیم الشان صدق کو کھینچ لاتی ہے جو خدا تعالیٰ کو دکھا دیتی ہے۔ صدق مجسم قرآن شریف ہے اور پیکر صدق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی مبارک ذات ہے۔ اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے مامُور و مُرسَل حق اور صِدق ہوتے ہیں۔ پس جب وُہ اس صدق تک پہنچ جاتا ہے تب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور اُسے ایک خاص بصیرت ملتی ہے جس سے معارف قرآنی اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ میں اس بات کے ماننے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوں کہ وُہ شخص جو صدق سے محبت نہیں رکھتا اور راستبازی کو اپنا شعار نہیں بناتا وُہ قرآن کریم کے معارف کو سمجھ بھی سکے۔ اس لئے کہ اس کے قلب کو اس سے مناسبت ہی نہیں۔ کیونکہ یہ تو صدق کا چشمہ ہے۔ اور اس سے وہی پی سکتا ہے جس کو صدق سے محبت ہو۔

معارف قرآنی کس کا نام ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ معارف قرآنی صرف اسی بات کا نام نہیں کہ کبھی کسی

نے کوئی نکتہ بیان کر دیا۔ اس کی تو وہی مثال ہے ؎

گاہ باشد کہ کودکے ناداں　　بغلط بر ہدف زند تیرے

نہیں۔ قرآنی حقایق و معارف کے بیان کرنے کے لئے قلب کو مناسبت اور کشش اور تعلق حق اور صدق سے ہو جاتا ہے اور پھر یہاںتک اس میں ترقی اور کمال ہوتا ہے کہ وہ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی[1] کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ جب پڑتی ہے۔ صدق پر ہی پڑتی ہے اور اُس کو ایک خاص قوت اور امتیازی طاقت دی جاتی ہے جس سے وہ حق و باطل میں فی الفور امتیاز کر لیتا ہے۔ یہاںتک کہ اُس کے دل میں ایک قوت آجاتی ہے جس کی ایسی تیز حس ہوتی ہے کہ اسے دُور سے ہی باطل کی بُو آجاتی ہے۔ یہی وہ سِر ہے جو لَایَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ[2] میں رکھا گیا ہے۔

جھوٹ ترک کئے بغیر انسان مطہر نہیں ہو سکتا

حقیقت میں جبتک انسان جھوٹ کو ترک نہیں کرتا وہ مطہر نہیں ہو سکتا۔ نابکار دُنیا دار کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر گذارہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک بیہودہ گوئی ہے۔ اگر سچ سے گذارہ نہیں ہو سکتا۔ تو پھر جھوٹ سے ہرگز گذارہ نہیں ہو سکتا۔ افسوس کہ یہ بدبخت لوگ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بدوں گذارہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنا معبود اور مشکل کشا جھوٹ کی نجاست کو ہی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جھوٹ کو بتوں کی نجاست کے ساتھ وابستہ کر کے بیان فرمایا ہے۔ یقیناً سمجھو کہ ہم ایک قدم کیا ایک سانس بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں لے سکتے۔ ہمارے جسم میں کیا کیا قویٰ ہیں۔ لیکن کیا ہم اپنی طاقت سے اُن سے کام لے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنیکے معنی

جو لوگ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اُن

[1] النجم: ۴　[2] الواقعہ: ۸۰

کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ خدا تعالےٰ پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے۔ بلکہ خدا تعالےٰ کے پیدا کردہ اسباب سے کام لینا اور اُس کے عطا کردہ قویٰ کو کام میں لگانا۔ پھر نتیجہ کے لئے خدا تعالےٰ پر بھروسہ کرنا ہی حقیقی راہ ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی قدر ہے۔ جو لوگ خدا داد قویٰ سے کام نہیں لیتے اور صرف مُنہ سے کہدیتے ہیں کہ ہم خدا تعالےٰ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ جھُوٹے ہیں اور وُہ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے۔ بلکہ خدا تعالےٰ کو آزماتے ہیں۔ اور اُس کی عطا کردہ قوتوں اور طاقتوں کو لغو قرار دیتے ہیں۔ اور اِس طرح پر اُس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتے ہیں اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے مفہوم سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اور اس پر عمل نہیں کرتے۔ بلکہ بغیر اس پر عمل کئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ ہرگز مناسب نہیں بلکہ جہانتک ہو سکے۔ اور انسان کے امکان اور طاقت میں ہو۔ رعایتِ اسباب ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن ان اسباب کو اپنا معبود اور مُشکل کُشا قرار نہ دے بلکہ اُن سے کام لیکر پھر انجام کو تفویض الی اللہ کرے اور اس بات پر سجداتِ شکر بجا لائے کہ خدا نے اس کو وہ طاقتیں اور قویٰ عطا فرمائے ہیں۔

خُدائی کام انسان سے کب صادر ہوتے ہیں

خُدا تعالےٰ کے فضل اور تائید کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کھینچا جاتا ہے اور خدا تعالےٰ میں فنا ہو جاتا ہے تو اس سے وہ کام صادر ہوتے ہیں۔ جو خدائی کام کہلاتے ہیں۔ اور اس پر اعلیٰ سے اعلیٰ انوار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ انسانی کمزوری کا تو کچھ بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ ایک قدم بھی خدا تعالےٰ کے فضل اور تائید کے بغیر نہیں چل سکتا۔ میں تو یہانتک یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے اُسے مدد نہ ملے تو وہ رفع حاجت کے بعد آزار بند تک بھی باندھنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ طبیبوں نے ایک مرض لکھی ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ انسان جب چھینک لے تو اس کے ساتھ ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ یقیناً یاد رکھو کہ انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا[1]۔ انسان کا اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سر سے لیکر پاؤں تک اتنے اعضاء نہیں رکھتا۔ جس قدر کہ اُس کو امراض لاحق ہوتے ہیں جب وہ اتنی کمزوریوں کا نشانہ اور مجموعہ ہے تو پھر اُس کے لئے امن اور عافیت کی یہی سبیل ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا مُعاملہ صاف ہو اور وہ اُس کا سچا اور مخلص بندہ بن جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وُہ صِدق کو اختیار کرے۔ جسمانی نظام کی کل بھی صِدق ہی ہے۔ جو لوگ صِدق کو چھوڑ دیتے ہیں اور خیانت کر کے جرائم کو پناہ میں لانے والی سپر کذب کو خیال کرتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔

کذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے

آنی اور عارضی طور پر ممکن ہے اس سے کسی انسان کو کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔ لیکن فی الحقیقت کِذب کے اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھُوٹ کے لئے پھر اسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ اس جھوٹ کو سچائی کا رنگ دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح اندر ہی اندر اس کے اخلاقی اور رُوحانی قویٰ زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اُسے یہانتک جُرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افتراء کر لیتا اور خدا تعالےٰ کے مُرسلوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالےٰ کے نزدیک اظلم ٹھہر جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ[2]۔ یعنی اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالےٰ پر جھُوٹ اور افترا باندھے یا اُس کی آیات کی تکذیب کرے۔ یقیناً یاد رکھو کہ جھُوٹ بہت ہی بُری بَلا ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جھُوٹ کا خطرناک نتیجہ اَور کیا ہو گا۔ کہ انسان خدا تعالےٰ کے مرسلوں اور اُس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پس تمہارے لئے یہ ضروری بات ہے کہ صِدق اختیار کرو۔

[1] النساء: ۲۹ [2] الانعام: ۲۲

حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں درج ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے طلب علم کے لئے نکلے تو آپ کی والدہ صاحبہؒ نے ان کے حصہ کی اسّی اشرفیاں اُن کی بغل کے نیچے پیراہن میں سی دیں اور یہ نصیحت کی کہ بیٹا جھوٹ ہرگز نہ بولنا۔ حضرت سید عبدالقادرؒ جب گھر سے رخصت ہوئے۔ تو پہلی ہی منزل میں ایک جنگل میں سے اُن کا گذر ہوا۔ جہاں چوروں اور قزاقوں کا ایک بڑا قافلہ رہتا تھا۔ جہاں اُن کو چوروں کا ایک گروہ ملا۔ اُنہوں نے آپ کو پکڑ کر پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ آپؒ نے دیکھا کہ یہ تو پہلی ہی منزل میں امتحان درپیش آیا۔ اپنی والدہ صاحبہ کی آخری نصیحت پر غور کی اور فوراً جواب دیا کہ میرے پاس اسّی اشرفیاں ہیں۔ جو میری بغل کے نیچے میری والدہ صاحبہ نے سی دی ہیں۔ وہ چور یہ سُنکر سخت حیران ہوئے کہ یہ فقیر کیا کہتا ہے۔ ایسا راستباز ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ آپؒ کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لیگئے اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس نے بھی جب آپؒ سے سوال کیا تب بھی آپؒ نے وہی جواب دیا۔ آخر جب آپ کے پیراہن کے اس حصّہ کو پھاڑ کر دیکھا گیا۔ تو واقعی اس میں اسّی اشرفیاں موجود تھیں۔ اُن سب کو حیرانی ہوئی۔ اِس پر اُن کے سردار نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس پر آپؒ نے اپنی والدہ صاحبہ کی نصیحت کا ذکر کر دیا۔ اور کہا کہ میں طلب دین کیلئے گھر سے نکلا ہوں اگر پہلی ہی منزل پر جھوٹ بولتا تو پھر کیا حاصل کر سکتا۔ اس لئے میں نے سچ کو نہیں چھوڑا جب آپؒ نے یہ بیان فرمایا تو قزاقوں کا سردار چیخ مار کر رو پڑا۔ اور آپؒ کے قدموں پر گر گیا۔ اور اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کی۔ کہتے ہیں کہ آپؒ کا سب سے پہلا مُرید یہی شخص تھا +

غرض صدق ایسی شَے ہے جو انسان کو مشکل سے مشکل وقت میں بھی نجات دلا دیتی ہے۔ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ ؎ کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست۔ پس جس قدر انسان صِدق کو اختیار کرتا ہے اور صِدق سے محبت کرتا ہے۔ اسی قدر اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے کلام اور انبیاءؑ کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تمام

راستبازوں کے نمونے اور چشمے ہوتے ہیں۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ[1] کا ارشاد اسی اصول پر ہے

صدیقوں کے کمال حاصل ہونے پر قرآن کریم کے حقایق اور معارف کھلتے ہیں

مختصر یہ کہ دوسرا کمال اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں صدیقوں کا کمال ہے۔ اور اس کمال کے حاصل ہونے پر قرآن شریف کے حقایق اور معارف کھلتے ہیں۔ لیکن یہ فضل اور فیض بھی محض تائید الٰہی سے آتا ہے۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ خدا تعالےٰ کی تائید اور فضل کے بغیر ایک انگلی کا ہلانا بھی مشکل ہے۔ ہاں یہ انسان کا فرض ہے کہ سعی اور مجاہدہ کرے۔ جہانتک اس سے ممکن ہو اور اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ سے ہی چاہے کبھی اس سے مایُوس نہ ہو۔ کیونکہ مومن کبھی مایُوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے خود بھی فرمایا ہے۔ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ[2] (پ۱۳) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر نا اُمید ہوتے ہیں۔ نا امیدی بہت ہی بُری بلا ہے۔ اصل میں ناامید وہ ہوتا ہے جو خدا تعالےٰ پر بدظنی کرتا ہے۔

بدظنی بہت ہی بُری بلا ہے

یہ خوب یاد رکھو کہ ساری خرابیاں اور برائیاں بدظنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اس سے بہت منع فرمایا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔[3] اگر مولوی لوگ ہم سے بدظنی نہ کرتے اور صدق اور استقلال کے ساتھ وہ ہماری باتیں سنتے، ہماری کتابیں پڑھتے اور ہمارے پاس رہ کر ہمارے حالات کا مشاہدہ کرتے تو ان الزامات کو جو وُہ ہم پر لگاتے ہیں، ہرگز نہ لگاتے۔ لیکن جب انھوں نے خدا تعالیٰ کے اس ارشاد کی عظمت نہ کی اور اس پر کاربند نہ ہوئے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر بدظنی کی اور میری جماعت پر بھی بدظنی کی۔ اور جھوٹے الزامات اور اتہامات لگانے شروع کر دیئے۔ یہانتک کہ بعض نے بڑی بیباکی سے یہ لکھ دیا کہ یہ تو دہریوں کا گروہ

[1] التوبہ: ۱۱۹ [2] یوسف: ۸۸ [3] الحجرات: ۱۳

ہے۔ اور یہ لوگ نمازیں نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر وہ اس بدظنی سے بچتے تو اُن کو جھوٹ کی لعنت کے نیچے نہ آنا پڑتا اور وہ اِس سے بچ جاتے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بدظنی بہت ہی بُری بلا ہے جو انسان کے ایمان کو تباہ کر دیتی ہے اور صدق اور راستی سے دُور پھینک دیتی ہے اور دوستوں کو دشمن بنا دیتی ہے صدیقوں کے کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بدظنی سے بہت ہی بچے۔ اور اگر کسی کی نسبت کوئی سُوءظن پیدا ہو۔ تو کثرت کے ساتھ استغفار کرے۔ اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرے تاکہ اس معصیت اور اس کے بُرے نتیجہ سے بچ جاوے جو اُس بدظنی کے پیچھے آنے والا ہے۔ اس کو کبھی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے جس سے انسان بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔

بدظنی کا انجام جہنم ہے

غرض بدظنی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہانتک لکھا ہے کہ جس وقت دوزخی لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اللہ تعالےٰ اُن سے یہی فرمائے گا کہ تم نے اللہ تعالےٰ پر بدظنی کی۔ بعض لوگ اِس خیال کے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خطاکاروں کو معاف کر دے گا اور نیکوکاروں کو عذاب دیگا۔ ایسا خیال بھی اللہ تعالےٰ پر بدظنی ہے۔ اس لئے کہ اُس کی صفتِ عدل کے سراسر خلاف ہے۔ گویا نیکی اور اُس کے نتائج کو جو قرآن شریف میں اس نے مقرر فرمائے ہیں بالکل ضائع کر دینا اور بیہودہ ٹھہرانا ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ بدظنی کا انجام جہنم ہے۔ اس کو معمولی مرض نہ سمجھو۔ بدظنی سے ناامیدی اور ناامیدی سے جرائم اور جرائم سے جہنم ملتا ہے۔ بدظنی صدق کی جڑ کاٹنے والی چیز ہے اس لئے تم اس سے بچو۔ اور صدیق کے کمالات حاصل کرنے کے لئے دُعائیں کرو۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو صدق دکھایا اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب دیا ہے

تو اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپؓ میں کیا کیا کمالات تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اس چیز کی وجہ سے ہے۔ جو اس کے دل کے اندر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں حضرت ابوبکرؓ نے جو صدق دکھایا۔ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں جو شخص صدیق کے کمالات حاصل کرنے کی خواہش کرے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابوبکری خصلت اور فطرت کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے جہانتک ممکن ہو مجاہدہ کرے اور پھر حتی المقدور دُعا سے کام لے جبتک ابوبکری فطرت کا سایہ اپنے اُوپر ڈال نہیں لیتا۔ اور اسی رنگ میں رنگین نہیں ہو جاتا۔ صدیقی کمالات حاصل نہیں ہو سکتے۔

ابوبکری فطرت کیا ہے؟

ابوبکری فطرت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث اور کلام کا یہ موقعہ نہیں۔ کیونکہ اس کے تفصیلی بیان کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ میں مختصراً ایک واقعہ بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اظہار فرمایا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ شام کی طرف سوداگری کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے۔ تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ ایک شخص آپؓ سے ملا۔ آپؓ نے اس سے مکّہ کے حالات دریافت فرمائے اور پُوچھا کہ کوئی تازہ خبر سُناؤ۔ جیسا کہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ جب انسان سفر سے واپس آتا ہے تو راستہ میں اگر کوئی اہلِ وطن مل جائے تو اس سے اپنے وطن کے حالات دریافت کرتا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ نئی بات یہ ہے کہ تیرے دوست محمّد نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ آپؓ نے یہ سُنتے ہی فرمایا۔ کہ اگر اس نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ تو بلاشک وُہ سچا ہے۔ اسی ایک واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آپؓ کو کس قدر حسن ظن تھا۔ مُعجزے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مُعجزہ وہ شخص مانگتا ہے جو مدّعی کے حالات سے ناواقف ہو۔ اور جہاں غیریت ہو۔

اور مزید تسلی کی ضرورت ہو۔ لیکن جس شخص کو حالات سے پوری واقفیت ہو۔ تو اُسے معجزہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ الغرض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راستہ میں ہی آنحضرتؐ کا دعویٰ نبوت سُنکر ایمان لے آئے۔ پھر جب مکہ میں پہنچے تو آنحضرتؐ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر دریافت کیا۔ کہ کیا آپؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ہاں یہ درست ہے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ کہ آپؐ گواہ رہیں۔ کہ میں آپؐ کا پہلا مصدق ہوں۔ آپؓ کا ایسا کہنا محض قول ہی قول نہ تھا۔ بلکہ آپؓ نے اپنے افعال سے اُسے ثابت کر دکھایا اور مرتے دم تک اُسے نبھایا۔ اور بعد مرنے کے بھی ساتھ نہ چھوڑا ❖

درحقیقت اس امر کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ انسان کا قول اور فعل باہم مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر اُن میں مطابقت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ[1] یعنی تم لوگوں کو تو نیکی کا امر کرتے ہو مگر اپنی جانوں کو اس نیکی کے امر کا مخاطب نہیں بناتے۔ بلکہ بھول جاتے ہو۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[2] مومن کو دو رنگی اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ بزدلی اور نفاق ہر دو مومن سے دُور رہتے ہیں ❖

صحابہؓ کے نقش قدم پر چلو

ہمیشہ اپنے قول اور فعل کو درست اور مطابق رکھو۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیوں میں کر کے دکھا دیا۔ ایسا ہی تم بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے صدق اور وفا کے نمونے دکھاؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نمونہ ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زمانہ پر غور کرو کہ جب دشمن قریش ہر طرف سے شرارت پر تلے ہوئے تھے اور انہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ کیا۔ وہ زمانہ بڑا ابتلا کا زمانہ تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حق رفاقت ادا کیا۔ اس کی

[1] البقرۃ: ۴۵ [2] الصف: ۳

نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ طاقت اور قوت بجز صدق ایمان کے ہرگز نہیں آ سکتی۔ آج جسقدر تم لوگ بیٹھے ہوئے ہو۔ اپنی اپنی جگہ سوچو کہ اگر اس قسم کا کوئی ابتلا ہم پر آجائے تو کتنے ہیں جو ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ مثلاً گورنمنٹ کی طرف سے ہی یہ تفتیش شروع ہو جائے کہ کس کس شخص نے اس شخص کی بیعت کی ہے تو کتنے ہونگے جو دلیری کیساتھ یہ کہدیں کہ ہم مبائعین میں داخل ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات سُنکر بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں سُن ہو جائیں گے اور ان کو فوراً اپنی جائدادوں اور رشتہ داروں کا خیال آجائیگا کہ اُن کو چھوڑنا پڑے گا۔

مشکلات کے وقت ساتھ دینا ہمیشہ کامل الایمان لوگوں کا کام ہوتا ہے

مشکلات ہی کے وقت ساتھ دینا ہمیشہ کامل الایمان لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ اس لئے جبتک انسان عملی طور پر ایمان کو اپنے اندر داخل نہ کرے۔ محض قول سے کچھ نہیں بنتا اور بہانہ سازی اُس وقت تک دُور ہی نہیں ہوتی۔ عملی طور پر جب مصیبت کا وقت ہو۔ تو اس وقت ثابت قدم نکلنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح ناصری کے حواری اس آخری گھڑی میں جو اُن کی مصیبت کی گھڑی تھی۔ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلے اور بعض نے تو مُنہ کے سامنے ہی آپ پر لعنت کر دی۔

حقیقت میں یہ بڑی غیرت کا مقام ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر بھی ایک ایسا وقت آیا تھا۔ کہ جب مسلمؓ نے ۷ ہزار آدمیوں کو نماز پڑھائی اور اُن سے حضرت امام حسینؓ کی رفاقت کا عہد لیا۔ مگر جب کسی شخص نے یزید کے آنے کی خبر دی۔ تو سب کے سب آپ کو تنہا چھوڑ گئے۔

عمل ایمان کا زیور ہے

اس قسم کے واقعات بہت ڈراتے ہیں۔ اس لئے اپنے ایمانوں کو وزن کرو۔ عمل

ایمان کا زیور ہے۔ اگر انسان کی عملی حالت درست نہیں ہے تو ایمان بھی نہیں ہے مومن ایک خوبصورت ہوتا ہے جس طرح ایک خوبصورت انسان کو معمولی اور ہلکا سا زیور بھی پہنا دیا جائے تو وہ اسے زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے اسیطرح پر ایک ایماندار کو اس کا عمل نہایت خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اگر وُہ بدعمل ہے تو پھر کچھ بھی نہیں۔ انسان کے اندر جب حقیقی ایمان پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو اعمال میں ایک خاص لذت آتی ہے۔ اور اُس کی معرفت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وُہ اس طرح نماز پڑھتا ہے۔ جس طرح نماز پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ گناہوں سے اسے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ناپاک مجلس سے نفرت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسُول کی عظمت اور جلال کے اظہار کے لئے اپنے دل میں ایک خاص جوش اور تڑپ پاتا ہے۔ ایسا ایمان اُسے حضرت مسیحؑ کی طرح صلیب پر چڑھ جانے سے بھی نہیں روکتا۔ وُہ خدا کے لئے اور صرف خدا تعالیٰ کے لئے حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں بھی پڑ جانے سے راضی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی رضا کو رضائے الٰہی کے ماتحت کر دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جو عَلِیْم بِذَاتِ الصُّدُور ہے اُس کا محافظ اور نگران ہو جاتا ہے اور اُسے صلیب پر سے بھی زندہ اتار لیتا ہے اور آگ میں سے بھی صحیح و سلامت نکال لیتا ہے۔ مگر ان عجائبات کو وُہی لوگ دیکھا کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ پر پُورا ایمان رکھتے ہیں۔

غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صدق اس مصیبت کے وقت ظاہر ہوا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا۔ گو بعض کفّار کی رائے اخراج کی بھی تھی۔ مگر اصل مقصد اور کثرت رائے آپؐ کے قتل پر تھی۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صدق اور وفا کا وہ نمونہ دکھلایا۔ جو ابدالآباد تک کے لئے نمونہ رہیگا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت اور اعلیٰ وفاداری کی ایک زبردست دلیل ہے۔ دیکھو۔ اگر وائسرائے ہند کسی شخص کو کسی خاص کام کے لئے انتخاب کر لے تو اُس کی رائے صائب اور بہتر ہو گی

یا ایک چوکیدار کی۔ ماننا پڑیگا کہ وائسرائے کا انتخاب بہرحال موزوں اور مناسب ہوگا کیونکہ جس حال میں کہ وُہ سلطنت کی طرف سے نائب السلطنت مقرر کیا گیا ہے اور اس کی وفاداری، فراست اور پختہ کاری پر سلطنت نے اعتماد کیا ہے۔ تب ہی تو زمام سلطنت اُس کے ہاتھ میں دی ہے۔ پھر اس کی صائب تدبیری اور معاملہ فہمی کو پس پُشت ڈال کر ایک چوکیدار کے انتخاب اور رائے کو صحیح سمجھ لینا نامُناسب امر ہے۔

آنحضرتؐ نے ہجرت کیوقت حضرت ابوبکرؓ کو کیوں انتخاب کیا

یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتخاب کا تھا۔ اس وقت آپکے پاس ۷۰۔ ۸۰ صحابہؓ موجود تھے۔ جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مگر ان سب میں سے آپؐ نے اپنی رفاقت کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی انتخاب کیا۔ اس میں سرّ کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ نبی خدا تعالیٰ کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کا فہم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کشف اور الہام سے بتا دیا۔ کہ اس کام کے لئے سب سے بہتر اور موزوں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں۔ ابوبکرؓ اس ساعتِ عُسرہ میں آپؐ کے ساتھ ہوئے۔ یہ وقت خطرناک آزمائش کا تھا۔ حضرت مسیحؑ پر جب اس قسم کا وقت آیا۔ تو اُن کے شاگرد ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک نے لعنت بھی کی۔ مگر صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک نے پُوری وفاداری کا نمونہ دکھایا۔ غرض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا پُورا ساتھ دیا۔ اور ایک غار میں جس کو غارِ ثور کہتے ہیں۔ آپؐ جا چھُپے۔ شریر کفّار جو آپؐ کی ایذا رسانی کے لئے منصوبے کر چکے تھے۔ تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ کہ اب تو یہ بالکل سر پر ہی آپہنچے ہیں۔ اور اگر کسی نے ذرا نیچے نگاہ کی۔ تو وُہ دیکھ لیگا اور ہم پکڑے جائینگے اس وقت آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا[1]۔ کچھ غم نہ کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لفظ پر غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ ملاتے

[1] التوبہ: ۴۰

ہیں چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ مَعَنَا میں آپ دونو شریک ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تیرے اور میرے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پلہ پر آنحضرتؐ کو اور دوسرے پر حضرت صدیقؓ کو رکھا ہے۔ اس وقت دونو ابتلا میں ہیں۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے یا تو اسلام کی بنیاد پڑنے والی ہے یا خاتمہ ہو جانے والا ہے۔ دشمن غار پر موجود ہیں۔ اور مختلف قسم کی رائے زنیاں ہو رہی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس غار کی تلاشی کرو۔ کیونکہ نشان پا یہاں تک ہی آکر ختم ہو جاتا ہے۔ . . . .

. . . . لیکن اُن میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہاں انسان کا گذر اور دخل کیسے ہوگا۔ مکڑی نے جالا تنا ہوا ہے۔ کبوتر نے انڈے دیئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کی آوازیں اندر پہنچ رہی ہیں۔ اور آپ بڑی صفائی سے اُن کو سُن رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن آئے ہیں کہ وہ خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور دیوانے کی طرح بڑھتے آئے ہیں۔ لیکن آپ کی کمال شجاعت کو دیکھو کہ دشمن سر پر ہے اور آپ اپنے رفیق صادق صدیقؓ کو فرماتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا[1]۔ یہ الفاظ بڑی صفائی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ آپؐ نے زبان ہی سے فرمایا۔ کیونکہ یہ آواز کو چاہتے ہیں۔ اشارہ سے کام نہیں چلتا باہر دشمن مشورہ کر رہے ہیں۔ اور اندر غار میں خادم و مخدوم بھی باتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس امر کی پرواہ نہیں کی گئی۔ کہ دشمن آواز سُن لیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر کمال ایمان اور معرفت کا ثبوت ہے۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں پر پُورا بھروسہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے لئے تو یہ نمونہ کافی ہے۔ . . . .

. . . . . . ابوبکر صدیقؓ کی شجاعت کے لئے ایک دوسرا گواہ اس واقعہ کے سوا اور بھی ہے ؛

آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی شجاعت

جب آنحضرتؐ نے رحلت فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار کھینچکر نکلے۔

[1] التوبہ : ۴۰

کہ اگر کوئی کہیگا کہ آنحضرت صلعم نے انتقال فرمایا ہے تو میں اسے قتل کردوں گا ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بڑی جرأت اور دلیری سے کلام کیا اور کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[1] یعنی محمد بھی اللہ تعالیٰ کے ایک رسول ہی ہیں اور آپ سے پہلے جسقدر نبی ہو گذرے ہیں سب نے وفات پائی۔ اس پر وہ جوش فرو ہوا۔ اس کے بعد بادیہ نشین اعراب مرتد ہو گئے۔ ایسے نازک وقت کی حالت کو حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے یوں ظاہر فرمایا ہے کہ پیغمبر خدا صلعم کا انتقال ہو چکا ہے اور بعض جھوٹے مدعی نبوت کے پیدا ہو گئے ہیں اور بعضوں نے نمازیں چھوڑ دیں اور رنگ بدل گیا ہے۔ ایسی حالت میں اور اس مصیبت میں میرا باپ آنحضرت صلعم کا خلیفہ اور جانشین ہوا۔ میرے باپ پر ایسے ایسے غم آئے کہ اگر پہاڑوں پر آتے۔ تو وہ بھی نابود ہو جاتے۔ اب غور کرو کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر بھی ہمت اور حوصلہ کو نہ چھوڑنا یہ کسی معمولی انسان کا کام نہیں۔ یہ استقامت صدق ہی کو چاہتی تھی اور صدیق رضؓ نے ہی دکھائی۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی دوسرا اس خطرہ کو سنبھال سکتا۔ تمام صحابہ رضؓ اس وقت موجود تھے۔ کسی نے نہ کہا کہ میرا حق ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ آگ لگ چکی ہے۔ اس آگ میں کون پڑے۔ حضرت عمر رضؓ نے اس حالت میں ہاتھ بڑھا کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر سب نے یکے بعد دیگرے بیعت کر لی۔ یہ اُن کا صدق ہی تھا۔ کہ اس فتنہ کو فرو کیا اور ان موذیوں کو ہلاک کیا۔ مسیلمہ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی تھا۔ اور اس کے مسائل اباحت کے مسائل تھے۔ لوگ اس کی اباحتی باتوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کے مذہب میں شامل ہوتے جاتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی معیت کا ثبوت دیا۔ اور ساری مشکلات کو آسان کر دیا۔

خونِ مسیح پر ایمان لانا بھی سہل بنا ہوا ہے کیونکہ اس پر ایمان لانے سے ایک تو روٹی مل جاتی ہے دوسرے اباحت کی زندگی۔ اسلام میں تو اللہ اکبر کی آواز سے ہی نماز

[1] آل عمران: ۱۴۵

کے لئے اُٹھنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ حال کہ خونِ مسیحؑ پر ایمان لاکر رات کو شراب پی کر سو گئے۔ اور جب جی چاہا اُٹھے۔ کوئی باز پُرس نہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کا رجوع عیسائیت کی طرف ہونا لازمی امر ہے۔ لوگوں کی حالت کچھ اس قسم کی ہوگئی ہے کہ کہتے ہیں۔ ایہہ جہان مِٹھا اگلا کس ڈِٹھا۔ اس جہان میں بدمعاشیاں کرلو۔ آگے دیکھا جائیگا۔ اِس قسم کے لوگ روٹی، بے قیدی اور آرام کی زندگی عیسائیت ہی میں پاسکتے ہیں۔ اُن کے لئے کوئی ضروری امر نہیں۔ خواہ دس برس تک بھی غُسلِ جنابت نہ کریں۔ پس ان لوگوں کو جو عیسائی ہوئے ہیں۔ دیکھ کر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ دہریہ منش جو مرتد ہوئے ہیں اگر عیسائی نہ ہوتے تو باطنی طور پر بھی تو مرتد ہی تھے۔

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اَزلی کافر جو بے قیدی اور اباحت کی زندگی کو چاہتے ہیں۔ اور تین قسم کے مومن۔ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ۔ مُقْتَصِد۔ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرَات۔ پہلی قسم کے مومن وہ ہیں جو ظالم ہیں یعنی ان پر کچھ جذباتِ نفس غالب آجاتے ہیں۔ دوسرے میانہ رو اور تیسرے خیرِ مجسم۔ اب ازلی کافر جو نفس کے غلام اور بندے ہیں۔ جن کی غرض و غایت بجز اِس کے اَور کچھ نہیں کہ بے قیدی کی زندگی بسر ہو۔ اور روپیہ بھی برباد ہو۔ اُن کو اسلام سے کیا مناسبت، وُہ تو عیسائیت کو پسند کریں گے کہ تنخواہ مِل جائے اور کسی چیز کی ضرورت نہ رہے۔ اگر جائیں گے، تو وہاں بھی محض اس غرض سے کہ صدہا خوبصورت عورتیں اچھے لباس پہن کر جاتی ہیں۔ وہاں بدنظری کے لئے جا بیٹھے غرض اس قسم کی اباحتی زندگی والوں کو اسلام سے کوئی مناسبت ہو ہی نہیں سکتی۔

حضرت ابوبکرؓ اسلام کے آدمِ ثانی ہیں

اُس زمانہ میں بھی مسیلمہ نے اباحتی رنگ میں لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ ایسے وقت میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ تو انسان خیال کرسکتا ہے کہ کس قدر مُشکلات پیدا ہوئی

ہوں گی۔ اگر وُہ قوی دِل نہ ہوتا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا رنگ اُس کے ایمان میں نہ ہوتا۔ تو بہت ہی مشکل پڑتی اور گھبرا جاتا۔ لیکن صدیقؓ نبی کا ہمسایہ تھا۔ آپؐ کے اخلاق کا اثر اس پر پڑا ہوا تھا اور دل نورِ یقین سے بھرا ہوا تھا۔ اس لئے وُہ شجاعت اور استقلال دکھایا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اُن کی زندگی اِسلام کی زندگی تھی۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر کسی لمبی بحث کی حاجت ہی نہیں۔ اُس زمانہ کے حالات پڑھ لو۔ اور پھر جو اسلام کی خدمت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ اس کا اندازہ کر لو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ابوبکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ اس اسلام کے لئے آدم ثانی ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ اگر آنحضرت صلعم کے بعد ابوبکرؓ کا وجود نہ ہوتا تو اسلام بھی نہ ہوتا۔ ابوبکر صدیقؓ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے اسلام کو دوبارہ قائم کیا۔ اپنی قوت ایمانی سے کُل باغیوں کو سزا دی۔ اور امن کو قائم کر دیا۔ اسی طرح پر جیسے خدا تعالیٰ نے فرمایا اور وعدہ کیا تھا۔ کہ مَیں سچے خلیفہ پر امن کو قائم کروں گا۔ یہ پیشگوئی حضرت صدیق رضؓ کی خلافت پر پوری ہوئی اور آسمان نے اور زمین نے عملی طور پر شہادت دیدی۔ پس یہ صدیق کی تعریف ہے کہ اُس میں صدق اس مرتبہ اور کمال کا ہونا چاہیئے۔ نظائر سے مسائل بہت جلد حل ہو جاتے ہیں۔

یوسفؑ صدیق

اگر گذشتہ زمانہ میں اس کی نظیر دیکھی جائے تو پھر یوسفؑ صدیق ہے۔ جس نے ایسا صدق دکھایا کہ یوسفؑ صدیق کہلایا۔ ایک خوبصورت معزز اور جوان عورت جو بڑے بڑے دعوے کرتی ہے۔ عین تنہائی اور تخلیہ میں ارتکاب فعل بد چاہتی ہے لیکن آفرین ہے اس صدیقؑ پر کہ خدا تعالیٰ کے حدود کو توڑنا پسند نہ کیا۔ اور اس کے بالمقابل ہر قسم کی آفت اور دُکھ اُٹھانے کو آمادہ ہوگیا۔ یہانتک کہ قیدی کی زندگی بسر کرنی منظور کر لی۔ چنانچہ کہا۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ[1] یعنی یوسفؑ

[1] یوسف: ۳۴

نے دُعا کی۔ کہ اَے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف وُہ مجھے بلاتی ہے۔ اس سے حضرت یوسفؑ کی پاک فطرت اور غیرت نبوّت کا کیسا پتہ لگتا ہے کہ دوسرے امر کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیا مطلب کہ اُس کا نام نہیں لیا۔ یوسفؑ اللہ تعالےٰ کے حُسن و احسان کے گرویدہ اور عاشق زار تھے۔ اُن کی نظر میں اپنے محبوب کے سوا دوسری کوئی بات جچ نہ سکتی تھی وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کہ حدودُ اللہ کو توڑیں ٭

کہتے ہیں کہ ایک لمبا زمانہ جو بارہ برس کے قریب بتایا جاتا ہے وہ جیل میں رہے۔ لیکن اس عرصہ میں کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ اللہ تعالےٰ اور اُس کی تقدیر پر پورے راضی رہے۔ اس عرصہ میں بادشاہ کو کوئی عرضی بھی نہیں دی۔ کہ اُن کے معاملہ کو سوچا جائے یا اُنہیں رہائی دی جائے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس خود غرض عورت نے تکالیف کا سلسلہ بڑھا دیا۔ کہ کسی طرح پر وُہ پھسل جاویں۔ مگر اس صدّیق نے اپنا صِدق نہ چھوڑا خدا نے ان کو صدّیق ٹھہرایا۔ یہ بھی صِدق کا ایک مقام ہے۔ کہ دُنیا کی کوئی آفت، کوئی تکلیف اور کوئی ذلّت اُسے حُدود اللہ کے توڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ جس قدر بلائیں بڑھتی جاویں وہ اُس کے مقامِ صدق کو زیادہ مضبوط اور لذیذ بناتی جاتی ہیں ٭

خلاصہ یہ کہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ جب انسان اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہکر صدق اور وفاداری کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک بڑی نہر صدق کی کھول دیتا ہے جو اس کے قلب پر آ کر گرتی ہے۔ اور اُسے صِدق سے بھر دیتی ہے وہ اپنی طرف سے بضاعۃ مزجاۃ لاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اعلیٰ درجہ کی گرانقدر جنس اُسے عطا کرتا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس مقام میں انسان یہانتک قدم مارتا ہے کہ وُہ صدق اس کیلئے ایک خارق عادت نشان ہو جاتا ہے۔ اس پر اس قدر معارف اور حقایق کا دریا کھلتا ہے یعنی قوّت دیجاتی ہے۔ کہ ہر شخص کی طاقت نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکے ٭

تیسرا کمال شُہداء کا ہے

تیسرا کمال شُہَدَاء کا ہے۔ عام لوگ تو شہید کیلئے اِتنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ کہ

شہید وُہ ہوتا ہے جو تیر یا بندُوق سے مارا جائے۔ یا کسی اَور اتفاقی مَوت سے مُرجائے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہادت کا یہی مقام نہیں ہے۔ میں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ سرحد کے پٹھانوں کو یہ بھی ایک خبط سمایا ہوا ہے کہ وُہ انگریز افسروں پر آکر حملے کرتے ہیں اور اپنی شوریدہ سری سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم کسی کافر یا غیر مذہب والے کو ہلاک کر دینگے تو ہم غَازِیؔ ہوں گے اور اگر مارے جائیں گے تو شَہِیدؔ ہوں گے۔ مجھے ان کمینہ فطرت مُلّانوں پر بھی افسوس ہے جو ان شوریدہ سر پٹھانوں کو اُکساتے ہیں۔ وہ اُنہیں نہیں بتلاتے کہ تم اگر کسی شخص کو بلا وجہ قتل کرتے ہو۔ تو غازی نہیں، ظالِم ٹھہرتے ہو۔ تم اگر وہاں ہلاک ہو جاتے ہو تو شہید نہیں بلکہ خود کشی کر کے حرام مَوت مَرتے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ[1] وُہ اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور فساد کرتے ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ وُہ سخت سزا کے مستوجب ہیں۔ غرض عام لوگوں نے تو شہادت اپنی سمجھ رکھی ہے۔ اور شہید کا یہی مقام ٹھہرا لیا ہے۔ مگر میرے نزدیک شہید کی حقیقت قطع نظر اس کے کہ اس کا جسم کاٹا جائے کچھ اَور بھی ہے اور وُہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ یاد رکھو۔ کہ صدیق نبی سے ایک قُرب رکھتا ہے اور وُہ اس سے دوسرے درجے پر ہوتا ہے اور شہید صدیق کا ہمسایہ ہوتا ہے۔ نبی میں تو سارے کمالات ہوتے ہیں یعنی وہ صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی ہوتا ہے۔ اور صالح بھی ہوتا ہے۔ لیکن صدیق اور شہید دو الگ الگ مقام ہیں۔ اس بحث کی بھی حاجت نہیں کہ آیا صدیق، شہید ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ مقام کمال جہاں ہر ایک امر خارق عادت اور مُعجزہ سمجھا جاتا ہے۔ وُہ ان دونوں مقاموں پر اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جُدا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اُسے ایسی قوت عطا کرتا ہے کہ جو عمدہ اعمال ہیں اور جو عمدہ اخلاق ہیں وہ کامل طور پر اور اپنے اصلی رنگ میں اُس سے صادر ہوتے ہیں اور بلا تکلّف صادر ہوتے ہیں۔ کوئی خوف اور رجار اُن اعمال صالحہ کے صدُور

[1] البقرۃ : ۱۹۶

کا باعث نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وُہ اس کی فطرت اور طبیعت کا جُزو ہو جاتے ہیں۔ تکلف اُس کی طبیعت میں نہیں رہتا۔ جیسے ایک سائل کسی شخص کے پاس آوے تو خواہ اس کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو تو اُسے دینا ہی پڑیگا۔ اگر خدا کے خوف سے نہیں تو خلقت کے لحاظ سے ہی سہی۔ مگر شہید میں اس قسم کا تکلّف نہیں ہوتا۔ اور یہ قوت اور طاقت اُسکی بڑھتی جاتی ہے۔ اور جُوں جُوں بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر اس کی تکلیف کم ہوتی جاتی ہے۔ اور وُہ بوجھ کا احساس نہیں کرتا۔ مثلاً ہاتھی کے سر پر ایک چیونٹی ہو تو وُہ اس کا کیا احساس کریگا۔

کیا جب انسان کامل درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو نماز اُسے معاف ہو جاتی ہے؟

فتوحات میں اس مقام کی طرف اشارہ کرکے ایک لطیف بات لکھّی ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ جب انسان کامل درجہ پر پہنچتا ہے۔ تو اُس کے لئے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ جاہلوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ نماز ہی مُعاف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بعض بے قید فقیر کہتے ہیں۔ اُن کو اس مقام کی خبر نہیں اور اس لطیف نکتہ پر اطلاع نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ابتدائی مدارج سلوک میں نماز اور دوسرے اعمالِ صالحہ ایک قسم کا بوجھ معلوم ہوتے ہیں۔ اور طبیعت میں ایک کسل اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان خدا تعالےٰ سے قوت پا کر اس مقامِ شہید پر پہنچتا ہے تو اس کو ایسی طاقت اور استقامت دی جاتی ہے کہ اُسے اُن اعمال میں کوئی تکلیف محسُوس ہی نہیں ہوتی۔ گویا وہ اُن اعمال پر سوار ہوتا ہے اور صوم۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ ہمدردی بنی نوع۔ مروت۔ فتوت غرض تمام اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا صدور قوت ایمانی سے ہوتا ہے۔ کوئی مصیبت دکھ اور تکلیف خدا تعالےٰ کی طرف قدم اُٹھانے سے اُسے روک نہیں سکتی۔ شہید اُسی وقت کسی شخص کو کہیں گے جب اُس کی قوتِ ایمانی اس سے وہ فعل دکھائے ہے۔ کہ آرام سے ان افعال کا صدور ہو۔ جیسے پانی اُوپر سے نیچے کو گرتا ہے۔ اسی طرح پر شہید سے

اعمالِ صالحہ کا صدُور ہوتا ہے۔شہید اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھتا ہے اور اُس کی طاقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔جب یہ مقام کامل درجہ پر پہنچے۔ تو یہ ایک نشان ہوتا ہے۔بعض آدمی دیکھے گئے ہیں کہ جب کوئی ابتلا آجائے تو گھبرا اُٹھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا شکوہ کرنے لگتے ہیں اُن کی طبیعت میں ایک افسردگی پائی جاتی ہے۔کیونکہ وہ صُلح جو کلی طور پر خدا تعالیٰ سے ہونی چاہیئے۔اُن کو حاصل نہیں ہوتی۔خدا تعالیٰ سے انسان کی اُسی وقت تک صُلح رہ سکتی ہے کہ جبتک اُس کی مانتا رہے۔یہ بھی یاد رکھو۔کہ خدا تعالیٰ کا معاملہ ایک دوست کا معاملہ ہے۔کبھی ایک دوست دوسرے دوست کی مان لیتا ہے اور دوسرے وقت اُس کو اُس دوست کی ماننی پڑتی ہے۔اور یہ تسلیم خوشی اور انشراحِ صدر سے ہونی چاہیئے نہ کہ مجبوراً۔

اللہ تعالیٰ ایک جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ[1] الی الآیۃ۔یعنی ہم آزماتے رہیں گے کبھی ڈرا کر، کبھی بھُوک سے۔کبھی مالوں اور ثمرات وغیرہ کا نقصان کر کے۔یہاں ثمرات میں اَولاد بھی داخل ہے اور یہ بھی کہ بڑی محنت سے کوئی فصل تیار کی اور یکایک اُسے آگ لگ گئی۔اور وُہ تباہ ہو گئی۔یا دیگر امُور کے لئے محنت اور مشقت کی مگر نتیجہ میں ناکام رہ گیا۔غرض مختلف قسم کے ابتلا اور عوارض انسان پر آتے ہیں۔اور یہ خدا تعالیٰ کی آزمائش ہے۔ایسی صُورت میں جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور اس کی تقدیر کے لئے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔وہ بڑی شرحِ صدر سے کہتے ہیں۔اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ[2]۔کسی قسم کا شکوہ اور شکایت یہ لوگ نہیں کرتے۔ایسے لوگوں کی نسبت اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ[3] الخ یعنی یہی وہ لوگ ہیں۔جن کے حصّہ میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت آتی ہے اللہ تعالےٰ انہیں لوگوں کو مشکلات میں راہ دکھا دیتا ہے۔یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی کریم رحیم اور بامروّت ہے۔جب کوئی شخص اس کی رضا کو مقدّم کر لیتا ہے۔اور اُس کی مرضی پر

[1] البقرۃ: ۱۵۶ [2] البقرۃ: ۱۵۷ [3] البقرۃ: ۱۵۸

راضی ہو جاتا ہے تو وُہ اُس کو اُس کا بدلہ دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ غرض یہ تو وُہ مقام اور مرحلہ ہے۔ جہاں وُہ اپنی بات منوانی چاہتا ہے۔ دوسرا مقام اور مرحلہ وُہ ہے۔ جو اس نے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] میں فرمایا ہے۔ یہاں وُہ بندے کی بات ماننے کا وعدہ فرماتا ہے۔ پس شہید اس پہلے مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی انشراح صدر کے ساتھ خدا تعالےٰ کی بات مانتا ہے وُہ دوست کے ایلام کو برنگ انعام مشاہدہ کرتا ہے ۔

چوتھا درجہ صالحین کا ہے

چوتھا درجہ صالحین کا ہے۔ یہ بھی جب کمال کے درجہ پر ہو۔ تو ایک نشان اور مُعجزہ ہوتا ہے۔ کامل صلاح یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی فساد باقی نہ رہے۔ بدن صالح میں کسی قسم کا کوئی خراب اور زہریلا مادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جب صاف اور موید صحت مواد اس میں ہو تو اُس وقت صالح کہلاتا ہے۔ جبتک صالح مادہ نہیں۔ تب تک اس کے لوازم بھی صالح نہیں ہوتے۔ یہانتک کہ مٹھاس بھی اسے کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح پر جبتک انسان صالح نہیں بنتا اور ہر قسم کی بدیوں سے نہیں بچتا اور خراب مادے نہیں نکلتے۔ اس وقت تک عبادات کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ نماز پڑھتا ہے۔ لیکن اُسے کوئی لذّت اور سرور نہیں آتا۔ وُہ ٹکریں مار کر منحوس مُنہ سے سلام پھیر کر رخصت ہوتا ہے۔ لیکن عبادت میں مزا اُسی وقت آتا ہے جب گندے مواد اندر سے نکل جاتے ہیں۔ پھر اُنس اور ذوق شوق پیدا ہوتا ہے۔ اصلاح انسانی اسی درجہ سے شروع ہوتی ہے۔ (اس قدر تقریر کے بعد حضرت مسیح موعودؑ نے دُعا فرمائی۔ اور جلسہ برخاست ہو گیا)

(الحکم جلد ۹ ۱۸-۹)

۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء۔ بروز اتوار ۹ بجے صبح۔ قادیان مفتی محمد صادق صاحب سے جو لاہور سے تین سال کے اندر طلب نشان والی پیشگوئی کے اشتہار کا انگریزی ترجمہ کرا کر ہمراہ لائے تھے۔ سیر پر جانے سے پہلے فرمایا:۔ "آپ نے اس کام میں خوب ہمّت کی" فرمایا:۔

[1] المومن : ۶۱

حصُولِ ثواب کی راہ

"اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ہم نے انگریزی نہیں پڑھی۔ وُہ آپ لوگوں کو ثواب میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم انگریزی پڑھے ہوئے ہوتے۔ تو اُردو کی طرح اس کے بھی دو چار صفحے ہم روز لکھ دیا کرتے مگر خدا نے چاہا۔ کہ جیسے آپ ہیں اور مولوی محمد علی صاحب ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی ثواب دیا جائے"۔

اس پر مفتی محمد صادق صاحب نے عرض کی کہ یہ ہمت اور ثواب تو مولوی محمد علی صاحب کا ہی حصّہ ہے۔ فرمایا۔ "عالمگیر کے زمانہ میں مسجد شاہی کو آگ لگ گئی تو لوگ دوڑے دوڑے بادشاہ سلامت کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ مسجد کو تو آگ لگ گئی۔ اس خبر کو سُنکر وہ فوراً سجدہ میں گرا اور شکر کیا۔ حاشیہ نشینوں نے تعجب سے پُوچھا کہ حضور سلامت یہ کونسا وقت شکر گذاری کا ہے کہ خانۂ خدا کو آگ لگ گئی ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے تو بادشاہ نے کہا کہ میں مدّت سے سوچتا تھا۔ اور آہ سرد بھرتا تھا۔ کہ اتنی بڑی عظیم الشّان مسجد جو بنی ہے اور اس عمارت کے ذریعہ سے ہزارہا مخلوقات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ کاش کوئی ایسی تجویز ہوتی۔ کہ اس کارِ خیر میں کوئی میرا بھی حصّہ ہوتا۔ لیکن چاروں طرف سے میں اِس کو ایسا مکمل اور بے نقص دیکھتا تھا کہ مجھے کچھ سُوجھ نہ سکتا تھا کہ اس میں میرا ثواب کسی طرح ہو جائے۔ سو آج خدا تعالیٰ نے میرے واسطے حصُولِ ثواب کی ایک راہ نکال دی۔ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ"۔

پھر لیکھرام کے متعلق دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا:-

لیکھرام کے اسلام پر حملے اور مسلمانوں کی دِلآزاری

"اسلام پر حملہ کرنے میں اور مسلمانوں کے بیجا دل دکھانے میں آریوں کے درمیان ایک طرح کی تریموُرتی تھی۔ جن میں سے سب سے بڑھ کر لیکھرام تھا اور اس کے بعد اندرمن اور الکھدھاری تھے۔" فرمایا۔ "دیانند بھی تھا مگر اس کو ایسا موقعہ نہیں تھا اور نہ وُہ

اس طرح سے کتابیں لکھتا تھا۔ ان تینوں نے اور خصوصاً لیکھرام نے بڑی بے ادبیاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا طریق ہے کہ جس راہ سے کوئی بدی کرے اُسی راہ سے گرفتار کیا جاتا ہے۔ چونکہ لیکھرام نے زبان کی چھری کو اسلام اور آنحضرت صلعم کے برخلاف حد سے بڑھ کر چلایا۔ اس واسطے خدا تعالےٰ نے اُس کو چھری سے سزا دی۔

لیکھرام کے معاملہ میں غیب کا ہاتھ کام کرتا ہوا صاف طور پر دکھائی دیتا ہے

لیکھرام کے معاملہ میں غیب کا ہاتھ کام کرتا ہوا صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس شخص (یعنی قاتل) کا شُدھ ہونے کے لئے اُس کے پاس آنا، اُس کا اُس پر بھروسہ کرنا، یہانتک کہ اپنے گھر میں بلا تکلف اُس کو لے جانا، شام کے وقت دیگر ملاقاتیوں کا چلا جانا، اُن کا اکیلا رہ جانا، عین عید کے دوسرے دن اُس کا اس کام کے لئے عازم ہونا، لیکھرام کا لکھتے لکھتے کھڑے ہو کر انگڑائی لینا اور اپنے پیٹ کو سامنے نکالنا اور چھری کا وار کاری پڑنا، مرتے دم تک اُس کی زبان کو خدا کا ایسا بند کرنا کہ باوجود ہوش کے اور اس علم کے کہ ہم نے اُس کے برخلاف پیش گوئی کی ہوئی ہے۔ ایک سیکنڈ کے واسطے اس شُبہ کا اظہار بھی نہ کرنا کہ مجھے مرزا صاحب پر شک ہے، پھر آجتک اُس کے قاتل کا پتہ نہ چلنا۔ یہ سب خدا تعالےٰ کے فعل ہیں جو ہیبت ناک طور پر اس کی قدرت اور طاقت کا جلوہ دکھا رہے ہیں۔" فرمایا:۔

"لیکھرام بڑا ہی زباندراز تھا۔ اور اُس کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ اذا ھلك کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ۔ اب اللہ تعالیٰ زمین کو ایسے لوگوں سے پاک رکھیگا"

شُعبدہ بازی

فرمایا:۔ "دُنیا کے اندر جو نشانات حضرت موسیٰؑ یا دیگر انبیاءؑ نے اس طرح کے دکھائے۔

جیساکہ سوٹے سے سانپ کا بنانا۔ یہ سب شبہ میں ڈالنے والی باتیں ہیں۔ خصوصاً اِس موجودہ زمانہ میں جبکہ ہر طرح کی شعبدہ بازیاں مداری لوگ دکھاتے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں ہرگز نہیں آتا کہ یہ اَمر کس طرح سے ہوگیا۔ انگریز لوگ ایسے ایسے کرتب شعبدہ بازی کے دکھاتے ہیں کہ مَرا ہوا آدمی واپس آجاتا ہے اور ٹوٹی ہوئی چیزیں ثابت دکھائی دیتی ہیں۔ جیساکہ آئین اکبری میں بھی ابوالفضل نے ایک قِصّہ بیان کیا ہے کہ ایک شُعبدہ باز آسمان پر لوگوں کے سامنے چڑھ گیا اور اُوپر سے اس کے اعضار ایک ایک ہو کر گرے۔ اور اُس نے اپنی بیوی کے لئے مطالبہ کیا اور ایک وزیر پر شُبہ کیا کہ اُس نے چھُپا رکھی ہے اور یہ اُس پر عاشق ہے اور پھر اُس کی تلاشی کی اجازت بادشاہ سے لے کر اُسی کی بغل سے نکال لی"۔

فرمایا:۔ " ایسی صورتوں میں پھر سوائے اِس کے اَور کچھ بات باقی نہیں رہتی ہے۔ کہ انسان ایمان سے کام لے اور انبیاءؑ کے کاموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور شُعبدہ بازوں کے کاموں کو دھوکا اور فریب خیال کرے اور اس طرح سے یہ معاملہ بہت نازک ہوجاتا ہے۔

قرآن کریم کے مُعجزے

لیکن خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو جو مُعجزہ عطا فرمایا ہے وُہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم اور اصُولِ تمدّن اور اُس کی فصاحت و بلاغت کا ہے۔ جس کا مقابلہ کوئی انسان ہرگز نہیں کرسکتا اور ایسا ہی مُعجزہ غیب کی خبروں اور پیشگوئیوں کا ہے۔ اس زمانہ کا کوئی شعبدہ بازی کا اُستاد ایسا کرنے کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے نشانات کو ایک صاف تمیز عطا فرمائی ہے۔ تاکہ کسی شخص کو حیلہ حجّت بازی کا نہ رہے اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے نشانات کھول کھول کر دکھائے ہیں۔ جن میں کوئی شک وشُبہ اپنا دخل پیدا نہیں کرسکتا۔

ایک شخص نے عرض کی کہ ایک معترض اعتراض کرتا تھا کہ مرزا صاحب نے لیکھرام کو خود مَروا ڈالا ہے۔

فرمایا کہ "یہ ایک بیہودہ اور جھوٹ بات ہے مگر ان لوگوں کو یہ تو خیال کرنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابورافع اور کعب کو کیوں قتل کروا دیا تھا؟"

ہماری سب پیشگوئیاں اقتداری ہیں

فرمایا:- "ہماری سب پیشگوئیاں اقتداری پیشگوئیاں ہیں۔ اور یہ اس بات کا نشان ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔" فرمایا۔ "لوگوں کی فصاحت اور بلاغت الفاظ کے ماتحت ہوتی ہے اور اس میں سوائے قافیہ بندی کے اَور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ ایک عرب نے لکھا ہے کہ سافرت الیٰ روم وانا علیٰ جمل مأتوم میں روم کو روانہ ہوا۔ اور میں ایک ایسے اُونٹ پر سوار ہوا جس کا پیشاب بند تھا۔ یہ الفاظ صرف قافیہ بندی کے واسطے لائے گئے ہیں۔ مگر یہ قرآن شریف کا اعجاز ہے کہ اس میں سارے الفاظ ایسے موتی کی طرح پروئے گئے ہیں اور اپنے اپنے مقام پر رکھے گئے ہیں کہ کوئی ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور کسی کو دوسرے لفظ سے بدلا نہیں جا سکتا۔ لیکن باوجود اس کے قافیہ بندی اور فصاحت اور بلاغت کے تمام لوازم موجود ہیں۔"

ایک شخص نے کسی صُوفی گدی نشین کی تعریف کی کہ وہ آدمی بظاہر نیک معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اس کو سمجھایا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس بات کو پا جائے اور عرض کی کہ میرا اس کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے کہ اگر حضور مجھے ایک خط اُن کے نام لکھدیں تو میں لے جاؤں گا اور امید ہے کہ اُن کو فائدہ ہو۔ اس پر آپؑ نے فرمایا۔ کہ

"آپ دو چار دن اَور یہاں ٹھہریں۔ میں انتظار کرتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ خود بخود استقامت کے ساتھ کوئی بات دل میں ڈالدے تو میں آپ کو لکھ دُوں۔" پھر فرمایا۔

"جبتک اِن لوگوں کو استقامت، حُسن نیّت کے ساتھ چند دن کی صحبت نہ حاصل ہو جائے۔ تب تک مشکل ہے چاہیئے کہ نیکی کے واسطے دل جوش مارے اور خدا کی رضا کے حصول کے لئے دل ترساں ہو۔"

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نقش کب تک دل میں نہیں جم سکتا

اس شخص نے پھر عرض کی کہ ان لوگوں کو اکثر یہ حجاب بھی ہوتا ہے کہ شاید کسی کو معلوم ہو جائے تو لوگ ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔ فرمایا:۔

"اس کا سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے قائل نہیں ہوتے۔ اور سچے دِل سے اِس کلمہ کو زبان سے نکالنے والے نہیں ہوتے۔" فرمایا۔ "جب زید و بکر کا خوف درمیان میں ہے۔ تب تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نقش دل میں نہیں جم سکتا۔" فرمایا۔

"یہ جو رات دن مسلمانوں کو کلمہ طیبہ کہنے کے واسطے تحریص اور تاکید ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شجاعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب آدمی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے تو تمام انسانوں اور چیزوں اور حاکموں اور افسروں اور دشمنوں اور دوستوں کی قوت اور طاقت ہیچ ہو کر انسان صرف اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور اس کے سوائے سب اُس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ پس وُہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اور کوئی ڈرانے والا اُس کو ڈرا نہیں سکتا۔"

فراست

فرمایا:۔ "فراست بھی ایک چیز ہے۔ جیسا کہ ایک یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھتے ہی کہدیا کہ میں اِن میں نبوّت کے نشان پاتا ہوں۔ اور ایسا ہی مباہلہ کے وقت عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلہ پر نہ آئے۔ کیونکہ اُن کے مشیر نے ان کو کہدیا تھا کہ میں ایسے مُنہ دیکھتا ہوں کہ اگر وُہ پہاڑ کو کہینگے کہ یہاں سے ٹل جا۔ تو وُہ ٹل جائے گا۔"

فرمایا:۔ "اگر کسی کے باطن میں کوئی حِصّہ روحانیت کا ہے۔ تو وُہ مجھ کو قبول کرلے گا۔"

ایک کتاب التعلیم لکھنے کا ارادہ

فرمایا۔ "مَیں چاہتا ہوں کہ ایک کتاب تعلیم کی لکھوں۔ اور مولوی محمد علی صاحب اُس کا ترجمہ کریں۔ اس کتاب کے تین حصّے ہوں گے:۔

ایکؔ یہ کہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں ہمارے کیا فرائض ہیں۔ اور دوؔسرے یہ کہ اپنے نفس کے کیا کیا حقُوق ہم پر ہیں۔ اور تیسؔرے یہ کہ بنی نوع کے ہم پر کیا کیا حقُوق ہیں۔"

فرمایا۔ "زمانۂ نبوّت تو نورٌ علیٰ نور تھا اور ایک آفتاب تھا۔ لیکن اُس کے بعد کے اولیاؤں کے جو خوارق و کرامات بتلائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ انکشاف نہیں رکھتے اور اُن کی تاریخ کا صحیح پتہ نہیں لگ سکتا۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات اُن کی وفات کے دوسَو سال بعد لکھی گئیں۔ اور علاوہ اِس کے اُن لوگوں کو یہ موقع دشمن کے مقابلہ کا نہیں ملا۔ اور نہ اُن کو ایسا فتنہ درپیش آیا جیسا کہ ہم کو۔"

فرمایا۔ "ابھی ہمارے مخالفوں میں سے بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کا ہماری جماعت میں داخل ہونا مقدّر ہے۔ وہ مخالفت کرتے ہیں پر فرشتے ان کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ کہ تم بالآخر انہی لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ وہ ہماری مخفی جماعت ہے۔ جو کہ ہمارے ساتھ ایک دن مل جائے گی۔"

سَیر سے واپس آکر آپ اندر تشریف لے گئے اور کھانے کے وقت دوبارہ تشریف لائے۔ اور مُلّانوں کی نفس پرستیوں اور طلاق و حلالہ کی منحوس رسومات پر مختلف گفتگو فرماتے رہے۔ ظہر و عصر کی نمازوں میں جماعت کے ساتھ شریک ہوئے۔ پھر شام کی نماز پڑھ لینے کے بعد سے نماز عشاء سے فراغت حاصل کر لینے تک احباب میں تشریف فرما رہے۔ ایک دوست کا خط اور دیگر دو اخبارات بعد نماز شام سُنے۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے میر حامد شاہ صاحب کی ایک نظم سُنائی جس سے آپ

بہت خوش ہوئے اور اسے اخبار میں چھپوا دینے کا حکم دیا۔ وہ نظم یہ تھی ؎

ڈنکا بجا جہاں میں مسیحا کے نام کا — خادم ہے دینِ پاکِ رسولِؐ انام کا الخ

دوسرے دن صبح نو بجے کی سیر میں لوقا کے ذکر پر جس کا بیان سیالکوٹ کے ایک اخبار میں سے گذشتہ دن سنایا گیا تھا جس میں مرہم عیسیٰ کے ضمن میں لکھا گیا تھا۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی آپؑ نے مفتی محمد صادق صاحب اور مولوی اللہ دیا لودھیانوی کو مزید تحقیقات کا حکم دیا۔ دوران گفتگو میں فرمایا:۔

"عربی میں لق[1] چٹنی کو کہتے ہیں" جس پر مفتی محمد صادق صاحب نے کہا کہ انگریزی میں لِق چاٹنے کو کہتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "چٹنی تک تو بات پہنچ گئی ہے امید ہے کہ مرہم پٹی تک بھی بات نکل آوے گی" فرمایا۔ "انگریزی کتابوں اور تاریخ کلیسیا سے اس کے حالات کے متعلق تحقیقات کرنی چاہیئے۔ یہ ایک نئی بات نکلی ہے۔" پھر فرمایا۔ "یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں تو لوقا پر توجہ کریں اور اس سے سب حال دریافت کریں۔ مگر ہماری طبیعت اس امر سے کراہت کرتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی اَور کی طرف توجہ کریں۔ خدا تعالیٰ آپ ہمارے سب کام بناتا ہے۔

وہ طریق اختیار کرو جو اللہ کے رسولؐ اور اُس کے صحابہؓ نے اختیار کیا

یہ لوگ جو کشف قبور لئے پھرتے ہیں یہ سب جھوٹ اور لغو اور بیہودہ بات ہے اور شرک ہے ہم نے سنا ہے۔ اس طرف ایک شخص پھرتا ہے اور اس کو بڑا دعویٰ کشف قبور کا ہے۔ اگر اس کا علم سچا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ ہمارے پاس آئے اور ہم اُس کو ایسی قبروں پر لے جائیں گے جن سے ہم خوب واقف ہیں۔ مگر یہ سب بیہودہ باتیں ہیں اور اُن کے پیچھے پڑنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ سعید آدمی کو چاہیئے کہ ایسے خیالات میں اپنے اَوقات کو خراب نہ کرے۔ اس طریق کو اختیار کرے جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے صحابہؓ نے اختیار کیا۔

اس کے بعد مختلف گدی نشینوں کے حالات پر افسوس ہوتا رہا۔ جو سرود وغیرہ بدعات میں گرفتار

[1] لعوق۔ چٹنی

ہیں۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ:-

"انسان میں ایک ملکہ اِستلذاذ کا ہوتا ہے کہ وُہ سرود سے حظ اُٹھاتا ہے۔ اور اُس کے نفس کو دھوکا لگتا ہے کہ میں اِس مضمون سے سرُور پا رہا ہوں۔ مگر دراصل نفس کو صرف حظ درکار ہوتا ہے۔ خواہ اُس میں شیطان کی تعریف ہو یا خدا کی۔ جب یہ لوگ اس میں گرفتار ہو کر فنا ہو جاتے ہیں تو اُن کے واسطے شیطان کی تعریف یا خدا کی سب برابر ہو جاتے ہیں"

اس پر آج کی سیر ختم ہوئی۔ پھر کھانے کے وقت آپؑ باہر تشریف لائے۔ اور کھانا کھانے کے بعد حضور اقدسؑ نے ایک تقریر فرمائی جو کچھ اس میں سے مَیں ضبط رکھ سکا وہ لکھتا ہُوں۔ اس زمانہ کے فتنہ و فساد کا ذکر تھا۔ فرمایا:-

اس زمانہ میں بڑی عبادت کیا ہے

"ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانہ کے درمیان جو فتنہ اسلام پر پڑا ہوا ہے اس کے دُور کرنے میں کچھ حصّہ لے۔ بڑی عبادت یہی ہے کہ اس فتنہ کے دُور کرنے میں ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ حصّہ لے۔ اس وقت جو بدیاں اور گستاخیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاہیئے کہ اپنی تقریر اور علم کے ذریعہ سے اور ہر ایک قوت کے ساتھ جو اس کو دی گئی ہے مخلصانہ کوشش کے ساتھ ان باتوں کو دنیا سے اُٹھا دے۔ اگر اسی دُنیا میں کسی کو آرام اور لذّت مل گئی تو کیا فائدہ۔ اگر دُنیا میں ہی درجہ پا لیا تو کیا حاصل۔ عُقبیٰ کا ثواب لو جس کی انتہا نہیں۔ ہر ایک مسلمان کو خدا تعالیٰ کی توحید و تفرید کے لئے ایسا جوش ہونا چاہیئے جیسا کہ خود اللہ کو اپنی توحید کا جوش ہے۔ غور کرو کہ دنیا میں اِس طرح کا مظلوم کہاں ملیگا جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ کوئی گند اور گالی اور دُشنام نہیں جو آپ کی طرف نہ پھینکی گئی ہو۔ کیا یہ وقت ہے کہ مسلمان خاموش ہو کر بیٹھ رہیں؟ اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا نہیں ہوتا اور حق کی گواہی دے کر جھُوٹے کے مُنہ کو بند نہیں کرتا۔ اور جائز رکھتا ہے کہ کافر لوگ بیحیائی سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر اتہام لگاتے جائیں۔ اور

لوگوں کو گمراہ کرتے جائیں تو یاد رکھو کہ وہ بے شک بڑی باز پُرس کے نیچے ہے۔ چاہیئے کہ جو کچھ علم اور واقفیت تمہیں حاصل ہے وہ اِس راہ میں خرچ کرو۔ اور لوگوں کو اِس مصیبت سے بچاؤ۔ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ اگر تم دجّال کو نہ مارو تب بھی وہ تو مر ہی جائے گا مثل مشہور ہے ؎ ہر کمالے را زوالے۔ تیرھویں صدی سے یہ آفتیں شروع ہوئیں۔ اور اب وقت قریب ہے کہ اُس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ کہ جہانتک ہو سکے پُوری کوشش کرے۔ نوُر اور روشنی لوگوں کو دکھائے ۔

نماز میں تسبیح کہنے کی وجہ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ولی اللہ اور صاحب برکات وُہی شخص ہے۔ جس کو یہ جوش حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا جلال ظاہر ہو۔ نماز میں جو سُبحان ربّی العظیم اور سُبحان ربّی الاعلیٰ کہا جاتا ہے وُہ بھی خدا تعالیٰ کے جلال کے ظاہر ہونے کی تمنّا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی عظمت ہو جس کی نظیر نہ ہو۔ نماز میں تسبیح و تقدیس کرتے ہوئے یہی حالت ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے کہ طبعاً جوش کے ساتھ اپنے کاموں سے اور اپنی کوششوں سے دکھادے کہ اُس کی عظمت کے برخلاف کوئی شَے مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔ یہ بڑی عبادت ہے۔ جو لوگ اس کی مرضی کے مطابق جوش رکھتے ہیں۔ وُہی مؤیّد کہلاتے ہیں اور وُہی برکتیں پاتے ہیں۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور تقدیس کے لئے جوش نہیں رکھتے۔ اُن کی نمازیں جھوٹی ہیں اور اُن کے سجدے بیکار ہیں جبتک خدا تعالیٰ کیلئے جوش نہ ہو یہ سجدے صرف منتر جنتر ٹھہرینگے۔ جن کے ذریعہ سے یہ بہشت کو لینا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کوئی جسمانی بات جس کے ساتھ کیفیت نہ ہو فائدہ مند نہیں ہو سکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی کے گوشت نہیں پہنچتے۔ ایسا ہی تمہارے رکوع اور سجود بھی نہیں پہنچتے جبتک اُن کے ساتھ کیفیت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کیفیت کو چاہتا ہے۔ اور اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی عزّت اور عظمت کے لئے جوش رکھتے ہیں۔ جو لوگ ایسا

کرتے ہیں وُہ ایک باریک راہ سے گذرتے ہیں اور کوئی دوسرا شخص اُن کے ساتھ نہیں جا سکتا جبتک کیفیت نہ ہو انسان ترقی نہیں کرسکتا۔ گویا خدا تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔ کہ جبتک اُس کیلئے جوش نہ ہو کوئی لذت نہیں دیگا۔

کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جبتک ساری تمناؤں پر خدا کی عظمت کو مقدم نہ کرلے

ہر ایک آدمی کے ساتھ ایک تمنا ہوتی ہے۔ لیکن کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ ساری تمناؤں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مقدم نہ کرلے۔ وَلی قریبی اور دوست کو کہتے ہیں۔ جو دوست چاہتا ہے وُہی یہ چاہتا ہے تب یہ وَلی کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[1] انسان کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے جوش رکھے۔ تب وُہ اپنے اَبنائے جنس سے بڑھ جائے گا اور خدا تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے بن جائیگا۔ مُردوں کی طرح نہیں ہونا چاہیئے کہ مُردہ کے مُنہ میں ایک شئے ایک طرف سے ڈالی جاتی ہے تو دوسری طرف سے نکل آتی ہے۔ اسی طرح شقاوت کی حالت میں کوئی اچھی چیز اندر نہیں جاسکتی۔ یاد رکھو کہ کوئی عبادت اور صدقہ قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ذاتی جوش نہ ہو۔ جس کے ساتھ کوئی ملونی ذاتی فوائد اور منافع کی نہ ہو اور ایسا جوش ہو کہ خود بھی نہ جان سکے کہ یہ جوش مجھ میں کیوں ہے۔ بہت ضرورت ہے کہ ایسے لوگ بکثرت پیدا ہوں۔ مگر سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے کچھ ہو نہیں سکتا۔

حالاتِ زمانہ اور ضرورتِ مصلح

اور جو لوگ اس طرح دینی خدمات میں مصروف ہوئے ہیں۔ وُہ یاد رکھیں کہ وہ خدا تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہر ایک فصل کے کاٹنے کا وقت آجاتا ہے۔ ایسا ہی اب مفاسد کے دُور کردینے کا وقت آگیا ہے۔ تثلیث پرستی حد کو پہنچ گئی ہے۔ صادق کی توہین اور گستاخی انتہا تک کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر گھٹی

[1] الذاریات: ۵۷

اور زنبور جتنی بھی نہیں کی گئی۔ زنبور سے بھی انسان ڈرتا ہے اور چیونٹی سے بھی اندیشہ کرتا ہے۔ لیکن حضرت نبی کریم صلعم کو بُرا کہنے میں کوئی نہیں جھجکتا۔ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کے مصداق ہو رہے ہیں۔ جتنا مُنہ اُن کا کھُل سکتا ہے انہوں نے کھولا اور مُنہ پھاڑ پھاڑ کر سب وشتم کئے۔ اب واقعی وہ وقت آگیا ہے کہ خدا تعالیٰ اُن کا تدارک کرے۔ ایسے وقت میں وہ ہمیشہ ایک آدمی کو پیدا کیا کرتا ہے جو اُس کی عظمت اور جلال کے لئے بہت جوش رکھتا ہے۔ ایسے آدمی کو باطنی مدد کا سہارا ہوتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ سب کچھ آپ ہی کرتا ہے۔ مگر اس کا پیدا کرنا ایک سنّت کا پُورا کرنا ہوتا ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[1] اب وہ وقت آگیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں عیسائیوں کو نصیحت فرمائی تھی۔ کہ اپنے دین میں غلُو نہ کریں۔ پر اُنہوں نے اِس نصیحت پر عمل نہ کیا۔ اور پہلے وُہ ضالّین تھے مگر اب مضلّین بھی بن گئے۔ خدا تعالیٰ کے صحیفۂ قدرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بات حد سے گذر جاتی ہے تو آسمان پر تیاری کی جاتی ہے۔ یہی اس کا نشان ہے کہ یہ تیاری کا وقت آگیا ہے۔ سچے نبی و رسول و مجدّد کی بڑی نشانی یہی ہے کہ وہ وقت پر آوے اور ضرورت کے وقت آوے۔ لوگ قسم کھا کر کہیں کہ کیا یہ وقت نہیں کہ آسمان پر کوئی تیاری ہو۔ مگر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ آپ ہی کیا کرتا ہے۔ ہم اور ہماری جماعت اگر سب کے سب حجروں میں بیٹھ جائیں تب بھی کام ہو جائے گا۔ اور دجّال کو زوال آجائے گا۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[2] اُس کا کمال بتاتا ہے۔ کہ اب اُس کے زوال کا وقت قریب ہے۔ اس کا ارتفاع ظاہر کرتا ہے کہ اب وُہ نیچا دیکھے گا۔ اُس کی آبادی اُس کی بربادی کا نشان ہے۔ ہاں ٹھنڈی ہَوا چل پڑی۔ اللہ تعالیٰ کے کام آہستگی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے پاس کوئی بھی دلیل نہ ہوتی۔ تاہم زمانہ کے حالات پر نظر کر کے مسلمانوں پر واجب تھا کہ وُہ دیوانہ وار پھرتے اور تلاش کرتے۔ کہ مسیح ابتک کیوں نہیں کسرِ صلیب

[1] الفتح : ۲۴ [2] آل عمران : ۱۴۱

کے لئے آیا۔ اُن کو یہ نہ چاہیئے تھا کہ اُسے اپنے جھگڑوں کے لئے بُلاتے۔ کیونکہ اُس کا کام کسرِ صلیب ہے۔ اور اُسی کی زمانہ کو ضرورت ہے۔ اسی لئے اُس کا نام مسیح موعود ہے۔ اگر ملاّنوں کو بنی نوع انسان کی بھلائی اور بہبودی مدنظر ہوتی۔ تو وُہ ہرگز ایسا نہ کرتے جیسا ہم سے کر رہے ہیں۔ اُن کو سوچنا چاہیئے تھا کہ اُنہوں نے ہمارے خلاف فتویٰ لکھ کر کیا بنا لیا ہے۔ جسے خدا تعالےٰ نے کہا کہ ہو جائے اُسے کون کہہ سکتا ہے کہ نہ ہو۔ یہ لوگ جو ہمارے مخالف ہیں یہ بھی ہمارے نوکر چاکر ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ہماری بات مشرق و مغرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہم نے ابھی سُنا ہے کہ پیر گولڑوی ہمارے خلاف ایک کتاب لکھنے والا ہے۔ اس پر ہم خوش ہوئے کہ اس کے مریدوں میں سے جس کو ہمارے نام و دعوےٰ کی خبر نہ تھی۔ اس کو بھی خبر ہو جائے گی۔ اور اس طرح انہیں ہماری کتابیں دیکھنے کی ایک تحریک پیدا ہو گی۔" (بدر جلد ۷ ملا صٖ ۲-۳ پرچہ ۱۹ مارچ ۱۹۰۸ء)

جلسہ سالانہ کی تقریر

۲۸ دسمبر ۱۸۹۹ء

جو کام ہو اللہ کیلئے ہو اور جو بات ہو خدا کے واسطے ہو۔

سب صاحبان متوجہ ہو کر سُنیں۔ میں اپنی جماعت اور خود اپنی ذات اور اپنے نفس کیلئے یہی چاہتا اور پسند کرتا ہوں کہ ظاہری قیل و قال جو لیکچروں میں ہوتی ہے۔ اُس کو ہی پسند نہ کیا جاوے اور ساری غرض و غایت آکر اُس پر ہی نہ ٹھیر جائے کہ بولنے والا کیسی جادو بھری تقریر کر رہا ہے۔ الفاظ میں کیسا زور ہے۔ میں اس بات پر راضی نہیں ہوتا۔ میں تو یہی پسند کرتا ہوں اور نہ بناوٹ اور تکلّف سے بلکہ میری طبیعت اور فطرت کا ہی یہی

اتقضنا ہے کہ جو کام ہو اللہ کے لئے ہو جو بات ہو خدا کیواسطے ہو۔ اگر اللہ کی رضا اور اُس کے احکام کی تعمیل میرا مقصد نہ ہوتا تو اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے تقریریں کرنی اور وعظ سُنانا تو ایک طرف مَیں تو ہمیشہ خلوت ہی کو پسند کرتا ہوں اور تنہائی میں وُہ لذت پاتا ہوں جس کو بیان نہیں کر سکتا۔ مگر کیا کرُوں بنی نوع کی ہمدردی کھینچ کر باہر لے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس نے مجھے تبلیغ پر مامُور کیا ہے۔ میں نے یہ بات کہ ظاہری قیل وقال ہی کو پسند نہ کیا جائے۔ اس لئے بیان کی ہے کہ ہر خیر میں بھی شیطان کا حصّہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ پس انسان جب وعظ کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ امر بالمعرُوف اور نہی عنِ المنکر بہت ہی عُمدہ کام ہے۔ مگر اس منصب پر کھڑا ہونے والے کو ڈرنا چاہئیے کہ اِس میں مخفی طور پر شیطان کا بھی حصّہ ہے۔ کچھ تو واعظ کے بخرہ میں آتا ہے اور کچھ سُننے والوں کے حِصّہ میں۔ اِس کی حقیقت یہ ہے کہ جب واعظ وعظ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو مقصد اور دلی تمنا صِرف یہ ہوتی ہے کہ میں ایسی تقریر کروں کہ سامعین خوش ہو جائیں۔ ایسے الفاظ اور فقرات بولوں کہ ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں آئیں۔ میں اس قسم کی تقریر کرنے والوں کے مقاصد کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ جیسے بھڑوے، نقال، قوال، گویئے یہی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے سُننے والے ان کی تعریفیں کریں۔

پس جب ایک مجمع کثیر سُننے والا ہو۔ اور اس میں ہر ایک مذاق اور درجہ کے لوگ موجود ہوں تو خدا کی طرف کی آنکھ کھُلی نہیں ہوتی۔ الّا ماشاء اللہ مقصود یہی ہوتا ہے کہ سُننے والے واہ واہ کریں۔ تالیاں بجائیں اور چیرز دیں۔ غرض یہ حصّہ شیطان کا واعظ یا بولنے والے میں ہوتا ہے۔ اور سامعین میں شیطانی حِصّہ یہ ہوتا ہے کہ وُہ بولنے والے کی فصاحت وبلاغت، زبان پر پُوری حکومت اور قادر الکلامی، برمحل اشعار، کہانیوں اور ہنسانے والے لطیفوں کو پسند کریں اور داد دیں تا کہ سخن فہم ثابت ہوں۔ گویا اُن کا مقصود بجائے خود خدا سے دُور ہونا ہے۔ اور بولنے والے کا الگ۔ وُہ بولتا ہے مگر خدا کیلئے نہیں۔ اور یہ سُنتے ہیں۔ مگر ان باتوں

کو دل میں جگہ نہیں دیتے اس لئے کہ وہ خدا کے لئے نہیں سُنتے۔ یہ کیوں ہوتا ہے صرف اس بات کے واسطے کہ ایک لذت حاصل کریں۔ یاد رکھو! انسان دو قسم کی لذتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک رُوح کی لذت ہے۔ دوسری نفس کی لذت ؛

رُوحانی و جسمانی لذت کے معنی

روحانی لذت تو ایک باریک اور عمیق راز ہے جس پر اگر کسی کو اطلاع مل جائے اور ساری عُمر میں ایک مرتبہ بھی جس کو یہ سرور اور ذوق مل جائے وہ اس سے سرشار اور مست ہو جائے۔ نفسانی لذتیں ایسی ہیں کہ ہمیشہ آنی اور فانی ہوتی ہیں۔ نفسانی لذت وہ لذت ہے۔ جس کے ساتھ ایک طوائف بازاروں میں ناچ کرتی ہے۔ وہ بھی اس لذت میں شریک ہیں۔ جیسے مولوی واعظ کی حیثیت میں گاتا ہے اور لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ ویسی ہی بازاری عورت گاتی ہے اُسے بھی پسند کرتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نفس یہی چیز ہے جو ایک واعظ کے وعظ سے بھی لذت اُٹھاتا ہے اور دوسری طرف ایک بدکار عورت کے گانے سے بھی لذت اُٹھاتا ہے۔ حالانکہ وُہ خوب جانتا ہے کہ یہ عورت بدکار ہے۔ اُس کے اخلاق، اس کی معاشرت بہت ہی قابل نفرت ہے۔ لیکن اس پر بھی اگر وُہ اُس کی باتوں اور اُس کے گانے سے لذت اُٹھاتا ہے اور اُس کو نفرت اور بدبُو نہیں آتی تو یقیناً سمجھو کہ یہ نفسانی لذت ہے ورنہ رُوح تو ایسی گھناؤنی اور متعفن شئے پر راضی نہیں ہو سکتی۔ اس قابلِ رحم واعظ کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھ میں پاک حصہ نہیں ہے۔ ایسا ہی اپنی جانوں پر ظُلم کرنے والے سامعین نہیں سمجھتے کہ ہم یہاں صرف نفسانی لذت کیلئے بیٹھے ہیں اور خدا کا بخرہ ہم میں نہیں ہے۔ پس میں خدا تعالےٰ سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ وُہ ہماری تقریروں، ہمارے بولنے والوں اور سُننے والوں میں سے اس ناپاک اور خبیث رُوح کے حصہ کو نکال کر محض لِلّٰہیت بھر دے۔ ہم جو کچھ کہیں خدا کے لئے، اُس کی رضا حاصل کرنے کے واسطے، اور جو کچھ سُنیں۔ خدا کی باتیں سمجھ کر سُنیں اور نیز عمل کرنے

کے واسطے سُنیں اور مجلسِ وعظ سے ہم صرف اتنا ہی حِصّہ نہ لے جائیں کہ یہ کہیں۔ آج بہت اچھّا وعظ ہوا +

مُسلمانوں کے زوال و ادبار کی وجہ

مُسلمانوں میں اِدبار اور زوال آنے کی یہ بڑی بھاری وجہ ہے۔ ورنہ اس قدر کانفرنسیں اور انجمنیں اور مجلسیں ہوتی ہیں اور وہاں بڑے بڑے لسّان اور لیکچرار اپنے لیکچر پڑھتے اور تقریریں کرتے، شاعر قوم کی حالت پر نوحہ خوانیاں کرتے ہیں۔ وہ بات کیا ہے کہ اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ قوم دن بدن ترقی کی بجائے تنزل ہی کی طرف جاتی ہے۔ بات یہی ہے کہ ان مجلسوں میں آنے جانے والے اخلاص لے کر نہیں جاتے۔ وہاں لیکچراروں کی غرض جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے۔ خواہ وہ مولوی ہوں یا نئے تعلیمیافتہ مشائخ ہوں یا صُوفی صرف واہ واہ سُننا ہوتی ہے۔ تقریر کرتے وقت ان کے معبُود سامعین ہوتے ہیں جن کی خوشی اور رضامندی اُن کو مطلوب ہوتی ہے نہ خدا کی رضاء لیکن راستباز اور حقّانی لوگ جو قیامت تک ہوں گے۔ اُن کا یہ مقصد اور منشار کبھی نہیں ہوتا۔ اُن کا مقصود اور مطلوب خدا ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کی سچّی ہمدردی اور غمگساری جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصُول کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ وہ دُنیا کو دکھانا چاہتے ہیں جو خود اُنہوں نے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنا اُن کی تمنا ہوتی ہے۔ اسلئے وہ جو کچھ کہتے ہیں بلاخوف لومۃ ولائم کہتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں سامعین ایک مُردہ کیڑے ہوتے ہیں۔ نہ اُن سے کوئی اجر مقصُود ہوتا ہے۔ نہ اُن کے واہ واہ کی پروا۔ غرض یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات لوگ اُن کی باتیں سُنکر گھبرا جاتے ہیں۔ اور درمیان تقریر میں اُٹھ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات گالیاں دیتے اور دُکھ دینے والی باتوں ہی پر اکتفا نہ کرکے قسم قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ نفسانی لذّت کا طالب اور خواہشمند کون ہوتا ہے اور نفسانی لذّت ہوتی کیا ہے۔ ایک

طوائف کا ناچ ہو تو ساری رات بھی جاگنا اور زر دادن و دردِ سر خریدن کا مصداق ہونا بھی منظور ۔

حقّانی ریفارمر

لیکن ایک حقّانی واعظ کے چند کلمے جو نہایت خلوص اور سچّے جوش اور حقیقی ہمدردی کی بنا پر اس کے پاک مُنہ سے نکلتے ہیں، اُن کے لئے سُننا دشوار اور گراں ۔ مگر یہ حقّانی واعظوں کی جماعت اِن باتوں سے نہ کبھی گھبراتی اور نہ جھکتی ہے کیوں؟ اُن کے پیشِ نظر خُدا ہوتا ہے ۔ جو اپنی لاانتہا قدرتوں اور فوق الفوق طاقتوں کے ساتھ اُن پر جلوہ نمائی کرتا ہے ۔ جو اُن پر سکینت اور استقلال نازل فرماتا ہے ۔ پھر وہ مُردہ دنیاداروں کی پرواہ کیا کر سکتے ہیں ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کی پیدائش میں ایک رُوح کا حصّہ ہے دوسرے نفس کا جو بہت پھیلا ہوا ہے ۔ اب آپ لوگ یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ جو چیز زیادہ ہوگی اُس کا اثر زیادہ ہوگا ۔ رُوح کا جوش ایسا ہے جیسے کوئی غریب الوطن ناواقف لوگوں میں آ کر بسے ۔ پس رُوح جو گمنام حالت میں ہوتی ہے ۔ اُس پر بہت کم اثر ہوتا ہے ۔

رُوح کے اثر کی علامت

رُوح کے اثر کی علامت یہ ہے کہ جب ربّانی واعظ اور حقّانی ریفارمر بولتا ہے ۔ تو وُہ اپنے وعظ میں سامعین کو کالعدم سمجھتا ہے اور پیغام رساں ہو کر باتیں پہنچاتا ہے ۔ ایسی صورت میں رُوح میں ایک گداز ش پیدا ہوتی ہے ۔ یہانتک کہ وُہ پانی کے ایک آبشار کی طرح جو پہاڑ کے بلند کڑاڑے سے نشیب کی طرف گرتا ہے ، بے اختیار ہو کر گرتی ہے ۔ خدا تعالیٰ کی طرف بہتی ہے اور اس بہاؤ میں وہ ایک ایسی لذّت اور سرور محسوس کرتی ہے ۔ جس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا ۔ پس وہ اپنے بیان اور اپنی تقریر میں وجہ اللہ کو دیکھتا ہے ۔ سامعین کی اُسے پرواہ بھی نہیں ہوتی ۔ کہ وُہ سُنکر کیا کہیں گے

اس کو ایک اَور طرف سے ایک لذت آتی ہے اور اندر ہی اندر خوش ہوتا ہے کہ میں اپنے مالک اور حکمران کے حکم اور پیغام کو پہنچا رہا ہوں۔ اس پیغام رسانی میں جو مشکلات اور تکالیف اُسے پیش آتی ہیں وہ بھی اُس کے لئے محسوس اللذّات اور مدرک الحلاوت ہوتی ہیں۔

ہمارے نبی کریمؐ میں ہمدردی اور جوش حد درجہ کا تھا

ایسے لوگ چونکہ بنی نوع کی ہمدردی میں محو ہوتے ہیں۔ اس لئے رات دن سوچتے رہتے ہیں اور اسی فکر میں کُڑھتے ہیں کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس راہ پر آجائیں اور ایک بار اس چشمہ سے ایک گھونٹ پی لیں۔ یہ ہمدردی یہ جوش ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا تھا۔ اس سے بڑھ کر کسی دوسرے میں ہو سکتا ہی نہیں۔ چنانچہ آپ کی ہمدردی اور غمگساری کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ[1] یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اِس غم میں کہ یہ کیوں مومن نہیں ہوتے۔ اس آیت کی حقیقت آپ پورے طور پر نہ سمجھ سکیں تو جُدا امر ہے۔ مگر میرے دل میں اس کی حقیقت یوں بھرتی ہے جیسے بدن میں خون

بدل دردیکہ دارم از برائے طالبانِ حق ٭ نمے گردد بیاں آں درد از تقریر کوتاہم

میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان حقّانی واعظوں کو کس قسم کا جانگزا درد اصلاح خلق کا لگا ہوا ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ معلّم جس رنگ اور طاقت کا ہو۔ اس کا اثر اسی حیثیت سے حسب استعداد سُننے والوں پر ہوتا ہے بشرطیکہ استعداد میں قابلیت ہو۔ جو لوگ خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور خوف اور خشیت رکھتے ہیں۔ اُن پر اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا نشان یہ ہے کہ رُوح تزکیہ نفس کے لئے دَوڑتی ہے اور بے اختیار ہو ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ اگر نفس امّارہ کے ساتھ تعلق زیادہ ہے اور اُس کی حکومت کے نیچے ہے تو طبیعت میں ایک اضطراب اور قلق سا پیدا ہوتا ہے۔ اُس کی باتوں سے نفرت معلوم ہوتی

[1] الشعراء: ۴

ہے۔ وہاں بیٹھنے اور سُننے کو جی نہیں چاہتا۔ بلکہ گھبراہٹ معلوم ہوتی ہے۔ جب انسان اس قسم کی بے چینی اور بے لذتی ایک حقانی واعظ کی باتوں سے اپنے دل میں پائے تو اُس کو واجب ہے کہ وہ اپنی رُوح کی فکر کرے کہ وُہ ہلاکت کے گڑھے پر پہنچی ہوئی ہے۔ خدا کی باتوں سے بے لُطفی اور بے ذوقی اِس سے بڑھ کر دُنیا میں ہلاک کرنے والی چیز کیا ہوگی اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج استغفار، خدا کے حضور رجوع، اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دُعائیں اور اُن پر دوام۔ اگر اس نُسخہ کو استعمال کیا جائے تو میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ اس بے لطفی سے ایک لُطف اور اس بے ذوقی میں سے ایک ذوق پیدا ہو جائے گا۔ پھر وہی رُوح جو خدا کے حضور جانے سے بھاگتی اور خدا کی باتوں کے سُننے سے نفرت کرتی تھی، خدا کی طرف گیند کی طرح لُڑھکتی ہوئی چلی جائے گی ٥

نفس کی تین اقسام

نفس کی تین قسمیں ہیں۔ اَمّارہ - لوّامہ - مطمئنّہ۔ مطمئنّہ کی ایک حالت نفس زکیّہ کہلاتی ہے۔ نفس زکیّہ بچوں کا نفس ہوتا ہے۔ جس کو کوئی ہَوا نہیں لگی ہوتی ہے اور وُہ ہر قسم کے نشیب و فراز سے ناواقف ایک ہموار سطح پر چلتے ہیں۔ نفسِ امّارہ وہ ہے جب کہ دُنیا کی ہَوا لگتی ہے۔ نفس لوّامہ وہ نفس ہے جبکہ ہوش آتا ہے۔ اور لغزشوں کو سوچتا ہے اور کوشش کرتا ہے اور بدیوں سے بچنے کے لئے دُعا کرتا ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے اور نفس مطمئنّہ وُہ ہوتا ہے جبکہ ہر قسم کی بدیوں سے بچنے کی بفضلِ الٰہی قوت اور طاقت پاتا ہے اور ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں سے اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے اور اس طرح پر ایک برُودت اور اطمینان قلب کو حاصل ہوتا ہے۔ کہ کسی قسم کی گھبراہٹ اور اضطراب باقی نہ رہے۔ اس کی مثال اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجُود میں تین قسم کی حکومت رکھی ہے۔ ایک دماغ، دوسرا دِل، تیسری زبان دماغ عقول اور براہین سے کام لیتا ہے اور اُس کا یہ کام ہے کہ ہر وقت وہ ایک تراشں

خراش میں لگا رہتا ہے اور نئی نئی براہین اور حجّج کو سوچتا رہتا ہے۔اس کے سپرد یہی خدمت ہے کہ وہ مقدمات مرتب کر کے نتائج نکالتا رہتا ہے۔قلب تمام وجُود کا بادشاہ ہے۔یہ دلائل سے کام نہیں لیتا۔چونکہ اس کا تعلق ملکُ الملُوک سے ہے۔اس لئے کبھی صریح الہام سے کبھی خفی الہام سے اطلاع پاتا ہے۔یُوں بھی کہہ سکتے ہیں۔کہ دماغ وزیر ہے۔وزیر مدبّر ہوتے ہیں۔اس لئے دماغ تجاویز۔اسباب۔دلائل اور نتائج کے متعلق کام میں لگا رہتا ہے۔قلب کو اُن سے کام نہیں ہے۔اُس کے اندر اللہ تعالیٰ نے قوت حاسّہ رکھی ہے جیسے چیونٹی جہاں کوئی شیرینی رکھی ہوئی ہو۔معاً اس جگہ پر پہنچ جاتی ہے۔حالانکہ اس کیلئے دلیل اس امر کی نہیں ہوتی کہ وہاں شیرینی ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے اُس میں ایک قوت حاسّہ رکھی ہوئی ہوتی ہے۔جو اس کی رہبری کرتی ہے۔اسی طرح پر قلب کو چیونٹی کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ اس میں بھی وہ قوت حاسّہ موجُود ہے۔جو اُس کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ دلائل و براہین اور ترتیب مقدمات اور استخراج نتائج کی ضرورت نہیں رکھتا۔گویہ امر دیگر ہے کہ دماغ اس کے لئے یہ اسباب اور امُور بھی بہم پہنچا دیتا ہے۔

قلب کے جسمانی اور روحانی معنے

قلب کے معنے ایک ظاہری اور جسمانی ہیں اور ایک رُوحانی۔ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ پھرنے والا۔چونکہ دوران خُون اسی سے ہوتا ہے۔اس لئے اس کو قلب کہتے ہیں۔روحانی طور پر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ترقیات انسان کرنا چاہتا ہے وُہ قلب ہی کے تصرف سے ہوتی ہیں۔جس طرح پر دورانِ خُون جو انسانی زندگی کے لئے اشد ضروری چیز ہے۔اسی قلب سے ہوتا ہے۔اسی طرح پر رُوحانی ترقیوں کا اسی کے تصرف پر انحصار ہے۔

دماغ اور قلب کی ماہیّت

بعض نادان آج کل کے فلسفی بیخبر ہیں۔وہ تمام عُمدہ کاروبار کو دماغ سے ہی منسوب کرتے ہیں۔مگر وہ اتنا نہیں جانتے کہ دماغ تو صرف دلائل و براہین کا ملکہ ہے۔قُوت متفکّرہ

اور حافظہ دماغ میں ہے لیکن قلب میں ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے وُہ سردار ہے۔
یعنی دماغ میں ایک قسم کا تکلّف ہے اور قلب میں نہیں بلکہ وُہ بلا تکلّف ہے۔ اس لئے
قلب ربُّ العرش سے ایک مناسبت رکھتا ہے۔ صرف قوّت حاسّہ کے ذریعہ دلائل و براہین
کے بغیر پہچان جاتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے استفتِ القلب
یعنی قلب سے فتوئے پُوچھ لے۔ یہ نہیں کہ دماغ سے فتویٰ پوچھ لو۔ الُوہیت کی تار اسی کے
ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کوئی اس کو بعید نہ سمجھے۔ یہ بات ادق اور مشکل تو ہے۔ مگر تزکیہ نفس کرنے
والے جانتے ہیں۔ کہ یہ مکرّمات قلب میں موجود ہیں۔ اگر قلب میں یہ طاقتیں نہ ہوتیں۔ تو
انسان کا وجُود ہی بیکار سمجھا جاتا۔ صوفی اور مجاہدہ کرنے والے لوگ جو تصوّف اور مجاہدات
کے مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ قلب سے روشنی اور نُور کے ستون
شہودی طور پر نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ایک خط مستقیم میں آسمان کو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ
بدیہی اور یقینی ہے۔ میں اس کو خاص مثال کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں جن لوگوں کو
مجاہدات کرنے پڑتے ہیں یا جنہوں نے سلوک کی منزلوں کو طے کرنا چاہا ہے۔ انہوں نے اس کو
اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے صحیح پایا ہے۔ قلب اور عرش کے درمیان گویا باریک تار ہے قلب کو
جو حکم کرتا ہے اس سے ہی لذّت پاتا ہے۔ خارجی دلائل اور براہین کا محتاج نہیں ہوتا ہے بلکہ مُلہَم
ہو کر خدا سے اندر ہی اندر باتیں پاکر فتویٰ دیتا ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ جبتک قلب قلب
ہے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ[1] کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی انسان پر ایک وہ زمانہ آتا ہے۔ کہ
جس میں قلب و دماغ کی قُوّتیں اور طاقتیں نہیں ہوتی ہیں۔ پھر ایک زمانہ دماغ کا آتا ہے۔
دماغی قوتیں اور طاقتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اور ایک ایسا زمانہ آتا ہے کہ قلب منوّر اور مشتعل
اور روشن ہو جاتا ہے۔ جب قلب کا زمانہ آتا ہے۔ اس وقت انسان رُوحانی بلوغ حاصل کرتا
ہے اور دماغ قلب کے تابع ہو جاتا ہے اور دماغی قوتوں کو قلب کی خاصیتوں اور طاقتوں پر
فوق نہیں ہوتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ دماغی حالتوں کو مومنوں سے ہی خصوصیّت نہیں ہے۔ ہندو

[1] الملک : ۱۱

اور چوہڑے وغیرہ بھی سب کے سب ہر ایک دماغ سے کام لیتے ہیں۔جو لوگ دُنیوی معاملات اور تجارت کے کاروبار میں مصروف ہیں وہ سب کے سب دماغ سے کام لیتے ہیں۔اُن کی دماغی قوتیں پُورے طور پر نشوونُما پائی ہوئی ہوتی ہیں۔اور ہر روز نئی نئی باتیں اپنے کاروبار کے متعلق ایجاد کرتے ہیں۔یُورپ اور نئی دُنیا کو دیکھو کہ یہ لوگ کس قدر دماغی قوتوں سے کام لیتے ہیں اور کس قدر آئے دن نئی ایجادیں کرتے ہیں۔قلب کا کام جب ہوتا ہے۔جب انسان خُدا کا بنتا ہے۔اس وقت اندر کی ساری طاقتیں اور ریاستیں معدُوم ہو کر قلب کی سلطنت ایک اقتدار اور قوّت حاصل کرتی ہے۔تب اِنسان کامل انسان کہلاتا ہے۔یہ وُہی وقت ہوتا ہے۔جبکہ وہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ[1] کا مِصداق ہوتا ہے اور ملائکہ تک اُسے سجدہ کرتے ہیں۔اُس وقت وُہ ایک نیا انسان ہوتا ہے۔اُس کی رُوح پُوری لذّت اور سرُور سے سرشار ہوتی ہے۔یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔کہ یہ لذّت ایسی لذّت نہیں جیسا کہ ایک ناعاقبت اندیش بدکار زِنا کرنے میں پاتا ہے۔یا خُوش الحانی کا شائق سرود اور خوش گلو کے گانے میں پاتا ہے۔نہیں بلکہ اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔رُوح کی لذّت اُس وقت ملتی ہے جب انسان گداز ہو کر پانی کی طرح بہنا شروع ہوتا ہے اور خوف خشیت سے بہہ نکلتا ہے۔اس مقام پر وہ کلمہ بنتا ہے اور اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ[2] کا مفہوم اُس میں کام کرنے لگتا ہے۔لوگوں نے کَلِمَةُ اللّٰه کے لفظ پر جو مَسِیح کی نسبت آیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اور مسیح کی کوئی خصوصیت سمجھی ہے۔حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے ہر انسان جب نفسانی ظُلمتوں اور گندگیوں اور تیرگیوں سے نکل آتا ہے۔اس وقت وُہ کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔

رُوح کی حقیقت

یاد رکھو۔انسان کلمۃ اللہ ہے۔کیونکہ اس کے اندر رُوح ہے۔جس کا نام قرآن شریف میں اَمرِ رَبّی رکھا گیا ہے۔لیکن انسان نادانی اور ناواقفی سے رُوح کی کچھ قدر نہ کرنے کے

[1] الحجر: ۳۰ [2] یٰسٓ: ۸۳

باعث اُس کو انواع و اقسام کی سلاسل اور زنجیروں میں مقید کر دیتا ہے اور اُس کی روشنی اور صفائی کو خطرناک تاریکیوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے اندھا اور سیاہ کر دیتا ہے۔ اور اُسے ایسا دھندلا بناتا ہے۔ کہ پتہ بھی نہیں لگتا۔ لیکن جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی ناپاک اور تاریک زندگی کی چادر اُتار دیتا ہے۔ تو قلب منوّر ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اصل مبدء کی طرف شروع ہوتا ہے۔ یہانتک کہ تقویٰ کے انتہائی درجہ پر پہنچ کر سارا میل کچیل اُتر کر پھر وہ کلمۃ اللہ ہی رہ جاتا ہے۔ یہ ایک باریک علم اور معرفت کا نکتہ ہے۔ ہر شخص اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

انسان کا کمال کیا ہے؟

انسان کا کمال یہ ہے کہ اُس میں حقیقی معرفت اور سچی فراست جو ایمانی فراست کہلاتی ہے (جس کے ساتھ اللہ کا ایک نورِ مُخبر ہوتا ہے جو اُس کی ہر راہ میں رہنمائی کرتا ہے) پیدا ہو۔ بدوں اس کے انسان دھوکے سے بچ نہیں سکتا۔ اور رسم و عادت کے طور پر کبھی کبھی نہیں بلکہ بسا اوقات سمِّ قاتل پر بھی خوش ہو جاتا ہے۔ پنجاب و ہندوستان کے سجادہ نشین اور گدیوں کے پیرزادے قوالوں کے گانے سے اور ہُو حق کے نعرے مارنے اور اُلٹے سیدھے لٹکنے ہی میں اپنی معرفت اور کمال کا انتہا جانتے ہیں۔ اور ناواقف پیرپرست ان باتوں کو دیکھ کر اپنی رُوح کی تسلّی اور اطمینان ان لوگوں کے پاس تلاش کرتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھو کہ یہ لوگ اگر فریب نہیں دیتے تو اس میں شک نہیں ہے۔ کہ فریب خوردہ ضرور ہیں۔ کیونکہ وہ سچا رشتہ جو عبودیّت اور الوہیّت کے درمیان ہے جس کے حقیقی پیوند سے ایک نُور اور روشنی نکلتی ہے اور ایسی لذّت پیدا ہوتی ہے۔ کہ دوسری کوئی لذّت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اُس کو ان قلابازیوں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ ہم نہایت نیک نیتی کے ساتھ اور اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے کہ ہماری نیت کیسی ہے۔ پُوچھتے ہیں۔ کہ اگر اس قسم کے مشغلے عبادتِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اور انسانی رُوح کے کمال کا باعث بن

سکتے ہیں تو پھر بازیگروں کو معرفت کی معراج پر پہنچا ہوا سمجھنا چاہیئے۔ اور انگریزوں نے تو اِن کھیلوں اور کرتبوں میں اَور بھی حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور باوجود ان ترقیوں کے اُن کی معرفت خدا کی نسبت یا تو یہ ہے کہ وہ سِرے سے ہی مُنکر اور دہریہ ہیں۔ اور اگر اقرار بھی کیا ہے تو یہ کہ ایک ناتوان بیکس انسان کو جو ایک عورت مریمؑ کے پیٹ سے پَیدا ہوا۔ خدا بنا لیا۔ اور ایک خدا کو چھوڑ کر تین خداؤں کے قائل ہوئے۔ جن میں سے ایک کو ملعون اور ہاویہ میں تین دن رہنے والا تجویز کیا۔ اب اے دانشمندو! سوچو، اور اے سلیم فطرت والو! غور کرو۔ کہ اگر اس اُلٹا سیدھا لٹکنے اور طبلہ اور سارنگی ہی کے ذریعہ خدا کی معرفت اور انسانی کمال حاصل ہو سکتا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس فن میں ماہر اور مُوجد انگریزوں کو جو قسم قسم کے باجے اور گانے کے سامان نکالتے ہیں ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ خدا کے بالکل منکر یا تثلیث کے قائل ہو گئے۔ باوجودیکہ دُنیوی امور میں ایجادات اور اختراعات میں اُن کی عقلیں ترقی پذیر سمجھی جاتی ہیں۔ پھر اس پر اَور بھی غور کرو اور سوچو کہ اگر یہی معرفت کا ذریعہ تھا تو تھیئٹروں میں ناچنے والے اور اچھا ناچنے گانے والے سب اعلےٰ درجے کے صاحبدل اور صاحبِ کمال ماننے پڑیں گے۔ افسوس اِن لوگوں کو خبر ہی نہیں کہ خدا کی معرفت ہوتی کیا ہے؟ اور انسانی کمال نام کس کا ہے؟ وُہ شیطانی حصّہ کی شناخت نہیں کر سکے۔ انہوں نے صرف چند قطرے آنسوؤں کے بہا لینا اور دو تین چیخیں مار دینا ہی رُوح کی تسلی اور اطمینان کا مُوجب سمجھ رکھا ہے۔ بسا اوقات انسان ناول پڑھتا ہے۔ جب اُس کے کسی دردناک حِصّہ پر پہنچتا ہے باوصفیکہ جانتا ہے کہ یہ ایک فرضی کہانی اور جھُوٹا قصہ ہے۔ لیکن پھر بھی وُہ ضبط نہیں کر سکتا اور بعض دفعہ چیخیں مار مار کر رو پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض رونا اور چلاّنا بھی اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میں نے سُنا ہے کہ ملوک چغتائیہ کے عہدِ سلطنت میں بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جو شرط لگا کر یقیناً رُلا دیتے تھے اور ہنسا دیتے تھے اور اب تو صریح یہ بات موجود ہے کہ طرح طرح کے ناول

موجود ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ انکو پڑھکر دل بے اختیار ہو کر دردمند ہو جاتا ہے حالانکہ انکو یقیناً بناوٹی قصّے اور فرضی کہانیاں جانتے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ انسان دھوکا کھاتا ہے۔ اور یہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب انسان نفسانی اغراض اور رُوحانی مطالب میں تمیز نہیں کرتا۔ جس قدر لوگ دُنیا میں ہیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو علاماتِ حقیقیہ سے بے نصیب ہیں۔ اُن کے مُنہ سے معارف اور حقایق نہیں نکلتے، پھر رُلا دیتے ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے۔ کہ وہ حقایق اور معارف سے بہرہ ور ہیں۔ جو عبودیت کے رنگ سے رنگین ہو کر الوہیت کے عظمت و جلال سے خائف اور ترساں ہو کر بولتے ہیں۔ بلکہ اس کی تہہ میں وُہی بات ہوتی ہے جو میں نے ابھی ناولوں اور کہانیوں کے متعلق بیان کی ہے۔ وہ خود بھی نفس کی ہَوا میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور یُوں رونا کچھ فائدہ نہیں رکھتا۔

خدا کے حضور اس کی خشیت سے متاثر ہو کر رونا دوزخ کو حرام کر دیتا ہے

ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور اس کی خشیت کا غلبہ دِل پر ہو۔ اور اس میں ایک رقّت اور گدازش پیدا ہو کر خدا کے لئے ایک قطرہ بھی آنکھ سے نکلے۔ تو وُہ یقیناً دوزخ کو حرام کر دیتا ہے۔ پس انسان اِس سے دھوکہ نہ کھائے کہ میں بہت روتا ہوں۔ اس کا فائدہ بجز اس کے اَور کچھ نہیں کہ آنکھ دُکھنے آجائے گی۔ اور یُوں امراض چشم میں مبتلا ہو جائیگا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کے حضور اس کی خشیت سے متاثر ہو کر رونا دوزخ کو حرام کر دیتا ہے۔ لیکن یہ گریہ و بکا نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ خدا کو خدا اور اس کے رسول کو رسول نہ سمجھے اور اس کی سچی کتاب پر اطلاع نہ ہو نہ صرف اطلاع بلکہ ایمان۔

طبیب جیسے ایک مریض کو جُلاب دیتا ہے اور اس کو ہلکے ہلکے دست آتے ہیں وُہ مرض کو ضائع نہیں کرتے۔ جبتک جگری دست نہ آویں۔ جو اپنے ساتھ تمام مواد ردّیہ اور فاسدہ کو

لے کر نکلتے ہیں اور ہر قسم کی عفونتیں اور زہریں جنہوں نے مریض کو اندر ہی اندر مضمحل اور مضطرب کر رکھا تھا۔ اُن کے ساتھ نکل جاتی ہیں۔ تب اُس کو شفا ہوتی ہے۔ اسی طرح پر جگری گریہ و بکا آستانہ الوہیت پر ہر ایک قسم کی نفسانی گندگیوں اور مُفسد مواد کو لے کر نکل جاتا ہے۔ اور اُس کو پاک وصاف بنا دیتا ہے۔ اہل اللہ کا ایک آنسو جو توبۃ النصوح کے وقت نکلتا ہے۔ ہوا و ہوس کے بندے اور ریاکار اور ظلمتوں کے گرفتار کے ایک دریا بہا دینے سے افضل اور اعلیٰ ہے کیونکہ وُہ خدا کے لئے ہے۔ اور یہ خلق کے لئے یا اپنے نفس کے واسطے ۔

اِس بات کو کبھی اپنے دِل سے محو نہ کرو۔ کہ خدا تعالیٰ کے حضور اخلاص اور راستبازی کی قدر ہے۔ تکلّف اور بناوٹ اُس کے حضور کچھ کام نہیں دے سکتی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصُول کے ذرائع

اب اگر یہ سوال ہو کہ پھر اِس درجہ کے حصُول کے لئے کیا کیا جائے اور قرآن کریم نے اس درجہ پر پہنچنے کا کیا ذریعہ بتایا ہے ؛ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کیلئے دو باتیں بطور اصُول کے رکھی ہیں۔ اوّل یہ کہ **دُعا کرو**۔ یہ سچی بات ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا[1]۔ انسان کمزور مخلوق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم کے بدُوں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کا وجُود اور اس کی پرورش اور بقار کے سامان سب کے سب اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہیں۔ احمق ہے وُہ انسان جو اپنی عقل و دانش یا اپنے مال و دولت پر ناز کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ وُہ کہاں سے لایا۔ اور دُعا کے لئے یہ ضروری بات ہے کہ انسان اپنے ضعف اور کمزوری کا پورا خیال اور تصور کرے جُوں جُوں وہ اپنی کمزوری پر غور کریگا۔ اسی قدر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج پائے گا۔ اور اس طرح پر دُعا کے لئے اس کے اندر ایک جوش پیدا ہوگا۔ جیسے انسان جب مصیبت میں مُبتلا ہوتا ہے۔ اور دُکھ یا تنگی محسوس کرتا ہے۔ تو بڑے زور کے ساتھ

[1] النساء : ۲۹

پکارتا اور چلّاتا ہے اور دوسرے سے مدد مانگتا ہے۔ اسی طرح اگر وُہ اپنی کمزوریوں اور لغزشوں پر غور کریگا۔ اور اپنے آپ کو ہر آن اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج پائیگا۔ تو اُس کی رُوح پُورے جوش اور درد سے بیقرار ہو کر آستانۂ اُلوہیت پر گرِیگی اور چلّائے گی۔ اور یارب یارب کہہ کر پکارے گی۔ غور سے قرآن کریم کو دیکھو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ پہلی ہی سورت میں اللہ تعالیٰ نے دُعا کی تعلیم دی ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ[1]

دُعا تب ہی جامع ہو سکتی ہے کہ وُہ تمام منافع اور مفاد کو اپنے اندر رکھتی ہو اور تمام نقصانوں اور مُضرتوں سے بچاتی ہو۔ پس اس دُعا میں تمام بہترین منافع جو ہو سکتے ہیں اور ممکن ہیں وہ اِس دُعا میں مطلوب ہیں۔ اور بڑی سے بڑی نقصان رساں چیز جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اُس سے بچنے کی دُعا ہے۔

مُنعَم علیہ گروہ کی چار اقسام

میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ مُنعَم علیہ چار قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل نبی۔ دوم صدیق۔ سوم شہید۔ چہارم صالحین۔

نبی

پس اس دُعا میں گویا ان چاروں گروہوں کے کمالات کی طلب ہے۔ نبیوں کا عظیم الشان کمال یہ ہے کہ وہ خُدا سے خبریں پاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[2] الآیہ یعنی خدا تعالےٰ کے غیب کی باتیں کسی دوسرے پر ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہاں اپنے نبیوں میں سے جس کو وُہ پسند کرے۔ جو لوگ نبوت کے کمالات سے حصّہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔ اور یہ بہت بڑا عظیم الشان نشان خدا کے مامور اور مُرسلوں کا ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مُعجزہ نہیں۔ پیشگوئی بہت بڑا مُعجزہ ہے۔

[1] الفاتحہ: ۶ - ۷ [2] الجن: ۲۷ تا ۲۸

تمام کتب سابقہ اور قرآن کریم سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ پیشگوئی سے بڑھ کر کوئی نشان نہیں ہوتا۔ نادان اور بداندیش مخالفوں نے اس علم پر کبھی غور نہیں کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر اعتراض کیا ہے۔ مگر افسوس ہے ان آنکھ بند کرکے اعتراض کرنے والوں کو یہ معلوم نہ ہوا۔ کہ جس قدر معجزات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے ہیں۔ دنیا میں کل نبیوں کے معجزات کو بھی اگر ان کے مقابلہ میں رکھیں۔ تو میں ایمان سے کہتا ہوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بڑھ کر ثابت ہونگے قطع نظر اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے اور قیامت تک اور اس کے بعد تک کی پیشگوئیاں اس میں موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اُن **پیشگوئیوں کا زندہ ثبوت دینے والا موجود ہوتا ہے۔** چنانچہ اس زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے **مجھے بطور نشان کھڑا کیا اور پیشگوئیوں کا ایک عظیم الشان نشان مجھے دیا۔** تا میں اُن لوگوں کو جو حقایق سے بے بہرہ اور معرفت الٰہی سے بے نصیب ہیں۔ روز روشن کی طرح دکھا دوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات کیسے مستقل اور دائمی ہیں ۰

زندہ رسول ابدالآباد کیلئے صرف محمد رسول اللہؐ ہی ہیں

کیا بنی اسرائیل کے بقیہ یہود یا حضرت مسیح علیہ السلام کو خداوند خداوند پکارنے والے عیسائیوں میں کوئی ہے جو ان نشانات میں میرا مقابلہ کرے میں پکار کر کہتا ہوں کہ کوئی بھی نہیں۔ ایک بھی نہیں۔ پھر یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداری معجزہ نمائی کی **قوت** کا ثبوت ہے۔ کیونکہ یہ مسلم مسئلہ ہے کہ نبی متبوع کے معجزات ہی وہ معجزات کہلاتے ہیں۔ جو اس کے کسی متبع کے ہاتھ پر سرزد ہوں۔ پس جو نشانات خوارق عادات مجھے دیئے گئے ہیں۔ جو پیشگوئیوں کا عظیم الشان نشان

مجھے عطا ہوا ہے یہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ معجزات ہیں۔ اور کسی دوسرے نبی کے متبع کو یہ آج فخر نہیں ہے کہ وہ اس طرح پر دعوت کرکے ظاہر کر دے کہ وہ بھی اپنے اندر اپنے ہی متبوع کی قدسی قوت کیوجہ سے خوارق دکھا سکتا ہے۔ یہ فخر صرف اسلام کو ہے۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ رسول ابدالآباد کیلئے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں جن کے انفاس طیبہ اور قوت قدسیہ کے طفیل سے ہر زمانہ میں ایک مردِ خدا خدا نمائی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

غرض بات تو یہ تھی کہ اسی دعا میں نبیوں کے کمالات سے حصہ لینے کی بھی دعا ہے کیونکہ منعم علیہ گروہ میں سب کا سردار انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہے اور اس کے کمالات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُن پر غیب کی باتیں جن کو پیش گوئیاں بھی کہتے ہیں۔ ظاہر کیجاتی ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ اس دعا میں درحقیقت پیشگوئیاں مانگنے کی دعا نہیں ہے۔ بلکہ اس مرتبہ کے حصول کی ہی دعا ہے جہاں پہنچکر پیشگوئی کرتا ہے۔ پیشگوئی کا مقام اللہ تعالےٰ کے اعلےٰ درجہ کے قرب کے بدوں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں وہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى[1] کا مصداق ہوتا ہے اور یہ درجہ تب ملتا ہے جب دَنَا فَتَدَلّٰى[2] کے مقام پر پہنچے۔ جبتک ظلّی طور پر اپنی انسانیت کی چادر کو پھینک کر الوہیت کی چادر کے نیچے اپنے آپ کو نہ چھپائے۔ یہ مقام اسے کب مل سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بعض سلوک کی منزلوں سے ناواقف صوفیوں نے آکر ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے آپ کو وہ خدا سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور اُن کی اس ٹھوکر سے ایک خطرناک غلطی پھیلی ہے جس نے بہتوں کو ہلاک کر ڈالا۔ اور وہ وحدت وجود کا مسئلہ ہے۔ جس کی حقیقت سے یہ لوگ ناواقف محض ہوتے ہیں۔

میرا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى[3] کے درجہ پر جبتک انسان نہ پہنچے۔ اس وقت تک اُسے پیشگوئی کی قوت نہیں مل سکتی۔

[1] النجم: ۴ [2] النجم: ۹ [3] النجم: ۴

اور یہ درجہ اُس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ انسان قربِ الٰہی حاصل کرے۔ قربِ الٰہی کے لئے یہ ضروری بات ہے۔ کہ تخلّقوا باخلاق اللہ پر عمل ہو۔ کیونکہ جبتک اللہ تعالیٰ کی صفات کو ملحُوظ خاطر رکھ کر اُن کی عزّت نہ کریگا اور اُن کا پرتَو اپنی حالت اور اخلاق سے نہ دکھائے۔ وہ خُدا کے حضور کیونکر جا سکتا ہے۔ مثلاً خُدا کی ایک صفت قُدّوُس ہے۔ پھر ایک ناپاک، غلیظ، ہر قسم کے فِسق و فجُور کی ناپاکی میں مُبتلا انسان اللہ تعالےٰ کے حضور کیونکر جا سکتا ہے اور وُہ خدا تعالیٰ سے تعلّق کیونکر پَیدا کر سکتا ہے ۔

غرض اس دُعا میں اوّل منعم علیہ گروہ کے کمالِ مراتب کے حصول کی دُعا ہے۔ پس جبتک انسان اپنے اندرُونی سِلسلہ خیالات کو چھوڑ کر اَنَا الموجُود کی آواز نہ سُنے دُعاؤں میں لگا رہے۔ یہ کمالِ تام کا درجہ ہوتا ہے ۔

صدّیق

پھر دوسرا مرتبہ صدّیق کا ہے۔ صدق کامل اُس وقت تک جذب نہیں ہوتا جب تک توبۃ النّصُوح کے ساتھ صِدق کو نہ کھینچے۔ قرآن کریم تمام صداقتوں کا مجموعہ اور صدق تام ہے جبتک خود صادق نہ بنے۔ صِدق کے کمال اور مراتب سے کیونکر واقِف ہو سکتا ہے ۔

صدّیق کے مرتبہ پر قرآن کریم کی معرفت اور اُس سے محبّت اور اس کے نکات وحقایق پر اطلاع ملتی ہے۔ کیونکہ کِذب کِذب کو کھینچتا ہے۔ اِس لئے کبھی بھی کاذب قرآنی معارف اور حقایق سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ[1] فرمایا گیا ہے ۔

شہید

پھر تیسرا مرتبہ شہید کا ہے۔ عام لوگوں نے شہید کے معنی صرف یہی سمجھ رکھے ہیں کہ جو شخص لڑائی میں مارا گیا یا دریا میں ڈوب گیا یا وباء میں مر گیا وغیرہ۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اسی پر اکتفاء کرنا اور اسی حد تک اس کو محدُود رکھنا مومن کی شان سے بعید ہے۔ شہید اصل میں

[1] الواقعہ : ۸۰

وہ شخص ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ سے استقامت اور سکینت کی قوّت پاتا ہے۔ اور کوئی زلزلہ اور حادثہ اس کو متغیر نہیں کر سکتا۔ وُہ مصیبتوں اور مشکلات میں سینہ سپر رہتا ہے یہانتک کہ اگر محض خدا تعالیٰ کے لئے اُس کو جان بھی دینی پڑے تو فوق العادت استقلال اُس کو ملتا ہے اور وہ بدُوں کسی قسم کا رنج یا حسرت محسوس کئے اپنا سر رکھ دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ بار بار مجھے زندگی ملے اور بار بار اس کو اللہ کی راہ میں دُوں۔ ایک ایسی لذّت اور سرور اس کی رُوح میں ہوتا ہے کہ ہر تلوار جو اُس کے بدن پر پڑتی ہے اور ہر ضرب جو اس کو پیس ڈالے اُس کو پہنچتی ہے۔ وہ اُس کو ایک نئی زندگی، نئی مسرّت اور تازگی عطا کرتی ہے۔ یہ ہیں شہید کے معنی ؛

پھر یہ لفظ شہد سے بھی نکلا ہے۔ عبادت شاقّہ جو لوگ برداشت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں ہر ایک تلخی اور کدُورت کو جھیلتے ہیں اور جھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ شہد کی طرح ایک شیرینی اور حلاوت پاتے ہیں۔ اور جیسے شہد فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ[1] کا مِصداق ہے۔ یہ لوگ بھی ایک تریاق ہوتے ہیں۔ اُن کی صُحبت میں آنے والے بہت سے امراض سے نجات پا جاتے ہیں ؛

اور پھر شہید اس درجہ اور مقام کا نام بھی ہے جہاں انسان اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے یا کم از کم خدا کو دیکھتا ہُوا یقین کرتا ہے۔ اس کا نام احسان بھی ہے ؛

صَالِحِیْن

چوتھا درجہ صالحین کا ہے۔ جن کو مواد ردّیہ سے صاف کر دیا گیا ہے۔ اور اُن کے قلوب صاف ہو گئے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک مواد ردّیہ دُور نہ ہوں اور سُوءِ مزاج رہے تو مزہ زبان تک کا بھی بگڑ جاتا ہے، تلخ معلوم دیتا ہے۔ اور جب بدن میں پُوری صلاحیّت اور اصلاح ہو اس وقت ہر ایک شئے کا اصل مزہ معلوم ہوتا ہے۔ اور طبیعت میں ایک قسم کی لذّت اور سرور اور چُستی اور چالاکی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح پر جب انسان

[1] النحل : ۷۰

گُناہ کی ناپاکی میں مُبتلا ہوتا ہے۔ اور رُوح کا قوام بگڑ جاتا ہے تو رُوحانی قوتیں کمزور ہونی شروع ہو جاتی ہیں یہانتک کہ عبادات میں مزہ نہیں رہتا۔ طبیعت میں ایک گھبراہٹ اور پریشانی پائی جاتی ہے۔ لیکن جب مواد ردّیہ جو گُناہ کی زندگی سے پیدا ہوئے تھے۔ توبۃ النّصوح کے ذریعہ خارج ہونے لگیں تو رُوح میں وُہ اضطراب اور بیچینی کم ہونے لگتی ہے۔ یہانتک کہ آخر ایک سکُون اور تسلّی ملتی ہے۔ پہلے جو گناہ کیطرف قدم اٹھانے میں راحت محسوس ہوتی تھی اور پھر اُسی فعل میں جو نفس کی خواہش کا نتیجہ ہوتا تھا اور جُھکنے میں خوشی ملتی تھی۔ اب اس طرف جُھکتے ہوئے دُکھ اور رنج معلوم ہوتا ہے۔ رُوح پر ایک لرزہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس تاریک زندگی کا وہم یا تصور بھی آجائے اور پھر عبادات میں ایک لُطف، ذوق، جوش اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ رُوحانی قویٰ جو گناہ آمیز زندگی سے مُردہ ہو چکے تھے۔ اُن کا نشو و نما شروع ہوتا ہے اور اخلاقی طاقتیں اپنا ظہور کرتی ہیں۔

یہ چار چیزیں ہیں۔ جن کے لئے ہر انسان دُنیا میں مامُور کیا گیا ہے اور اس کے حصُول کے لئے دُعا ہی ایک زبردست ذریعہ ہے اور ہم کو موقع دیا گیا ہے کہ پانچ وقت اُن مراتب کو مانگیں۔ لیکن یہاں ایک اَور مشکل ہے کہ اگرچہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] فرمایا اور کہا گیا ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[2]

اگر خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء کا لحاظ نہ کیا جائے اور دُعا کی جائے تو وُہ کچھ بھی اثر نہیں رکھتی

اور قرآن شریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعاؤں کو سُنتا ہے اور وُہ بہت ہی قریب ہے۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء کا لحاظ نہ کیا جائے اور دُعا کی جائے تو وُہ کچھ بھی اثر نہیں رکھتی۔ صرف اِس ایک راز کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ معلوم نہ کرنے کی وجہ سے دُنیا ہلاک ہو رہی ہے۔ میں نے بہت لوگوں کو

[1] المومن: ۶۱ [2] البقرۃ: ۱۸۷

کہتے سُنا ہے کہ ہم نے بہت دعائیں کیں اور ان کا نتیجہ کچھ نہیں ہوا۔ اور اس نتیجہ نے اُن کو دہریہ بنا دیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہر امر کے لئے کچھ قواعد اور قوانین ہوتے ہیں۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایسا ہی دعا کے واسطے قواعد و قوانین مقرر ہیں یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی اس کا باعث یہی ہے کہ وہ ان قواعد اور مراتب کا لحاظ نہیں رکھتے جو قبولیت دعا کیواسطے ضروری ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب ایک لانظیر اور بیش بہا خزانہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور ہم میں سے ہر ایک اس کو پاسکتا ہے اور لے سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کبھی بھی جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو قادر خدامان کر یہ تجویز کریں کہ جو کچھ اس نے ہمارے سامنے رکھا ہے اور جو ہمیں دکھایا ہے یہ محض سراب اور دھوکا ہے۔ ایسا وہم بھی انسان کو ہلاک کر سکتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ ہر ایک اس خزانہ کو لے سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر ایک کو یہ خزانے دے سکتا ہے پھر بھی اس میں کمی نہیں آسکتی۔

غرض وہ تو ہم کو نبوت کے کمالات تک دینے کو تیار ہے۔ لیکن ہم اس کے لینے کی بھی سعی کریں۔ پس یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ اور دھوکا ہے جو اس پیرایہ میں دیا جاتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ اصل یہی ہے کہ وہ دعا قبولیت کے آداب اور اسباب سے خالی محض ہے۔ پھر آسمان کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے۔ سُنو! قرآن شریف نے کیا کہا ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ[1]۔ اللہ تعالیٰ متقیوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ جو لوگ متقی نہیں ہیں۔ ان کی دعائیں قبولیت کے لباس سے ننگی ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمانیت ان لوگوں کی پرورش میں اپنا کام کر رہی ہے۔

متقیوں کی بعض دعاؤں کا اُن کی حسب منشا پورا نہ ہونے کیوجہ

دعاؤں کی قبولیت کا فیض ان لوگوں کو ملتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ اب مَیں بتاؤں گا کہ متقی کون ہوتے ہیں۔ مگر ابھی میں ایک اَور شُبہ کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا

[1] المآئدۃ : ۲۸

ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ جو متقی ہوتے ہیں۔ بظاہر اُن کی بعض دُعائیں اُن کے حسب منشا پُوری نہیں ہوتی ہیں یہ کیوں ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُن لوگوں کی کوئی بھی دُعا درحقیقت ضائع نہیں جاتی۔ لیکن چونکہ انسان عالم الغیب نہیں ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس دُعا کے نتائج اُس کے حق میں کیا اثر پیدا کرنے والے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کمال شفقت اور مہربانی سے اس دُعا کو اپنے بندہ کے لئے اُس صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔ جو اُس کے واسطے مفید اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ جیسے ایک نادان بچہ سانپ کو ایک خوبصورت اور نرم شے سمجھ کر پکڑنے کی جُرأت کرے یا آگ کو روشن دیکھ کر اپنی ماں سے مانگ بیٹھے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ وُہ ماں خواہ وُہ کیسی ہی نادان سے نادان بھی کیوں نہ ہو۔ کبھی پسند کریگی کہ اُس کا بچّہ سانپ کو پکڑے یا اپنی خواہش کے موافق آگ کا ایک روشن کوئلہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وُہ جانتی ہے کہ یہ اُس کی زندگی کو گزند پہنچائے گا۔ پس اللہ تعالےٰ جو عالِم الغیب اور عالِم الکُل ہے اور مہربان ماں سے بھی زیادہ رحیم کریم ہے اور ماں کے دل میں بھی یہ رافت اور محبّت اُسی نے ڈالی ہے وہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اگر اُس کا عزیز بندہ اپنی کمزوری اور غلطی اور ناواقفی کی وجہ سے کسی ایسی چیز کے لئے دُعا کر بیٹھے جو اُس کے حق میں مضرت بخش ہے تو وہ اُس کو فی الفور منظور کر لے نہیں بلکہ وہ اس کو رَدّ کر دیتا ہے اور اس کے بجائے اس سے بھی بہتر اُس کو عطا کرتا ہے اور وہ یقیناً سمجھ لیتا ہے کہ یہ میری فلاں دُعا کا اثر اور نتیجہ ہے۔ اپنی غلطی پر بھی اس کو اطلاع ملتی ہے۔ غرض یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ متقیوں کی بھی بعض دُعا قبول نہیں ہوتی۔ نہیں اُن کی تو ہر دُعا قبول ہوتی ہے۔ ہاں اگر وُہ اپنی کمزوری اور نادانی کی وجہ سے کوئی ایسی دُعا کر بیٹھیں جو اُن کے لئے عُمدہ نتائج پیدا کرنے والی نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس دُعا کے بدلہ میں اُن کو وُہ چیز عطا کرتا ہے۔ جو اُن کی شَے مطلوبہ کا نعم البدل ہوء

اب اس کے بعد پھر میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ مُتقی کون

ہوتے ہیں ؟

متقی کون ہوتے ہیں؟

درحقیقت متقیوں کے واسطے بڑے بڑے وعدے ہیں اور اس سے بڑھکر کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ولی ہوتا ہے۔ جھوٹے ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ ہم مقربِ بارگاہِ الٰہی ہیں اور پھر متقی نہیں ہیں بلکہ فسق و فجور کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ایک ظلم اور غضب کرتے ہیں جبکہ وُہ **ولایت** اور قربِ الٰہی کے درجہ کو اپنے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ متقی ہونے کی شرط لگادی ہے ؛

پھر ایک اور شرط لگاتا ہے۔ یا یہ کہو متقیوں کا ایک نشان بتاتا ہے ۔اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا[۱]۔ خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اُن کی نصرت کرتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیّت کا ثبوت اس کی نصرت ہی سے ملتا ہے۔ پہلا دروازہ ولایت کا ویسے بند ہُوا۔ اب دوسرا دروازہ معیّت اور نصرتِ الٰہی کا اس طرح پر بند ہُوا۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نصرت کبھی بھی ناپاکوں اور فاسقوں کو نہیں مل سکتی۔ اس کا انحصار تقویٰ ہی پر ہے خدا کی اعانت متقی ہی کے لئے ہے۔ پھر ایک اَور راہ ہے کہ انسان مشکلات اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور حاجات مختلف رکھتا ہے۔ اُن کے حل اور روا ہونے کے لئے بھی تقویٰ ہی کو اصول قرار دیا ہے۔ معاش کی تنگی اور دوسری تنگیوں سے راہ نجات تقویٰ ہی ہے۔ فرمایا۔ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ[۲]۔ خدا متقی کے لئے ہر مشکل میں ایک مخرج پیدا کر دیتا ہے۔ اور اُس کو غیب سے اُس سے مخلصی پانے کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ اُس کو ایسے طور سے رزق دیتا ہے کہ اُس کو پتہ بھی نہ لگے ؛

اب غور کرکے دیکھ لو کہ انسان اس دُنیا میں چاہتا کیا ہے۔ انسان کی بڑی سے بڑی خواہش دنیا میں یہی ہے کہ اس کو سُکھ اور آرام ملے۔ اور اُس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ مقرر کی ہے جو تقویٰ کی راہ کہلاتی ہے اور دوسرے لفظوں میں اُس کو قرآن کریم کی راہ کہتے ہیں۔

[۱] النحل : ۱۲۹ [۲] الطلاق : ۳، ۴

اور یا اُس کا نام صِرَاطِ مُسْتَقِيْم رکھتے ہیں ؎

کوئی یہ نہ کہے کہ کفار کے پاس بھی مال و دولت اور املاک ہوتے ہیں اور وُہ اپنی عیش و عشرت میں منہمک اور مست رہتے ہیں۔ میں نہیں سچ کہتا ہوں کہ وُہ دنیا کی آنکھ میں بلکہ ذلیل دنیا داروں اور ظاہر پرستوں کی آنکھ میں خوش معلوم دیتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ ایک جلن اور دُکھ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تم نے اُن کی صورت کو دیکھا ہے مگر میں ایسے لوگوں کے قلب پر نگاہ کرتا ہوں۔ وہ ایک سعیر اور سلاسل و اغلال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جیسے فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا۔[1] وہ نیکی کی طرف آ ہی نہیں سکتے۔ وہ ایسے اغلال ہیں کہ خدا کی طرف اُن اغلال کی وجہ سے ایسے دبے پڑے ہیں کہ حیوانوں اور بہائم سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھ ہر وقت دُنیا ہی کی طرف لگی رہتی ہے اور زمین کی طرف جُھکتے جاتے ہیں۔ پھر اندر ہی اندر ایک سوزش اور جلن بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر مال میں کمی ہو جائے یا حسبِ مراد تدبیر میں کامیابی نہ ہو تو کُڑھتے اور جلتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات سودائی اور پاگل ہو جاتے ہیں یا عدالتوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ واقعی بات ہے کہ بیدین آدمی سعیر سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کو قرار اور سکون نصیب نہیں ہوتا۔ جو راحت اور تسلی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسے شرابی ایک جام شراب پی کر ایک اَور مانگتا ہے۔ اور مانگتا ہی جاتا ہے اور ایک جلن سی لگی رہتی ہے۔ ایسا ہی دنیا دار بھی سعیر میں ہے۔ اس کی آتشِ آز ایک دم بھی بجھ نہیں سکتی۔ سچی خوشحالی حقیقت میں ایک متقی ہی کے لئے ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کے لئے دو جنت ہیں ؎

حقیقی راحت اور لذّت کا مدار تقویٰ پر ہے

متقی سچی خوش حالی ایک جھونپڑی میں پا سکتا ہے جو دُنیا دار اور حرص و آز کے پرستار کو رفیع الشان قصر میں بھی نہیں مل سکتی۔ جس قدر دنیا زیادہ ملتی ہے۔ اسی قدر بلائیں زیادہ سامنے آجاتی ہیں۔ پس یاد رکھو کہ حقیقی راحت اور لذّت دنیا دار کے حصہ میں

[1] الدھر: ۵

نہیں آئی۔ یہ مت سمجھو کہ مال کی کثرت عمدہ عمدہ لباس اور کھانے کسی خوشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کا مدار ہی تقویٰ پر ہے ۔

جبکہ اِن ساری باتوں سے معلوم ہوگیا کہ سچّے تقویٰ کے بغیر کوئی راحت اور خوشی مِل ہی نہیں سکتی تو معلوم کرنا چاہیئے کہ تقویٰ کے بہت سے شعبے ہیں جو عنکبوت کے تاروں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ تقویٰ تمام جوارح انسانی اور عقائد زبان اخلاق وغیرہ سے متعلق ہے۔ نازک ترین معاملہ زبان سے ہے۔ بسا اوقات تقویٰ کو دُور کرکے ایک بات کہتا ہے اور دل میں خوش ہو جاتا ہے کہ میں نے یُوں کہا اور ایسا کہا۔ حالانکہ وہ بات بُری ہوتی ہے۔ مجھے اِس پر ایک نقل یاد آئی ہے کہ ایک بزرگ کی کسی دُنیادار نے دعوت کی۔ جب وُہ بزرگ کھانا کھانے کے لئے تشریف لے گئے تو اس متکبّر دنیادار نے اپنے نوکر کو کہا کہ فلاں تھال لانا جو ہم پہلے حج میں لائے تھے۔ اور پھر کہا دوسرا تھال بھی لانا جو دوسرے حج میں لائے تھے اور پھر کہا کہ تیسرے حج والا بھی لیتے آنا۔ اُس بزرگ نے فرمایا کہ تُو تو بہت ہی قابل رحم ہے۔ ان تین فقروں میں تُو نے اپنے تین ہی حجّوں کا ستیہ ناس کر دیا۔ تیرا مطلب اس سے صِرف یہ تھا کہ تو اِس امر کا اظہار کرے کہ تُو نے تین حج کئے ہیں۔ اس لئے خدا نے تعلیم دی ہے کہ زبان کو سنبھال کر رکھا جائے۔ اور بیمعنی، بیہودہ بیموقع غیرضروری باتوں سے احتراز کیا جائے ۔

دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی تعلیم دی ہے۔ اب ممکن تھا کہ انسان اپنی قوت پر بھروسہ کرلیتا اور خُدا سے دُور ہو جاتا۔ اس لئے ساتھ ہی اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تعلیم دیدی کہ یہ مت سمجھو کہ یہ عبادت جو میں کرتا ہوں اپنی قوت اور طاقت سے کرتا ہوں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی استعانت جبتک نہ ہو اور خود وُہ پاک ذات جبتک توفیق اور طاقت نہ دے۔ کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ اور پھر اِیَّاکَ اَعْبُدُ یا اِیَّاکَ اَسْتَعِیْنُ نہیں کہا۔ اس لئے کہ اُس میں نفس کے تقدّم کی بُو آتی تھی اور یہ تقویٰ کے خِلاف ہے۔

تقویٰ والا کل انسانوں کو لیتا ہے۔ زبان سے ہی انسان تقویٰ سے دُور چلا جاتا ہے۔ زبان سے تکبّر کر لیتا ہے اور زبان سے ہی فرعونی صفات آجاتی ہیں۔ اور اسی زبان کی وجہ سے پوشیدہ اعمال کو ریاکاری سے بدل لیتا ہے۔ اور زبان کا زیان بہت جلد پیدا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص ناف کے نیچے کے عُضو اور زبان کو شرّ سے بچاتا ہے اس کی بہشت کا ذمّہ دار میں ہوں۔ حرامخوری اس قدر نقصان نہیں پہنچاتی جیسے قولِ زُوْر۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حرام خوری اچھی چیز ہے۔ یہ سخت غلطی ہے۔ اگر کوئی ایسا سمجھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اضطراراً سُؤر کھالے۔ تو یہ امر دیگر ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی زبان سے خنزیر کا فتویٰ دیدے تو وُہ اسلام سے دُور نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حرام کو حلال ٹھیراتا ہے۔ غرض اس سے معلوم ہوا کہ زبان کا زیان خطرناک ہے۔ اس لئے متقی اپنی زبان کو بہت ہی قابُو میں رکھتا ہے۔ اس کے مُنہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکلتی۔ جو تقویٰ کے خلاف ہو۔ پس تم اپنی زبان پر حکومت کرو۔ نہ یہ کہ زبانیں تم پر حکومت کریں۔ اور اناپ شناپ بولتے رہو۔

ہر ایک بات کہنے سے پہلے سوچ لو کہ اُس کا نتیجہ کیا ہو گا

ہر ایک بات کہنے سے پہلے سوچ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت اُس کے کہنے میں کہاں تک ہے جبتک یہ نہ سوچ لو مت بولو۔ ایسے بولنے سے جو شرارت کا باعث اور فساد کا مُوجب ہو، نہ بولنا بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی مومن کی شان سے بعید ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں رُکے۔ اس وقت کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور خوف زبان کو نہ روکے۔ دیکھو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی نبوّت کا اعلان کیا۔ تو اپنے پرائے سب کے سب دشمن ہو گئے۔ مگر آپؐ نے ایک دَم بھر کے لئے کبھی کسی کی پَروا نہ کی۔ یہاں تک کہ جب ابُوطالب آپؐ کے چچا نے لوگوں کی شکائیتوں سے تنگ آکر کہا۔ اُس وقت بھی آپؐ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اس کے اظہار سے نہیں رُک سکتا

آپ کا اختیار ہے، میرا ساتھ دیں یا نہ دیں۔

پس زبان کو جیسے خدا تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف کسی بات کے کہنے سے روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح امرِ حق کے اظہار کے لئے کھولنا لازمی امر ہے۔ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ[۱] مومنوں کی شان ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنی عملی حالت ثابت کر دکھائے کہ وہ اس قوت کو اپنے اندر رکھتا ہے کیونکہ اس سے پیشتر کہ وہ دوسروں پر اپنا اثر ڈالے اُس کو اپنی حالت اثر انداز بھی تو بنانی ضروری ہے۔ پس یاد رکھو کہ زبان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی مت روکو۔ ہاں محل اور موقع کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اور اندازِ بیان ایسا ہونا چاہیئے جو نرم ہو اور سلاست اپنے اندر رکھتا ہو اور ایسا ہی تقویٰ کے خلاف بھی زبان کا کھولنا سخت گناہ ہے۔

قرآنی تعلیم کی علّت غائی تقویٰ ہے

پھر دیکھو کہ تقویٰ ایسی اعلیٰ درجہ کی ضروری شئے قرار دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی علّت غائی اسی کو ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ دوسری سُورۃ کو جب شروع کیا ہے۔ تو یُوں ہی فرمایا ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ[۲] میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن کریم کی یہ ترتیب بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس میں عِلَل اربعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ علت فاعلی، مادی، صوری، غائی ہر ایک چیز کے ساتھ یہ چار ہی عِلَل ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نہایت اکمل طور پر اُن کو دکھاتا ہے۔ الٓمّٓ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت جاننے والا ہے اس کلام کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے یعنی خدا اس کا فاعل ہے۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ یہ مادہ بتایا۔ یا یہ کہو کہ یہ علت مادی ہے۔ علت صُوری لَا رَیْبَ فِیْہِ ہر ایک چیز میں شک وشبہ اور ظنونِ فاسدہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی رَیب نہیں ہے۔ لاریب اسی

[۱] اٰل عمران: ۱۱۵ [۲] البقرۃ: ۲، ۳

کے لئے ہے۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی شان یہ بتائی کہ لَارَیْبَ فِیْہِ۔ تو طبعًا ہر ایک سلیم الفطرت اور سعادتمند انسان کی رُوح اچھلے گی اور خواہش کریگی۔ کہ اُس کی ہدایتوں پر عمل کرے۔ ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی اعلیٰ اور اصفیٰ شان کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔ ورنہ قرآن شریف کی خوبیاں اور اس کے کمالات اس کا حُسن اپنے اندر ایک ایسی کشش اور جذب رکھتا ہے کہ بے اختیار ہو ہو کر دل اس کی طرف چلے آئیں۔ مثلاً اگر ایک خوشنما باغ کی تعریف کی جاوے اور اُس کے خوشبودار درختوں اور دِل کو تر و تازہ کرنے والی بوٹیوں اور روشوں اور مصفّا پانی کی بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کا تذکرہ کیا جاوے۔ تو ہر ایک شخص دِل سے چاہیگا کہ اس کی سَیر کرے اور اس سے حظ اُٹھاوے۔ اور اگر یہ بھی بتایا جاوے کہ اُس میں بعض چشمے ایسے جاری ہیں۔ جو امراضِ مزمنہ اور مُہلکہ کو شفا دیتے ہیں تو اَور بھی زیادہ جوش اور طلب کے ساتھ لوگ وہاں جائیں گے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کی خوبیوں اور کمالات کو اگر نہایت ہی خوبصورت اور مؤثر الفاظ میں بیان کیا جاوے۔ تو رُوح پُورے جوش کیساتھ اُس کی طرف دوڑتی ہے۔

قرآنی علوم کے انکشاف کیلئے تقویٰ شرط ہے

اور حقیقت میں رُوح کی تسلّی اور سیری کا سامان اور وُہ بات جس سے رُوح کی حقیقی احتیاج پُوری ہوتی ہے۔ قرآن کریم ہی میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ اور دوسری جگہ کہا لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ[1]۔ اس سے مُراد وہی متقین ہیں جو ھُدًی لّلمتقین میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوا۔ کہ قرآنی علوم کے انکشاف کے لئے تقویٰ شرط ہے۔ علوم ظاہری اور علومِ قرآنی کے حصُول کے درمیان ایک عظیم الشّان فرق ہے۔ دنیوی اور رسمی علوم کے حاصل کرنے کے واسطے تقویٰ شرط نہیں ہے۔ صرف و نحو۔ طبعی۔ فلسفہ۔ ہیئت و طبابت پڑھنے کے واسطے یہ ضروری امر نہیں ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور اوامرِ الٰہی اور نواہی

[1] الواقعہ : ۸۰

کو ہر وقت مدنظر رکھتا ہو۔ اپنے ہر فعل و قول کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکومت کے نیچے رکھے۔ بلکہ بسا اوقات عموماً دیکھا گیا ہے کہ دُنیوی علُوم کے ماہر اور طلبگار دہریہ منش ہو کر ہر قسم کے فِسق و فجور میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ آج دُنیا کے سامنے ایک زبردست تجربہ موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ باوجودیکہ وُہ لوگ ارضی علُوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں اور آئے دن نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی روحانی اور اخلاقی حالت بہت ہی قابلِ شرم ہے۔ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے حالات جو کچھ شائع ہوئے ہیں۔ ہم تو اُن کا ذکر بھی نہیں کر سکتے مگر علُوم آسمانی اور اسرارِ قرآنی کی واقفیت کے لئے تقویٰ پہلی شرط ہے۔ اس میں توبۃ النصوح کی ضرورت ہے جبتک انسان پُوری فروتنی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ اُٹھالے۔ اور اس کے جلال اور جبرُوت سے لرزاں ہو کر نیازمندی کے ساتھ رجُوع نہ کرے۔ قرآنی علُوم کا دروازہ نہیں کھل سکتا اور رُوح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اُس کو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا۔ جس کو پا کر رُوح میں ایک لذّت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اُس کے علوم خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ پس اس کے لئے تقویٰ بطور نردبان کے ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان، شریر، خبیث النفس، ارضی خواہشوں کے اسیر اُن سے بہرہ ور ہوں۔ اس واسطے اگر ایک مسلمان مسلمان کہلا کر خواہ وہ صرف و نحو، معانی و بدیع وغیرہ علوم کا کتنا ہی بڑا فاضل کیوں نہ ہو۔ دُنیا کی نظر میں شیخ الکُل فی الکُل بنا بیٹھا ہو۔ لیکن اگر تزکیہ نفس نہیں کرتا تو قرآن شریف کے علُوم سے اس کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جُھکی ہوئی ہے۔ اور مغربی روشنی نے تمام عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی تو بدقسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنالیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں

کا حال ہے۔ جو لوگ پُرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامئ دین متین سمجھتے ہیں۔ اُن کی ساری عُمر کی تحصیل کا خُلاصہ اور لُبّ لباب یہ ہے کہ صرف و نحو کے جھگڑوں اور الجھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ضالّین کے تلفظ پر مرمٹے ہیں۔ قرآن شریف کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ہاں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تزکیۂ نفس کے دعوے کرتا ہے۔ وہ صُوفیوں اور سجادہ نشینوں کا گروہ ہے۔ مگر ان لوگوں نے قرآن شریف کو تو چھوڑ دیا ہے اور اپنے ہی طریق اختراع کر لئے ہیں۔ کوئی چلّہ کشیاں کرتا ہے۔ کوئی اِلّا اللہ کے نعرے مارتا ہے کوئی نفی اثبات توجہ۔ حبس دم وغیرہ میں مبتلا ہے۔ غرض ایسے طریقے نکالے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتے اور نہ قرآن شریف کا یہ منشاء ہے اور نہ کبھی سلسلہ نبوت نے ایسے طریقوں کو پسند کیا۔ غرض یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جبتک انسان ایک پاک تبدیلی نہیں کرتا ہے اور نفس کا تزکیہ نہیں کرتا۔ قرآن شریف کے معارف اور خوبیوں پر اطلاع نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں وُہ نکات اور حقائق ہیں جو رُوح کی پیاس کو بجھا دیتے ہیں۔

کاش دُنیا کو معلوم ہوتا کہ رُوح کی لذت کس چیز میں ہے۔ اور پھر وُہ معلوم کرتی۔ کہ وُہ قرآن شریف اور صِرف قرآن شریف میں موجود ہے۔

انسان اَبدال کیسے بنتا ہے؟

دیکھو جس جس قدر انسان تبدیلی کرتا جاتا ہے۔ اسی قدر وُہ ابدال کے زمرہ میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ حقائق قرآنی نہیں کھُلتے جبتک ابدال کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔ لوگوں نے ابدال کے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور اپنے طور پر کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابدال وُہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر پاک تبدیلی کرتے ہیں۔ اور اس تبدیلی کی وجہ سے اُن کے قلب گُناہ کی تاریکی اور زنگ سے صاف ہو جاتے ہیں شیطان کی حکومت کا استیصال ہو کر اللہ تعالیٰ کا عرش ان کے دل پر ہوتا ہے پھر وُہ رُوح القدس

سے قوت پاتے اور خدا تعالیٰ سے فیض پاتے ہیں۔ تم لوگوں کو میں بشارت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو اپنے اندر تبدیلی کرے گا وُہ ابدال ہے۔ انسان اگر خُدا کی طرف قدم اُٹھائے تو اللہ تعالیٰ کا فضل دَوڑ کر اُس کی دستگیری کرتا ہے۔ یہ سچّی بات ہے۔ اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ چالاکی سے علُوم القرآن نہیں آتے۔ دماغی قوت اور ذہنی ترقی قرآنی علوم کو جذب کرنے کا اکیلا باعِث نہیں ہو سکتا۔ اصل ذریعہ تقویٰ ہی ہے۔ متقی کا معلّم خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں پر اُمّیت غالب ہوتی ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لئے اُمّی بھیجا گیا۔ اور باوجودیکہ آپؐ نے نہ کسی مکتب میں تعلیم پائی اور نہ کسی کو اُستاد بنایا۔ پھر آپؐ نے وہ معارف اور حقایق بیان کئے۔ جنہوں نے دنیوی علُوم کے ماہروں کو دنگ اور حیران کر دیا۔ قرآن شریف جیسی پاک، کامل کتاب آپؐ کے لبوں پر جاری ہوئی جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے عرب کو خاموش کرا دیا۔ وہ کیا بات تھی جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم علوم میں سب سے بڑھ گئے۔ وہ تقویٰ ہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مطہّر زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف جیسی کتاب وُہ لائے۔ جس کے علوم نے دُنیا کو حیران کر دیا ہے۔

آپؐ کا اُمّی ہونا ایک نمونہ اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی علوم یا آسمانی علوم کے لئے تقویٰ مطلوب ہے نہ دنیوی چالاکیاں۔

تقویٰ کے تین مراتب

غرض قرآن شریف کی اصل غرض اور غایت دُنیا کو تقویٰ کی تعلیم دینا ہے جس کے ذریعہ وہ ہدایت کے منشاء کو حاصل کر سکے۔ اب اس آیت میں تقویٰ کے تین مراتب کو بیان کیا ہے۔ اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ [1] وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ [2] وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ [3] یُنۡفِقُوۡنَ [1]۔ لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ مگر طوطے کی طرح سے یُونہی بغیر سوچے سمجھے

[1] البقرۃ: ۴

چلے جاتے ہیں۔ جیسے ایک پنڈت اپنی پوتھی کو اندھا دھند پڑھتا جاتا ہے۔ نہ خود سمجھتا ہے۔ اور نہ سننے والوں کو پتہ لگتا ہے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کی تلاوت کا طریق صرف یہ رہ گیا ہے کہ دو چار سپارے پڑھ لئے اور کچھ معلوم نہیں کہ کیا پڑھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ سُر لگا کر پڑھ لیا۔ اور ق اور ع کو پورے طور پر ادا کر دیا۔ قرآن شریف کو عمدہ طور پر اور خوش الحانی سے پڑھنا یہ بھی ایک اچھی بات ہے۔ مگر قرآن شریف کی تلاوت کی اصل غرض تو یہ ہے کہ اس کے حقائق اور معارف پر اطلاع ملے اور انسان ایک تبدیلی اپنے اندر کرے۔ یہ یاد رکھو کہ قرآن شریف میں ایک عجیب وغریب اور سچا فلسفہ ہے۔ اس میں ایک نظام ہے جس کی قدر نہیں کی جاتی۔ جب تک نظام اور ترتیب قرآنی کو مدنظر نہ رکھا جاوے اور اس پر پورا غور نہ کیا جاوے۔ قرآن شریف کی تلاوت کے اغراض پورے نہ ہوں گے۔ اگر یہ لوگ جو قرآن شریف کے قؔ اور عیؔن اور ضاد پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تفسیق پر منہ کھولتے ہیں۔ نظام قرآنی کی قدر کرتے تو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ میں میرے ساتھ کیوں برسرِ پرخاش ہوتے جبکہ وہ دیکھتے کہ قرآن شریف ایک ترتیب کے طور پر اُن واقعات کو بیان کرتا ہے جو خارجی طور پر اپنا ایک وجود رکھتے ہیں۔ کہ اے عیسٰی میں تجھے وفات دینے والا ہوں۔ سوچنا چاہیئے تھا کہ یَاعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[1] قرآن شریف نے کہا کیوں۔ اس کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟

یہودیوں ہی سے پوچھ لیتے تو یہ پتہ لگ جاتا۔ اصل بات جسکو میں نے بارہا بیان کیا ہے یہ ہے کہ یہود حضرت مسیح کو ملعون قرار دیتے ہیں معاذ اللہ۔ اور اس کا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ انہوں نے مسیح کو صلیب کے ذریعہ قتل کر دیا۔ مگر قرآن شریف نے اس الزام کو دور کیا اور یہود کو ملزم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے پاک بندوں کو ذلیل نہیں کرتا۔ اور لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا[2] اس کا سچا وعدہ ہے۔ حضرت مسیح جب صلیب پر چڑھائے گئے تو اُن کو اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ

[1] آل عمران: ۵۶ [2] النساء: ۱۴۲

مجھے صلیبی موت سے ہلاک کرنے کے مُوجب ٹھیرے ہیں اور اس طرح پر یہ لعنتی موت ہوگی اس ہلاکت کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کو یہ بشارت دی کہ میں تجھے طبعی موت سے وفات دُوں گا اور تیرا رفع کرنے والا ہوں اور تجھے پاک کرنے والا ہوں۔ اس آیت کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے مگر افسوس یہ لوگ کچھ بھی غور نہیں کرتے اور قرآن کریم کی ترتیب کو بدل کر تحریف کرنا چاہتے ہیں ؛

کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہ تھا۔ جو یُوں کہہ دیتا کہ یَاعِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَی السَّمَآءِ ؛

یَاعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کی تفسِیر

پھر وہ کونسی دقّت اور مشکل اُس کو پیش آگئی تھی جو یَاعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ ہی کہا۔ غرض اس آیت میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ واقعات کی بنا پر ہے۔ وہ احمق ہے جو کہتا ہے۔ کہ ترتیب واؤ سے نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہی غبی ہے کہ وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا تو اُس کو واقعات پر نظر کرنی چاہیئے اور دیکھے کہ تطہیر رفع کے بعد ہوتی ہے یا پہلے اس تطہیر میں دراصل اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تیرے بعد ایک رسُول آئیگا جو حَکَم ہو کر تیری نسبت جھگڑے کو فیصل کر دیگا۔ اور جسقدر الزامات یہودی تجھ پر لگاتے ہیں اُن سے تجھے پاک ٹھیرائیگا۔ تین ترتیبوں کے تو یہ مخالف بھی قائل ہیں یعنی رافعك الیّ و مطھرك من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوك فوق الذین کفروا[1] یہ تو مانتے ہیں کہ مرتب کلام ہے۔ اس میں جو کچھ وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وہ پُورا ہو گیا جسمانی رفع کے قائل اس میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ مگر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب تین ترتیبوں کے وُہ قائل ہیں اور انہوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے تو توفی کے لفظ کو اُٹھانے کی بیفائدہ کوشش کیوں کرتے ہیں بھلا یہ یہودی طرز اختیار کرکے بتاؤ تو سہی اس لفظ کو رکھو گے کہاں ؟ اگر رفع کے بعد رکھو تو واقعات خارجہ کے خلاف ہے۔ رفع اور

[1] آل عمران : ۵۶

تطہیر میں فاصلہ نہیں ہے بلکہ رفع کے بعد تطہیر ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے اس الزام سے کہ وُہ نبی بھی نہیں مانتے تھے اور ملعُون قرار دیتے تھے۔ اور عیسائی کہتے تھے کہ ابن اللہ اور اللہ ہیں جس کو آسمان پر اُٹھایا گیا۔ اور وُہ ہمارے لئے ملعُون ہوا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بَری کیا ہے۔ یہ دو انگلیوں کی طرح ہیں۔ اُن کو الگ کر سکتے ہی نہیں۔ اور جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ کو دیکھو تو وہ قیامت تک مُطَہِّرُکَ کے بعد کسی دوسرے لفظ کو آنے ہی نہیں دیتا۔ پھر اس کو رکھو گے تو کہاں رکھو گے۔ جس طرح پر واقعات ظہور میں آئے۔ اسی طرز سے بیان کیا ہے۔ اب اُلٹ پلٹ کر کہاں رکھ سکتے ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ تمہیں خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ اس قدر دشمنی کیوں ہے۔ جو اس کی ترتیب توڑنا چاہتے ہو۔ کیا تم کو یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ کی خدائی ثابت کرو۔ عیسائیوں کے اس مُردہ خدا کو کہیں تو مرنے دو۔ تعجّب کی بات ہے کہ ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ ہم مسیحؑ کو محض ایک بندہ اور نبی مانتے ہیں۔ دُوسری طرف اُن کی نسبت ایسے عقیدے رکھنے چاہتے ہو جو اُن کو خدا بناتے ہیں۔ اس کی وُہی مثال ہے کہ ایک شخص تو کسی کی نسبت کہتا ہے کہ وُہ مر گیا۔ مگر دوسرا کہتا ہے کہ نہیں مرا تو نہیں مگر نبض اُس کی نہیں چلتی۔ بدن بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ سانس بھی نہیں آتا۔

اَے دانشمندو! غور تو کرو۔ اُس کے مرنے میں کیا شک رہا۔ جس کی زندگی کا کوئی بھی اثر نہیں پایا جاتا۔

مخالف حضرت عیسٰیؑ میں خدائی اوصاف مانتے ہیں

تم کہتے ہو کہ مسیحؑ خدا نہیں مگر مانتے ہو کہ وُہ آجتک زندہ ہے اور زمانہ کے اثر سے محفوظ اور لاتبدیل غیر متغیر ہے۔

تم کہتے ہو مسیح خالق نہیں۔ مگر مانتے ہو کہ اس نے بھی کچھ چڑیاں بنائی تھیں جو ان چڑیوں میں مل گئی ہیں۔

لہ آل عمران: ۵۶

تم کہتے ہو کہ مسیحؑ عالم الغیب نہیں مگر یہ مانتے ہو کہ وُہ تمہارے کھانے پینے کی چیزوں اور تمہارے گھروں کے ذخیروں کی اطلاع دے دیتا تھا۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ مسلمان کہلا کر ایک خُدا کو تمام صفات کاملہ سے موصُوف مان کر پھر اُس کی صفات ایک عاجز انسان کو دو۔ کچھ تو خدا کا خوف بھی کرو۔ یہی باتیں ہیں جنہوں نے نصاریٰ کی قوم کو جُرأت دِلا دی اور اُنہوں نے تمہاری قوم کا ایک بڑا حصہ گمراہ کر ڈالا۔

تمہیں کب خبر ہوگی جب سارا گھر لُٹ چکیگا؛ تم میرے ساتھ دشمنی نہیں کرتے مگر اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہو۔ میں نے کونسی انوکھی بات کہی تھی۔ میں تم سے کیا کچھ مانگتا ہوں۔ پھر مجھ سے عداوت کی کیا وجہ۔ کیا اس لئے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک ہی کامل الصفات ذات ہے جو عبادت کے قابل ہے۔ اس کے صفات کسی انسان کو نہ دو۔ کیا اس لئے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ دُنیا میں ایک ہی کامل انسان گزرا ہے جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ کیا اس لئے کہ میں کہتا ہوں کہ مسیح کے درجات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات سے ہرگز نہ بڑھاؤ۔ اس لئے کہ وہ اُن صفات سے ہرگز موصُوف نہیں جن سے موصُوف تم مانتے ہو۔ خدا کیلئے سوچو! یہ یاد رکھو کہ آخر مرنا ہے اور خدا کے حضور جانا ہے۔

غرض بات یہ تھی کہ قرآن شریف میں ترتیب کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے اور یہ آیتیں جو میں نے پڑھی تھیں۔ اُن میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1]

اتقاء کی تین اقسام ہیں،

یاد رکھو اِتّقا تین قسم کا ہوتا ہے۔ پہلی قسم اتقا کی عِلمی رنگ رکھتی ہے۔ یہ حالت ایمان کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری قسم عملی رنگ رکھتی ہے۔ جیسا کہ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ میں فرمایا ہے۔ انسان کی وُہ نمازیں جو شبہات اور وساوس میں مبتلا ہیں، کھڑی نہیں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے يقرؤن نہیں فرمایا بلکہ يقيمون فرمایا۔ یعنی جو

[1] البقرة: ۴

حق ہے اُس کے ادا کرنے کا۔ سُنو! ہر ایک چیز کی ایک علت غائی ہوتی ہے۔ اگر اس سے رہ جاوے تو وُہ بیفائدہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک بَیل جو قلبہ رانی کے واسطے خریدا گیا ہے۔ اپنے منصب پر اُس وقت قائم سمجھا جاویگا۔ جب وہ کر کے دکھاوے۔ لیکن اگر اس کی غرض و غایت کھانے پینے ہی تک محدود رہے۔ تو اپنی علت غائی سے دُور ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اُس کو ذبح کیا جاوے۔ اسی طرح یقیمون الصلٰوۃ میں لوازم الصلٰوۃ معراج ہے اور یہ وُہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق شروع ہوتا ہے۔ مکاشفات اور رویاء صالحہ آتے ہیں۔ لوگوں سے اِنقطاع ہوتا جاتا ہے۔ اور خدا کی طرف ایک تعلق پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ تبتّل تام ہو کر خدا میں جا ملتا ہے •

صلی جلنے کو کہتے ہیں۔ جیسے کباب بُھونا جاتا ہے۔ اسی طرح نماز میں سوزش لازمی ہے۔ جبتک دل بریان نہ ہو، نماز میں لذّت اور سرور پیدا نہیں ہوتا۔ اور اصل تو یہ ہے کہ نماز ہی اپنے سچے معنوں میں اُسی وقت ہوتی ہے۔ نماز میں شرط ہے کہ وہ بجمیع شرائط ادا ہو۔ جبتک وُہ ادا نہ ہو وُہ نماز نہیں ہے اور نہ وہ کیفیت جو صلٰوۃ میں میل نماز کی ہے حاصل ہوتی ہے •

نماز میں حَالؔ و قالؔ کی تصویر

یاد رکھو صلٰوۃ میں حالؔ اور قالؔ دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ بعض وقت اعلام تصویری ہوتا ہے۔ ایسی تصویر دکھائی جاتی ہے جس سے دیکھنے والے کو پتہ ملتا ہے کہ اُس کا منشاء یہ ہے۔ ایسا ہی صلٰوۃ میں منشائے الٰہی کی تصویر ہے۔ نماز میں جیسے زبان سے کچھ پڑھا جاتا ہے ویسے ہی اعضاء و جوارح حرکات سے کچھ دکھایا بھی جاتا ہے۔ جب انسان کھڑا ہوتا ہے اور تحمید و تسبیح کرتا ہے۔ اس کا نام قیام رکھا ہے۔ اب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ حمد و ثناء کے مُناسب حال قیام ہی ہے۔ بادشاہوں کے سامنے جب قصائد سنائے جاتے ہیں تو آخر کھڑے ہو کر ہی پیش کرتے ہیں۔ تو ادھر ظاہری طور پر

قیام رکھا ہے اور اُدھر زبان سے حمد وثنا بھی رکھی ہے۔ مطلب اس کا یہی ہے کہ رُوحانی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو۔ حمد ایک بات پر قائم ہو کر کی جاتی ہے۔ جو شخص مصدق ہو کر کسی کی تعریف کرتا ہے تو وُہ ایک رائے پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس الحمدللہ کہنے والے کے واسطے یہ ضروری ہُوا کہ وہ سچے طور پر الحمدللہ اُسی وقت کہہ سکتا ہے کہ پُورے طور پر اس کو یقین ہو جائے کہ جمیع اقسام محامد کے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جب یہ بات دل میں انشراح کے ساتھ پیدا ہو گئی تو یہ رُوحانی قیام ہے۔ کیونکہ دل اس پر قائم ہو جاتا ہے۔ اور پھر سمجھا جاتا ہے۔ کہ وُہ کھڑا ہے۔ حال کے موافق کھڑا ہو گیا تاکہ رُوحانی قیام نصیب ہو۔

پھر رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہتا ہے۔ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ جب کسی کی عظمت مان لیتے ہیں۔ تو اس کے حضور جُھکتے ہیں۔ عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کے لئے رکُوع کرے۔ پس سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم زبان سے کہا اور حال سے جُھکنا دکھایا یہ اُس قول کے ساتھ حال دکھایا۔ پھر تیسرا قول ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ اَعْلٰی اَفعلُ تفضیل ہے۔ یہ بالذّات سجدہ کو چاہتا ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ حالی تصویر سجدہ میں گرنا ہے۔ اس اقرار کے مناسب حال ہیئت فی الفور اختیار کر لی۔

اس قال کے ساتھ تین حال جسمانی ہیں۔ ایک تصویر اس کے آگے پیش کی گئی ہر ایک قسم کا قیام بھی کیا گیا ہے۔ زبان جو جسم کا ٹکڑا ہے۔ اس نے بھی کہا۔ اور وہ شامل ہو گئی۔

تیسری چیز اَور ہے وہ اگر شامل نہ ہو۔ تو نماز نہیں ہوتی۔ وُہ کیا ہے؟ وہ قلب ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قلب کا قیام ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرکے دیکھے کہ درحقیقت وہ حمد بھی کرتا ہے اور کھڑا بھی ہے۔ اور رُوح بھی کھڑا ہُوا حمد کرتا ہے۔ جسم ہی نہیں بلکہ رُوح بھی کھڑا ہے۔ اور جب سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہتا ہے تو دیکھے

کہ اتنا ہی نہیں کہ صرف عظمت کا اقرار ہی کیا ہے۔ نہیں بلکہ ساتھ ہی جھکا بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی رُوح بھی جُھک گیا ہے۔ پھر تیسری نظر میں خدا کے حضور سجدہ میں گرا ہے۔ اس کی علوشان کو ملاحظہ میں لا کر اُس کے ساتھ ہی دیکھے کہ رُوح بھی الُوہیت کے آستانہ پر گری ہوئی ہے۔ غرض یہ حالت جبتک پیدا نہ ہو لے۔ اس وقت تک مطمئن نہ ہو۔ کیونکہ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کے معنی یہی ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ یہ حالت پیدا کیونکر ہو۔ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ نماز پر مداومت کی جاوے اور وساوس اور شبہات سے پریشان نہ ہو۔ ابتدائی حالت میں شکوک و شبہات سے ایک جنگ ضرور ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ نہ تھکنے والے استقلال اور صبر کیساتھ لگا رہے اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں مانگتا رہے آخر وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ کی تفسیر

یہ تقویٰ عملی کا ایک جزو ہے اور دوسری جزو اس کی مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ[1] ہے کہ جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں عام لوگ رزق سے مراد اشیاء خوردنی لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے جو کچھ قویٰ کو دیا جاوے وُہ بھی رزق ہے۔ عُلوم و فنُون وغیرہ معارف حقائق عطا ہوتے ہیں۔ جسمانی طور پر معاش مال میں فراخی ہو۔ سب رزق ہے۔

رزق میں حکومت بھی شامل ہے اور اخلاق فاضلہ بھی رزق ہی میں داخل ہیں یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں یعنی روٹی میں سے روٹی دیتے ہیں۔ علم میں سے علم اور اخلاق میں سے اخلاق۔ علم کا دینا تو ظاہر ہی ہے۔ یہ یاد رکھو کہ وُہی بخیل نہیں ہے جو اپنے مال میں سے کسی مستحق کو کچھ نہیں دیتا۔ بلکہ وہ بھی بخیل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ دوسروں کو سکھانے میں مضائقہ کرے۔ محض اس خیال سے اپنے علوم و فنون سے کسی کو واقف نہ کرنا کہ اگر وہ سیکھ جاوے گا تو ہماری بیقدری ہو جاوے گی یا آمدنی میں فرق آجائے گا۔ شرک ہے۔ کیونکہ اس

[1] البقرۃ ۴

صُورت میں وُہ اس علم یا فن کو ہی اپنا رازِق اور خُدا سمجھتا ہے۔ اسی طرح پر جو اپنے اخلاق سے کام نہیں لیتا۔ وہ بھی بخیل ہے۔ اخلاق کا دینا یہی ہوتا ہے کہ جو اخلاق فاضلہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے دے رکھے ہیں۔ اس کی مخلوق سے اُن اخلاق سے پیش آوے۔ وہ لوگ اس کے نمُونہ کو دیکھ کر خود بھی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اخلاق سے اس قدر ہی مراد نہیں ہے کہ زبان کی نرمی اور الفاظ کی نرمی سے کام لے۔ نہیں بلکہ شجاعت، مروّت، عِفّت جسقدر قوتیں انسان کو دی گئی ہیں۔ دراصل سب اخلاقی قوتیں ہیں۔ اُن کا برمحل استعمال کرنا ہی اُن کو اخلاقی حالت میں لے آتا ہے۔ ایک موقعہ مناسب پر غضب کا استعمال بھی اخلاقی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

مسیحؑ کی تعلیم قابل عمل نہیں

یہ نہیں کہ انجیل کی طرح ایک ہی پہلُو اپنے اندر رکھتی ہے کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دو۔ یہ اخلاق نہیں ہے اور نہ یہ تعلیم حکمت کے اصُول پر مبنی ہو سکتی ہے اگر ایسا ہو تو تمام فوجوں کا موقوف کر دینا اور ہر قسم کے آلاتِ حرب کو توڑ دینا لازم آئے گا۔ اور مسیحی دُنیا کو بطور ایک خادم کے رہنا پڑیگا۔ کیونکہ اگر کوئی کُرتہ مانگے تو چُغہ بھی دینا پڑے گا۔ ایک کوس بیگار لے جانا چاہے۔ تو دو کوس جانے کا حکم ہے۔ پھر عیسائی لوگوں کو کس قدر مشکلات پیش آئیں اگر وُہ اس تعلیم پر عمل کریں تو نہ اُن کے پاس ضروریات زندگی بسر کرنے کو کچھ رہے اور نہ کوئی آرام کی صورت۔ کیونکہ جو کچھ اُن کے پاس ہو کوئی مانگ لے تو پھر اُن کے پاس کیا رَہ جاوے؟ اگر محنت مزدوری سے کمانا چاہیں تو کوئی بیگار میں لگا دے۔ غرض اس تعلیم پر زور تو بہت دیا گیا ہے اور پادریوں کو دیکھا ہے کہ وُہ بازاروں میں اس تعلیم کی بڑے شدّ و مد سے تعریف کر کے وعظ کرتے ہیں لیکن جب عمل پوچھو تو کچھ نہیں ہے گویا گُفتن ہی سب کچھ ہے۔ کرنے کے واسطے کچھ نہیں۔ اس لئے اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔ اخلاق یہ ہے کہ تمام قویٰ کو جو اللہ تعالےٰ نے دیئے ہیں برمحل استعمال کیا جاوے۔ مثلاً عقل دی

گئی ہے اور کوئی دُوسرا شخص جس کو کسی امر میں واقفیت نہیں اُس کے مشورہ کا محتاج ہے اور یہ پُوری واقفیت رکھتا ہے تو اخلاق کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی عقل سلیم سے اس کو پُوری مدد دے اور اُس کو سچا مشورہ دے۔ لوگ اِن باتوں کو معمُولی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس کو خراب ہونے دو۔ یہ شیطانی فعل ہے۔ انسانیت سے بعید ہے کہ وہ کسی دوسرے کو بگڑتا دیکھے اور اُس کی مدد کے لئے تیار نہ ہو۔ نہیں بلکہ چاہیئے کہ نہایت توجہ اور دلدہی سے اُس کی بات سُنے اور اپنی عقل و سمجھ سے اُس کو ضروری مدد دے

لیکن اگر کوئی یہاں یہ اعتراض کرے کہ مِمَّا رَزَقْنَاھُمْ کیوں فرمایا مِمَّا کے لفظ سے بُخل کی بُو آتی ہے۔ چاہیئے تھا کہ ع

ہَرچہ دَارِی خرچ کُن دَر راہِ اُو

اصل بات یہ ہے کہ اس سے بُخل ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن شریف خدائے حکیم کا کلام ہے حِکمت کے معنی ہیں شئے را بر محل داشتن۔ پس مِمَّا رَزَقْنَاھُمْ میں اسی اَمر کیطرف اشارہ ہے کہ محل اور موقع کو دیکھ کر خرچ کرو۔ جہاں تھوڑا خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں تھوڑا خرچ کرو۔ جہاں بہت خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں بہت خرچ کرو۔

عفو کا استعمال

اب مثلاً عفو ہی ایک اخلاقی قوت ہے۔ اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے۔ کہ آیا عفو کے لائق ہے یا نہیں۔ مُجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی ہے جو غصّہ تو لاتی ہے لیکن وُہ معافی کے قابل ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کی کسی شرارت پر چشم پوشی کی جاوے اور اُن کو مُعاف کر دیا جاوے تو وُہ زیادہ دلیر ہو کر مزید نقصان کا باعث بنتے ہیں مثلاً ایک خدمتگار ہے جو بڑا نیک اور فرماں بردار ہے۔ وہ چائے لایا۔ اتفاق سے اُس کو ٹھوکر لگی اور چائے کی پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور چا بھی مالک پر گر گئی۔ اگر وہ اُس کو مارنے کے

لئے اُٹھ کھڑا ہو اور تیز اور تند ہو کر اُس پر جا پڑے تو یہ سفاہت ہوگی۔ یہ عفو کا مقام ہے کیونکہ اس نے عمداً شرارت نہیں کی ہے اور عفو اس کو زیادہ شرمندہ کرتا اور آئندہ کے لئے محتاط بناتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا شریر ہے کہ وہ ہر روز توڑتا ہے اور یوں نقصان پہنچاتا ہے تو اُس پر رحم یہی ہوگا کہ اُس کو سزا دی جائے۔ پس یہی حکمت ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] میں ہر ایک مومن اپنے نفس کا مجتہد ہوتا ہے۔ وُہ محل اور موقع کی شناخت کرے اور جسقدر مناسب ہو خرچ کرے۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ قرآن شریف کی تعلیم حکیمانہ نظام اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کے بالمقابل انجیل کی تعلیم کو دیکھو کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دے وغیرہ وغیرہ، کیسی قابل اعتراض ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی۔ اور اُس کی تمدنی صُورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑا نرم خُو اور تقدس مآب پادری بھی اس تعلیم پر عمل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی انجیل کی اس تعلیم کا عملی ثبوت لینے کے لئے کسی پادری صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارے۔ تو وہ بجائے اِس کے کہ دوسری گال پھیرے۔ پولیس کے پاس دَوڑا جاوے گا۔ اور اُس کو حکام کے سپرد کرا دے گا۔

اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجیل معطّل پڑی ہے اور قرآن شریف پر عمل ہو رہا ہے۔ ایک مُفلس اور نادار بڑھیا بھی جس کے پاس ایک جَو کی روٹی کا ٹکڑا ہے۔ اس ٹکڑے میں سے ایک حصہ دے کر مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ میں داخل ہو سکتی ہے۔ لیکن انجیل کی طمانچہ کھا کر گال پھیرنے کی تعلیم میں مقدس سے مقدس پادری بھی شامل نہیں ہو سکتا۔ ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

انجیل تو اس پہلو میں یہاں تک گری ہوئی ثابت ہوتی ہے کہ اَور تو اَور خود حضرت مسیح بھی اس پر پُورا عمل نہ دکھا سکے اور وُہ تعلیم جو خود پیش کی تھی۔ عملی پہلو میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وُہ کہنے ہی کے لئے ہے۔ ورنہ چاہیئے تھا کہ اِس سے پیشتر کہ وُہ گرفتار

[1] البقرة: ۴

ہوتے خود اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے اور دُعائیں مانگنے اور اضطراب ظاہر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اِس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا۔ کہ وہ کفّارہ ہی کے لئے آئے ہیں۔ کیونکہ اگر اُن کی زندگی کا یہی کام تھا کہ وہ خودکشی کے طریق سے دُنیا کو نجات دیں اور بقول عیسائیوں کے خدا بجز اس صورت کے نجات دے ہی نہیں سکتا تھا۔ تو اُن کو چاہیئے تھا کہ جس کام کیلئے وُہ بھیجے گئے تھے۔ وہ تو یہی تھا۔ پھر وعظ اور تبلیغ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیوں نہ آتے ہی یہ کہدیا۔ کہ مجھے پکڑو اور پھانسی دیدو۔ تاکہ دُنیا کی رُستگاری ہو۔

قرآنی تعلیم انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے

غرض قرآن شریف کی تعلیم ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے اور ذرّہ ذرّہ اس کے آگے ہے اور اس نے ایسی تعلیم دی ہے جو انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے اور عفو اور انتقام کو محل اور موقع پر رکھنے کے واسطے اِس سے بڑھ کر تعلیم نظر نہیں آئیگی۔ اگر کوئی اس تعلیم کے خِلاف اَور کچھ پیش کرتا ہے تو وُہ گویا قانون الٰہی کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ بعض طبائع طبعاً عفو چاہتی ہیں اور بعض مار کھانے کے قابل ہوتی ہیں۔ سب عدالتیں قرآن شریف کی تعلیم کے موافق کھُلی رہ سکتی ہیں اگر انجیل کے موافق کریں تو آج ہی سب کچھ بند کرنا پڑے اور پھر دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ انسان انجیلی تعلیم پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ پس یہ دو نمونے علمی اور عملی تقویٰ کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے سوا تیسری قسم تقویٰ کی ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ [1]

اِنسان قوّت شہادت کا محتاج ہے۔ ایسی راہ اختیار نہ کرے کہ پاک شہادتوں سے دُور ہو۔ وُہ راہ خطرناک راہ ہے جس میں راستبازوں کی شہادتیں موجود نہیں ہیں۔ تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ جس میں زبردست شہادتیں ہر زمانہ میں زندہ موجُود ہوں۔ مثلاً تم نے راہ پوچھا کسی نے کچھ کہا کہ یہ راہ فلاں طرف جاتا ہے مگر دس کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو فلاں طرف

[1] البقرۃ : ۵

جاتا ہے۔ تو اب تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اِن بھلے مانس آدمیوں کی بات مان لو۔ یہ یاد رکھو کہ شہادت پاکبازوں کی ہی مقبول اور موزون ہوتی ہے۔ بدمعاشوں کی شہادت کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ یہ تیسری قسم تقویٰ کی ہے۔ جو یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو چھوڑ کر بھی لوگ بہت خراب ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو لوگوں نے مخالفت کی ہے تو اسی وجہ سے کہ اُنہوں نے تقویٰ کی اِس قسم کو چھوڑ دیا ہے۔

وفاتِ مسیحؑ اور قرآن مجید

خدا تعالیٰ کا کلام تیس آیتوں میں ہمارا مؤید ہے۔ کبھی وہ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ[1] کہہ کر کبھی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[2] کہہ کر کبھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[3] کہہ کر۔ غرض کبھی کسی پیرایہ میں کبھی کسی صورت میں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہی راہ سچی ہے۔ جس پر ہم بفضلہٖ تعالیٰ قائم ہیں۔ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیحؑ کو حضرت یحییٰؑ کے ساتھ معراج میں دیکھتے ہیں۔ اور یہ پکی بات ہے کہ اِن دونوں میں کوئی خاص فرق جو زندوں اور مُردوں میں ہونا چاہیئے نہیں بتایا۔ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عمر بتا کر یہ شہادت دیتے ہیں کہ وُہ مرگیا۔ اور کبھی آنے والے مسیح موعود اور اسرائیلی مسیح کا حلیہ جدا جدا بتا کر سمجھاتے ہیں کہ وُہ مرگیا۔ یہ شہادتیں تو حدیث اور قرآن کی ہیں۔ اِن کے علاوہ تمام صحابہؓ کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وفات پر یہ ہوئی ہے کہ سب نبی مرگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ابھی نہیں مرے اور تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر یہ خطبہ پڑھتے ہیں کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اب اس موقعہ پر جو ایک قیامت ہی کا میدان تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اِس دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور کُل صحابہؓ جمع ہیں۔ یہانتک کہ اُسامہ کا لشکر بھی روانہ نہیں ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت ابو بکرؓ بآواز بلند کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

[1] آل عمران: ۵۶ [2] المائدۃ: ۱۱۸ [3] آل عمران: ۱۴۵

کی وفات ہوگئی اور اس پر استدلال کرتے ہیں مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ سے۔ اب اگر صحابہؓ کے وہم و گمان میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی زندگی ہوتی تو ضرور بول اُٹھتے۔ مگر سب خاموش ہوگئے اور بازاروں میں یہ آیت پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ گویا یہ آیت آج اتری ہے۔

معاذاللہ صحابہؓ منافق نہ تھے جو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رُعب میں آکر خاموش ہو رہے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی تردید نہ کی۔ نہیں اصل بات یہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ نے بیان کی اس لئے سب نے گردن جُھکا لی۔ یہ ہے اجماع صحابہؓ کا۔ حضرت عمرؓ بھی تو یہی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آئیں گے۔ اگر یہ استدلال کامل نہ ہوتا (اور کامل تب ہی ہوتا کہ کسی قسم کا استثناء نہ ہوتا کیونکہ اگر حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور انہوں نے پھر آنا تھا تو پھر یہ استدلال کیا یہ تو ایک مسخری ہوتی) تو خود حضرت عمرؓ ہی تردید کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کا فہم قرآن

جبکہ آیت میں استثناء نہ تھا اور امر واقعی یہی تھا۔ اس لئے سب صحابہ نے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کر لیا اور حضرت ابوبکرؓ جن کو قرآن شریف کا یہ فہم ملا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ[1] پڑھی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ کسی نے پُوچھا کہ یہ بڈھا کیوں روتا ہے۔ تو آپ نے کہا کہ مجھے اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بُو آتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام بطور حُکام کے ہوتے ہیں۔ جیسے بندوبست کا ملازم جب اپنا کام کر چکتا ہے۔ تو وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی طرح پر انبیاء علیہم السّلام جس کام کے واسطے دنیا میں آتے ہیں جب اس کو کر لیتے ہیں تو پھر وہ اِس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ پس جب اکملت لکم دینکم کی صدا پہنچی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ یہ آخری صدا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا فہم بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور یہ جو احادیث میں آیا ہے کہ مسجد کی طرف سب کھڑکیاں بند کی جاویں۔ مگر ابوبکرؓ کی کھڑکی مسجد

[1] المآئدۃ: ۴

کی طرف کھلی رہے گی۔ اس میں یہی رمز ہے کہ مسجد چونکہ مظہر اسرار الٰہی ہوتی ہے اس لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف یہ دروازہ بند نہیں ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ جو شخص خشک ملاؤں کی طرح یہ کہتا ہے کہ نہیں ظاہر ہی ظاہر ہوتا ہے وہ سخت غلطی کرتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو یہ کہنا کہ یہ دہلیز بدل دے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سونے کے کڑے دیکھنا وغیرہ امور اپنے ظاہری معنوں پر نہیں تھے بلکہ استعارہ اور مجاز کے طور پر تھے ان کے اندر ایک اور حقیقت تھی۔

غرض مدعا یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو فہم قرآن سب سے زیادہ دیا گیا تھا۔ اسی لئے جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ استدلال کیا۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ اگر یہ معنی بظاہر معارض بھی ہوتے۔ تب بھی تقویٰ اور دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ ابوبکرؓ ہی کی مانتے مگر یہاں تو ایک بھی لفظ قرآن شریف میں ایسا نہیں ہے۔ جو حضرت ابوبکرؓ کے معنوں کا معارض ہو۔

اب مولویوں سے پوچھو کہ ابوبکرؓ دانشمند تھا یا نہیں؟ کیا یہ وہ ابوبکرؓ نہیں جو صدّیق کہلایا؟ کیا یہی وہ شخص نہیں جو سب سے پہلے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنا؟ جس نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی۔ کہ خطرناک ارتداد کی وبار کو روک دیا۔ اچھا اور باتیں جانے دو۔ یہی بتاؤ کہ ابوبکرؓ کو منبر پر چڑھنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر تقویٰ سے یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[1] پڑھا تو اس سے استدلال تام کرنا تھا یا ایسا ناقص کہ ایک بچہ بھی کہہ سکتا کہ عیسیٰؑ کو موتی سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے۔

افسوس! ان مخالفوں نے میری مخالفت اور عداوت میں یہی نہیں کہ قرآن کو چھوڑا بلکہ میری عداوت نے اُن کی یہانتک نوبت پہنچائی ہے کہ صحابہؓ کی کل جماعت پر انہوں نے اپنے طریق عمل سے کفر کا فتویٰ دیدیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے استدلال

[1] آل عمران: ۱۴۵

کو استخفاف کی نظر سے دیکھا۔

وفاتِ مسیحؑ پر اجماع

سارا قرآن شریف ہمارے ساتھ ہے۔ تیس آیات مخصوصاً مسیح علیہ السلام کی وفات پر گواہ ہیں۔ معراج کی رات، ابو بکر صدیقؓ کی تقریر اور صحابہؓ کا اجماع شاہد ہے۔ یہ لوگ جو ہمارے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اجماع کے خلاف ایک بات کہی۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اجماع اُن کے ساتھ ہرگز نہیں ہے۔ اوّل تو اجماع صحابہؓ ہی تک ہے اور ہم نے ابھی بتایا ہے کہ صحابہؓ کا اجماع رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسیحؑ کی وفات پر ہو چکا ہے۔ امام احمد حنبلؒ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے بعد اجماع کا دعویٰ جھوٹا ہے ماسوائے اِس کے بھی بہت سے لوگ اُن کے خلاف اور ہمارے ساتھ ہیں۔ معتزلہ مسیحؑ کے آسمان پر زندہ اُٹھائے جانے کے قائل نہیں ہیں۔ صُوفیوں کا یہی مذہب ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ مسیحؑ کی آمد بروزی ہے۔ وَقَالَ مَالِكٌ مَاتَ۔ امام مالکؒ موت ہی کے قائل ہیں۔ ابن حزم کا بھی مذہب یہی ہے۔ اب مالکی۔ ابن حزم کے ماننے والے اور معتزلہ اس مسئلہ میں ہمارے ساتھ ہیں لیکن پھر بھی علیٰ سبیل تنزّل اگر ہم مان لیں کہ کوئی بھی ہمارے ساتھ اُن میں سے نہیں۔ تو بھی ہم تو کہتے ہیں کہ قرون ثلٰثہ کے بعد زمانہ کا نام فیج اعوج رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے۔ یعنی ایک ٹیڑھا گروہ۔ اور ان کی نسبت فرمایا۔ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَلَسْتُ مِنْھُمْ۔ اب اُن کے ہاتھ میں کیا ہے؟ صحابہؓ کے وارث ہم، قرآن اور حدیث کے مغز کے وارث تو ہم ہی ٹھیرے۔ باقی رہی یہ بات کہ لکھا ہوا ہے کہ مسیحؑ نازل ہوگا۔ پس یاد رہے کہ نزول کا لفظ بہت وسیع ہے۔ نزیل مسافر کو بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ بروز۔ بروزی آمد

ماسوا اِس کے اصل بات یہ ہے جس کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ رسُول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلّم کو جو آخری زمانہ کا علم دیا گیا تھا۔ آپ نے اس علم کے موافق دو بروزوں کی خبر دی تھی۔ اہل اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ مراتب وجود دَوری ہیں۔ میں اس کو مانتا ہوں۔ قرآن شریف سے بھی مستنبط ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام اس کو مانتے ہیں۔ کہ کسی گذرے ہوئے انسان کی طبیعت، خُو، اخلاق ایک اَور میں آتے ہیں۔ اُن کی اصطلاح میں یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص قدمِ آدم پر ہے یا قدمِ نوح پر ہے۔ اس کو بعض بروز بھی بولتے ہیں۔ اُن کا مذہب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے بروز ہے۔ جیسے ہابیل کا بروز شیث علیہ السلام اور یہ پہلا بروز تھا۔

ہبل نوحہ کو کہتے ہیں۔ خدا نے شیثؑ کو یہ بروز دیا۔ پھر یہ سلسلہ برابر چلا گیا۔ یہانتک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بروز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم تھے۔ اسی لئے مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا[1] فرمایا۔ اس میں بھی رمز ہے۔ ابراہیمؑ دو اڑھائی ہزار سال کے بعد عبد اللہ کے گھر میں ظاہر ہوا۔

غرض بروز کا مذہب ایک متفق علیہ مسئلہ ظہورات کا ہے۔ اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے آخری زمانہ کے واسطے خبر دی تھی کہ اُس وقت دو رنگ کے فتنے ہوں گے ایک اندرونی، دوسرا بیرونی۔ اندرونی فتنہ یہ ہوگا کہ مسلمان سچی ہدایت پر قائم نہ رہیں گے۔ اور شیطانی عمل دخل کے نیچے آجائیں گے۔ قمار بازی۔ زنا کاری، شراب خوری اور ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر حدود اللہ سے نکل جائیں گے۔ اور خدا تعالیٰ کی نواہی کی پرواہ نہ کریں گے۔ صوم و صلوٰۃ کو ترک کر دیویں گے اور امر الٰہی کی بیحرمتی کی جائے گی اور قرآنی احکام کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا کیا جائے گا۔ بیرونی فتنہ یہ ہوگا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی پاک ذات پر افترا کئے جائیں گے۔ اور ہر قسم کے دل آزار حملوں سے اسلام کی توہین اور تخریب کی کوشش کی جاوے گی۔ مسیحؑ کی خدائی کو منوانے کیلئے اور اس کی صلیبی لعنت پر ایمان لانے کے واسطے ہر قسم کے حیلے اور تدابیر عمل میں

[1] البقرۃ: ۱۳۶

لائی جاویں گی۔ غرض ان دونوں اندرونی اور بیرونی عظیم الشان فتنوں کی اصلاح کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ ہی یہ بشارت ملی کہ ایک شخص آپ کی اُمت میں سے مبعوث کیا جاوے گا۔ جو بیرونی فتنہ اور صلیبی مذہب کی حقیقت کو توڑ دینے والا ہوگا۔ اور اسی لحاظ سے وہ مسیح ابن مریمؑ ہوگا اور اندرونی تفرقوں اور بے راہیوں کو دُور کر کے ہدایت کی سچی راہ پر قائم کرے گا۔ اس لئے مہدی کہلائے گا۔ اسی بشارت کی طرف وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ[1] میں بھی اشارہ ہے۔

دجّال و یاجُوج ماجُوج کی حقیقت

جبکہ یہ دونوں فتنے ہوں گے۔ ان فتنوں کی بنیاد دو خبیث چیزوں پر ہوگی۔ ایک فرقہ ہوگا جو **الدجّال** کہلائے گا۔ اور ایک **یاجُوج**۔ الدجال۔ دجل یہ ہے کہ اندر ناقص چیز اور اُوپر کوئی صاف چیز ہو۔ مثلاً اُوپر سونے کا ملمع ہو اور اندر تانبہ ہو۔ یہ دجل ابتدائے دُنیا سے چلا آتا ہے۔ مکر و فریب سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ زرگر کیا کرتے ہیں۔ جیسے دُنیا کے کاموں میں دجل ہے ویسے ہی رُوحانی کاموں میں بھی دجل ہوتا ہے۔ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ[2] بھی دجل ہے۔ جو یَاعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ[3] کو اُلٹاتے ہیں یہ بھی دجل ہے۔ مگر آخری زمانے کا دجل عظیم الشان دجل ہوگا۔ گویا دجّالیت کا ایک دریا بہہ نکلیگا۔ اَلدَّجَّال پر اَلْ استغراق کا ہے۔ پس الدجّال دجاجلہ مختلفہ کا بُروز ہے۔ یعنی پہلے جسقدر مختلف اور متفرق کید، حیلے، ضلالت اور کفر کے تھے۔ کسی زمانہ میں نابکار لوگوں نے کچھ کہا۔ کسی نے کچھ کہا۔ متفرق طور پر جسقدر اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے مگر وہ ایک حد تک تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس وقت اعتراضات کا ایک دریا بہہ نکلیگا۔ جیسے چھوٹی چھوٹی نہریں ندیاں مل کر ایک دریا بن جاتا ہے۔ اسی طرح کُل دجل مل کر ایک بڑا دجل ہوگا۔

[1] الجمعہ: ۴ [2] النساء: ۴۷ [3] آل عمران: ۵۶

چنانچہ اس زمانہ میں دیکھ لو کتنا بڑا دجل ہو رہا ہے۔ ہر طرف سے اسلام پر نکتہ چینیاں اور اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اور عیسائیوں نے تو حد کر دی ہے۔ میں نے اِن اعتراضوں کو جمع کیا ہے۔ جو عیسائیوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے ہیں۔ اُن کی تعداد تین ہزار تک پہنچتی ہے ! ور جس قدر کتابیں اور رسالے اور اشتہار آئے دن ان لوگوں کی طرف سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضوں کی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔ اُن کی تعداد چھ کروڑ تک پہنچ چکی ہے گویا ہندوستان کے مسلمانوں میں سے ہر ایک آدمی کے ہاتھ میں یہ لوگ کتاب دے سکتے ہیں۔

پس سب سے بڑا فتنہ یہی نصاریٰ کا فتنہ ہے۔ اور الدجال کا برُوز ہے۔ ایسا ہی یاجُوج۔ یہ لفظ اجیج سے مُشتق ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آتشی کاموں کے ساتھ اُن کا بہت بڑا تعلق ہوگا۔ اور وُہ آگ سے کام لینے میں بہت مہارت رکھیں گے۔ گویا آگ اُن کے قابو میں ہوگی اور دُوسرے لوگ اِس آتشی مقابلہ میں ان سے عاجز رہ جائیں گے۔ اب یہ کیسی صاف بات ہے۔ دیکھ لو کہ آگ کے ساتھ اس قوم کو کس قدر تعلق ہے۔ کلیں کس قدر جاری ہیں۔ اور دن بدن آگ سے کام لینے میں ترقی کر رہے ہیں *

یہ دونوں برُوز ہیں۔ اور یہ دونوں کیفیتیں جو متفرق طور پر تھیں۔ ایک وجُود میں آئی ہیں۔ ایسا ہی ماجُوج ہیں۔ اور یہ ایک پکّی بات ہے کہ النّاس علیٰ دین ملوکھم۔ انسان پر مُلوک کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ مُلوک تو ملوک ہوتے ہیں۔ ادنیٰ درجہ کے نمبرداروں تک کا اثر پڑتا ہے۔ سِکھوں کے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے کیس رکھ لئے تھے اور کچھ پہن لئے تھے۔ ایک شخص ہمارے قریب ایک گاؤں میں بھی رہتا تھا۔ اس کا نام خُدا بخش تھا۔ اس نے اپنا نام خُدا سنگھ رکھ لیا تھا *

موضع ڈلّہ میں گلاب شاہ اور مہتاب شاہ دو بھائی تھے۔ وہ گرنتھ ہی پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ معمولی بات ہے کہ ملوک کے خیالات کا مذہب، طرز لباس ہر قسم

کے امور کا اخلاقی ہو یا مذہبی بہت بڑا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ جیسے ذکور کا اثر اناث پر پڑتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ[1]۔ اسی طرح پر رعایا پر ملوک کا اثر ضروری ہے۔ سکھوں کی عملداری میں دو پگڑیاں باندھا کرتے تھے۔ اور اب تک بھی ریاستوں میں اس کا بقیہ چلا جاتا ہے۔ جب ایک دوسرے سے بلا کرتے تھے۔ تو سب ایک ہی لفظ بولا کرتے تھے۔ شکھ ہے۔

ایسا ہی اب اس عملداری میں سلطنت کا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ طرز لباس ہی کو دیکھو کہ ہر ایک شخص انگریزی لباس کوٹ پتلون کو پہن کر فخر کرتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو انگریزی ٹوپیاں بھی پہنتے ہیں۔ سلطنت کی طرف سے کسی قسم کی ترغیب نہیں دی جاتی۔ کوئی حکم جاری نہیں کیا جاتا۔ کہ لوگ اس قسم کا لباس پہنیں۔ مگر خود بخود طبائع میں ایک شوق دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ باوجودیکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس لباس کی تبدیلی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور اپنی جگہ سعی بھی کرتے ہیں کہ یہ طریق ترقی نہ پکڑے۔ مگر نہیں یہ ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے اور رُک نہیں سکتا۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی طرز لباس ترقی پر ہے۔ یہانتک کہ مکانات بنوانے میں بھی انگریزی طرز اور فیشن کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ الناس علی دین ملوکھم۔ یہ مت سمجھو کہ طرز لباس ہی نے ترقی کی ہے۔ نہیں۔ یہ طرز بجائے خود ایک خطرناک ترغیب ہے اور بہت سی باتوں کے لئے۔

انگریزی لباس کے بعد انگریزی طرز کی مجلسوں کا مذاق ترقی کرے گا اور کر رہا ہے۔ عیسائیت نے خمر کو حرام نہیں کیا۔ اس میں پردہ بھی ضروری نہیں۔ قمار بازی بھی ممنوع نہیں ہے۔ پھر کھانے میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ پس اس آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب حقیقی جو انسان کو ایک حد بندی کے درمیان رکھنا چاہتا ہے اس سے لوگوں نے تجاوز شروع کیا۔ انگریزی مجلسی مذاق میں شراب کا پینا لازمی امر

[1] النسآء: ۳۵

ہے۔جس محفل میں شراب نہ ہو وہ گویا مجلس ہی قابلِ نفرت ہے ؂
پس وہ لوگ جو انگریزی طرز اور فیشن کے دلدادہ ہیں وہ کب دین کی حدُود کے اندر آنے لگے۔ اور مذہب کی طرف بُلانے والوں کی طرف اُن کو رغبت ہو تو کس طرح ؂
میں سچ کہتا ہوں کہ لوگوں نے اس امر پر غور نہیں کی۔ کہ عیسائیت کیونکر اندر ہی اندر سرایت کر رہی ہے۔ میں نے اِس پر بہت غور کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک امر اس وقت عیسائیت کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ خصوصًا ایسی حالت میں کہ ان پادریوں نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ بھی اُس کے پھیلانے میں فروگذاشت نہیں کیا۔ ہر قسم کے طریق اشاعت کو اُنہوں نے اختیار کیا ہے۔ قطع نظر اِس کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ یہ انگریزی فیشن ہی کا اثر ہے کہ اب علانیہ شراب پی جاتی ہے۔ زناکاری کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مُمِد اور مُعاون امور پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ قمار بازی گو قانُونًا جرم ہو۔ مگر اُس کی بعض ایسی صورتیں پیدا کر لی گئی ہیں کہ وہ قانُونًا جائز ہی قرار دی گئی ہے۔ عیسائی عورتوں کا بے پردہ پھرنا اور عام طور پر غیر مردوں سے مِلنا جُلنا اِس نے ایسا خطرناک اثر کیا ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جو عورتوں کو بے پردہ سیر کرانا پسند کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہیں۔ ان کو پردہ میں نہ رکھا جاوے کیونکہ یہ ظُلم ہے ؂

اسلامی پَردہ کی حقیقت

اسلامی پَردہ پر اعتراض کرنا اُن کی جہالت ہے اللہ تعالیٰ نے پَردہ کا ایسا حکم دیا ہی نہیں۔ جس پر اعتراض وارد ہو۔
قرآن مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غَضِّ بَصَر کریں۔ جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے ہی نہیں تو محفوظ رہیں گے۔ یہ نہیں کہ انجیل کی طرح یہ حکم دیدیتا کہ شہوت کی نظر سے نہ دیکھ۔ افسوس کی بات ہے کہ انجیل کے مصنّف کو یہ

بھی معلوم نہیں ہوا کہ شہوت کی نظر کیا ہے؟ نظر ہی تو ایک ایسی چیز ہے جو شہوت انگیز خیالات کو پیدا کرتی ہے۔ اس تعلیم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ اُن لوگوں سے مخفی نہیں ہے۔ جو اخبارات پڑھتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہوگا کہ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے کیسے شرمناک نظارے بیان کئے جاتے ہیں۔

اسلامی پردہ سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ عورت جیلخانہ کی طرح بند رکھی جائے قرآن شریف کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں ستر کریں۔ وُہ غیر مرد کو نہ دیکھیں۔ جن عورتوں کو باہر جانے کی ضرورت تمدّنی امُور کے لئے پڑے۔ اُن کو گھر سے باہر نکلنا منع نہیں ہے وہ بیشک جائیں۔ لیکن نظر کا پردہ ضروری ہے۔

مساوات کے لئے عورتوں کے نیکی کرنے میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی ہے۔ اور نہ اُن کو منع کیا گیا ہے کہ وُہ نیکی میں مشابہت نہ کریں۔ اسلام نے یہ کب بتایا ہے کہ زنجیر ڈال کر رکھو۔ اسلام شہوات کی بناء کو کاٹتا ہے۔ یُورپ کو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ کُتوں اور کُتیوں کی طرح زِنا ہوتا ہے اور شراب کی اس قدر کثرت ہے کہ تین میل تک شراب کی دکانیں چلی گئی ہیں۔ یہ کِس تعلیم کا نتیجہ ہے؟ کیا پردہ داری کا یا پردہ دری کا۔

اسلام کی بات کو بگاڑنا اور اندھا دُھند اعتراض کرنا ظُلم ہے۔ اِسلام تقویٰ سکھانے کے واسطے دنیا میں آیا ہے۔

بُرائی کے دوبرُوز، الدجّال یاجُوج ماجُوج

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ مُلوک کے دِین پر ہوتے ہیں اور میں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ اس اَمر کو بیان کر دیا ہے۔ اب دیکھ لو کہ جو حالات ابتر اس ملک میں ہوتے ہیں وہ کسی اَور ملک میں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ مکّہ مدینہ میں بھی نہیں ہوئے۔ ایسی آزادی اور اباحت جو یہاں ہے۔ اُس کی نظیر کِسی دوسرے مُلک میں نہ

ملے گی۔ اور اُن ملکوں میں چونکہ اِس قسم کے محرکات پیش نہیں آئے۔ اس لئے وہاں خیالات بھی بہت ابتر نہیں ہوئے۔ اب مَیں پھر اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔ میں نے یہ بیان کیا ہے۔ کہ دو بروز ہیں۔ ایک الدجّال دوسرا یاجوج ماجوج کا۔ الدجّال کا بروز وُہ ہے جو آدم علیہ السّلام سے لیکر ایک سلسلہ چلا جاتا تھا۔ جس قسم کی بدیاں اور شرارتیں مختلف طور پر مختلف وقتوں میں ظاہر ہوئیں۔ آج اُن سب کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ایک عجیب نظارۂ قدرت دکھایا ہے۔ چونکہ اب انسانی عمروں کا خاتمہ ہے۔ اس لئے خاتمہ پر ایک بدیوں کا اور ایک نیکیوں کا بروز بھی دکھایا۔

بدیوں کا بروز وہی ہے جس کو میں نے الدجّال کہا ہے۔ تمام مکائد اور شرارتوں کا وُہ مجموعہ ہے۔ اِس آخری زمانہ میں ایک گروہ کو سفلی عقل اِس قدر دی گئی ہے کہ تمام چھپی ہوئی چیزیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُس نے دو قسم کا دجل دکھایا۔ ایک قسم کا حملہ نبوت پر کیا اور ایک خدا پر۔

نبوت پر تو یہ حملہ تھا کہ منشائے الٰہی کو بگاڑا اور دماغی طاقتوں کو انتہائی مدارج پر پہنچا کر الوہیت پر تصرف کرنے کے لئے خدا پر حملہ کیا۔ امراض مزمنہ کے علاج کی طرف توجہ کرنا، ایک کا نطفہ لے کر رحم میں بذریعۂ کل ڈالنا، بارش برسانے کے آلات کا ایجاد کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب امور اس قسم کے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ الوہیت پر تصرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ خود خدا بن رہا ہے اور دوسرا گروہ کسی اَور انسان کو خدا بناتا ہے۔ جو کچھ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے اس کی غرض کیا ہے، یہی کہ ایک آزادی اور حرص جو پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو پُورے طور پر کام میں لا کر ربوبیت کے بھیدوں کو معلوم کر کے خدا سے آزاد ہو جاویں۔

غرض جان ڈالنے کے، مُردوں کو زندہ کرنے کے، بارش برسانے کے تجربے کرتے ہیں۔ یہانتک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اُن کی تو کوشش یہ ہو رہی ہے کہ جو کچھ

دُنیا میں ہو رہا ہے وُہ سب ہمارے ہی قبضہ میں آجاوے ؛

اگرچہ میں اِس بات کو مانتا ہوں کہ تدبیر کرنا منع نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ گُناہ ہمیشہ افراط یا تفریط سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر انسان کو صرف ہاتھ لگا دو تو گُناہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو ایک مُکا مار دو تو یہ گُناہ ہے۔ یہ افراط ہے۔ اور تفریط یہ ہے کہ کِسی کو اگر ایک پیالہ پانی دینے کی ضرورت ہو۔ تو وُہ اس کو ایک قطرہ دے ؛

غرض موجُودہ زمانہ میں دجّال کا بُروز ایک معجُون مرکّب ہے۔ ایک حملہ خُدا پر ہو رہا ہے ایک نبوّت پر ؛

ایک خُدا کو انسان بناتا ہے دوسرا آپ ہی خُدا بنتا ہے۔ کیا یہ بات سچ نہیں ہے؟ کتابیں دیکھو۔ اخبارات پڑھو تو پتہ لگیگا۔ کہ کِس قدر فساد بَرپا ہو رہا ہے۔ اور یہ دو رنگی ظُلم ڈھا رہی ہے ؛

یاجُوج ماجُوج کے فساد کی نسبت مَیں نے بتا دیا ہے کہ اُس کا اثر دِل پر پڑتا ہے۔ اُس کو شوکت ہے۔ خدا کی طرف رجُوع کرنا، امانت دیانت کا اختیار کرنا، شراب۔ زِنا۔ بدنظری۔ بدکاری۔ قمار بازی سے بچنا مشکل ہو رہا ہے۔ بہت ہی تھوڑے شاید ایک آدمی فی ہزار جو بچتے ہوں گے ؛

نیکی کے بھی دو بُروز ہیں۔ اندرُونی لحاظ سے مہدی اور بیرُونی لحاظ سے مسیح ابن مریم

اب یہ بات کیسی صاف ہے۔ کہ جبکہ بَدی کے دو بُروز تھے۔ تو ایسا ہی نیکی کے بھی دو بُروز بَدی کے مقابل ضروری تھے۔ چنانچہ دو بُروز نیکی کے بھی رکھے دراصل وُہ بھی ایک ہی چیز ہے۔ جس کے دو نام ہیں۔ جیسے ایک ہی حالت میں مجسٹریٹ اور کلکٹر دو جداگانہ عُہدے ہوتے ہیں ؛

دو نیکی کے بروز یہ ہیں کہ ایک تو اندرونی لحاظ سے ہے۔ اور دوسرا بیرونی لحاظ سے اندرونی لحاظ سے وُہ مہدی ہے اور بیرونی لحاظ سے مسیح ابن مریم۔ بیرونی طور پر مسیح کا کام کیا ہے؟ جو اس کا یہ نام رکھا۔ مسیح ابن مریم کا کام دفع شر ہوگا اور مہدی کا کام کسب خیر۔ چنانچہ غور کرو کہ مسیح کا کام یقتل الخنزیر اور یکسر الصلیب بتایا ہے یہی دفع شر ہے۔ لیکن ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے۔ کہ وہ دفع شر کے لئے تیغ و سنان لے کر جنگ کے واسطے نکلیگا۔

علماء جو یہ کہتے ہیں کہ وہ جنگ کرے گا یہ صحیح نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔ یہ کیا اصلاح ہوئی کہ ابھی آپ آئے اور آتے ہی تلوار پکڑ کر لڑائی کے واسطے میدان میں نکل آئے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ صحیح اور سچی بات وُہی ہے جو خدا تعالیٰ نے ہم پر کھولی۔ . . . . ۔ جو احادیث کے منشاء کے موافق ہے کہ مسیح کوئی خونی جنگ نہ کرے گا۔ اور نہ تلوار پکڑ کر لڑنا اُس کا منصب ہے۔ بلکہ وُہ تو اصلاح کے لئے آئے گا۔ ہاں یہ ہم مانتے ہیں کہ اس کا کام دفع شر ہے۔ اور وہ حجج اور براہین سے کرے گا۔

اور مہدی کا کام کسب خیر ہے۔ یعنی جو بدعادات اور فسق و فجور پھیلا ہوا ہوگا۔ وہ اُس کو ہدایت سے بدل دے گا۔ عیسیٰ کا لفظ عوس سے لیا ہے۔ جو دفع شر کی طرف ایما ہے۔ اِن ہر دو بروزوں میں بہتر یہ ہے کہ مہدی کا بروز اکمل ہے۔ کیونکہ اُس کا کام ہے افاضہ خیر۔ اور افاضہ خیر دفع شر کی نسبت اکمل بات ہے۔ ایک شخص ہے جو کسی کی راہ سے صرف کانٹے اُٹھا دے۔ یہ بے شک بڑا کام ہے۔ لیکن جو اس کو سواری دے اور اپنے گھر لے جا کر روٹی بھی کھلائے۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ پس مہدی اکمل ہے۔ اسی لئے وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ عیسیٰ ابن مریم جو مہدی خلیفۃ اللہ کی بیعت کرے گا اس میں یہی سِر ہے۔ اور

مہدی کا بروز یوں بھی اکمل ہے کہ وہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہوگا اور آپ خاتم الانبیاء تھے۔ اور اکمل الانبیاء، اس لئے اُس کا بروز بھی اکمل ہی ہوگا۔

یہ دو بروز تھے۔ علماء نے کیسا ظلم کیا کہ ایک بروز کو تو اُنہوں نے مان لیا۔ کہ مہدی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خُلق اور نام پر ہوگا۔ لیکن عیسیٰ ابن مریمؑ کی نسبت یہی تجویز کیا۔ کہ وہی آسمان سے اُتر کر آئے گا۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ کیسے ذہن متنزل ہو گئے ہیں جو تناقض پیدا کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ ایک جگہ تو بروز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مان لیا۔ اُس کا قائم مقام خلیفۃ اللہ بن گیا۔ مگر پھر یہ کیا ہوا کہ جو چھوٹا تھا۔ اُسے خود کیوں آنا پڑا۔ وہ مہدی جس کو افاضۂ خیر دیا گیا ہے اور جو اکمل ہے اس کو بروزی رنگ میں لانے اور مسیح ابن مریمؑ کو اُس کی بیعت کرانے کے واسطے خود اُتارتے ہو۔ ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

الائمۃ من القریش کے معنی

جب اُن سے پوچھا جاوے کہ تم ایک نبی کو اُتار کر جو اس کی بیعت مہدی کے ہاتھ پر کراتے ہو۔ یہ کیا بات ہے تو جواب دیتے ہیں کہ کیا کیا جاوے۔ حدیث میں آیا ہے۔ الائمۃ من القریش۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اس حدیث کے وُہی معنے ہوں جو تم قرار دیتے ہو تو چاہیئے تھا کہ سلطنت رُوم کے سب لوگ باغی ہوتے۔

اگر پیشگوئی کے طور پر یہی نہ سمجھا جاوے۔ پھر جو سلطان رُوم کو خلیفۃ المسلمین قرار دیتے ہیں۔ اس کے کیا معنے ہوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو کشفی طور پر دکھایا گیا تھا کہ خلیفے قریش سے ہوں گے۔ خواہ حقیقی طور پر یا بروزی طور پر۔ جیسے دجّال کا بروز بتایا۔ اسی طرح پر سلاطین مغلیہ وغیرہ بروزی طور پر

قریش ہی ہیں۔ خدا نے جو عہدہ اُن کو دیا وہ اُس کے متکفل رہے۔ جب تک خدا نے چاہا وُہ سلطنت کرتے رہے۔ جب تک کوئی بروز کے مسئلہ کو نہیں سمجھتا اس پیشگوئی کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا اور آخر اُس کو اِس پیشگوئی کو جھٹلانا پڑے گا۔

جب اصل قریش میں استعداد نہ رہی۔ اور اِس قوم میں وُہ استعداد پائی گئی تو خدا نے وُہ عہدہ اُس کے حوالے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طبعًا سلطان رُوم کی متابعت اختیار کی اور سچی محبت سے اُس کو قبول کیا۔ یہ تصنّع اور بناوٹ سے نہیں ہوا۔ بلکہ دلوں نے یہ فتویٰ دیا۔ کہ وہ خادم حرمین الشریفین ہے۔ اظلالی امُور ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہوں گے۔ یہ معنے ہیں الائمۃ من القریش کے۔

غرض یہ دو نام ایک ہی شخص کے تھے۔ ایک کو افاضہ خیر کا درجہ ملا۔ دوسرے کو دفع شر کا۔ افاضہ خیر چونکہ بڑھ کر ہے۔ اس کو دفع شرّ پر بزرگی دی جاتی ہے۔ اس لئے اِس حیثیت سے وُہ خلیفۃ اللہ کہلایا۔

پس جیسے مقابل پر دو خبیث بروز تھے۔ یہ خیر کے برُوز ہیں۔

اب اس کے متعلق میں ایک اَور نکتہ بیان کرکے اس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ عیسٰی کے نام میں دفع شر کا مفہُوم پایا جاتا ہے۔ اور احمؐد یا محمّدؐ کے نام میں افاضۂ خیر کا مفہُوم یعنی نہایت ہی تعریف کیا گیا۔ تعریف اس نام پر ہوتی ہے۔ جس کو خیر پہنچاؤ گے وہ بے اختیار تعریف کرے گا۔ حمد کرنے کے ساتھ لازمی طور پر منعم علیہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمّدؐ اس لئے ہی تھا۔ کہ وہ افاضۂ خیر ہے جو خلق کی طرف کرتا ہے۔ احمؐد منعم ہے اور محمّدؐ منعم علیہ ہے۔ اور عیسٰی کے معنے ہیں بچایا گیا۔ یہ تو دفع شر کی طرف اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ خدا نے وہ قصہ یاد دلایا۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔[1] اس قصہ میں پیشگوئی مذکوُر ہے۔ اب میں اُس کا بیان لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ بس اسی پر

[1] البقرۃ: ۳۱

ختم کرتا ہوں کہ مسیح اور مہدی دراصل ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ جو اس کی دو مختلف حیثیتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو دفعِ شر اور افاضۂ خیر ہیں۔ افسوس ان علماء پر کہ اُنہوں نے افاضۂ خیر کے بُروز کو مانا اور دفعِ شر کے بُروز سے انکار کیا۔

دسمبر ۱۸۹۹ء کے جلسہ سالانہ پر بہت کم لوگ آئے۔ اس پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے بہت اظہار افسوس کیا۔ اور فرمایا:-

جلسہ سالانہ پر نہ آنیوالوں پر اظہار افسوس

"ہنوز لوگ ہمارے اغراض سے واقف نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں کہ وہ بن جائیں۔ وہ غرض جو ہم چاہتے ہیں اور جس کے لئے ہمیں خدا تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے۔ وہ پُوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک لوگ یہاں بار بار نہ آئیں اور آنے سے ذرا بھی نہ اکتائیں" اور فرمایا۔

"جو شخص ایسا خیال کرتا ہے کہ آنے میں اُس پر بوجھ پڑتا ہے۔ یا ایسا سمجھتا ہے کہ یہاں ٹھہرنے میں ہم پر بوجھ ہوگا۔ اسے ڈرنا چاہیئے کہ وہ شرک میں مُبتلا ہے۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے۔ کہ اگر سارا جہان ہمارا عیال ہو جائے تو ہمارے مہمات کا متکفل خدا تعالیٰ ہے۔ ہم پر ذرا بھی بوجھ نہیں۔ ہمیں تو دوستوں کے وجُود سے بڑی راحت پہنچتی ہے۔ یہ وسوسہ ہے جسے دلوں سے دُور پھینکنا چاہیئے۔ میں نے بعض کو یہ کہتے سُنا ہے۔ کہ ہم یہاں بیٹھ کر کیوں حضرت صاحب کو تکلیف دیں۔ ہم تو نکمے ہیں۔ یوں ہی روٹی بیٹھ کر کیوں توڑا کریں۔ وہ یہ یاد رکھیں یہ شیطانی وسوسہ ہے جو شیطان نے اُن کے دلوں میں ڈالا ہے کہ اُن کے پَیر یہاں جمنے نہ پائیں"۔

ایک روز حکیم فضل دین صاحب نے عرض کیا کہ حضُور میں یہاں نکما بیٹھا کیا کرتا ہوں۔ حکم ہو تو بھیرہ چلا جاؤں۔ وہاں درس قرآن کریم ہی کروں گا۔ یہاں مجھے بڑی شرم

آتی ہے کہ میں حضورؑ کے کسی کام نہیں آتا اور شاید بیکار بیٹھنے میں کوئی معصیت نہ ہو

فرمایا:-

"آپ کا یہاں بیٹھنا ہی جہاد ہے اور یہ بیکاری ہی بڑا کام ہے۔"

غرض بڑے دردناک اور افسوس بھرے لفظوں میں نہ آنے والوں کی شکایت کی اور

فرمایا:-

"یہ عُذر کرنے والے وُہی ہیں جنہوں نے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور عُذر کیا تھا۔ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ اور خدا تعالیٰ نے اُن کی تکذیب کر دی کہ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا" (احزاب)

فرمایا:-

"ہمارے دوستوں کو کس نے بتایا ہے کہ زندگی بڑی لمبی ہے۔ موت کا کوئی وقت نہیں۔ کہ کب سر پر ٹوٹ پڑے۔ اس لئے مُناسب ہے کہ جو وقت ملے۔ اُسے غنیمت سمجھیں۔"

فرمایا:-

"یہ ایّام پھر نہ ملیں گے اور یہ کہانیاں رہ جائیں گی۔"

اپنے نفس پر قابُو

فرمایا:-

"میں اپنے نفس پر اتنا قابُو رکھتا ہوں اور خدا تعالیٰ نے میرے نفس کو ایسا مُسلمان بنایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سال بھر میرے سامنے میرے نفس کو گندی سے گندی گالی دیتا رہے۔ آخر وُہی شرمندہ ہوگا۔ اور اُسے اقرار کرنا پڑیگا کہ وہ میرے پاؤں جگہ سے اُکھاڑ نہ سکا۔"

لوگوں کی تکالیف اور شرارتوں سے آپ کبھی مرعُوب نہیں ہوئے۔ اِسباره میں فرمایا:-

الاحزاب: ۱۴

"کوئی معاملہ زمین پر واقعہ نہیں ہوتا جبتک پہلے آسمان پر طے نہ ہو جائے اور خدا تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور وُہ اپنے بندہ کو ذلیل اور ضائع نہیں کریگا۔"

ابتلا کے وقت حضرت اقدسؑ کا حال

جالندھر کے مقام میں فرمایا:۔

"اِبتلا کے وقت ہمیں اندیشہ اپنی جماعت کے بعض ضعیف دلوں کا ہوتا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ اگر مجھے صاف آواز آوے کہ تو مخذول ہے اور تیری کوئی مُراد ہم پوری نہ کریں گے۔ تو مجھے خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ اُس عشق اور محبت الٰہی اور خدمتِ دین میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی اس لئے کہ میں تو اُسے دیکھ چکا ہوں"۔ پھر یہ پڑھا:۔ "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" [1]

نوکروں سے مہربانی اور حُسنِ سلوک

اپنے خادم حامد علی کو اپنی ڈاک ڈاکخانہ میں ڈالنے کو دی۔ اُسے وہ کہیں فراموش ہو گئی۔ ایک ہفتہ کے بعد کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اُس کے برآمد ہونے پر حامد علی کو بُلوا کر اور خطوط دکھا کر بڑی نرمی سے صرف اتنا ہی کہا:۔

"حامد علی۔ تمہیں نسیان بہت ہو گیا ہے۔ فکر سے کام کیا کرو۔"

حرمات اللہ کی ہتک آپؑ کو گوارا نہ تھی۔ اس بارہ میں فرمایا:۔

"میری جائداد کا تباہ ہونا اور میرے بچوں کا آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہونا مجھ پر آسان ہے بہ نسبت دین کی ہتک اور استخفاف کے دیکھنے اور اُس پر صبر کرنیکے"

اخراجات کے بارہ میں احباب کے خیالات پر آپؑ نے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ کھانے کے متعلق میں اپنے نفس میں اتنا تحمّل پاتا ہوں کہ ایک پیسہ پر دو دو وقت بڑے آرام سے بسر کر سکتا ہوں۔ ایک دفعہ میرے دل میں آیا کہ انسان کہاں تک بھوک کی برداشت کر سکتا ہے۔ اس کے اِمتحان کے لئے چھ

[1] مریم: ۶۶

ماہ تک میں نے کچھ نہ کھایا۔ کبھی کوئی ایک آدھ لقمہ کھا لیا۔ اور چھ ماہ کے بعد میں نے اندازہ کیا کہ چھ سال تک بھی یہ حالت لمبی کی جا سکتی ہے۔ اس اثنار میں دو وقت کھانا گھر سے برابر آتا تھا اور مجھے اپنی حالت کا اخفار منظور تھا۔ اس اخفار کی تدابیر کے لئے جو زحمت اُٹھانی پڑتی تھی۔ شاید وُہ زحمت اَوروں کو بھوک سے نہ ہوتی ہوگی۔ میں وہ دو وقت کی روٹی دو تین مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس حال میں نماز پانچوں وقت مسجد میں پڑھتا اور کوئی میرے آشناؤں میں سے کسی نشان سے پہچان نہ سکا کہ میں کچھ نہیں کھایا کرتا۔

خدا تعالےٰ نے جس کام کیلئے کسی کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تیاری اور لوازم اور اُس کے سرانجام اور مہمّات کے طے کے لئے اس میں قوٰی بھی مُناسب حال پَیدا کئے ہیں۔ دوسرے لوگ جو حقیقتاً فطرت کے مقتضار سے وہ قوٰی نہیں رکھتے اور ریاضتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ آخر کار دیوانے اور مختبط الحواس ہو جاتے ہیں۔"

اِسی ضمن میں فرمایا:-

"طبیبوں نے نیند کے لئے طبعی اسباب مقرر کئے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جب خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ ہم سے کلام کرے۔ اس وقت پوری بیداری میں ہوتے ہیں۔ اور یکدم ربُودگی اور غنودگی وارد کر دیتا ہے اور اس جسمانی عالَم سے قطعاً باہر لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُس عالَم سے پُوری مُناسبت ہو جائے۔ پھر یُوں ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ کلام کر چکتا ہے۔ پھر ہوش و حواس واپس دے دیتا ہے۔ اس لئے کہ مُلہَم اس کو محفوظ کر لے۔ اس کے بعد پھر ربُودگی طاری کرتا ہے۔ پھر یاد کرنے کے لئے بیدار کر دیتا ہے۔ غرض اس طرح کبھی پچاس دفعہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے وہ ایک تصرّف الٰہی ہوتا ہے۔ اس طبعی نیند سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور اطبّار اور ڈاکٹر

اس کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے"۔

ایک دن ایک سائل نے بعد فراغت نماز جبکہ آپؑ اندرون خانہ تشریف لے جا رہے تھے سوال کیا۔ مگر ہجوم کے باعث اُس کی آواز اچھی طرح نہ سُنی جا سکی۔ اندر جا کر جلد واپس تشریف لائے۔ اور خدام کو سوالی کے بُلانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑایا۔ مگر وُہ نہ ملا۔ شام کو وہ پھر آیا۔ اس کے سوال کرنے پر آپؑ نے اپنی جیب سے نکال کر کچھ دیا۔ چند یوم بعد کسی تقریب پر فرمایا کہ

"اُس دن جو وُہ سائل نہ ملا۔ میرے دل پر ایسا بوجھ تھا۔ کہ جس نے مجھے سخت بیقرار کر رکھا تھا۔ اور میں ڈرتا تھا کہ مجھ سے معصیت سرزد ہوئی ہے۔ کہ میں نے سائل کی طرف دھیان نہ کیا اور یُوں جلدی اندر چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کہ وُہ شام کو واپس آ گیا۔ ورنہ خدا جانے میں کس اضطراب میں پڑا رہتا۔ اور میں نے دُعا بھی کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اُسے واپس لائے۔"

(از خط مولانا عبدالکریم صاحبؓ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۰۰ء مندرجہ الحکم جلد ۴ ع ۳ صفحہ ۶-۱۱)

۱۸۹۹ء۔ "ہمارے گھر میں مرزا صاحب (مُراد اپنے والد بزرگوار مرزا غلام مرتضیٰ خانصاحب مرحُوم) پچاس برس تک عِلاج کرتے رہے۔ وُہ اس فن طبابت میں بہت مشہور تھے۔ مگر اُن کا قول تھا کہ کوئی حکمی نسخہ نہیں ملا۔ حقیقت میں اُنہوں نے سچ فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی ذرّہ جو انسان کے اندر جاتا ہے کچھ اثر نہیں کر سکتا"۔

ایک شخص نے پُوچھا کہ حکّام اور برادری کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ فرمایا کہ:۔

"ہر ایک سے نیک سلوک کرو۔ حکّام کی اطاعت اور وفاداری ہر مُسلمان کا فرض ہے وہ ہماری حفاظت کرتے ہیں اور ہر قسم کی مذہبی آزادی ہمیں دے رکھی ہے۔ میں اس کو بڑی بے ایمانی سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کی اطاعت اور وفاداری سچے دل سے نہ کی جائے۔"

برادری کے حقوق ہیں۔ اُن سے بھی نیک سلوک کرنا چاہیئے۔ البتہ اُن باتوں میں جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف ہیں، اُن سے الگ رہنا چاہیئے ۔

ہمارا اصُول تو یہ ہے کہ ہر ایک سے نیکی کرو۔ اور خدا تعالیٰ کی کُل مخلوق سے احسان کرو۔"

خدا تعالیٰ کبھی قضاء و قدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دُعا قبُول کرتا ہے

"جب اللہ تعالیٰ کا فضل قریب آتا ہے تو وہ دُعا کی قبولیت کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ دل میں ایک رقّت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دُعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہوتا تو دل میں اطمینان اور رجُوع پیدا نہیں ہوتا۔ طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالو۔ مگر طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی خدا تعالیٰ اپنی قضاء و قدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دُعا قبول کرتا ہے۔ اس لئے میں توجبتک اذن الٰہی کے آثار نہ پاؤں۔ قبولیّت کی کم امید کرتا ہوں۔ اور اُس کی قضاء و قدر پر اس سے زیادہ خوشی کے ساتھ جو قبولیّت دعا میں ہوتی ہے راضی ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ اس رضا بالقضاء کے ثمرات اور برکات اس سے بہت زیادہ ہیں۔"

اللہ تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا وُہ مغز کو قبُول کرتا ہے

"اللہ تعالےٰ پوست کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو رُوحانیّت اور مغز کو قبُول کرتا ہے۔ اس لئے قرآن شریف میں فرمایا۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى[1] (الحج) اور دُوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ[2]۔ حقیقت میں یہ بڑی نازک جگہ ہے۔ یہاں پیغمبرزادگی بھی کام نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت فاطمہؓ سے بھی ایسا ہی فرمایا۔ اور قرآن شریف میں بھی صاف الفاظ ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[3]

[1] الحج: ۳۸ [2] المائدہ: ۲۸ [3] الحجرات: ۱۴

یہودی بھی تو پیغمبرزادے ہیں۔ کیا صدہا پیغمبر اُن میں نہیں آئے تھے؟ مگر اس پیغمبرزادگی نے اُن کو کیا فائدہ پہنچایا۔ اگر اُن کے اعمال اچھے ہوتے تو وہ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ[1] کے مصداق کیوں ہوتے۔ خدا تعالیٰ تو ایک پاک تبدیلی کو چاہتا ہے۔ بعض اوقات اِنسان کو تکبّر نسب بھی نیکیوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اور وُہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اِسی سے نجات پاؤں گا جو بالکُل خیالِ خام ہے۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھا ہوا۔ ہم نے چماروں کے گھر جنم لیا۔ کبیرا اچھا ہوا ہم نیچے بھلے سب کو کریں سلام، خدا تعالیٰ وفاداری اور صدق سے پیار کرتا ہے اور اعمال صالحہ کو چاہتا ہے۔ لاف و گزاف اُسے راضی نہیں کر سکتے"۔

فرمایا کہ:-

"قرآن شریف تو رفع اختلاف کے لئے آیا ہے۔ اگر ہمارے مخالف رَافِعُكَ اِلَیَّ کے یہ معنے کرتے ہیں۔ کہ حضرت مسیحؑ جسم سمیت آسمان پر چڑھ گئے تو وہ ہمیں یہ بتائیں کہ کیا یہود کی یہ غرض تھی۔ اور وُہ یہ کہتے تھے کہ مسیحؑ آسمان پر نہیں چڑھا؟ اُن کا اعتراض تو یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کا رفع الی اللہ نہیں ہوُا۔ یعنی اُسے قُرب الی اللہ نصیب نہیں ہوا۔ اگر رَافِعُكَ اِلَیَّ اِس اعتراض کا جواب نہیں۔ تو پھر چاہیئے کہ اُن کے اس اعتراض کا جواب دیا اور دکھایا جائے"۔

قادیان میں رہائش کی غرض کیا ہونی چاہیئے

ایک مرتبہ کِسی دوست نے عرض کی کہ وُہ تجارت کے لئے قادیان آنا چاہتا ہے۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ:-

"یہ نیّت ہی فاسد ہے۔ اِس سے توبہ کرنی چاہیئے۔ یہاں تو دِین کے واسطے

[1] البقرة : ۶۲

آنا چاہیئے اور اصلاحِ عاقبت کے خیال سے یہاں رہنا چاہیئے۔ اصل نیّت یہی ہو۔ اور اگر پھر اُس کے ساتھ کوئی تجارت وغیرہ یہاں رہنے کے اغراض کو پُورا کرنے کے لئے ہو، تو حرج نہیں ہے۔ اصل مقصد دین ہو نہ دُنیا۔ کیا تجارتوں کے لئے اَور شہر موزُوں نہیں؟ یہاں آنے کی اصلی غرض کبھی دین کے سوا اَور نہ ہونی چاہیئے۔ پھر جو کچھ حاصل ہو جائے وُہ خدا کا فضل سمجھو"۔

بنی نوع انسان کی ہمدردی خصوصاً اپنے بھائیوں کی ہمدردی اور حمائت پر نصیحت کرتے ہوئے ایک موقعہ پر فرمایا:۔

ہر ایک سے ہمدردی کرو۔ اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ دکھلاؤ

" میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی کو درد ہوتا ہو اور میں نماز میں مصروف ہُوں میرے کان میں اُس کی آواز پہنچ جائے تو میں تو یہ چاہتا ہوں کہ نماز توڑ کر بھی اگر اُس کو فائدہ پہنچا سکتا ہُوں تو فائدہ پہنچاؤں اور جہانتک ممکن ہے اُس سے ہمدردی کروں یہ اخلاق کے خلاف ہے کہ کسی بھائی کی مصیبت اور تکلیف میں اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اگر تم کچھ بھی اس کے لئے نہیں کر سکتے تو کم از کم دُعا ہی کرو۔

اپنے تو درکنار، میں تو یہ کہتا ہوں کہ غیروں اور ہندوؤں کے ساتھ بھی اعلےٰ اخلاق کا نمونہ دکھاؤ۔ اور اُن سے ہمدردی کرو۔ لااُبالی مزاج ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک مرتبہ میں باہر سَیر کو جا رہا تھا۔ ایک پٹواری عبدالکریم میرے ساتھ تھا وہ ذرا آگے تھا اور میں پیچھے۔ راستہ میں ایک بڑھیا کوئی ۷۰، ۷۵ برس کی ضعیفہ ملی۔ اُس نے ایک خط اُسے پڑھنے کو کہا۔ مگر اُس نے اُس کو جھڑکیاں دے کر ہٹا دیا۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اُس نے وہ خط مجھے دیا۔ میں اُس کو لے کر ٹھہر گیا۔

اور اس کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھا دیا اس پر پٹواری کو بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ کیونکہ ٹھہرنا تو پڑا اور ثواب سے بھی محروم رہا۔"

مجھے بڑے ہی کشفِ صحیح سے معلوم ہوا ہے کہ ملوک بھی اس سِلسلہ میں داخل ہوں گے۔ یہاں تک کہ وُہ ملوک مجھے دکھائے بھی گئے ہیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ میں تجھے یہاں تک برکت دوں گا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

اللہ تعالیٰ ایک زمانہ کے بعد ہماری جماعت میں ایسے لوگوں کو داخل کریگا۔ اور پھر اُن کے ساتھ ایک دُنیا اس طرف رجُوع کرے گی۔" (الحکم جلد ۸ ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۴ پرچہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء)

۱۸۹۹ء۔ فرمایا:۔

تزکیۂ نفس کیلئے صحبت صالحین اور نیکوں کیساتھ تعلق پیدا کرنا بہت مُفید ہے

"قرآن شریف میں آیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا[1]۔ اُس نے نجات پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔ تزکیۂ نفس کے واسطے صُحبتِ صالحین اور نیکوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا بہت مُفید ہے۔ جھُوٹ وغیرہ اخلاقِ رذیلہ دُور کرنے چاہئیں اور جو راہ پر چل رہا ہے۔ اُس سے راستہ پُوچھنا چاہیئے۔ اپنی غلطیوں کو ساتھ ساتھ درست کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ غلطیاں نکالنے کے بغیر اِملا درست نہیں ہوتا۔ ویسا ہی غلطیاں نکالنے کے بغیر اخلاق بھی درست نہیں ہوتے۔ آدمی ایسا جانور ہے کہ اُس کا تزکیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔ تو سیدھی راہ پر چلتا ہے۔ ورنہ بہک جاتا ہے۔"

(بدر جلد ۱۰ ۴۴٬۴۵ صفحہ ۹ پرچہ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

---

[1] الشمس: ۱۰

۱۸۹۹ء ۔ فرمایا:۔

"رات کے وقت جب سب طرف خاموشی ہوتی ہے اور ہم اکیلے ہوتے ہیں اس وقت بھی خدا کی یاد میں دِل ڈرتا رہتا ہے کہ وہ بے نیاز ہے"۔

فرمایا:۔

"جب انسان کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور عجز و مصیبت کی حالت نہیں رہتی۔ تو جو شخص اس وقت انکسار کو اختیار کرے۔ اور خدا کو یاد رکھے۔ وہ کامل ہے۔ ؎ چوں بدولت برسی مست نگردی مَردی"۔

مفتی محمد صادق صاحب نے اپنے گزشتہ رات کے خواب کا ذکر کیا۔ جو صبح پُورا ہُوا۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔

"جس چیز کا وجود نہیں، اور وہ چیز موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ پہلے سے اُس کی خبر دے دیتا ہے۔ دہریہ لوگ کیوں اس پر غور نہیں کرتے"۔

فرمایا:۔

"مجھے الہام ہوُا ہے۔ گورنر جنرل کی دُعاؤں کی قبولیّت کا وقت آگیا۔"

فرمایا:۔

"گورنر جنرل سے مراد "رُوحانی عہدہ" ہے"۔

(بدر جلد ۱۰ نمبر ۴۶،۴۷ صـ۲ پرچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۱ء)